

WWW.PAKSOCIETY.COM
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
جولائی 2015
خواتین ڈائجسٹ
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیر خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

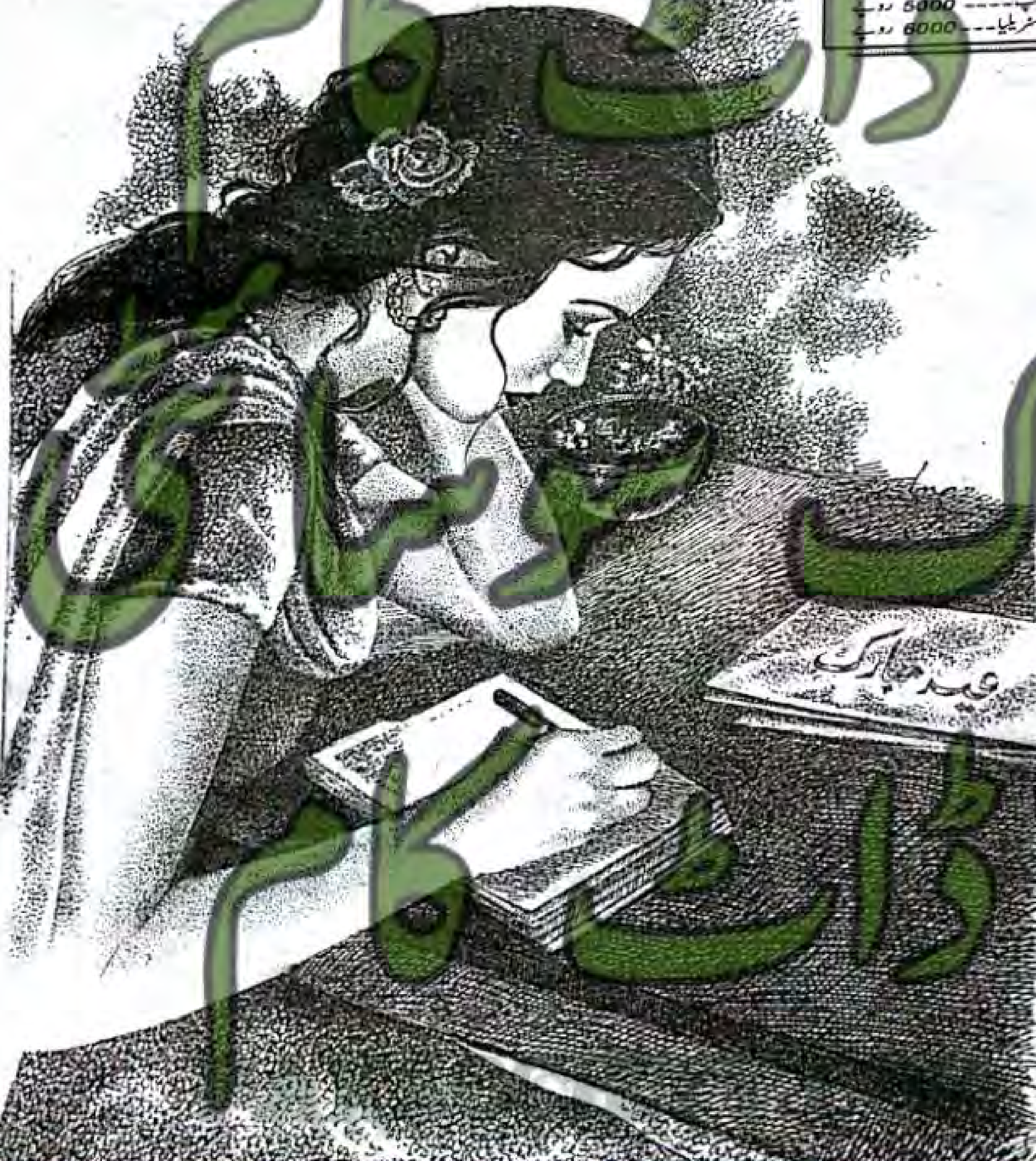
خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار، کراچی

MEMBER	
APNS	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
CPNE	رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے















جولائی 2015

جلد 43 شمارہ 3

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

کچھ اپنی باتیں

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
رمضان المبارک کی پُرنور ساعتیں تیزی سے گزر رہی ہیں۔ یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو آخری عشرہ کی عبادتوں کے ساتھ ساتھ عید کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔ آخری عشرہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے شب قدر کا تحفہ ہے۔ اس عشرے کی طاق راتوں میں قرآن پاک کی تلاوت، نفل، تسبیحات، نیکیاں بڑھانے اور قرب الٰہی حاصل کرنے کا بہترین موقع ہے۔ خصوصاً تلاوت قرآن پاک۔ قرآن پاک ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ ایک بار ضرور سمجھ کر پڑھیں تاکہ جان سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے عالم انسانیت کے لیے کیا پیغام بھیجا ہے۔ آج دُنیا جن مسائل کا شکار ہے، ان تمام مسائل کا حل قرآن پاک میں ہے۔
پاکستان ہماری جائے پناہ، ہماری شناخت۔
27 رمضان المبارک کو معرض وجود میں آیا تھا۔ اپنی عبادتوں میں پاکستان کی سلامتی اور امن و امان کے لیے دُعا کریں۔ خصوصاً کراچی کے لیے جو اس وقت گرم ترین ہواؤں کی زد میں ہے۔ گرمی کی شدت اس بار جان لیوا ہے۔ بہت سے لوگ جانیں گنوا بیٹھے ہیں۔ کئی سالوں سے یہاں بارش نہیں ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شہر پر کرم اور رحمت کی بارش برسائے۔
عید اجتماعی خوشی کا تہوار ہے۔ عید کی خوشیاں تب ہی تکمیل پاتی ہیں۔ جب سب کے دل خوش ہوں۔ آپ کے ارد گرد کچھ ایسے لوگ ضرور ہوں گے جو اس تہوار کو منانے کی استطاعت سے محروم ہوں گے۔ آپ کی تھوڑی سی توجہ اور اعانت انہیں خوشیاں مہیا کر سکتی ہے۔ خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں اور حقیقی خوشی دینے میں ہی ہے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے آپ سب کو دلی عید مبارک۔ ہماری دُعا ہے صبح عید آپ کے آنگن میں خوشیوں کی جھلمل کرنیں لے کر طلوع ہو۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول۔ عہد الست تکمیل کے مراحل میں،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل،
- آسیہ رزاقی کا مکمل ناول۔ اب سوال یہ ہے،
- حنا یاسمین، رضوانہ ارشاد الحق اور فریدہ فرید کے ناولٹ،
- نازیہ جمال، میمونہ صدف اور سمیرا افضل کے افسانے،
- عمیرہ احمد اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- عید کے حوالے سے معروف شخصیات سے سروے،
- ٹی وی فنکارہ مریم انصاری سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا عید نمبر آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے' سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

اولیاء کی کرامات اور ان کے شرف و فضل کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"آگاہ رہو! اللہ کے ولی' ان پر خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (ولی کون ہیں؟) وہ جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے' ان کے لیے دنیا کی زندگی اور آخرت میں خوش خبری ہے۔ اللہ کی باتوں میں تبدیلی نہیں' یہ ہے بڑی کامیابی۔" (سورۃ یونس 62-63)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اے مریم!) اس کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا' تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں گریں گی' چنانچہ کھا اور پی۔) (سورۃ مریم 25-26)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"جب بھی زکریا (علیہ السلام) اس (مریم) کے حجرے میں آتے تو اس کے پاس کھانے کی چیزیں پاتے۔ انہوں نے پوچھا: اے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آئیں؟ انھوں نے کہا: یہ اللہ کے پاس سے آئی ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بے حساب روزی دیتا ہے۔" (سورۃ آل عمران 37)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"جب تم ان کافروں اور ان کے ان معبودوں سے الگ ہو گئے جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں' تو (اب) غار کی طرف ٹھکانا پکڑو' تمہارے لیے تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے کام میں آسانی مہیا کر دے گا۔ اور تو دیکھے گا سورج کو کہ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے داہنی طرف کو ہو کر نکلتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو بائیں طرف کو ان سے کترا کر نکل جاتا ہے۔" (طلوع و غروب دونوں اوقات میں سورج کی حدت سے وہ محفوظ رہتے ہیں۔) (سورۃ کہف 16-17)

فائدہ آیات : قرآن کریم کی پہلی آیت میں اولیاء اللہ کی پہچان بتلائی گئی ہے کہ ایمان و تقویٰ سے آراستہ لوگ اللہ کے ولی ہیں۔ جب یہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے تو ان پر خوف و حزن کے آثار نہیں

ہوں گے کیونکہ ایمان و تقویٰ کا زادراہ ان کے پاس موجود ہو گا جو قیامت والے دن انسانوں کی نجات کا ذریعہ ہو گا۔

دوسری آیات میں اولیاء اللہ کی بعض کرامات کا بیان ہے۔ کرامت' خرق عادت واقعے کو کہتے ہیں' یعنی عام عادی اسباب سے ہٹ کر کسی واقعے کا ظہور پذیر ہونا' جیسے آگ کا کام جلانا ہے لیکن وہ نہ جلائے' سوکھے درخت یا غیر موسم میں پھل نہیں ہوتے لیکن ان میں پھل پیدا ہو جائے۔ یہ کرامت ہے۔ یہ کسی انسان کے اختیار میں نہیں کہ جب کوئی ولی اللہ چاہے اس کا اظہار کردے' بلکہ یہ کلیتاً" اللہ کے اختیار میں ہے' وہ جب چاہے اپنے کسی بندے کے ہاتھ سے اسے ظاہر کروا دیتا ہے۔ کرامات' انبیاء علیہ السلام کے معجزات کی طرح برحق ہیں لیکن یہ کسی کی ولایت کی دلیل یا معیار نہیں جیسا کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔ ایک متقی اور مومن کامل یقیناً" اللہ کا ولی ہے' اس کی ولایت کسی کرامت کی محتاج نہیں ہے۔ کرامت ایک الگ شرف و فضل ہے' اگر اللہ چاہے تو اس سے بھی اسے سرفراز فرمادے' لیکن یہ ولایت کے اثبات کے لیے ضروری نہیں ہے۔

اب اس سلسلے کی چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

برکت

حضرت ابو محمد عبدالرحمن بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔

"اصحاب صفہ غریب لوگ تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا۔

"جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو' وہ تیسرے آدمی کو (اپنے ساتھ) لے جائے۔ جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو' وہ پانچویں' چھٹے آدمی کو لے جائے۔"

چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تین آدمیوں کو لے گئے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم دس آدمیوں کو لے گئے۔ اور ابوبکر رضی اللہ عنہا نے شام کا کھانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھایا' پھر وہیں ٹھہرے رہے یہاں تک کہ عشاء کی نماز پڑھی' پھر گھر لوٹے۔ جب گھر آئے تو رات کا کچھ حصہ' جتنا اللہ نے چاہا' گزر چکا تھا۔ ان کی بیوی نے کہا۔

"آپ کو اپنے مہمانوں (کی خاطر تواضع) سے کس چیز نے روک کے رکھا؟" انہوں نے کہا۔

"کیا تو نے ان کو رات کا کھانا نہیں کھلایا؟"

بیوی نے کہا۔ "انہوں نے آپ کے آنے تک کھانے سے انکار کردیا' ورنہ گھر والوں نے تو ان کو کھانا پیش کردیا تھا۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت ناراض ہوئے

حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں جلدی سے چھپ گیا' تو انہوں نے فرمایا۔

"او نادان! اور مجھے برا بھلا کہا۔

پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھالی کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گے اور بیوی نے بھی نہ کھانے کی قسم کھالی' اور مہمان یا مہمانوں نے بھی قسم کھالی کہ وہ بھی اس وقت تک کھانا نہیں کھائے گا یا نہیں کھائیں گے' جب تک کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ نہ کھائیں۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ "یہ (قسم) شیطان کی طرف سے ہے اور کھانا منگوایا اور کھایا اور مہمانوں نے بھی کھایا۔ وہ جو لقمہ بھی اٹھاتے تھے تو نیچے سے وہ کئی حصے بڑھ جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے بنی فراس کی بہن! یہ کیا ماجرا ہے؟"

تو انہوں نے کہا "میری آنکھ کی ٹھنڈک کی قسم! یہ اب یقیناً" ہمارے کھانے سے قبل جتنا تھا' اس سے بہت زیادہ ہے۔"

چنانچہ انہوں نے کھایا اور اسے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بھیجا۔ اور راوی نے بیان کیا کہ آپ نے بھی اس میں سے کھایا۔

ایک اور روایت میں ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے (بیٹے)

عبدالرحمن سے کہا: تم اپنے مہمانوں کی دیکھ بھال کرو' میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جارہا ہوں۔ تم میرے آنے تک ان کی مہمان نوازی سے فارغ ہو جانا۔ چنانچہ عبدالرحمن (اندر) گئے اور جو کچھ تھا' مہمانوں کے سامنے لاکر رکھ دیا اور عرض کیا: "کھاؤ۔"

مہمانوں نے کہا: "ہمارے گھر والے کہاں ہیں؟"

عبدالرحمن ؓ نے کہا: "آپ کھانا کھائیں۔"

انہوں نے کہا "جب تک گھر والے (ابوبکرؓ) نہ آجائیں' ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔"

عبدالرحمن ؓ نے کہا: "آپ لوگ ہماری طرف سے اپنی مہمان نوازی قبول کریں' اس لیے کہ اگر وہ (گھر والے' ابوبکرؓ) آگئے جب کہ آپ لوگوں نے کھانا نہیں کھایا ہوگا تو ہمیں ان کا عتاب سہنا پڑے گا۔"

لیکن انہوں نے (کھانے سے) انکار کر دیا۔ میں نے جان لیا کہ وہ (والد صاحب) مجھ سے ناراض ہوں گے۔ چنانچہ جب وہ تشریف لائے تو میں (ڈرتے ہوئے) ان سے ایک طرف ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا: تم لوگوں نے کیا کیا؟ تو انہوں نے بتلایا۔ انہوں (ابوبکرؓ) نے آواز دی۔

"اے عبدالرحمن ؓ!"

میں خاموش رہا۔

انہوں نے پھر آواز دی "اے عبدالرحمن ؓ!"

میں پھر بھی خاموش رہا۔

انہوں نے کہا: "اے نادان بچے! میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ اگر تو میری آواز سن رہا ہے تو چلا آ۔"

چنانچہ میں نکل کر آیا اور کہا:

"آپ اپنے مہمانوں سے پوچھ لیں۔ کہ ہم نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔"

انہوں نے کہا "عبدالرحمن ؓ نے سچ کہا ہے' یہ ہمارے پاس (کھانا) لایا تھا۔"

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "تو تم میرے انتظار میں رہے' اللہ کی قسم! میں آج کی رات کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

چنانچہ دوسروں نے بھی کہا: اللہ کی قسم! جب تک آپ نہیں کھائیں گے ہم بھی نہیں کھائیں گے۔"

تب آپ رضی اللہ نے فرمایا:

"افسوس ہے تم پر' تمہیں کیا ہے۔ تم ہماری مہمان نوازی قبول نہیں کرتے؟ لاؤ اپنا کھانا۔"

چنانچہ عبدالرحمٰن کھانا لائے۔ آپ نے اس میں ہاتھ ڈال کر فرمایا: (شروع) اللہ کے نام سے' پہلی حالت (جس میں غصے سے قسم کھائی) شیطان کی طرف سے تھی۔" چنانچہ آپ نے بھی کھایا اور باقی سب نے بھی کھانا کھایا۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1 ۔ مدارس دینیہ اور علوم اسلامیہ کے طلبہ کو اس طرح اپنے اپنے گھروں میں ساتھ لے جاکر کھانا کھلانا جائز ہے' جیسے پہلے بعض علاقوں اور حلقوں میں اس کا رواج تھا اور شاید اب بھی کہیں ہو۔

2 ۔ عورت کا اذن خصوصی کے بغیر مہمان کی خاطر داری کرنا اور اسے کھلانا پلانا جائز ہے۔

3 ۔ باپ کا تادیب کے طور پر اولاد کو برا بھلا کہنا جائز ہے۔

4 ۔ مباح چیز کے ترک پر قسم کھانا جائز ہے۔

5 ۔ بہتر صورت سامنے آجائے تو قسم توڑ کر اسے اختیار کیا جائے' تاہم قسم کا کفارہ دینا ضروری ہوگا۔

6 ۔ اس میں کرامت کا اثبات ہے کہ تھوڑے سے کھانے میں اللہ نے اتنی برکت ڈال دی کہ اہل خانہ' مہمانوں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ بارہ عریفوں نے بھی اپنے اپنے رفقاء سمیت اسے کھایا۔ یہ فوائد فتح الباری سے لیے گئے ہیں۔

محدث

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم سے پہلے جو امتیں ہوئیں' ان میں کچھ لوگ محدث ہوتے تھے۔ اگر میری امت میں بھی کوئی

محدث ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔"

اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے اور مسلم نے اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے بیان کیا ہے۔ اور ان دونوں روایتوں میں ہے کہ ابن وہب نے کہا: محدثون کے معنی ہیں: الہام یافتہ۔

فوائد و مسائل : الہام یافتہ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں میں باتیں ڈال دی جاتی ہیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ اگر اندیشہ محسوس ہو تو موسیٰ کو سمندر میں ڈال دیں۔ حضرت مریم کو القا ہوتا رہا۔ یہ بھی کرامت کی ایک صورت ہے۔

یہ حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہا کی فضیلت میں واضح ہے۔

بددعا

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں

کہ اہل کوفہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ ع کی شکایت کی۔ چنانچہ حضرت عمر نے انہیں (کوفے کی گورنری سے) معزول کر دیا اور ان پر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو گورنر مقرر فرما دیا۔ اہل کوفہ نے حضرت سعد کی شکایت میں یہاں تک بیان کیا کہ یہ تو نماز بھی صحیح طریقے سے نہیں پڑھاتے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف پیغام بھیجا اور کہا۔

"اے ابو اسحاق! (حضرت سعد کی کنیت) یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ تم نماز بھی صحیح نہیں پڑھاتے تھے۔"

حضرت سعد رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں تو اللہ کی قسم! ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز پڑھاتا تھا، میں اس میں کوئی کمی نہیں کرتا تھا۔ میں عشاء کی نماز پڑھاتا تو پہلی دو رکعتوں میں قیام لمبا کرتا اور پچھلی رکعتوں میں مختصر۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اے ابو اسحاق! تمہارے متعلق یہی گمان تھا۔"

اور ان کے ساتھ ایک آدمی یا چند آدمی کوفے بھیجے تاکہ وہ حضرت سعد کی بابت اہل کوفہ کی رائے معلوم کریں، چنانچہ انہوں نے کوفے کی ہر مسجد میں جا کر ان کی بابت پوچھا۔ سب نے ان کی تعریف کی، حتیٰ کہ وہ بنو عبس کی مسجد میں آئے تو وہاں کے نمازیوں میں سے ایک شخص کھڑا ہوا۔ اسے اسامہ بن قتادہ کہا جاتا تھا اور اس کی کنیت ابو سعدہ تھی۔ اس نے کہا:

"جب آپ نے ہمیں قسم دلائی ہے تو عرض یہ ہے کہ سعد لشکر کے ساتھ (جہاد کے لیے) نہیں جاتے تھے۔ (مال غنیمت کی) تقسیم میں برابری نہیں کرتے تھے اور فیصلہ کرنے میں انصاف سے کام نہیں لیتے تھے۔"

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! میں بھی تین باتوں کی دعا ضرور کروں گا: اے اللہ! اگر تیرا یہ بندہ جھوٹا ہے اور ریاکاری اور شہرت کی خاطر کھڑا ہوا ہے تو اس کی عمر لمبی کر، اس کی غربت و ناداری میں اضافہ کر اور اسے فتنوں کا نشانہ بنا دے۔"

(چنانچہ ایسا ہی ہوا) اس کے بعد جب اس سے پوچھا جاتا تو وہ کہتا۔

"بہت بوڑھا اور فتنوں میں مبتلا ہوں، مجھے سعد کی بددعا لگ گئی ہے۔"

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے راوی عبدالملک بن عمیر کہتے ہیں کہ میں نے بعد میں اسے دیکھا تھا، بڑھاپے کی وجہ سے اس کے دونوں ابرو اس کی آنکھوں پر گرے پڑے تھے اور وہ راستوں میں لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا اور انہیں اشارے کرتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1 ۔ اس میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا بیان ہے کہ وہ مستجاب الدعوات تھے۔

2 ۔ کسی کی بابت تحقیق و تفتیش کرنی ہو تو اہل خیرد

اہل صلاح سے پوچھا جائے' جیسے کوفے کی مساجد میں جا کر نمازیوں سے تحقیق کی گئی۔

3 ۔ عمال حکومت کو مصلحتاً" بدل دینا بھی جائز ہے' جیسے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا گیا حالانکہ ان کے خلاف شکایات جھوٹ پر مبنی تھیں' پھر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ ان کی جگہ نیا حاکم مقرر کر دیا جائے۔

4 ۔ اس میں کرامت کا اثبات ہے کہ حضرت سعد کی تینوں بددعائیں قبول ہوئیں۔

قبولیت

حضرت عروہ بن زبیر رحمتہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ سے اروی بنت اوس نے جھگڑا کیا اور حضرت مروان بن حکم (والی مدینہ) تک اپنی شکایت پہنچائی اور اس نے دعوا کیا کہ۔

"سعیدؓ نے اس کی کچھ زمین غصب کرلی ہے۔"

حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے کہا: "کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (وعید) سننے کے بعد اس کی زمین کا کچھ حصہ غصب کرلیتا۔

حضرت مروان رحمتہ اللہ نے پوچھا: "تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا (وعید) سنی ہے؟"

انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"جس نے ناجائز طریقے سے کسی کی ایک بالشت زمین بھی ہتھیالی تو اسے (قیامت والے دن) سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔"

یہ سن کر حضرت مروان رحمتہ اللہ نے ان سے کہا۔ "اس کے بعد میں تم سے کوئی دلیل طلب نہیں کروں گا۔"

چنانچہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے اس عورت کے لیے بددعا فرمائی۔

"اے اللہ! اگر یہ عورت جھوٹی ہے تو اس کی آنکھوں کی بینائی ختم کردے اور اس کو اس کی زمین ہی میں موت دے۔"

حضرت عروہ رحمتہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ مرنے سے پہلے اس کی بینائی چلی گئی اور ایک دفعہ وہ اپنی زمین میں چل رہی تھی کہ ایک گڑھے میں گر گئی اور اس میں مرگئی۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی ایک روایت جو محمد بن زید بن عبداللہ بن عمر سے اسی کے ہم معنی منقول ہے' اس میں ہے کہ محمد بن زید (راوی حدیث) نے اس عورت کو نابینا اور دیواریں ٹٹولتے ہوئے دیکھا۔ وہ کہتی تھی۔

"مجھے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی بددعا لگ گئی ہے۔ اور وہ ایک کنویں پر سے گزری جو زمین کے اسی احاطے میں تھا جس کے بارے میں اس نے جھگڑا کھڑا کیا تھا' چنانچہ وہ اس میں گر (کر مر) گئی اور وہی اس کی قبر بنا۔

فوائد و مسائل : 1 ۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ حضرت مروان بن حکم کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مدینے کے گورنر تھے اور اسی دور کا یہ واقعہ ہے جو روایت میں مذکور ہوا۔ یزید کے بیٹے معاویہ بن یزید کے بعد یہ چند مہینے خلیفہ بھی رہے۔

2 ۔ اس میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور استجابت دعا سے ان کی کرامت واضح ہے۔

3 ۔ نیک لوگوں کو ایذا دینے سے بچنا چاہیے تاکہ انسان ان کی بددعا سے محفوظ رہے کیونکہ مظلوم کی بددعا اللہ تعالیٰ بعض دفعہ فوراً" قبول فرمالیتا ہے۔



کل کا کام آج پر نہ ٹالو

انشاء جی

جب ہمارے دوستوں کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ کو خواتین ڈائجسٹ کے لیے کچھ نہ کچھ لکھنا ہو گا' ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو' تو ہم نے عذر کیا کہ۔

"پہلی کو تو ہم کچھ نہیں کرتے۔ بس بال کٹاتے ہیں۔ مالش کراتے ہیں۔ فلموں' جائیدادوں اور سیکنڈ ہینڈ کاروں کے اشتہارات دیکھتے ہیں۔ بہت مصروف دن ہوتا ہے ہمارا۔"

"تو کسی اور دن لکھ دیا کیجئے۔ ہمارا پرچا مہینے میں ایک روز آئے گا۔"

"کیا نام رکھا ہے آپ نے پرچے کا؟"

"خواتین ڈائجسٹ۔"

"اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ پرچا آپ عورتوں کے لیے نکال رہے ہیں؟"

"آپ بہت ذہین آدمی ہیں۔ آپ نے صحیح سمجھا۔"

"لیکن میں تو عورت نہیں ہوں۔"

"ہمیں معلوم ہے۔"

"مجھے کھانا پکانے کی ترکیبیں بھی نہیں آتیں کہ آپ کے لیے کریلوں کے حلوے' بھنڈی کے قورمے یا بینگن کی کھیر کے موضوع پر کچھ لکھ سکوں۔ انڈا البتہ "ابال لیتا ہوں۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمارے ہاں دستر خوان یا ہنڈ کلیا کا کالم اگر ہوا تو اسے کوئی خانہ دار خاتون لکھیں گی۔"

"تو پھر آپ مجھ سے کشیدہ کاری کے نمونوں کی فرمائش کریں گے۔ اس میں بھی میں کورا ہوں۔"

"یہ بھی ہمیں معلوم ہے۔"

"اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں راتوں کی نیند حرام کرنے والا کوئی ناول آپ کے لیے قسط وار لکھ سکوں گا۔ تب بھی آپ غلطی پر ہیں۔"

"آپ کو ایسی کوئی چیز لکھنے کی زحمت نہ دی جائے گی۔"

اب ہم نے بچ نکلنے کا آخری حربہ استعمال کیا۔

"آپ سے ہمارا اصولی اختلاف ہو جائے گا' کیونکہ ہم مردوں اور عورتوں کے لیے برابر حقوق کے حامی ہیں۔"

"اطمینان رکھیے! ہم بھی ہیں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔ ورنہ بالعموم ہمارے معاشرے میں مرد کو اس کا جائز مقام نہیں دیا جاتا' حالانکہ یہ بھی ایک خاصی ضروری مخلوق ہے۔"

"جی ہاں! ہم جانتے ہیں۔"

"اچھی بات۔"

اس وقت تو ہم بہت خوش ہوئے کہ اپنی بات منوالی' لیکن اب ہماری مثال ان نو آزاد ملکوں کی سی ہے' جن کو آزادی مل جاتی ہے تو سوچتے ہیں کہ اب ہم کیا کریں۔ کم ازکم لنکا کے ساتھ یہی ہوا کہ انگریز بہادر نے پاکستان اور ہندوستان سے رخصت سفر باندھا اور درو دیوار پر حسرت کی نگاہ ڈالتے ہوئے رخصت ہوا تو لنکا سے بھی کہا کہ "آج سے تم بھی آزاد۔ جب مکان ہی چھوڑ دیا تو اس کا غسل خانہ رکھ کر کیا کریں گے۔" اس پر لنکا والے بہت بھنائے کہ "صاحب! یہ کیا بے مروتی ہے۔ آپ کو ابھی کچھ دن اور حکومت کرنا ہو گی۔" لیکن انگریز نہ مانے۔ جلسے جلوس بھی ہوئے' ہڑتالیں بھی۔ حتیٰ کہ کچھ دہشت پسندوں نے بم وغیرہ بھی پھینکے اور "لنکا سے مت جاؤ" کے نعرے بھی خوب لگے' لیکن یہ سامراجی ممالک لاتوں کے بھوت ہیں' باتوں کے نہیں اور غریب لنکا کے پاس اتنی طاقت کہاں تھی' کہ بزور ان کو روکتا۔ خون کے سے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

ہمارے سامنے بھی اسی قسم کا مسئلہ ہے کہ لکھیں تو کیا لکھیں۔ دیکھا جائے تو آخر عورتوں کے کتنے مسائل ہیں' جو مردوں سے الگ ہیں۔ کھانا پکانا' بٹن لگانا' موزے سینا' بچوں کے منہ دھلانا' کپڑے بدلنا وغیرہ' اکثر گھروں میں بے شک مرد کرتے ہیں تاکہ عورتوں کی مجلسی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہ پڑے اور ہمسایوں سے ان کے میل ملاقات میں فرق نہ آئے' لیکن عورتوں کو بھی اس کی کچھ ممانعت نہیں۔ فلمیں دیکھنے میں بھی دونوں برابر ہیں۔ اگرچہ اس کی اصل صلاحیت اللہ تعالیٰ نے عورتوں ہی کو ودیعت کی ہے۔ روپے پیسے کے معاملے میں البتہ مدت سے تقسیم کار ہو چکی ہے۔ نہ عورتیں کمانے میں دخل دے سکتی ہیں نہ



مد خرچ کرنے میں۔ جس کا کام اسی کو ساجھے۔ روپے کمانے کے بارے میں ہمارا ذاتی تجربہ بہت کم ہے۔ یوں بھی بازار میں ایسی کتابیں مل جاتی ہیں، جن کی مدد سے انسان راتوں رات لکھ پتی بن سکتا ہے۔ ہم خود کو روپے خرچ کرنے (یا نہ کرنے) کے موضوع تک محدود رکھیں گے۔ بالخصوص اس لیے کہ ہمارا ذاتی اور طویل تجربہ اسی میدان میں ہے۔

سب سے زرین اصول یہ ہے کہ جو کام کل ہو سکتا ہے۔ اسے آج پر نہ ڈالو اور جو چیز کہیں اور مل سکتی ہے، اسے سامنے کی دکان سے نہ خریدو۔ ہم فلم دیکھنے میں بالعموم یہی اصول برتتے ہیں۔ شروع کے تین دنوں میں تو ہم رش سے گھبراتے ہیں تاکہ جن کو دیکھنا ہے، دیکھ لیں اور بھیڑ چھٹ جائے۔ پیر کے بعد ہم حساب لگاتے ہیں کہ ابھی چار روز اور ہیں۔ کسی بھی دن دیکھ لیں گے۔ وہ تین دن ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں لگ جاتے ہیں کہ میٹنی شو دیکھنا مناسب ہو گا یا رات کا۔ حتیٰ کہ اخبار میں فلم اترنے کا اعلان آجاتا ہے۔ شیطان کے جن کاموں کو ہم برا جانتے ہیں، ان میں تعجیل بھی ہے۔ فلم اب نہ دیکھی۔ پھر آئے گی تو دیکھ لی جائے گی۔ نتیجہ یہ کہ اس وقت تمام اچھی فلمیں ہمارے ویٹنگ لسٹ پر ہیں کہ دوبارہ آئیں تو دیکھی جائیں۔

کپڑوں کے بارے میں بھی یہی قیمتی اصول ہمارے پیش نظر رہتا ہے۔ پاکستان میں صنعتیں برابر ترقی کر رہی ہیں۔ ہر سال نئے نئے اور بہتر ڈیزائن کے کپڑے بازار میں آتے ہیں۔ اگر ہم بالفرض گزشتہ سال سوٹ سلوا لیتے، تو آج افسوس ہوتا۔ آج سلوا لیں تو اگلے برس افسوس ہو گا۔ انسان ایسا کام ہی کیوں کرے، جس میں بعد ازاں افسوس کا اندیشہ ہو۔

1961ء میں کنٹرول ریٹ پر ایک کار مل رہی تھی۔ پھر وہ نہ ملی کیونکہ دکاندار ہمارے اصول سے واقف نہ تھا۔ اس نے بیچنے میں جلدی کی۔ اگر کہیں اس وقت یہ کار ہم خرید لیتے تو اس وقت چار سال پرانی ہوتی۔ کوئی آدھے داموں بھی نہ پوچھتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کفایت شعاری اور جزرسی، جسے فضول خرچ لوگ خسّت کا نام دیتے ہیں۔ اللہ کی دین ہے۔ تاہم ایسی مثالیں بھی ہیں کہ انسان کوشش سے یہ ملکہ حاصل کر لیتا ہے۔ ان میں سب سے روشن مثال خود ہماری ہے۔ ابھی چند سال پہلے تو ہم کبھی کبھار کوئی چیز خرید بیٹھتے تھے اور ظاہر ہے کہ آخر میں پچھتاتے تھے۔ آخر ایک روز اپنے دوست ممتاز مفتی سے، جو ہمارے ساتھ کام کرتے تھے۔ ہم نے گزارش کی کہ ہمارے ساتھ ایک نیکی کیجیے۔

بولے "کہو! کیا بات ہے۔ کچھ قرض چاہیے؟"

ہم نے کہا۔ "جی نہیں۔ وہ تو روز چاہیے ہوتا ہے۔ آج یہ کہنا ہے کہ ہم بازار میں خریداری کو نکلیں تو ہمارے ہم رکاب رہا کیجیے۔ آپ کا کام فقط ہمیں مفید مشورے دینا ہو گا۔ جہاں آپ دیکھیں کہ ہم کوئی چیز خریدنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آہستہ سے اتنا فرما دیا کیجیے کہ یہ اگلی دکان پر چار آنے سستی ہے۔"

بولے "ٹھیک ہے۔" اب ہوا یہ کہ ہم نے ایک جگہ دو روپے موزوں کے طے کیے۔ (دکان دار تین روپے مانگ رہا تھا) اور بٹوہ نکال کر ادائیگی کرنے کو تھے کہ مفتی جی نے کہا۔ "یہاں سے مت لو جی۔ فریئر روڈ کے فٹ پاتھ پر یہی چیز ڈیڑھ روپے کی ہے۔"

یوں ہمارے وہ دو روپے بھی بچے اور وہ ڈیڑھ روپیہ بھی، کیونکہ اس روز فٹ پاتھ پر تلاش بسیار کے باوجود دکان دار ہمیں نہ مل سکا۔ مل جاتا تو مفتی صاحب فرماتے کہ "ذرا بندر روڈ پر چلو تو یہ موزہ ایک روپے میں دلا دوں۔"

چند روز میں ہم یہ بھول گئے کہ یہ ترکیب مفتی صاحب کو خود ہم نے سمجھائی ہے۔ قارئین کرام بھی یہ نسخہ استعمال کر کے دیکھیں.... اور فائدہ ہو تو اس فقیر کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔

(1970ء میں لکھا گیا)

صبح عید کا تصور ہی جان فزا ہوتا ہے۔ کہیں شیر خورمہ کی خوشبو، تو کہیں مہندی کی مہک، تو کہیں چوڑیوں کی کھنک، ہنسی کی گنگناہٹیں تو کہیں نماز عید کی بھاگ دوڑ، یہ عید کے دن کا ایک خاص ماحول تقریباً" ہر گھر میں ہوتا ہے لیکن ہر عمر کی عید کے مختلف رنگ ہوتے ہیں عید تو وہی ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے اپنے محسوسات بدل جاتے ہیں، وقت کے ساتھ تبدیلیاں آتی ہیں تو عید کا تصور بھی بدلتا جاتا ہے۔ کچھ عیدوں کے رنگ ہمارے دلوں میں ہمیشہ کے لیے ایک یاد بن کر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ہم نے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں سے چند سوالات کیے ہیں۔

1۔ عید پر حاصل ہونے والی کوئی سچی خوشی؟
2۔ اپنے یا پرائے لوگوں سے ملنے والی یادگار عیدی؟
3۔ خوشی یا پریشانی کے حوالے سے کوئی یادگار عید؟

عید آتی ہے ہر سال کی طرح

شاہین رشید

عاصمہ شیرازی ــــ (اینکر)

1 سچی خوشی تو نیکی کا کوئی کام کر کے ہی حاصل کی جا سکتی ہے تو میرا خیال ہے کہ نیکی کے کاموں کو بتایا نہیں جاتا کہ نیکی ضائع ہو جاتی ہے۔ عید مسلمانوں کے لیے ایک تحفہ ہے ہمیں چاہیے کہ ہم عید پر ان لوگوں کا بھی خیال رکھیں جنہیں یہ سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ جن کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ وہ عید کا اہتمام کر سکیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے کچھ خرچ کر کے خوشی ہوتی ہے۔



2 پرائے کی تو بات چھوڑیں۔ اپنے والدین سے ملنے والی عیدی کی ہی نہ صرف خوشی ہوتی ہے بلکہ وہ عیدی یادگار بھی بن جاتی ہے۔ اب عیدی لینے کا مزا نہیں آتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی تھی تو ابو عید کے لیے نئے نوٹ لے کر آیا کرتے تھے۔ اور عید کی نماز پڑھ کر جب گھر آتے تھے تو وہ نئے نوٹ عیدی کی شکل میں ہمیں دیا کرتے تھے۔ تو بس ابو کے ساتھ گزری ہوئی ساری عیدیں بہت یادگار ہیں۔

3 شادی کے بعد کی ساری عیدیں بہت یادگار ہیں اور پہلی عید تو خاص طور بہت یادگار تھی کہ جب میاں صاحب نے سجنے سنورنے کو کہا۔ چوڑیاں پہننے کو کہا، مہندی لگانے کو کہا تو مجھے اتنا اچھا لگا کہ میری زندگی میں بھی کوئی ہے، جسے میری فکر ہے، جسے میرا خیال ہے، میرے میاں بہت روایتی قسم کے ہیں اور عید پر اپنی بیگم کو روایتی انداز میں ہی سجے بنے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور شادی سے پہلے کی عید تو بس سارا دن سو کر ہی

گزرتی تھی۔ تو زندگی میں یہ چینج بہت خوب صورت تھا۔

مدیحہ شاہ (ڈراما رائٹر)

1 شادی سے پہلے تو عید پر کبھی کوئی کام نہیں کیا تھا۔ امی رات کو چنے چاٹ، فروٹ چاٹ، شیر خورمہ جو کہ ہماری پوری کالونی میں مشہور ہوتا تھا بنا کر رکھ دیتی تھیں اور دوپہر میں بریانی بناتی تھیں۔ باقی کام گھر کے ملازموں کے سپرد ہوتے تھے۔ ہمارا کام تو بس انجوائے کرنا ہوتا تھا۔ چاند رات اور عید کو ہر بات سے بے فکر ہو کر انجوائے کرتے تھے۔ لیکن اب عید پر خوب مہمان ہوتے ہیں اور میں عید پر فروٹ ٹرائفل اور چنا چاٹ بناتی ہوں۔ باقی کام کک کرتا ہے ہاں عید پر سب ملازمین کو کپڑے جوتے اور عیدی دیتی ہوں تو بہت خوشی ہوتی ہے پہلے ان باتوں کی خبر نہیں تھی۔ شادی کے بعد ذمہ داری پڑی تو احساس ہوا کہ کسی کے ساتھ کچھ کر کے کتنی خوشی اور اطمینان ہوتا ہے۔

2 اپنے ابو (مرحوم) سے ملنے والی ہر عیدی یادگار عیدی تھی اب تو ہمیں عیدی نہیں ملتی اب تو ہم اپنے بچوں کو عیدی دیتے ہیں۔ عیدی لینے اور عیدی دینے کے بیچ سالوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔ آج سوچتی ہوں کہ کاش ابو سے ملنے والی عیدی کو کبھی خرچ نہ کرتی، ہمیشہ اپنے پاس رکھتی، جانے والے چلے جاتے ہیں مگر ان کی یادان کے ساتھ کبھی دفن نہیں ہوتی۔

3 میری مرحومہ نانی مسز خضرہ جیلانی ایک مشہور ماہر تعلیم تھیں اور جو وقار النساء کالج کی پرنسپل (راولپنڈی) اور پھر اسلامیہ کالج کینٹ لاہور کی پرنسپل رہ چکی تھیں۔ ان کے ساتھ گزاری گئی آخری عید یادگار تھی اور اپنے مرحوم ابو کے ساتھ گزاری ہر عید یادگار تھی کہ ہم نے صرف انجوائے کیا اور کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ کبھی کوئی ذمہ داری نہیں لی۔ ابو کے جانے کے بعد تو عید کا ذرا مزہ محسوس ہوتا ہے نہ لطف۔۔۔ جن لوگوں کے والدین اس دنیا سے چلے جاتے ہیں وہ بھی



اسی طرح محسوس کرتے ہوں گے جس طرح میں محسوس کر رہی ہوں یا کرتی ہوں۔

فصیح باری خان (ڈرامہ رائٹر)

1 سچی خوشی سے ہمکنار کرنے والے کام ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جو انسان خود سے بھی شیئر نہیں کرتا یا کر سکتا' اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے کو پتا نہ چلے۔

2 یادگار عیدیاں تو بہت سی ہیں لیکن وہ عیدی بہت خاص تھی جو میں نے اپنے ایک بہت ہی کنجوس رشتے دار سے لڑ جھگڑ کر وصول کی تھی، کبھی نہیں بھولوں گا۔

3 میرے لیے وہ ساری عیدیں خوشگوار اور حسین تھیں اور یادگار ہیں جو میں نے اپنی امی کے ساتھ گزاری تھیں۔

امبر ارشد (معروف آرٹسٹ)

1 ہمیشہ سچی خوشی کوئی اچھا کام کر کے ہی حاصل ہوتی ہے۔ تو رمضان المبارک کے آنے سے پہلے ہی میں زکوٰۃ ان ضرورت مندوں تک پہنچا دیتی ہوں جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا ہے تاکہ انہیں بھی وہ سب خوشیاں نصیب ہوں جن پر ان کا حق ہے۔



2 عید پر ملنے والی عیدی تو بچپن میں ہی ملا کرتی تھی اور سچ میں اس وقت کے دو روپے بھی بہت بڑی رقم لگا کرتی تھی اور پھر جب 10 روپے ملنے لگے تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں کہاں کہاں خرچ کروں کیا کیا کھاؤں۔

3 گزشتہ سال کی عید تو بہت پریشانی میں گزری جب میری والدہ بیمار تھیں اور "شوکت خانم" اسپتال میں داخل تھیں۔ ہم نے عید نہیں منائی تھی بلکہ بڑی سادگی سے دن گزارا تھا اور خوشی کے حوالے سے جو یادگار عید تھی، وہ وہ عید تھی جو میں نے اپنے بیٹے ابو بکر کے ساتھ گزاری۔ دنیا میں آنے کے بعد ابو بکر کی پہلی عید تھی "ماں" بننے کا احساس بہت اچھا لگ رہا تھا اور میں نے بیٹے کے لیے خاصا اہتمام کیا تھا۔

علی ناصر ـــــ (اینکر پرسن بزنس پلس)

1 مجھے ہر عید پر عیدی ملنے کی سچی خوشی ہوئی ہے۔ عیدی مجھے ہر سال ملتی ہے خواہ وہ کم ملے یا زیادہ۔ اپنی عمر سے بڑے رشتے داروں کو دیکھتا رہتا ہوں اور وہ اگر میری طرف متوجہ نہ ہوں تو انہیں اپنی طرف متوجہ ضرور کرتا ہوں۔ اور عیدی ضرور لیتا ہوں اور بہت خوش ہوتا ہوں اور عیدی حاصل کر کے مجھے دلی تسکین ملتی ہے۔

2 پورا مہینہ روزے رکھنے کے بعد دل کو بڑی تسکین ہوتی ہے کہ رب کے حضور کچھ اچھا کام کیا ہے۔ عید کے پہلے دن جب کھانے پینے کی چیزیں سامنے آتی ہیں تو میں ایک دم سے بے چین ہو جاتا ہوں اور بڑے شوق سے چیزیں کھاتا ہوں ایک آدھ سال سے تھوڑی احتیاط کر رہا ہوں کیونکہ وزن بڑھ گیا ہے۔ عید کے دن شیر خورمہ بہت اچھا پکتا ہے ہمارے گھر۔ تو عید پر ملنے والی عیدی میرے لیے شیر خورمہ اور اچھے اچھے پکوان ہوتے ہیں۔

3 اب عیدیں یادگار نہیں ہوتیں۔ بس بچپن کی عیدیں ہی یادگار تھیں۔ اب تو چند سالوں سے بہت بوریت ہوتی ہے معاشرے میں ملنساری بہت کم ہو گئی ہے۔



شائستہ فرید :- (نیوز کاسٹر ڈان نیوز)

1 صرف عید کا انتظار نہیں کرتی کہ کچھ اچھا کام کر کے سچی خوشی حاصل کرلوں۔ عام دنوں میں بھی لوگوں کی مدد کر کے مجھے سچی خوشی حاصل ہوتی ہے، لیکن کسی سے ذکر نہیں کرتی، بس جو کچھ کرنا ہوتا ہے خاموشی کے ساتھ کر لیتی ہوں۔ دل کو بہت سکون ملتا ہے۔

2 عید پر ملنے والی وہ پہلی عیدی جو ہمارا ریلیشن قائم ہونے کے بعد فرید نے دی تھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

انہوں نے مجھے 100 روپے عیدی دی تھی جو کہ میں نے ابھی تک سنبھال کر رکھی ہوئی ہے اگرچہ اس کے بعد وہ مجھے ہر سال باقاعدہ عیدی دیتے ہیں۔ لیکن جو خوشی مجھے ان 100 روپے کی تھی کسی عیدی کی نہیں ہوگی۔

3 اب تک منائی جانے والی عیدوں میں بچپن کی عیدیں بہت یادگار گزری ہیں۔ بڑے ہونے کے بعد تو اب عید کی کوئی ایکسائٹمنٹ نہیں ہوتی۔ اور ویسے بھی جب سے نیوز کی فیلڈ میں آئی ہوں ہماری عید آفس میں ہی گزرتی ہے۔ 13 سال ہوگئے ہیں جاب کرتے ہوئے اور تیرہ سال سے عید کا دن آفس میں ہی گزرتا ہے۔ رات کو تھکے ہوئے گھر جاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔



تنویر آفریدی ——— (معروف گلوکار + کمپوزر)

1 رمضان المبارک ہو یا عید۔ ان دنوں میں دوسروں کی مدد کرکے سب سے زیادہ خوشی ملتی ہے ہم رمضان میں افطار پارٹیوں کا اہتمام کرتے ہیں لیکن درحقیقت ہم ان پارٹیوں میں پیٹ بھروں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ ان پارٹیوں میں کم سے کم دو سے پانچ لاکھ روپے ضرور خرچ ہوجاتے ہیں اور اس رقم میں ہم اگر چاہیں تو 100 گھروں کو ایک ماہ کا راشن دے رکھتے ہیں۔ تو میں تو رمضان میں یہ کارثواب ضرور حاصل کرتا ہوں۔ اور بہت سادگی اختیار کرتا ہوں۔ سچی خوشی لوگوں کے کام آکے ہی ملتی ہے۔ میں ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں کہ جب میں چھوٹا تھا اور میوزک کا طالب علم تھا تو کسی عزیز کو رمضان کے آخری عشرے میں ٹرین میں بٹھانے کے لیے اسٹیشن گیا تو ایک پٹھان آیا میرے پاس اور چونکہ مجھے پشتو آتی تھی تو اس نے مجھ سے پشتو میں بات کی کیونکہ میرے جو ساتھی اسٹیشن آئے تھے انہوں نے اس لڑکے سے کہا کہ انہیں پشتو آتی ہے تو اس لڑکے نے کہا کہ میں پشاور جانا چاہتا ہوں کہ میری ماں میرے لیے رو رہی ہوگی میں تو کراچی کام کے لیے آیا تھا مگر مجھے کام ملا نہیں۔ مجھے آپ ٹکٹ دلادیں۔ تاکہ میں پشاور چلا جاؤں۔ اس کے ہاتھ میں سوا پچاس روپے کی کچھ چیزیں تھیں اس نے کہا کہ یہ آپ رکھ لیں۔ میں نے وہ چیزیں اسے واپس کی۔ ٹکٹ دلائی اسے اور جن کو چھوڑنے آیا تھا ان سے درخواست کی کہ اس کو پشاور میں اس کے گاؤں تک پہنچا کر آئیے گا۔ تو مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ آج مجھے جو مقام حاصل ہے وہ شاید اس لڑکے کے ساتھ چھوٹی سی نیکی کرکے ہے۔

2 چونکہ میرا تعلق ایک لوئر کلاس فیملی سے تھا اللہ نے مجھے پروموٹ کیا تو عیدی کے حوالے سے حالات ہمیشہ بس ایسے ہی رہے ہیں تو ایسے نامساعد حالات میں کبھی ایسی عیدی نہیں ملی کہ اسے یادگار کہہ سکوں۔ چھوٹے تھے تو 10 روپے عیدی ملتی تھی بڑے ہوئے تو 100 200 روپے ملنے لگے اور جب خود بڑے ہوئے تو عیدی دینے والوں میں شامل ہوگئے۔ اور عیدی بانٹنے میں مزا آتا ہے۔

3 بہت سی عیدیں یادگار ہیں ایک تو وہ جب اپنے دو تین بھائیوں کو لے کر میں نے کراچی سے پشاور تک کا سفر بائے روڈ 22 بائیس گھنٹوں میں طے کیا اور عید کے دن والد کی قبر پر گیا۔ اور دوسری یادگار عیدیں وہ ہیں جو



ہم اپنے گھر والوں سے دور دوسرے ملکوں میں جا کر پروگراموں کے ذریعے سیلیبریٹ کرتے ہیں یا اپنے ملک میں پروگرام کرتے ہیں۔

حنا حبیبہ ـــــ (نعت خواں)

1 آج کی بات نہیں مجھے ہمیشہ سے ہی عید کے موقع پر غریبوں کی مدد کر کے سچی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

2 ہماری دادی جان ہم سب سے بہت پیار کرتی تھیں انہوں نے اپنے ہاتھوں سے جو پہلی اور آخری عیدی دی تھی وہ میرے لیے یادگار عیدی تھی۔

3 گزری عید پر میرے پاپا کو بمپر کیش پرائز ملا تھا۔

علی رحمن ـــــ (آرٹسٹ)

1 اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی نعمتوں سے نوازا ہوا تھا تو میں ان نعمتوں کو عید کے موقع پر غریبوں کو تقسیم کر کے بہت خوش ہوتا ہوں۔ اور میرا یہ تجربہ ہے کہ غریبوں کی مدد کر کے دل کو بہت خوشی ہوتی ہے۔

2 عیدی کے حوالے سے مجھے یاد ہے کہ میں شاید پندرہ سال کا تھا کہ عید کے دن والد صاحب کے کچھ دوست آئے ہوئے تھے اور انہوں نے ہمیں 10'10 ہزار عیدی دی' وہ دبئی سے آئے ہوئے تھے تو پندرہ سال کی عمر میں ہزار روپے ملنا بھی بہت بڑی بات ہوتی تھی تو یہ تو 10 ہزار تھے۔ جس کو پا کر ہمارے تو ہوش ہی اڑ گئے تھے۔

3 ہر وہ عید جو فیملی کے ساتھ گزرے یادگار ہی ہوتی ہے تو سب سے یادگار عید دادی کے انتقال سے پہلے ان کی آخری عید تھی۔ اس عید پر اتفاق دیکھیں کہ تایا جان اور دیگر لوگ پاکستان آئے تھے' عید کرنے اور سب نے ایک ہی جگہ پہ عید کی تھی۔ کیا پتا تھا کہ یہ دادی جان کے ساتھ آخری عید ہوگی۔ اور پھر دادی جان کے بعد جو پہلی عید گزری وہ بہت ہی سوگوار عید تھی۔ اور گزشتہ سال عید کے دن ہی مجھے کام پر جانا پڑا تھا تو وہ عید فیملی کے بغیر گزری تھی تو بہت بور ہوا تھا۔

حامد میر ـــــ (اینکر + صحافی جیو نیوز)

1 ہر سال عید کے موقع پر مستحق لوگوں کے ساتھ کچھ کرنا اچھا لگتا ہے کہ عید منانے کا حق ان کو بھی اتنا ہی ہے' جتنا کہ ہم صاحب حیثیت لوگوں کا۔ اور اس خوشی کے موقع پر سب کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔ عید کے دن لاہور میں والدین کی آخری آرام گاہ ضرور جاتا ہوں۔

2 بچپن میں جب والد صاحب عیدی کے طور پر پانچ روپے دیا کرتے تھے تو بہت زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ اسے خرچ کرتے تھے تو لگتا تھا کہ خرچ ہی نہیں ہو رہے' اتنی ویلیو اور برکت تھی ان پیسوں میں۔

3 دو عیدیں بہت یادگار ہیں میرے لیے۔ ایک





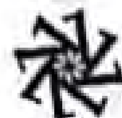
2005ء کی عید جو میں نے زلزلہ متاثرین کے ساتھ گزاری تھی اور دوسری 2010ء میں خیبر پختونخواہ میں سیلاب زدگان کے ساتھ عید منائی تھی۔

فرید رئیس —— (اینکر ڈان نیوز)

1 عید کا تہوار اس لحاظ سے اہم ہوتا ہے کہ سب سے ایک ہی دن ملنے کا موقع مل جاتا ہے اور سب کے ساتھ عید گزار کر ہی سچی خوشی حاصل ہوتی ہے عام دنوں میں ایسے مواقع ذرا کم ہی میسر آتے ہیں۔

2 یاد ہیں بچپن کی وہ تمام عیدیاں جو نانی' دادی اور دیگر رشتے داروں سے ملا کرتی تھیں۔ ان عیدیوں کی نہ صرف بہت اہمیت ہوتی تھی بلکہ خوشی بھی بے انتہا ہوتی تھی۔ اب تو کوئی بزرگ ہمارے درمیان نہیں رہے تو بس ان کی یادیں رہ گئی ہیں۔

3 وہ تمام عیدیں جو ایک ساتھ اپنوں کے درمیان رہ کر گزاریں یادگار ہیں۔



حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

میرے روز و شب تھے بندھے ہوئے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا

آپ کی محبتوں کے ساتھ ایک اور سال کا سفر تمام ہوا۔

43 برسوں پر محیط یہ سفر جتنا مشکل تھا' اتنا ہی آسان بھی تھا کہ اس سفر میں لگن اور شوق شامل تھا جس نے تھکنے نہیں دیا۔

گردش ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے' کئی اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن قافلۂ شوق رکنے نہیں پایا' وہ شوق' وہ جستجو' وہ تلاش آج بھی جاری ہے۔

اس طویل سفر میں ہماری مصنّفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے۔ ان کی تحریروں میں عہد حاضر کی کرب ناک حقیقتوں کی آگہی کے ساتھ ساتھ شگفتگی' دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے لاکھوں قارئین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی' ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے' یہی وجہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصنّفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔

فطری بات ہے' ہم جن کو پسند کرتے ہیں' جن سے لگاؤ رکھتے ہیں' ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں' ہماری قارئین بھی مصنّفین کے بارے میں ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔

سالگرہ نمبر کے موقع پر ہم نے مصنّفین سے سروے ترتیب دیا ہے' سوالات یہ ہیں۔

1 لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟

2 آپ کے گھر والے' خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے۔

3 آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو۔ اب تک جو لکھا ہے' اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟

4 اپنے علاوہ کن مصنّفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟

5 اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آیئے دیکھتے ہیں' مصنّفین نے ان کے کیا جوابات دیے ہیں۔

سعدیہ حمید چودھری

1 قلم سے میرا رشتہ۔

اللہ اور میری اماں کا مرہون منت ہے۔ صلاحیت خداداد تھی۔ مطالعے سے گہرے شغف نے اسے دو چند کر دیا۔ بچوں کے ایڈیشن کو پڑھ کر' الفاظ کے جوڑ توڑ سیکھا کرتی تھی۔ نونہال پھول اور تعلیم و تربیت سے الفاظ کی بنت کاری سیکھی۔

اپنی عمر سے بڑے الفاظ لکھ کر' اکثر دوسروں کو

حیران کرتی تھی، نجانے قلم بڑا ہے یا لکھنے والی۔

ایک بار میری محترم استاد، میرے دل کے بہت قریب ہستی، ریحانہ عبدالقیوم نے ساری کلاس کو اصلاح کی غرض سے کچھ الفاظ لکھ کے دیے۔ میں نے وہ الفاظ لکھے تو انہوں نے ایک نظر دیکھا اور کاپی لوٹا دی۔ "تمہیں اصلاح کی ضرورت نہیں" یہ ایک بیش قیمت تعریف تھی۔ جو پہلی بار میرے حصے میں آئی۔

میرے لکھے ہوئے خطوط جو میں اکثر Reminder کے طور پر، عزیز ہستیوں کو لکھا کرتی تھی ۔۔۔ میرے دوستوں کی من پسند تحریر ہوا کرتی تھی۔ مکاتیب غالب تو تھا مکاتیب سعدی بھی کہتے تھے سب۔ کہتے ہیں کہ خط آدھی ملاقات ہوتا ہے، مگر میری یہی کوشش ہوتی تھی کہ اسے پوری ملاقات ہی بنا ڈالوں۔ اب تو میڈیا اتنا مقبول عام اور زد عام ہو چکا ہے کہ کاغذ اور قلم کا یہ تعلق اتنی معنی خیزی نہیں رکھتا۔

"یار تم لکھا کرو" اکثر یہ نادر مشورے ملتے تھے سو پھر ان پہ عمل کرنے کا بھی سوچ لیا۔

قلم در حقیقت مجھے میری ماں سے وراثت میں ملا۔ وہ کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ خلیل الرحمٰن اور محمود شام کے ساتھ ان کا ادبی تعلق اور راہنمائی کا مضبوط تعلق تھا۔ ان کی کچھ ادھوری کہانیاں تھیں۔ جن کو میں نے مکمل کیا۔ لفظوں کو قالب میں ڈھالا تو خواتین ڈائجسٹ کا پلیٹ فارم ملا۔ امتل کی اپنائیت بھری راہنمائی ملی۔ جو الحمدللہ آج بھی ملتی ہے۔ کتنا خوب صورت تعلق ہے نا کہ زندگی کے پرپیچ راستوں میں کھونے کے بعد بھی آپ کسی کو تلاشیں تو وہ آپ کو اسی جگہ مل جائے جہاں چھوڑا تھا۔"

پھر مجھے لگا کہ میں لکھ سکتی ہوں۔ میرا مطمع نظر، ذات کی شناخت یا نام کمانا نہیں تھا۔ میرے اندر قدرتی طور پر ایک بے نیازی اور قلندری ہے، جس نے مجھے ہمیشہ قانع رکھا ہے۔ جو مل گیا اسے لے لیا۔ جو نہیں ملا اس پہ قناعت۔

کبھی گھٹن بہت بڑھ گئی تو کاغذ سیاہ کر دیے۔ اندر کی سیاہی کی دوات باہر کاغذ پہ الٹ دی، مگر اب ایک عرصہ ہوا اندر جھانکنے کا وقت نہیں ملا۔

باہر اور باہر والے لوگ زیادہ طاقتور اثر پزیری رکھتے ہیں۔ قلم ہاتھ سے پھسل گیا ہے (دیکھیں کب پکڑتی ہوں) کبھی کوئی مصرعہ اودھم مچا دیتا ہے۔ کبھی کسی کی نم آلود آنکھیں شور مچانے لگتی ہیں۔ کبھی کسی کی ان کہی کہانی دل بوجھل کر دیتی ہے، مگر کہانی لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ (نجانے میں اتنی مصروف یا کاہل کیوں ہو گئی ہوں؟) اچھے دوستوں کی دھونس بھی کام نہیں آتی، جانے انجانے اچھے لوگوں کی فرمائشیں سن کر، میری کاہلی دور نہیں ہوتی، کب دور ہو گی؟ یہ بھی وقت ملا تو سوچیں گے۔

2 میرے بہن بھائیوں کو لکھنے کا شوق تھا، بلکہ وہ برگد کے درخت ہیں اور میں ان کے نیچے اگا ہوا ایک چھوٹا سا ڈیزی کا پھول۔ میں ان کی تحاریر کے مقابلے میں اتنی کوتاہ قامت ہوں، مگر جو بہت دور برگد کے درخت ہیں۔ ان کو میں اور میری صلاحیتیں کھل کے نظر آتی ہیں اور وہ تعریف کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

مجھے بہت اچھے اساتذہ ملے، جنہوں نے مجھے جزوی طور پر نہیں بلکہ کاملیت کے ساتھ علم دیا۔ میں نے بھی اوک بھر کے نہیں لیا بلکہ اپنا دامن بھر لیا۔

ابھی بھی سیکھنے کا عمل جاری ہے نا پختگی اور کوتاہ قامتی کامل، بننے کے احساس کو جنم ہی نہیں لینے دیتی۔ To be or not to be کا پنڈولم اکثر کنفیوژن پھیلاتا رہتا ہے۔ "میں ہوں" اور "میں ہی ہوں" کا فرق دامن گیر رہتا ہے۔

اس ضمن میں الحمدللہ Blessed ہوں۔

میرے قلم کی کاوشیں میری ماں، کے نام ہیں۔ وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ یہی میرا اجر ہے۔ آج کل میری

کتاب ظاہری آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی' جو تقاریر پر مشتمل ہے' زیرِ طباعت ہے۔ اس کا انتساب بھی انہی کے نام ہے۔

3 مجھے ہر وہ کہانی اچھی لگتی ہے۔ جس میں بے ساختگی ہو' پروفیشنلزم کم ہو جو اپنی اپنی سی لگے۔ جس نے بھی لکھی ہو۔ میں نے بلا تفریق سب کو پڑھا ہے' بہت اچھے لکھاری ہیں سب جو آج کل لکھ رہے ہیں۔

رضیہ بٹ کو میں نے نہیں پڑھا (اماں کی طرف سے پابندی تھی) مگر آج کل مجھے لائبریری سے ان کی آپ بیتی ملی ہے بچھڑے لمحے' نایاب تصاویر سے مزین۔ میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ قبل از پاکستان کا طرزِ رہن سہن اور با اخلاق عام سے لوگوں سے ملاقات کرنی ہے تو اس کتاب کو پڑھیں۔ رومانٹیزم ایک خوب صورت ذائقہ ہے۔ کھٹی میٹھی مٹھاس لیے۔

مگر ہم اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ نفرت اور انا پرستی جو Attitudes کہلاتے ہیں۔ ان کا معزز مقام' معاشرتی لحاظ سے متعین ہو چکا ہے۔ جب قدرتی چشمے کا راستہ روکا جاتا ہے۔ تو وہ پتھریلی چٹانوں سے ٹکرا کے اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔ جس کے اثرات اکثر منفی بھی ہوتے ہیں۔

4 ہر کہانی جب مکمل ہوتی ہے تو اطمینان کا تسلی بخش احساس ہوتا ہے۔ آج بھی کسی کہانی پر' کچھ دل کے قریب لوگ تبصرہ کرتے ہیں تو پروا کی ہوا چلنے لگتی ہے۔

یہی لوگ اندھیروں میں چمکنے والے جگنوؤں کی مانند ہیں جو آپ کی کہانیوں کو سند قبولیت بخشتے ہیں' آپ کو پڑھتے ہیں اور آپ سے محبت کرتے ہیں۔ مختلف سوالات پوچھتے ہیں۔ زیادہ سوالات' سب مایا ہے' من ہو تو' پروانہ' دیا اور جگنو' ساحر آنکھیں اور کچی عمر کے دکھ' کچھ پرانے راستے' فرحاج' ماہا اور عید کا چاند کے متعلق پوچھے جاتے ہیں۔

سب مایا ہے کی مہر سیال' من و تو کی زینب۔۔۔ پروانہ' دیا اور جگنو کی دیا احمد' کچھ پرانے راستے کی سارہ حسن' سب میرے دل کے قریب ہیں۔ کہیں نہ کہیں میری جھلک موجود ہے۔

5 شاعری۔

میری روح کا حصہ ہے۔ بہت سے شعراء کو بلا تخصیص پڑھا۔ فرحت عباس شاہ کی شاعری اور ان کے اشعار پہلی مرتبہ پہلی بارش بن کر برسے تھے اور کچی مٹی مہکنے لگی تھی۔

بارش ہوئی تو گھر کے دریچے سے لگ کے ہم
چپ چاپ' سوگوار تمہیں سوچتے رہے

بلا کی افراتفری ہے ہماری ذات میں لیکن
ہمیں اس بے دھیانی میں بھی تیرے دھیان رہتے ہیں

مقام فیض' راہ میں کوئی جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

منحصر ہے کس کی کتاب Bed Back ہے۔ وہ ہی اشعار زیرِ لب دہرائی ہوں۔ نصیر احمد ناصر کی نظمیں' گلزار کی گل و گلزار شاعری' ناصر کاظمی کی اداسی۔ محسن نقوی کی گمشدہ محبت۔ احمد فراز کا رومانٹیزم اور فیض کی عظمت' سیکھنے کو بہت کچھ ہے۔

6 آج کل ایک اقتباس پسندیدگی کی سند پا چکا ہے بلکہ زندگی کا کلیہ ہاتھ آ چکا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کے ساتھ شیئر کروں۔

"انسان سے بندہ بننے کا نسخہ بہت آسان ہے بس کرنا کچھ ایسے ہے کہ جو مل جائے اس پہ شکر کر لو' جو چھن جائے اس پہ افسوس نہ کرو' جو مانگ لے اسے دے دو۔ جو بھول جائے اسے بھول جاؤ۔ دنیا میں خالی ہاتھ آئے تھے' خالی ہاتھ ہی جانا ہے۔ بس جتنی ضرورت ہو اتنا ہی رکھو' ہجوم سے پرہیز کرو۔ تنہائی کو اپنا ساتھی بناؤ۔ مفتی ہو تب بھی فتوے جاری نہ کرو' جسے خدا نے ڈھیل دی ہو اس کا احتساب کبھی نہ کرو۔ بلا ضرورت سچ فساد ہوتا ہے۔ کوئی پوچھے تو سچ بولو ورنہ چپ رہو۔

بس ایک چیز کا دھیان رکھنا کسی کو خود نہیں چھوڑنا جو جا رہا ہے اسے جانے دو' لیکن اگر کوئی واپس آئے تو اس کے لیے دروازے کھلے رکھو۔ یہ اللہ کی صفت ہے۔"



1 ''اصلی اور پورا نام؟''
''مریم کمال انصاری۔''
2 ''پیار سے کیا پکارتے ہیں؟''
''ابو' چاچا اور بھائی ''میمو'' اور امی ''بے بی''
3 ''جنم سال / شہر؟''
''یکم مارچ 1991ء / سعودی عرب۔''
4 ''ستارہ؟''
''Pices۔''
5 ''بہن بھائی آپ کا نمبر؟''
''ایک بڑا بھائی ہے پھر میں۔''
6 ''تعلیمی ڈگریاں؟''
''A لیول کر لیا ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے نیویارک جاؤں گی۔''
7 ''شادی؟''
''ابھی تو بالکل بھی نہیں کچھ بن جاؤں گی پھر کروں گی۔''
8 ''شادی اپنی پسند سے یا والدین کی پسند سے؟''
''دونوں کی پسند سے ماں باپ کا زیادہ تجربہ ہوتا ہے۔''
9 ''شوبز میں متعارف کرانے کا سہرا؟''

مریم انصاری سے باتیں

شاہین رشید

''میرے بھائی علی انصاری کے سر جاتا ہے۔''
10 ''پہلا سیریل؟''
''بنٹی آئی لو یو'' اور اس سے شہرت بھی ملی۔''
11 ''پہلی فلم؟''
''سرمد کھوسٹ کی فلم آئینہ۔''
12 ''پریکٹیکل لائف میں کب آئیں؟''
''10 سال کی عمر سے' شوقیہ آئی' ریڈیو پہ اور کمائی کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ پریکٹیکل لائف نہیں کہہ سکتے' فیلڈ کہہ سکتے ہیں۔''

13 ''10 سال کی عمر میں کیا کمایا؟''
''ایک پروگرام کے 1000 روپے ملتے تھے۔ مہینے میں چار پروگرام تو چار ہزار۔''
14 ''شوبز کے بارے میں تاثرات؟''
''اب تو ہماری انڈسٹری بہت ''بوم'' کر رہی ہے الحمدوللہ اس لیے نئے لوگوں کو آنا چاہیے۔''
15 ''صبح کب اٹھتی ہیں؟''
''جب میرا Call ٹائم ہو اور رات جب میرا ''بیک اپ ہو۔''

16 ”صبح کی پہلی خواہش؟“
”کہ جلدی سے تیار ہو کر شوٹ پہ جاؤں اور اپنا کام جلدی ختم کرادوں۔“

17 ”گھر میں کس کی بات بری لگتی ہے؟“
”گھر میں تین ہی تو لوگ ہیں۔ کسی کی بات بری نہیں لگتی۔ سب پیار کرتے ہیں۔“

18 ”پاکستان کے لیے کیا کہیں گی؟“
”قانون کی پاسداری نہیں اور شکایات کی فہرست لمبی ہے۔“

19 ”جسمانی طور پر کیا آپ ایک مکمل انسان ہیں؟“
”الحمد و للہ اور اللہ نے جیسا بنایا ہے اس پر خوش رہنا چاہیے۔ ہاں اپنے آپ کو فٹ رکھنا ہمارا اپنا کام ہے۔“

20 ”محنت کرو' حسد نہ کرو اس پر عمل کرتی ہیں؟“
”بالکل کرتی ہوں۔ محنت کرو اپنے آپ کو فٹ رکھو۔ کوئی آپ کی جگہ نہیں لے سکے گا۔“

21 ”تیز بھوک میں کیفیت؟“
”آج کل تو ڈائیٹ پہ ہوں۔ ویسے کنٹرول کر لیتی ہوں۔“

22 ”دھوپ میں نکلنا کیسا لگتا ہے؟“
”کوئی مسئلہ نہیں۔ سن بلاک لگا کر نکلتی ہوں۔“

23 ”کس دن کا شدت سے انتظار کرتی ہیں؟“
”ہے وہ ایک دن.... بتانے والا نہیں ہے۔“

24 ”کب گھر سے باہر نہیں نکلتیں؟“
”جب بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں۔“

25 ”کب بہت خوش ہوتی ہیں؟“
”میں تو ہمیشہ ہی خوش رہتی ہوں اور امی کو دیکھ کر تو بہت ہی خوش ہوتی ہوں کہ وہ میری سب کچھ ہیں۔“

26 ”طبیعت میں ضد ہے یا اچھی بچی ہیں؟“
”طبیعت میں ضد تو ہے۔ بہت ضدی ہوں کوئی چیز چاہیے تو بس چاہیے' چاہیے اور ضرور چاہیے۔“

27 ”غصہ آتا ہے؟“
”میں شارٹ ٹمپر نہیں ہوں، لیکن جب کوئی مجھے تیلی لگا دے تو بس پھر میرا غصہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔“

28 ”غصے میں کیفیت؟“
”دروازہ پٹخنا.... کیونکہ منہ کا تیر واپس نہیں آتا بس باڈی لینگویج۔“

29 ”مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے کیا بری؟“
”مرد بہت Arrogant ہوتے ہیں۔ اچھی؟.... اچھی تو کوئی بھی نہیں لگتی۔“

30 ”کوئی نوجوان مسلسل گھورے تو؟“
”تو نزدیک جا کر کہوں گی کہ بھئی کیا مسئلہ ہے۔“

31 ”پرائز بانڈ لیتی ہیں؟“
”ہاں جی لیتی ہوں' مگر نکلا نہیں آج تک۔“

32 ”گھر میں کون غصے کا تیز ہے؟“
”بھائی.... بہت ڈرتی ہوں ان کے غصے سے۔“

33 ”کیا منہ سے نکلی فرمائش پوری ہوتی ہے؟“
”بالکل ہوتی ہے اور میری فرمائشیں میری امی پوری کرتی ہیں اور میرے بولنے سے پہلے پوری کرتی ہیں۔“

34 ”محبت کا اظہار آسانی سے کر لیتی ہیں؟“
”ہرگز نہیں.... بہت مشکل ہوتی ہے۔ الفاظ نہیں ملتے۔“

35 ”کس ملک میں ہمیشہ رہنا چاہتی ہیں؟“
”صرف اور صرف اپنے پاکستان میں.... بہت خوش ہوں۔“

36 ”شاپنگ پہ پہلی خریداری؟“
”پہلے پورا مال گھومتی ہوں۔ پھر اگر کچھ پسند آئے تو خرید لیتی ہوں۔ میرے ساتھ تو جو شاپنگ جائے گا وہ پتلا ہو کر آئے گا۔“

37 ”انسان کا دنیا میں آنے کا مقصد؟“
”ایک ہی مقصد ہے کہ یہ زندگی ایک امتحان ہے' جو اللہ ہمارا لے رہا ہے اور ہمیں یہ امتحان پاس کرنا ہے۔“

38 ”پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہوں؟“
”کہ ان پیسوں کا کچھ خرید لوں یا کھانا کھا لوں۔“

39 ”کوئی وقت جو کرائسز میں گزارہ؟“
”بالکل گزارا ہے۔ لیکن برا وقت بھی گزر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اتنا مہربان ہے کہ برا وقت دکھا کر پھر اچھا وقت بھی لے آتا ہے۔“

40 ”اللہ کا دیا بہترین تحفہ؟“
”والدین۔“

41 "گھر کی ایک شخصیت جن کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتی ہوں؟"
"اپنے ابو کے ساتھ ایک بھرپور شام گزارنا چاہتی ہوں۔"

42 "موڈ فریش ہو جاتا ہے؟"
"جب کوئی مجھ سے اچھی طرح بات کرے کہ کیا کیا پورا دن گھر آؤں تو میرے لیے کھانا تیار ہو' سب کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں۔"

43 "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں؟"
"ہاں چھوڑ دیتی ہوں۔ بس اٹھ گئی تو اٹھ گئی۔"

44 "پر خلوص کون لوگ ہوتے ہیں؟"
"اپنے اور کبھی کبھی پرائے بھی' آپ کو کبھی پتا ہی نہیں ہوتا کہ کوئی دور سے آپ کے لیے دعا مانگ رہا ہوتا ہے' اور وہ دعا قبول ہو جائے تو انسان خود حیران ہوتا ہے کہ کس کی دعا لگی ہے۔"

45 "چھٹی کا دن کہاں گزارتی ہیں؟"
"میری بہترین دوست نیہا ہے' اس کے ساتھ گزارتی ہوں یا اپنے گھر والوں کے ساتھ۔"

46 "فرصت کے اوقات؟"
"امی کے ساتھ واک پہ جاتی ہوں یا پھر ٹی وی دیکھتی ہوں۔"

47 "شوٹ پہ جاتی ہیں تو کیا چیز ضرور لے جاتی ہیں؟"
"کوئی نہ کوئی کتاب کہ شوٹ کو دیر ہو تو پڑھ لوں۔"

48 "لباس میں کیا چیز پسند ہے؟ مشرقی یا مغربی؟"
"سب پہن لیتی ہوں۔ مغربی اور مشرقی بھی۔"

49 "اپنی شخصیت کے لیے ایک لفظ؟"
"Loving۔"

50 "عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟"
"دونوں ہونی چاہیے۔"

51 "گھر کے کس کونے میں زیادہ وقت گزرتا ہے؟"
"اپنے گھر کے باغ میں' بہت بڑا باغ ہے۔ پھول لگے ہوئے ہیں۔ بہت سکون ملتا ہے۔"

52 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟"
"اپنے ابو کے.... ابو سعودی عرب میں ہیں تو صبح اٹھتے ہی ان کو sms کرتی ہوں۔"

53 "فون نمبر آسانی سے دے دیتی ہیں؟"
"ہرگز نہیں۔"

54 "گھر میں گھریلو لڑکی ہیں یا رعب ہے؟"
"بالکل گھریلو لڑکی' گھر میں مہمان آجائیں تو خود میزبانی کرتی ہوں چائے' کافی' کولڈ ڈرنک' کھانا وغیرہ سب کچھ خود کرتی ہوں۔"

55 "کثرت سے جمع کرتی ہیں؟"
"تصاویر۔"

56 "انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور؟"
"بچپن' خوب صورت اور حسین دور۔"

57 "برا مان جاتی ہیں؟"
"برا منانا... میری فطرت میں ہی شامل نہیں ہے۔"

58 "وقت کی پابندی کی قائل ہیں؟"
"بالکل ہوں اور کرتی بھی ہوں۔"

59 "سب کچھ لٹانے کو دل چاہتا ہے؟"
"اپنی فیملی اور اپنی دوست نیہا پہ۔"

61 "کھانا کہاں کھانا پسند کرتی ہیں؟"
"مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کہیں پہ بھی بٹھا دیں میں کھانا کھا لوں گی۔"

62 "ہاتھ سے کھانے میں مزا ہے یا چھری کانٹے سے؟"
"ہاتھ سے.... کون اتنی محنت کرے چھری کانٹے سے کھانے کی' ہاں ابو کے سامنے چھری کانٹے سے ہی کھاتی ہوں۔"

63 "کوئی کردار جو آپ کی شخصیت سے میچ کرتا ہو؟"
"سسرال میرا" میں میرا پہلا پورشن' جس میں میں نے پونہ کا رول کیا تھا وہ میچ کرتا ہے۔"

64 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟"
"میں تو فیس بک کنگ ہوں۔ فری ٹائم میں فون اور فیس بک پہ ہی ہوتی ہوں۔"

بقیہ صفحہ نمبر 287

عمیرہ احمد



آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص — سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ ملا جاتا ہے۔



J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرادی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کررہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی' اس نے اس بار بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہورہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

نویں قسط

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

افریقہ کا دوسرا سب سے بڑا ملک کانگو پچھلی کئی دہائیوں سے دنیا میں صرف پانچ چیزوں کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔
خانہ جنگی۔۔۔ جس میں اب تک 45 لاکھ لوگ جان گنوا چکے تھے۔ غربت کے لحاظ سے یو این کے اکنامک انڈیکیٹرز میں کانگو یو این کے 188 ممالک کی فہرست میں 187 ویں نمبر پر تھا۔ معدنی وسائل کے ذخائر کے لحاظ سے کانگو دنیا کا امیر ترین ملک تھا۔ گھنے جنگلات سے بھرا ہوا' جہاں پر کثرت سے بارشیں ہوتی تھیں۔ اور (Pygmy people) پستہ قامت' سیاہ فام لوگ کانگو کے ان جنگلات میں صدیوں سے پائے جانے والی انسانوں کی ایک ایسی نسل' جو مہذب زمانے کے واحد غلام جنہیں غلام بنانا قانوناً" جائز تھا۔
اور یہ پہچان صرف کانگو کی نہیں تھی' افریقہ کے ہر ملک کی پہچان کم و بیش ایسی ہی چیزیں بن چکی ہیں۔ ایک چھٹی شناخت جو ان سب ملکوں میں مشترکہ ہے وہ مغربی استعماریت کی نئی شکل ہے۔ ورلڈ بینک۔۔۔ جو ان تمام ملکوں میں غربت کو ختم کرنے اور بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی کے لیبل کے نیچے ان تمام ممالک میں امریکا اور یورپی ممالک کو اپنی ملٹی نیشنل کمپنیز کے ذریعے افریقہ کے قدرتی اور معدنی وسائل کو' گنے کے رس کی طرح نچوڑنے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔۔۔ کانگو میں بھی یہی ہو رہا تھا اور پچھلی کئی دہائیوں سے ہو رہا تھا۔
1960 میں بیلجیم کی استعماریت سے نجات حاصل کرنے کے بعد کانگو نے تیس سال میں کم از کم بیس بار اپنا نام بدلا تھا۔۔۔ ساری جنگ نام رکھنے اور نام بدلنے کے بڑے مقصد کے حصول تک ہی محدود رہی اور بڑی عالمی طاقتوں امریکا اور فرانس کی پشت پناہی سے خانہ جنگی میں تبدیل ہو گئی۔۔۔ ایک ایسی ہولناک خانہ جنگی' جس میں کانگو نے اپنی آزادی کے 55 سالوں میں تقریباً" 45 لاکھ لوگوں کی جان گنوائی۔۔۔ ساڑھے چھ کروڑ کی آبادی والے اس ملک میں کوئی گھر اور خاندان ایسا نہیں بچا جو اس خانہ جنگی سے متاثر نہ ہوا ہو' جس کے کسی فرد نے اس قتل و غارت میں جان نہ گنوائی ہو یا جسم کا کوئی حصہ نہ کھو بیٹھا ہو' یا جس کے خاندان کی عورتوں کی عزت پامال نہ ہوئی ہو' جس کے بچے اور بچیاں جنسی زیادتیوں کا شکار نہ ہوئی ہوں' یا چائلڈ سولجر کے طور پر متحارب گروپس کے ہاتھوں ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہ ہوئے ہوں۔ یہ دنیا کی مہذب تاریخ کی وہ پہلی خانہ جنگی تھی جس میں ایک دوسرے سے لڑنے والے قبیلے' لڑائی کے دوران انسانوں کو قتل کرتے اور ان کا گوشت خوراک کے متبادل کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ خانہ جنگی' دریائے کانگو کے گرد بسنے والے اس ملک کے لوگوں کا "کلچر" تھا۔۔۔ ایک ایسا "کلچر" جو مہذب دنیا کے مہذب لوگوں نے ان پر تھوپا تھا۔ خانہ جنگی کے ذریعے عالمی طاقتیں کانگو کی زمین اور معدنی وسائل پر قبضہ کر کے وہاں سے اربوں روپے کی معدنیات اپنے ملکوں اور اپنے معاشروں کی ترقی و فلاح و بہبود کے لیے لے جا رہی تھیں اور انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ افریقہ میں انسانیت کی تذلیل کس کس طرح سے کر رہے تھے اور اس کو فروغ دینے کا بھی ذریعہ بن رہے تھے۔
اگر 45 لاکھ لوگ خانہ جنگی کا شکار ہوئے تھے تو تقریباً" اتنی ہی تعداد بھوک' بیماری اور بنیادی انسانی ضروریات کی عدم فراہمی کی وجہ سے لقمہ اجل بن چکی تھی اور یہ سب کچھ اس ملک میں ہو رہا تھا جو معدنی وسائل کے ذخائر کے حساب سے دنیا کا سب سے امیر ترین ملک تھا۔ جس کی زمین کوبالٹ' پلاٹینم' یورینیم جیسی دنیا کی مہنگی ترین دھاتوں سے نہ صرف بھری ہوئی تھی بلکہ بہت ساری کمپنیز مقامی لوگوں کو خشک دودھ' مسالے اور کھانے پینے کی روزمرہ کی اشیا فراہم کر کر کے یہ ساری دھاتیں نکال بھی رہی تھیں۔

کانگو صرف ان دھاتوں سے مالا مال نہیں تھا بلکہ اس وقت دنیا بھر میں سب سے زیادہ خام ڈائمنڈ بھی پیدا کر رہا تھا' دنیا بھر میں دوسرا سب سے بڑا بارانی جنگلات رکھنے کا اعزاز بھی کانگو کو ہی حاصل تھا جو نہ صرف اربوں ڈالرز کی قیمتی لکڑی کا مالک تھا' بلکہ ان ہی جنگلات سے دنیا بھر میں ربڑ بھی بھیجا جا رہا تھا۔
اور یہ سارے اعزازات کانگو کے سینے پر بالکل اسی طرح لگے ہوئے تھے جس طرح افریقہ کے کسی فوجی ڈکٹیٹر

جنرل کے سینے پر لٹکے ہوئے میڈلز اور رنگ برنگی پٹیوں کی قطار اور اس کے ہولسٹر میں لٹکا خالی ریوالور اور شاندار وردی کے ساتھ دنیا کے کسی بڑے ملک میں امداد کی بھیک کے لیے اس کا وہ دورہ جس میں ملنے والی زیادہ تر رقم اس کے بیرون ملک اکاؤنٹس میں ٹرانسفر ہو جاتی اور اس کے بدلے کانگو کی زمین کا سینہ کچھ اور خالی ہو جاتا۔

اور کانگو کی اسی زمین پر دنیا کے دوسرے بڑے بارانی جنگلات میں تقریباً" پانچ لاکھ کے قریب وہ خستہ حال آبادی رہتی تھی جو اپنی گزر بسر شکار کرکے کرتی تھی جن کے افراد آج بھی اپنے جسم درختوں کی چھالوں پتوں یا جانوروں کی کھالوں سے ڈھانپتے تھے یا پھر وہ برہنہ رہتے تھے۔ پانچ لاکھ کی وہ آبادی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں فرانس سے دوگنا رقبے پر پھیلے ہوئے ان بارانی جنگلات میں پھیلی ہوئی تھی' اس لیے عددی اعتبار سے وہ کہیں بھی اس جنگلات کے قریبی آباد قصبوں میں آباد بانٹو قبیلے کے افراد پر غالب نہیں آسکتی تھی جو ہر لحاظ سے ان سے برتر تھے وہ کانگو کے آئینی اور قانونی شہری تھے جن کے پاس بنیادی حقوق' بنیادی ضروریات کا سامان اور بہتر زندگی کے وسائل تھے۔

ان بے مایہ پست قامت کے پاس کچھ بھی نہیں تھا' ان کے پاس صرف وہ جنگل تھا جس میں وہ رہتے تھے' شکار کرکے پیٹ بھر لیتے تھے۔ تالابوں اور جھیلوں میں جمع بارش کے پانی سے پیاس بجھا لیتے تھے۔ درختوں کی لکڑیوں اور خشک پتوں سے جھونپڑیاں بنا کر چھت بنا لیتے تھے یا پھر گھنے درختوں پر مچان بنا کر رہ لیتے تھے۔ آپس میں شادیاں کر لیتے تھے اور ڈائریا' ملیریا جیسی چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتے۔۔۔ ان کی زندگی کا چکر بس یہیں تک تھا۔

جو لوگ زیادہ گھنے جنگلات کے بجائے قصبوں کے قریب جنگلات میں رہتے تھے۔ وہ بانٹو قبیلے کے افراد کے غلاموں کے طور پر جنگل میں کام کرتے۔۔۔ ان کے لیے لکڑی کاٹتے' شکار کرتے' کان کنی کرکے مختلف قسم کی دھاتیں بانٹو قبیلے کے اپنے مالکوں کو پہنچاتے جو ان کے لیے بے کار تھیں اور بدلے میں ان کے مالک انہیں روٹی' کپڑا اور ضروریات کی وہ چھوٹی موٹی چیزیں دیتے تھے جو ان لوگوں کے لیے ضرورت سے زیادہ حیرت اور فخر کا باعث ہوتیں۔۔۔ انہیں دنیا سے جنگل کے علاوہ اور کچھ چاہیے بھی نہیں تھا' لیکن دنیا کو جنگل نہیں چاہیے تھے۔

2002 میں کانگو کی قائم مقام حکومت نے کچھ عالمی طاقتوں کے دباؤ میں جنگلات سے لکڑی کی کٹائی کا ایک نیا قانون وضع کیا اور اس قانون کے تحت' کانگو کی حکومت کے پاس یہ اختیار آگیا کہ وہ جنگلات میں رہنے والے قبیلوں اور آبادیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کرکے' اپنی مرضی سے جنگل کا کوئی بھی حصہ' کسی بھی طریقے سے استعمال کر سکتی تھی۔ ورلڈ بینک اور دوسرے بین الاقوامی مالیاتی اداروں نے نہ صرف اس فریم ورک کو سپورٹ کیا بلکہ کانگو کی حکومت کو مالی وسائل فراہم کیے تاکہ کانگو کے جنگلات کو مختلف زونز میں تقسیم کرکے نشان دہی کی جائے کہ کس زون میں درخت کاٹے جائیں گے اور کس حصے کو صنعتی مقاصد کے لیے' جنگلی حیات کی بقا کے لیے استعمال کیا جائے گا اور نیشنل پارک کی صورت میں تبدیل کرکے انسانی رہائش کے لیے ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔ ورلڈ بینک نے یو این کی خوراک کے عالمی ادارے کے ساتھ مل کر کانگو میں ان جنگلات کی تباہی کے ایک "عظیم الشان" پروجیکٹ کا آغاز کر دیا تھا۔

سالار سکندر جس وقت اس پروجیکٹ کے ہیڈ کے طور پر کانگو' پہنچا تب تک اس منصوبے کو تین سال ہو چکے تھے۔ سالار سکندر کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ ورلڈ بینک اسے کس طرح استعمال کرنے والا تھا' لیکن اسے یہ اندازہ بہت جلد ہو گیا تھا۔۔۔ ایباکا سے پہلی ملاقات کے بعد۔۔۔



پیٹرس ایباکا سے سالار سکندر کی پہلی ملاقات بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ اسے کانگو میں آئے تقریباً"

ایک سال ہونے والا تھا جب لاموکونامی جگہ کو اپنی ٹیم کے ساتھ وزٹ کرتے ہوئے پیٹرس ایباکا تقریباً" دو درجن کے قریب Pygmies (پستہ قد لوگوں) کے ساتھ اچانک وہاں آگیا تھا جہاں سالار اور اس کی ٹیم کے لوگ اپنی گاڑیوں سے اتر کر اس علاقے کا جائزہ لے رہے تھے' جسے کچھ عرصہ پہلے ہی ایک یورپین ٹمبر کمپنی کو لیز پر دیا گیا تھا۔ ان کے پاس پرائیویٹ اور گورنمنٹ دونوں کی طرف سے دی جانے والی سیکورٹی موجود تھی اور ان گارڈز نے ایباکا اور اس کے گروپ کے لوگوں کو یک دم وہاں نمودار ہوتے دیکھ کر حواس باختگی کے عالم میں بے دریغ فائرنگ شروع کردی تھی۔

سالار نے دو پگمیز کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا اور باقیوں کو درختوں کی اوٹ میں چھپتے اور پھر بلند آواز میں ایباکا کو کسی درخت کی اوٹ سے انگریزی زبان میں یہ پکارتے سنا تھا کہ وہ حملہ کرنے نہیں آئے بات کرنے آئے ہیں۔ سالار اس وقت اپنی گاڑی کی اوٹ میں تھا اور اسی نے سب سے پہلے ایباکا کی پکار سنی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ حیران رہ گیا تھا کسی پگمیز کا انگریزی بولنا اس کے لیے یقیناً" حیران کن تھا' لیکن اس سے زیادہ حیران کن وہ امریکن لب و لہجہ تھا جس میں ایباکا چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اسے ان سے بات کرنی ہے وہ صرف ملنا چاہتا ہے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اور اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہیں۔

سالار کی ٹیم کے ساتھ موجود گارڈز اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے تب تک ٹیم کے تمام افراد کو گاڑیوں میں پہنچا چکے تھے ماسوائے سالار سکندر کے۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے گارڈز کی رہنمائی میں گاڑی میں سوار ہوتا اور پھر اس کی گاڑی بھی وہاں سے تیز رفتاری سے غائب ہو جاتی' سالار نے گارڈز سے وہاں کی مقامی زبان کنگالا میں کہا تھا' کہ وہ اس پکارنے والے آدمی سے بات کرنا چاہتا وہ فائرنگ بند کردیں' کیوں کہ یہ یک طرفہ ہے دوسری طرف سے نہ تو فائرنگ ہو رہی ہے نہ ہی کسی اور ہتھیار کا استعمال۔۔۔

اس کے گارڈز کچھ دیر تک اس سے بحث کرتے رہے اور اس بحث کو ختم کرنے کا واحد حل سالار نے وہ نکالا تھا جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی ثابت ہو سکتی تھی اگر دوسرا گروپ واقعی مسلح ہوتا۔۔۔ وہ یک دم زمین سے اٹھ کر گاڑی کی اوٹ سے باہر نکل آیا تھا اس کی سیکورٹی پر تعینات گارڈز ان پگمیز کے سامنے آنے پر اس طرح حواس باختہ نہیں ہوئے تھے جتنے اس کے اس طرح بالکل سامنے آجانے پر ہوئے تھے۔

سالار ان کی حواس باختگی سمجھ سکتا تھا۔ وہ پاکستان نہیں تھا' خانہ جنگی کا شکار کانگو تھا' جہاں کسی کی جان لینا مچھر مارنے کے برابر تھا اور یہ قتل و غارت کسی قانونی عدالت میں کسی کو کوئی سزا نہیں دلوا سکتی تھی۔ جب جان لے لینا اتنا آسان ہو تو کوئی بھی حواس باختہ ہو کر خوف کی حالت میں وہی کرتا ہے جو اس کے گارڈز کر رہے تھے مار دینا بہرحال خود مر جانے سے زیادہ بہتر انتخاب تھا اور اس وقت وہ کچھ فاصلے پر دو پگمیز کی لاشیں دیکھ سکتا تھا اور وہ دور سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ زندہ نہیں تھے۔

فائرنگ اب تھم گئی تھی اس کی تقلید میں اس کی سیکورٹی کے افراد بھی باہر نکل آئے تھے وہاں اب صرف دو گاڑیاں تھیں ٹیم کے باقی سب افراد وہاں سے اپنے اپنے گارڈز کی حفاظت میں نکل چکے تھے۔

فائرنگ کے تھمتے ہی ایباکا بھی باہر نکل آیا تھا۔ سالار نے چلا کر اپنے گارڈز کو گولی چلانے سے منع کیا تھا پھر وہ اس ساڑھے چار فٹ قد کے بے حد سیاہ چپٹی ناک والے اور موٹی موٹی سیاہ آنکھوں والے آدمی کی طرف متوجہ ہوا' جو اپنے ساتھیوں کے برعکس جینز اور شرٹ میں تھا ان ننگے پاؤں والے پست قامت لوگوں کے درمیان جاگرز پہنے بے حد عجیب لگ رہا تھا۔

اسے اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ حملہ آور گروپس کے افراد نہیں تھے۔ ورلڈ بینک اور دوسرے بین الاقوامی مالیاتی ادارے اپنی ٹیمز کو ان جنگلات میں کہیں بھی بھیجنے سے پہلے اس گروپ سے اپنی ٹیم کے افراد کے تحفظ اور

سیکورٹی کی ضمانت لیتے تھے۔ جو گروپ اس علاقے پر قابض ہوتا تھا اور اس کے بدلے وہ اس متحارب گروپ کو کچھ نہ کچھ مالی امداد فراہم کرتے تھے۔ اگرچہ وہ علاقہ جس میں سالار کی ٹیم گئی تھی وہ خانہ جنگی سے متاثرہ علاقوں میں سے نہیں تھا اس کے باوجود اس ٹیم کے وزٹ کے لیے بھی تحفظ کی یقین دہانی کرائی گئی تھی اور اس کے باوجود یہ واقعہ ہو گیا تھا۔

"پیٹرس ایباکا!" اس پست قامت شخص نے آگے بڑھ کر تعارف کرواتے ہوئے سالار سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا جسے تھامنے سے پہلے سالار نے بڑے نپے تلے انداز میں ایباکا کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا تھا وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ بھی ان مفلوک حال لوگوں ہی کی طرح ہو گا جو غیر ملکیوں کی گاڑیاں سامنے آنے پر امداد کے لیے ان کے سامنے آجاتے تھے۔ مالی امداد نہ سہی، لیکن خشک خوراک کے ڈبے، دودھ، جوسز بھی ان کے لیے ایک عیاشی ہوتی۔ سالار بھی ایباکا سے ایسی ہی کسی ڈیمانڈ کا انتظار کر رہا تھا، لیکن جوابا" ایباکا کی زبان سے اپنا نام سن کر وہ حیران ہو گیا تھا۔

اس نے ایباکا سے اپنا تعارف نہیں کروایا تھا پھر بھی وہ اسے نام سے کیسے جانتا تھا۔ وہ ایباکا سے یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے جوابا" اسے بتایا کہ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ لوموکا میں ہونے والے وزٹ کے بارے میں بھی اسے بینک کے آفس میں کام کرنے والے کسی مقامی آدمی نے بتایا تھا۔ جس نے ایباکا کی سرتوڑ کوشش کے باوجود سالار سے ملاقات کے لیے اپائنٹ منٹ کے حصول میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ چند دنوں یا چند ہفتوں کی بات نہیں تھی۔ ایباکا ورلڈ بینک کے کنٹری ہیڈ سے ملاقات کے لیے کئی مہینوں سے کوشش کر رہا تھا۔ وہ سالار کے آفس نمبرز پر ہر روز ڈھیروں کالز کرتا رہتا تھا۔ ویب سائٹ پر موجود اس کے ای میل ایڈریس پر اس نے سینکڑوں ای میلز کی تھیں جن کا جواب ہر بار صرف موصولی ہی کا آیا تھا۔ اس کے بعد آگے کچھ نہیں۔۔۔ فون کالز ریسیو کرنے والے سالار کے عملے کے افراد کے پاس بھی ایباکا کے لیے صرف ایک جواب تھا۔ وہ میٹنگ میں ہیں آپ کا پیغام پہنچا دیا جائے گا۔

ایباکا کی ملاقات کا مقصد جان کر اسے جوابا" ۔۔۔ بڑے نارمل انداز میں ٹالا جاتا۔ اس کی گفتگو سنتے ہوئے سالار اس کی زبان و بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اسے اب شبہ نہیں رہا تھا کہ بیلجیم کی کالونی ہونے کی وجہ سے جس ملک کی قومی زبان فرنچ ہو وہاں ایں امریکن لب و لہجے میں انگریزی میں اتنی روانی سے بات کرنے والا جنگلات کا باسی ہونے کے باوجود بیرون ملک کا تعلیم یافتہ ہو گا۔

یہ ناقابل یقین بات تھی، لیکن اس کے بعد جو کچھ سالار سکندر نے سنا تھا اس نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ پیٹرس ایباکا ہاورڈ بزنس اسکول کا گریجویٹ تھا اور وال اسٹریٹ میں جے پی مارگن گروپ کے ساتھ پانچ سال کام کرنے کے بعد کانگو آیا تھا۔

اپنے والٹ سے نکالے ہوئے کچھ وزیٹنگ کارڈز اس نے سالار سکندر کی طرف بڑھا دیے تھے اس نے بے حد بے یقینی سے انہیں پکڑا تھا۔ وہ فقیر پست قامت بے مایہ شخص تھا۔۔۔ کانگو کے جنگلات میں تیروں، نیزوں اور پتھروں سے شکار کر کے پیٹ کی بھوک مٹانے والا ایک جنگلی۔۔۔ وہ ہاورڈ کے کینیڈی بزنس اسکول کہاں سے پہنچ گیا تھا اور پھر جے پی مارگن گروپ کے ساتھ منسلک رہنا۔۔۔ تو پھر وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟

اور یہ وہ سوال تھا جس کا جواب پیٹرس ایباکا نے سالار سکندر کو اس کے آفس میں دوسرے دن اپنی دوسری ملاقات میں کاغذات کے ایک انبار کے ساتھ دیا تھا، جو وہ اس ملاقات میں سالار سکندر کو دینے آیا تھا۔

پیٹرس ایباکا دس سال کی عمر میں لوموکا میں ایک بچہ کے طور پر ایک مشنری سے متعارف ہوا تھا، جو اسے اپنے ساتھ کانگو کے جنگلات میں وہاں کے لوگوں سے رابطہ اور کمیونی کیشن کے لیے ساتھ لے کر پھرتا رہا اور پھر اسے

اس حد تک اس بچے کے ساتھ لگاؤ ہو گیا کہ بیماری کی وجہ سے کانگو چھوڑنے پر وہ ایباکا کو بھی اپنے ساتھ امریکا لے گیا تھا جہاں اس نے اسے پیٹرس کا نام دیا۔ ایک نیا مذہب بھی۔۔۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے ایباکا کو تعلیم دلوائی۔ تعلیم کے لیے خیرات سے فنڈنگ دلوائی۔ ایباکا بے حد ذہین تھا اور ریورنڈ جانسن نے اس کی اس ذہانت کو جانچ لیا تھا' وہ ایباکا کو اس کے بعد ہر سال کانگو لاتا رہا جہاں ایباکا کا خاندان آج بھی اسی طرح جی رہا تھا۔ دس سالہ ایباکا نے اگلے پچیس سال امریکا میں گزارے تھے' مگر اس کے بعد وہ امریکا چھوڑ آیا تھا۔

وہ اپنے لوگوں کے پاس رہنا چاہتا تھا کیوں کہ انہیں اس کی ضرورت تھی اور انہیں اس کی ضرورت اس لیے تھی کیونکہ ورلڈ بینک کے مالی تعاون سے ہونے والے بہت سے منصوبوں میں سے ایک منصوبہ جنگل کے اس حصے میں شروع ہو گیا تھا جہاں ایباکا کا قبیلہ آباد تھا۔ اس کا خاندان اور خاندان سے بھی بڑھ کر وہ دس ہزار لوگ جو اب جنگل کے اس حصے سے بے دخل کیے جا رہے تھے' جس میں وہ صدیوں سے رہ رہے تھے۔ جنگل کٹتے جا رہا تھا' وہ ساری زمین صاف ہوتی پھر اس کے بعد وہاں ان معدنیات کی تلاش شروع ہوتی جو اس منصوبے کا دوسرا حصہ تھا اور ایباکا مسئلہ' اس کا اپنا خاندان نہیں تھا۔ ایباکا کا مسئلہ وہ پورا جنگلات کا حصہ تھا جو اب جگہ جگہ زونز بنا کر کاٹا جا رہا تھا اور کہیں نیشنل پارک بنا کر ان لوگوں کو وہاں سے بے دخل کیا جا رہا تھا۔

"ہم پانچ لاکھ لوگ ہیں مگر یہ جنگل تو کانگو کے ساڑھے تین کروڑ لوگوں کو روزگار دے رہا ہے۔ ورلڈ بینک ٹمبر انڈسٹری کو معاونت دے رہا ہے کیونکہ اس سے ہماری غربت ختم ہو گی۔ جب چند دہائیوں میں جنگل ہی غائب ہو کر یورپ اور امریکہ کی فیکٹریز اور شورومز میں مہنگے داموں بکنے والی لکڑی کی اشیاء میں تبدیل ہو جائیں گے تو کانگو کے لوگ کیا کریں گے۔ تم لوگ ہم سے وہ بھی چھیننا چاہتے ہو جو اللہ نے ہمیں دیا ہے۔ اگر کبھی ہم ویسٹ میں ان سے سب کچھ چھیننے پہنچ گئے تو تمہیں کیسا لگے گا؟" ایباکا نے اپنا کیس بہت تہذیب سے پیش کیا تھا مگر بات کے اختتام تک اس کی بے چینی اس کے لب و لہجہ سے جھلکنے لگی تھی۔

سالار سکندر کے پاس اس کے سوالوں کے رٹے رٹائے جوابات تھے۔ اس پروجیکٹ کی طرح کانگو میں ہونے والے اور بہت سے پراجیکٹس کی تفصیلات اس کی انگلیوں پر تھیں وہ وہاں ورلڈ بینک کا کنٹری ہیڈ تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ ان پروجیکٹس کی اہمیت اور فزیبلٹی رپورٹس کے بارے میں اسے پتا نہ ہوتا۔ مگر ایسا پہلی بار ہوا تھا' کہ پیٹرس ایباکا کے انکشافات اور سوالات اسے پریشان کرنے لگے تھے۔ بہت کچھ ایسا تھا جو اس کی ناک کے نیچے ہو رہا تھا اور اسے پتا نہیں تھا لیکن وہ اس سب کا حصہ دار تھا کیونکہ وہ سب کچھ اس کے دستخطوں کے ساتھ منظور ہو رہا تھا۔ کانگو میں وہ پہلی بار نہیں آیا تھا نہ ہی افریقہ اور اس کے مسائل اس کے لیے نئے تھے نہ ہی وہاں کے وسائل پر مغرب کی ٹپکتی ہوئی رال اس کے لیے کوئی پوشیدہ بات تھی لیکن وہ ہمیشہ یہ سمجھتا رہا تھا کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں اور کوئی بھی فلاحی کام کرنے والی بین الاقوامی مالیاتی تنظیم اپنے مفادات کو بالائے طاق رکھ کر' کسی ملک اور قوم کے لیے کچھ نہیں کر سکتی اور وہ انہیں اتنی چھوٹ دیتا تھا مگر ایباکا کے اعتراضات اور انکشافات نے اسے ہولا دیا تھا۔ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا' وہ ورلڈ بینک کے اپنے چارٹر کے خلاف تھا لیکن یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور ورلڈ بینک کی دلچسپی اور مرضی سے ہو رہا تھا۔

ایباکا کی دی ہوئی فائلوں کے انبار وہ کئی ہفتے پڑھتا رہا تھا۔ کئی ہفتے وہ اپنے آپ سے جنگ کرتا رہا تھا۔ ورلڈ بینک کے ایماء پر وہاں ایسی کمپنیوں کو لکڑی استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تھی جن کا ٹریک ریکارڈ افریقہ کے دوسرے بہت سے ممالک میں اسی حوالے سے قابل اعتراض رہا تھا۔ لکڑی کٹ رہی تھی۔ جنگل صاف ہو رہا تھا۔ آبادی بے دخل ہو رہی تھی اور جن شرائط پر ان کمپنیز کو وہاں لائسنس دیا گیا تھا وہ کمپنیز ان شرائط کو بھی پورا نہیں کر رہی تھیں۔ انہیں لکڑی کے عوض اس علاقے کے لوگوں کی معاشی حالت سدھارنے کا فریضہ دیا گیا تھا اور وہ کمپنیاں

کروڑوں ڈالرز کی لکڑی لے جانے کے عوض چند عارضی نوعیت کے اسکولز اور ڈسپنسریز لوگوں کو فراہم کر رہی تھیں۔ خوراک۔ خشک دودھ نمک اور مسالاجات کی شکل میں دی جا رہی تھی۔

اور یہ سب ورلڈ بینک آفیشلز کے نگرانی کے باوجود ہو رہا تھا کیونکہ پگمیز کو اس ملک میں اچھوت کا درجہ حاصل تھا' وہ ان کمپنیز کے خلاف عدالت میں نہیں جاسکتے تھے۔ حکومتی عہدے داران کے پاس نہیں جاسکتے تھے۔ صرف ایک کام کر سکتے تھے۔ احتجاج۔ این جی اوز کے ذریعے یا پھر میڈیا کے ذریعے۔ اور یہ کام بہت مشکل تھا۔ وہ مہذب دنیا کا حصہ نہیں تھا جہاں پر کسی کے ساتھ ہونے والی زیادتی' چار گھنٹے میں ہر بڑے نیوز چینل کی ہیڈ لائن بن جاتی تھی۔ وہ افریقہ تھا جہاں پر ایسی زیادتی' تشدد کے ذریعے ہی دبادی جاتی تھی۔

اگلے دو ماہ سالار کو ایبا کا کے ساتھ اور انفرادی حیثیت میں ان جگہوں کو خود جا کر دیکھنے میں لگے جن کے بارے میں ایبا کا نے اسے دستاویزات دی تھیں۔ اور پھر اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دستاویزات اور ان میں پائی جانے والی معلومات بالکل ٹھیک تھیں۔ ضمیر کا فیصلہ بہت آسان تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ غلط تھا اور وہ اس کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا' لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اب کیا کرے۔ ایک استعفیٰ دے کر اس ساری صورت حال کو اسی طرح چھوڑ کر نکل جاتا۔ اور اسے یقین تھا ایسی صورت میں جو کچھ وہاں چل رہا تھا' وہ چلتا ہی رہتا۔ یا پھر وہ وہاں ہونے والی بے ضابطگیوں پر آواز بلند کرتا۔ بے ضابطگی ایک بہت چھوٹا لفظ تھا۔ جو کچھ ورلڈ بینک وہاں کر رہا تھا وہ اخلاقیات اور انسانیت کی دھجیاں اڑانے کے برابر تھا۔

افریقہ میں ایبا کا سے ملنے کے بعد' زندگی میں پہلی بار سالار سکندر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کے ان الفاظ کو سمجھا تھا کہ "کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی سبقت حاصل نہیں۔" وہ ہمیشہ ان الفاظ کو صرف ذات' برادری اور اونچ نیچ کے حوالے سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ پہلی دفعہ اس سیاہ فام آبادی کا حال اور استحصال دیکھ رہا تھا' جو دنیا کے ایک بڑے خطے پر بستی تھی۔ معدنیات اور قدرتی وسائل سے مالا مال خطہ۔ اور پھر اس گوری آبادی کی ذہنی پسماندگی' ہوس دیکھ رہا تھا جس کا وہ بھی حصہ تھا۔ اور اسے خوف محسوس ہوا تھا۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ "آنے والے زمانوں کے حوالے سے اسی خطے اور اسی سیاہ فام آبادی کے حوالے سے کوئی پیش گوئی تھی۔ یا کوئی تنبیہہ جسے صرف سفید فام لوگ ہی نہیں مسلمان بھی نظرانداز کیے ہوئے تھے۔ صدیوں پہلے غلامی کا جو طوق سیاہ فاموں کے گلے سے ہٹا لیا گیا تھا 21 ویں صدی کے مہذب زمانے میں افریقہ میں استعماریت نے وہ طوق ایک بار پھر ڈال دیا تھا۔

اور انہیں سیاہ فام پست قامت لوگوں میں سے ایک پیٹرس ایبا کا تھا۔ جو امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں اپنی زندگی کے 25 سال گزارنے کے بعد بھی وہاں سے "اس سیاہ دور" میں لوٹ آیا تھا۔ صرف اپنے لوگوں کی "بقا" کے لیے۔ "بقا" کے لفظ کا مفہوم سالار سکندر نے پیٹرس ایبا کا سے سیکھا تھا اور اس بقائے باہمی کے لیے کیا کیا قربان کیا جا سکتا تھا وہ بھی وہ ایبا کا سے ہی سیکھ رہا تھا۔

زندگی میں اسے تقویٰ کا مطلب بھی اسی شخص نے سمجھایا تھا جو مسلمان نہیں تھا۔ وہ تقویٰ جس کا ذکر آخری خطبے میں تھا اور جس کو فضیلت حاصل تھی رنگ' نسل' ذات' پات ہر اس دنیاوی شے پر جسے برتر سمجھا جاتا تھا۔

پیٹرس ایبا کا کو اللہ کا خوف تھا۔ لادین سے کیتھولک اور کیتھولک سے پھر لادین ہونے کے باوجود اللہ سے ڈرتا تھا۔ اسے مانتا تھا۔ اس کی عبادت بھی کرتا تھا اور اس سے مانگتا بھی تھا لیکن وہ یہ کام کسی گرجے' مندر یا مسجد میں نہیں کرتا تھا کانگو میں اپنے لوگوں کے ساتھ انسانیت سے گرا ہوا سلوک ہونے کے باوجود وہ انسانیت کا درد رکھتا تھا۔ ایمان دار تھا۔ اخلاقی برائیوں سے بچا ہوا تھا۔ مگر پیٹرس ایبا کا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ترغیبات کو خدا خوفی کی وجہ سے چھوڑتا تھا۔ وہ نفس پرست نہیں تھا۔ وہ طمع زدہ بھی نہیں تھا اور سالار سکندر بہت

بار اسے سمجھ نہیں پاتا تھا۔ ایبا کا بلاشبہ غیر معمولی انسان تھا اور وہ اگر سالار سکندر کو متاثر کر رہا تھا تو وہ کسی بھی انسان کو کر سکتا تھا۔

وہ دنیا کے دو ذہین ترین انسانوں کا آمنا سامنا تھا یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک متاثر ہوتا دوسرا نہیں۔

"سالار سکندر! میں اپنی زندگی میں تم سے زیادہ قابل اور ذہین انسان سے نہیں ملا۔"

ایبا کا نے ایک مہینے کے بعد سالار کے ساتھ ہونے والی کئی ملاقاتوں کے بعد جیسے اس کے سامنے اعتراف کیا تھا۔ سالار صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

"میں خود انٹرنیشنل آرگنائزیشنز میں کام کر چکا ہوں اور ان میں کام کرنے والے بہت افراد سے ملتا بھی رہا ہوں لیکن تم ان سب میں مختلف ہو مجھے یقین ہے تم میری مدد کرو گے۔"

"تعریف کا شکریہ لیکن اگر تم اس خوشامد کا سہارا میری مدد کے لیے لے رہے ہو اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے منہ سے یہ سب سننے کے بعد آنکھیں بند کر کے تمہاری خاطر اس صلیب پر چڑھ جاؤں گا تو میرے بارے میں تمہارا اندازہ غلط ہے۔ میں جو بھی قدم اٹھاؤں گا' سوچ سمجھ کر اٹھاؤں گا۔

ایبا کا کی اس فیاضانہ تعریف کو خوشامد قرار دینے کے باوجود سالار جانتا تھا ایبا کا کو اس کی شکل میں اور اس پوزیشن پر واقعی ایک مسیحا مل گیا تھا۔ مسیحا بھی وہ جو ورلڈ بینک میں کام کرنے کے باوجود اپنا ضمیر زبردستی بے ہوش تو کر سکتا تھا' سلا نہیں سکتا تھا۔

"تمہارا سینس آف ہیومر بہت اچھا ہے" ایبا کا نے جواباً" مسکراتے ہوئے کہا تھا" یہ چیز مجھ میں نہیں پائی جاتی۔"

سالار نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "اور جس صورت حال میں تم مجھے ڈال بیٹھے ہو' اس کے بعد تو اگلے کئی سالوں بھی اس کے پیدا ہونے کے کوئی امکانات نہیں۔"

"میں بہت سارے مسلمانوں کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں' کام کرتا رہا ہوں' ملتا رہا ہوں مگر تم ان سے مختلف ہو۔"

وہ عجیب تبصرہ تھا یا کم از کم سالار کو لگا تھا۔

"میں کس طرح مختلف ہوں؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"تم ایک اچھے مسلمان ہونے کے ساتھ اچھے انسان بھی ہو۔ جن سے میرا واسطہ پڑا' وہ یا اچھے مسلمان ہوتے تھے یا اچھے انسان۔"

سالار کچھ دیر تک بول نہیں سکا بولنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا افریقہ کے اس بے دین انسان نے۔

"اچھا مسلمان تمہاری نظر میں کیا ہے؟" سالار نے بہت دیر خاموش رہنے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔

تمہیں میری بات بری تو نہیں لگی؟ ایبا کا ایک دم محتاط ہوا تھا۔

"نہیں۔ مجھے تمہاری بات انٹرسٹنگ لگی مگر تمہاری زبان سے ادا ہونے والا یہ پہلا جملہ تھا جس میں تمہاری کم علمی جھلکی۔"

اس بار ایبا کا الجھا۔ وہ مذہب ڈسکس کرنے کے لیے نہیں ملے تھے لیکن مذہب ڈسکس ہو رہا تھا۔ وہ مذہب پر بحث نہیں کرنا چاہتے تھے اور مذہب پر بحث ہو رہی تھی۔

"اچھا مسلمان۔؟ جو بہت Practising (باعمل) ہے۔ ساری عبادات کرتا ہے۔ پورک نہیں کھاتا۔ شراب نہیں پیتا۔ نائٹ کلب میں نہیں جاتا۔ میرے نزدیک وہ ایک اچھا مسلمان ہے جیسے ایک اچھا عیسائی یا ایک اچھا یہودی۔"

ایبا کا کو اندازہ نہیں تھا' وہ اپنی کم علمی میں بھی جو باتیں کہہ رہا تھا۔ وہ سالار سکندر کو شرمسار کرنے کے لیے کافی

تھیں۔ رنج اپنے لیے نہیں ہو رہا تھا اپنے مذہب کے پیروکاروں کے تعارف پر ہو رہا تھا۔ یعنی کوئی فرق ہی نہیں رہا تھا صرف عبادات اور باعمل ہونے پر ایک کم علم شخص کے ذہن میں مسلمان کو اور عیسائی یا یہودی میں۔ وہ لمحہ ذاتی حیثیت میں سالار کے لیے سوچنے کا تھا۔ ایبا کا اسے اچھا انسان بھی مان رہا تھا اور اچھا مسلمان بھی۔ مگر کیا واقعی وہ اس معیار پر پورا اترتا تھا کہ ایک باعمل یہودی یا عیسائی سے اپنی شناخت الگ رکھ پاتا۔

کانگو کے اس جنگل میں ایبا کا کے ساتھ بیٹھے سالار نے کبھی مذہب کو اس زاویے سے نہیں دیکھا تھا جس زاویے سے پیٹرس ایبا کا دیکھ رہا تھا۔

"یہ بدقسمتی کی بات ہے یا صرف اتفاق کہ مجھے اپنی زندگی میں کبھی اچھے مسلمان اچھے عیسائیوں یا اچھے یہودیوں سے اچھے تجربات نہیں ہوئے۔ وہ مجھے کبھی متاثر نہیں کرسکے اور جنہوں نے متاثر کیا اور جنہیں میں آج تک اچھے انسانوں کی فہرست میں رکھتا ہوں وہ کبھی مذہبی نہیں تھے۔ باعمل نہیں تھے۔"

"ریونڈ جانسن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" سالار نے بے ساختہ کہا۔

"ویل!" ایبا کا کہہ کر مسکرایا تھا۔ "ان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں لیکن وہ کبھی میرے آئیڈیل نہیں بن سکے۔"

"کیوں؟" وہ سوال و جواب سالار کو عجیب لطف دے رہے تھے۔

"ان احسانوں کی ایک قیمت تھی وہ مجھے کرسچن بنانا چاہتے تھے۔ جب میں نے وہ مذہب اختیار کرلیا تو پھر انہوں نے وہ سارے احسانات ایک کرسچن بچے پر کیے۔ ایک انسان کے طور پر صرف انسان سمجھ کر تو انہوں نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ مذہب کسی کے دل اور دماغ میں زبردستی نہیں ڈالا جاسکتا۔ میں یونیورسٹی جانے تک چرچ جاتا رہا پھر نہیں گیا۔"

ایبا کا مدھم آواز میں کہہ رہا تھا۔ شاید اسے ریورنڈ جانسن کو مایوس کرنے پر افسوس بھی تھا اور پچھتاوا بھی۔

"میں نے تھوڑا بہت سب مذاہب کا مطالعہ کیا ہے۔ سب اچھے ہیں۔ لیکن پتا نہیں جو انسان ان مذاہب کا پیروکار ہو جاتا ہے' وہ اپنی اچھائیاں کیوں کھو بیٹھتا ہے۔ تمہیں لگ رہا ہوگا میں فلاسفر ہوں۔"

ایبا کا کو بات کرتے کرتے احساس ہوا تھا۔ سالار بہت دیر سے خاموش تھا۔ اسے لگا' وہ شاید اس کی گفتگو میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔

"نہیں اتنا فلاسفر تو میں بھی ہوں۔" سالار نے مسکرا کر کہا۔ "تم امریکہ سے یہاں واپس کیسے آگئے؟" سالار نے اس سے وہ سوال کیا جو اسے اکثر الجھاتا تھا۔

"ایک چیز جو میں نے ریونڈ جانسن سے سیکھی تھی۔ وہ اپنے لوگوں کے لیے ایثار تھا۔ اپنی ذات سے آگے کسی دوسرے کے لیے سوچنا۔ امریکہ بہت اچھا تھا وہاں میرے لیے مستقبل تھا۔ لیکن صرف میرا مستقبل تھا۔ میری قوم کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں کانگو کا پست قامت حقیر سیاہ فام تھا اور میں امریکہ میں بھی کانگو کا وہی رہا لیکن میں کانگو میں کچھ اور بننے کا خواب لے کر آیا ہوں۔" ایبا کا کہہ رہا تھا۔

"اور وہ کیا؟" سالار کو پھر تجسس ہوا تھا۔

"کانگو کا صدر بننے کا۔" سالار کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

"تم ہنسے نہیں؟" ایبا کا نے جواباً" کہا تھا۔

"تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ میں ہنس پڑوں۔ ہارورڈ کینیڈی اسکول سے پڑھنے کے بعد تمہیں اتنے ہی بڑے خواب دیکھنے چاہئیں۔" ایبا کا اس کی بات پر مسکرا دیا تھا۔

وہ مہینے سالار کے لیے بے حد پریشانی کے تھے۔ کیا کرنا چاہیے اور 'کیا کرسکتا تھا' کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔

وہ ایبا کا کی مدد نہ بھی کرتا تب بھی۔ وہ جتنی جانفشانی سے وہ اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہا تھا۔ سالار کو یقین تھا جلد یا بدیر ورلڈ بینک کے چہرے پر کالک ملنے والا ایک بہت بڑا اسکینڈل آنے والا تھا۔ حفاظتی اقدامات کا وقت اب گزر چکا تھا۔ پیٹرس ایبا کا صرف کنگالا یا سواحلی بولنے والا ایک پست قد سیاہ فام نہیں تھا جسے کانگو کے جنگلات تک محدود کیا جاسکتا۔ وہ امریکہ میں اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارنے والا شخص تھا جس کے کانٹیکٹس تھے۔ وہ رابطے وقتی طور پر اگر اس کے کام نہیں بھی آرہے تھے تو بھی اس سے ایبا کا کمزور نہیں پڑا تھا بلکہ کئی حوالوں سے وہ زیادہ طاقت ور بن کر ابھرا تھا۔ وہ صرف پگمیز کی آواز نہیں رہا تھا بلکہ باتنو قبیلے کے بہت سے افراد کی آواز بھی بن چکا تھا جو پگمیز کی طرح جنگلات پر انحصار کرتے تھے۔

اگلا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہی ایبا کا کے ساتھ اس کا میل جول ان لوگوں کی نظروں میں آگیا تھا جن کے مفادات ورلڈ بینک کے ذریعے پورے ہو رہے تھے۔

سالار پر نظر رکھی جانے لگی تھی اور اس سے پہلے کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی ہوتی۔ انگلینڈ کے ایک اخبار نے پیٹرس ایبا کا کی فراہم کی گئی معلومات کی تحقیق کرنے کے بعد کانگو کے پگمیز اور ورلڈ بینک کے کانگو کے بارانی جنگلات میں ہونے والے پراجیکٹس کے بارے میں ایک کور سٹوری کی تھی جس میں ورلڈ بینک کے کردار کے حوالے سے بہت سارے اعتراضات اٹھائے گئے تھے۔

واشنگٹن میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں جیسے ہلچل مچ گئی تھی۔ ورلڈ میڈیا میں اس معاملے کی رپورٹنگ اور کوریج کو دبانے کی کوشش کی گئی تھی مگر اس سے پہلے ہی یورپ اور ایشیا کے بہت سارے ممالک کے ممتاز اخبارات اس آرٹیکل کو ری پرنٹ کر چکے تھے اور ورلڈ بینک کے اندر بھی وہ ہلچل اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی جب سالار سکندر کی طرف سے ہیڈ آفس کو کانگو میں چلنے والے ان پروجیکٹس کے حوالے سے ایک تفصیلی ای میل کی گئی جس میں اس نے مختلف ماحولیاتی اداروں سے ملنے والا ڈیٹا بھی منسلک کیا تھا جو اس جنگلات کی اس طرح کٹائی کو ایک بڑے ماحولیاتی عدم توازن کا پیش خیمہ قرار دے چکے تھے۔ ایک انسانی المیہ کے علاوہ۔ اس کا وہ خط بینک کے اعلا عہدے داران کے لیے شدید پریشانی کا باعث بنا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب سالار سکندر کو نامعلوم ذرائع کی طرف سے دھمکیوں کا آغاز ہوا تھا۔ وہ پروجیکٹس جو انہیں چلانے والی کمپنیوں کو اربوں ڈالرز کی آمدنی دے رہے تھے بینک کے اپنے کنٹری ہیڈ کی مخالفت کا باعث بنتے تو وہ کمپنیز اور ان کے پیچھے کھڑی بین الاقوامی طاقتیں خاموش تماشائی نہیں بنی رہ سکتی تھیں۔ کوئی عام صورت حال ہوتی تو اس وقت تک سالار سکندر سے استعفی لے کر اسے بڑے ہتک آمیز طریقے سے ملازمت سے فارغ کیا جاچکا ہوتا مگر اس وقت اس کا استعفی انٹرنیشنل میڈیا کے تجسس کو اور ابھار دیتا۔ وہ طوفان جو ابھی چائے کے کپ میں آیا تھا وہ اس سے باہر آجاتا۔

اس ای میل کا جواب سالار سکندر کو ایک تنبیہہ کی صورت میں دیا گیا تھا جو سادہ لفظوں میں خاموش ہو جانے کی تاکید تھی اور سالار کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔

بینک نے نہ صرف اس ای میل میں ہونے والے اس کے تجزیے کو ناپسند کیا تھا بلکہ پیٹرس ایبا کا کی فراہم کی جانے والی بنیاد پر گارڈین میں شائع ہونے والی کور اسٹوری کا ملبہ بھی اس کے سر ڈالتے ہوئے اسے ایبا کا اور اس کور اسٹوری میں استعمال ہونے والی معلومات کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا۔

یہ الزام سالار سکندر کے پروفیشنل کام پر ایک دھبے کے مترادف تھا۔ پیٹرس ایبا کا سے ہمدردی رکھنے، متاثر ہونے اور میل جول کے باوجود سالار نے اس سے بینک کی کسی انفارمیشن یا دستاویز کی بات کبھی نہیں کی تھی۔ ایبا کا نے ساری معلومات یا دستاویزات کہاں سے لی تھیں، وہ ایبا کا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس تنبیہہ کے جواب میں سالار نے بینک کو اپنے استعفی کی پیش کش کی تھی۔ اسے اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اسے مانیٹر کیا جاتا

تھا۔اس کی فون کالز ٹیپ ہورہی تھیں اور اس کی ای میلز ہیک ہورہی تھیں۔دنوں میں اس کے آفس کا ماحول تبدیل ہوگیا تھا۔اس نے بینک کی ناراضی اور ہدایات کے باوجود ایباکا سے نہ تو اپنا میل جول ختم کیا تا نہ ہی رابطہ ختم کیا تھا۔استعفیٰ کی پیشکش کے ساتھ اس نے بینک کو جانگو میں چلنے والے جنگلات پروجیکٹ کے خلاف اپنی تفصیلی رپورٹ بھی بھیج دی تھی،جو سالار سکندر کی اپنی تحقیقات اور معلومات کی بنیاد پر تھی۔اور توقع کے مطابق اسے واشنگٹن طلب کرلیا گیا تھا۔

امامہ کو اس ساری صورت حال کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔وہ امید سے تھی اور سالار اسے اس ٹینشن کا حصہ دار بنانا نہیں چاہتا تھا جس سے وہ خوف گھر رہا تھا۔وہ صرف ایباکا کے بارے میں جانتی تھی اور اس کی جدوجہد کے بارے میں۔جنگلات کے حوالے سے انٹرنیشنل الیکٹرانک میڈیا پر ہونے والی تنقید اس کی نظر میں بھی آئی تھی اور اس نے سالار سے اس کے بارے میں پوچھا بھی تھا لیکن سالار نے بڑے سرسری انداز میں اس کا ذکر کیا۔وہ اسے تفصیلات بتانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

امامہ کو صحیح معنوں میں تشویش تب ہوئی تھی۔جب اس نے اسی میڈیا میں سالار سکندر کا نام بھی نمودار ہوتے دیکھا جس کے بارے میں انٹرنیشنل میڈیا یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس پروجیکٹ کے حوالے سے ہیڈ آفس کو اختلافی رپورٹ دے چکا تھا۔اس رپورٹ کے مندرجات ابھی کسی رپورٹر تک نہیں پہنچے تھے۔

اور ان ہی حالات میں واشنگٹن سے اچانک اس کا بلاوا آیا تھا اور وہ یہ وزٹ تھا جس پر امامہ نے بالآخر اس سے پوچھ ہی لیا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہے سالار؟" وہ اس رات سالار کی پیکنگ کررہی تھی جب پیکنگ کرتے اس نے اچانک سالار سے پوچھا تھا۔وہ اپنا بریف کیس تیار کررہا تھا۔

"ہاں یار۔۔۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" سالار نے اس سے جواباً"پوچھا۔

"تم واشنگٹن کیوں جارہے ہو؟"وہ اپنے خدشوں کو کسی مناسب سوال کی شکل میں نہیں ڈھال سکی تھی۔

"میٹنگ ہے اور میں تو اکثر آتا جاتا رہتا ہوں کہیں نہ کہیں۔اس بار تمہیں اس طرح کے سوال کیوں پوچھنے پڑ رہے ہیں؟" اپنا بریف کیس بند کرتے ہوئے اس نے امامہ سے کہا تھا۔

"پہلے کبھی تم اتنے پریشان نہیں لگے۔"وہ اس کی بات پر چند لمحے بول نہیں سکا۔کوشش کے باوجود اس کا چہرہ اس کی ذہنی کیفیت کو امامہ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکا تھا۔

"نہیں۔۔۔ کوئی ایسی بڑی پریشانی نہیں ہے۔بس شاید یہ ہوگا کہ مجھے اپنی جاب چھوڑنی پڑے گی۔"

امامہ کے کندھے پر ہاتھ رکھے اس نے اپنے الفاظ اور لہجے کو ممکن حد تک نارمل رکھنے کی کوشش کی۔اس بار بھونچکا ہونے کی باری امامہ کی تھی۔

"جاب چھوڑنی پڑے گی؟ تم تو اپنی جاب سے بہت خوش تھے۔" وہ حیران نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔

"تھا۔۔۔ لیکن اب نہیں ہوں۔" سالار نے مختصراً"کہا تھا۔"کچھ مسئلے ہیں۔تمہیں واپس آکر بتاؤں گا۔تم اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا۔کہاں ہیں وہ دونوں؟"

سالار نے بات بڑی سہولت سے بدل دی تھی۔ایک لمحہ کے لیے اس وقت اسے خیال آیا تھا کہ ان حالات میں اسے اپنے بچوں اور امامہ کو کنشاسا میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔لیکن حل کیا تھا اس کے پاس۔امامہ کی پریگننسی کے آخری مہینے چل رہے تھے۔وہ ہوائی جہاز کا سفر نہیں کرسکتی تھی اور وہ واشنگٹن میں ہونے والی اس میٹنگ کو موخر یا کینسل کرنے کی صوابدید نہیں رکھتا تھا۔

"تم اپنا اور بچوں کا بہت خیال رکھنا۔میں صرف تین دن کے لیے جارہا ہوں'جلدی واپس آجاؤں گا۔" وہ اب

بچوں کے کمرے میں بستر پر سوئے ہوئے جبریل اور عنایہ کو پیار کر رہا تھا۔ اس کی فلائٹ چند گھنٹوں بعد تھی۔
"ملازمہ کو اپنے پاس گھر پر رکھنا میری غیر موجودگی میں" اس نے امامہ کو ہدایت کرتے ہوئے کہا تھا۔
"تم ہماری فکر مت کرو۔ تین دن ہی کی تو بات ہے۔ تم صرف اپنی میٹنگ کو دیکھو۔ آئی ہوپ' وہ ٹھیک رہے۔" امامہ کو واقعی اس وقت تشویش اس کی میٹنگ کی ہی تھی۔

سالار اس دن آفس سے خلاف معمول جلدی آیا تھا' اور پھر وہ سارا دن گھر میں ہی رہا تھا۔ اس دن معمول کی طرح شام کے لیے بھی کوئی مصروفیات نہیں رکھی تھیں اور نہ ہی گھر آ کر لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا تھا' نہ کارڈلیس فون ہاتھ میں لیے آفس کے معاملات گھر میں نپٹاتا پھرا تھا۔

وہ بس لان میں ان سب کو کھیلتے دیکھ کر خود بھی وہاں آ گیا تھا۔ اس کال کو ریسیو کرنے کے بعد۔ اس نے امامہ کو بتایا تھا کہ اسے ایمرجنسی میں تقریباً" دس گھنٹے کے بعد رات کے پچھلے پہر واشنگٹن کی فلائٹ پکڑنی تھی۔ یہ بھی ایک معمول کی بات تھی۔ سالار کی مصروفیات اور سفر اسی طرح آتے تھے۔ اچانک۔ بن بتائے۔

پھر وہ بچوں کے ساتھ لان میں کھیلتا رہا تھا' امامہ کے ساتھ گپ شپ لگاتا رہا تھا۔ یہ خلاف معمول تھا۔ معمول میں ایسا صرف ویک اینڈز پر ہوتا تھا وہ بھی ہر ویک اینڈ پر نہیں۔

سالار گھڑی دیکھ کر زندگی گزارنے والا شخص تھا۔ آج اگر وہ وقت کو بھولا تھا تو کہیں کچھ تو غلط تھا۔ اس کی پریشانی کی نوعیت کیا تھی اور اس کا لیول کیا تھا۔ امامہ اس کا اندازہ تو نہیں لگا پائی تھی' لیکن اسے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ شادی کے چھ سال کے بعد وہ سالار کو اتنا تو پڑھ ہی سکتی تھی۔ اور اب یک دم اس کا یہ اطلاع دینا کہ مسئلہ جو بھی تھا' اسے شاید اپنی جاب چھوڑنی پڑے۔ وہ پریشان ہوئی تھی تو اس لیے کیونکہ ایک جمی جمائی زندگی پھر منتشر ہو رہی تھی۔ امامہ ہاشم کی زندگی میں ہمیشہ یہی ہوتا تھا جب سب کچھ ٹھیک ہونے لگتا تو سب کچھ خراب ہو جاتا تھا۔ اسے زندگی میں بہت تبدیلیاں پسند نہیں تھیں سالار سکندر کی طرح' اور دونوں بچوں نے جیسے اس کی اس عادت کو کچھ اور پختہ کر دیا تھا۔

اسے آدھے گھنٹے میں نکلنا تھا۔ اس کا سامان پیک تھا۔ وہ دونوں چائے کا ایک آخری کپ پینے کے لیے لاؤنج میں ساتھ بیٹھے تھے اور اس وقت چائے کا پہلا گھونٹ پینے سے پہلے سالار نے اس سے کہا تھا۔
"میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میں تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔"
امامہ اپنی چائے اٹھاتے ہوئے ٹھٹکی پھر ہنسی۔ "آج بہت عرصے کے بعد تم نے کہیں جانے سے پہلے ایسی کوئی بات کہی ہے۔ خیریت ہے؟"
وہ اب اس کا ہاتھ تھپک رہی تھی۔ سالار نے مسکرا کر چائے کا کپ اٹھا لیا۔
"ہاں خیریت ہے' لیکن تمہیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہوں اس لیے فکرمند ہوں۔"
"اکیلی تو نہیں ہوں میں۔ جبریل اور عنایہ ہیں میرے ساتھ۔ تم پریشان مت ہو۔"
سالار چائے کے گھونٹ بھرتا رہا امامہ بھی چائے پینے لگی لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔
"تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی وہ چائے پیتے ہوئے چونکا پھر مسکرایا۔ وہ ہمیشہ اسے بوجھ لیتی تھی۔ ہمیشہ۔
"ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں لیکن ابھی نہیں کروں گا' واپس آ کر کروں گا۔" اس نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔
"مجھے تمہاری یہ عادت سخت ناپسند ہے' ہر دفعہ کہیں جاتے ہوئے مجھے الجھا جاتے ہو میں سوچتی رہوں گی کہ پتا

نہیں کیا اعتراف کرتا ہے۔"

امامہ نے ہمیشہ کی طرح بُرا مانا تھا اور اس کا گلہ غلط نہیں تھا وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ اور جان بوجھ کر کرتا تھا۔

"اچھا دوبارہ کبھی نہیں کروں گا۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ بازو پھیلائے وہ ہمیشہ کی طرح جانے سے پہلے امامہ سے آخری بار مل رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ایک ایک گرم جوش معانقہ۔

"آئی ول مس یو جلدی آنا۔" وہ ہمیشہ کی طرح جذباتی ہوئی تھی اور وہی کلمات دہرائے تھے جو وہ ہمیشہ دہراتی تھی۔

پورچ میں کھڑے ایک آخری بار اس کو خدا حافظ کہنے کے لیے اس نے الوداعیہ انداز میں سالار کی گاڑی کے چلتے ہی ہاتھ ہلایا تھا۔ گاڑی تیز رفتاری سے طویل پورچ کو عبور کرتے ہوئے کھلے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔

امامہ کو لگا تھا زندگی اور وقت دونوں تھم گئے تھے۔ وہ جب کہیں چلا جاتا' وہ اسی کیفیت سے دوچار ہوتی تھی' آج بھی ہو رہی تھی گارڈ نے اب گیٹ بند کر دیا تھا۔

شادی کے چھ سال کے بعد بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ زندگی جیسے ایک پٹڑی پر چلنے لگتی ہے۔ روز مرہ کے معمول کی پٹڑی پر۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انسان دائروں میں سفر کرنے لگتا ہے۔

وہ بچوں کی آمد سالار اور امامہ کی زندگی کو بھی بڑی حد تک ایک دائرے کے اندر لے آئی تھی۔ جہاں اپنی ذات پیچھے چلی جاتی ہے۔ سینٹر اسٹیج بچوں کے پاس چلا جاتا ہے۔ وہ خدشات' توقعات اور غلط فہمیوں کا وہ جال جس میں ایک نیا شادی شدہ جوڑا شادی کے شروع کے کچھ عرصہ میں جکڑا رہتا ہے۔ وہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ اعتماد لمحہ بھر میں بداعتمادی میں نہیں بدلتا۔ بے اعتباری پل بھر میں غائب ہونا سیکھ جاتی ہے۔ گلہ گونگا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بندھن عادت میں بدلنے لگتا ہے اور زندگی معمول بنتے ہوئے یوں گزرنے لگتی ہے کہ انسان دنوں' ہفتوں مہینوں کی نہیں سالوں کی گنتی بھول جاتا ہے۔

امامہ بھی بھول گئی تھی۔ پیچھے پلٹ کر وہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ پیچھے یادیں تھیں اور یادیں آکٹوپس بن کر لپٹ جانے کی خاصیت رکھتی تھیں۔ پیچھے اب کچھ رہا بھی نہیں تھا' اور جو رہ گئے تھے ان کے لیے وہ کب کی مرچکی تھی۔



کسی اپنے کی موت انسان کو پل بھر میں کس طرح خاک کر دیتی ہے یہ کوئی امامہ سے پوچھتا۔

بیس سال کی عمر میں گھر سے نکلتے ہوئے اس کو یہی لگا تھا وہ تو مرہی گئی تھی۔ جیتے جی۔ کسی کا کوئی تعلق ایک رشتہ ختم ہوتا ہے اس کے تو سارے ہی تعلقات ایک ہی وقت میں ختم ہوئے تھے۔ اسے لگا تھا ایسا صدمہ ایسی تکلیف تو کوئی اور شے اسے پہنچا ہی نہیں سکتی تھی۔

جلال انصر کو کھو دینا اس کی زندگی کا دوسرا سب سے بڑا صدمہ تھا۔ وہ نو عمری کی محبت تھی۔ محبت نہیں پاگل پن تھا جس میں وہ مبتلا ہوئی تھی۔ عشق نہیں تھا' عقیدت تھی' جو وہ اس شخص کے لیے پال بیٹھی تھی۔ ساری زندگی اس کے ساتھ گزارنے کے خواب' خواہش اور امید ایک ہی وقت چکنا چور ہوئے تھے اور ایسے چکنا چور ہوئے تھے کہ اس کا پورا وجود کئی سال انہیں کرچیوں سے اٹا رہا تھا۔ تب اسے لگا تھا یہ تکلیف موت جیسی تھی' ایسی بے بسی اور بے توقیری زندگی میں بس ایک ہی بار محسوس کرتا ہے انسان' اور صرف محبت کے کھو دینے پر ہی کرتا ہے۔

کوئی اور چیز کہاں ایسے مارتی ہے انسان کو۔
وسیم اور سعد کی موت نے اسے بتایا تھا کہ مارتی تو موت ہی ہے اور جیسی مار وہ انسان کو دیتی ہے کوئی اور تکلیف نہیں دیتی۔ آب حیات پی کر بھی انسان اپنی موت ہی روک سکتا ہے پر ان کو جانے سے کیسے روک سکتا ہے، جو جان سے بھی پیارے ہوتے ہیں۔
وہ اس وقت نیویارک میں تھی۔ اس کے ہاں پہلا بچہ ہونے والا تھا۔ وہ ساتویں آسمان پر تھی کیونکہ جنت پاؤں کے نیچے آنے والی تھی۔ نعمتیں تھیں کہ گنی ہی نہیں جا رہی تھیں۔ تیسرا مہینہ تھا اس کی پریگننسی کا۔ جب ایک رات سالار نے اسے نیند سے جگایا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ اسے نیند سے جگا کر کیا بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور شاید ایسی ہی کیفیت سالار کی تھی، کیونکہ اس کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کن الفاظ میں اتنے بڑے نقصان کی اطلاع دے۔ اس سے پہلے سکندر عثمان اور وہ یہی ڈسکس کرتے رہے تھے کہ امامہ کو اطلاع دینی چاہیے یا اس حالت میں اس سے یہ خبر چھپا لینی چاہیے۔
سکندر عثمان کا خیال تھا امامہ کو یہ خبر ابھی نہیں پہنچانی چاہیے، لیکن سالار کا فیصلہ تھا کہ وہ اس سے اتنی بڑی خبر چھپا کر ساری عمر کے لیے اسے کسی رنج میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ وہ وسیم سے فون اور میسج کے ذریعے ویسے بھی رابطے میں تھی، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اسے ایک آدھ دن میں اس کے بارے میں اطلاع نہ مل جاتی۔
وہ دونوں قادیانیوں کی ایک عبادت گاہ پر ہونے والی فائرنگ میں درجنوں دوسرے لوگوں کی طرح مارے گئے تھے اور امامہ چند گھنٹے پہلے ایک پاکستانی چینل پر یہ نیوز دیکھ چکی تھی، وہ اس جانی نقصان پر رنجیدہ بھی ہوئی تھی ایک انسان کے طور پر۔ مگر اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان لوگوں میں اس کے دو اتنے قریبی لوگ بھی شامل تھے۔ اسے شبہ ہوتا بھی کیسے۔ وہ اسلام آباد کی عبادت گاہ نہیں تھی ایک دوسرے شہر کی تھی۔ سعد اور وسیم وہاں کیسے پہنچ سکتے تھے اور وسیم تو بہت کم اپنی عبادت گاہ میں جاتا تھا۔
بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ ایک ہفتے کے بعد وہ اور سعد نیویارک آنے والے تھے اس کے پاس "تقریباً" دس سالوں کے بعد وہ سعد سے ملنے والی تھی۔ بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ وسیم نے اس سے وعدہ کیا تھا، وہ اپنے عقائد سے تائب ہو جائے گا۔ اور وہ سعد کو بھی سمجھائے گا جو اس سے زیادہ کٹر تھا اپنے مذہبی عقائد میں اور بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ ایک دن پہلے تو اس نے وسیم سے بات کی تھی، اسے ان کچھ چیزوں کی فہرست ای میل کی تھی جو اسے پاکستان سے چاہیے تھیں۔
اور سالار۔۔۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کیا وہ پاگل ہو گیا تھا۔ یا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک بار پھر سے۔ جیسے وہ نو سال ڈاکٹر سبط علی کے گھر دیکھتی رہی تھی۔
وہ صبر نہیں تھا وہ شاک بھی نہیں تھا۔ وہ بے یقینی تھی۔ سالار کو اندازہ تھا مگر وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ اب اس انکشاف کے بعد اس سے کیسے نکالے۔
وہ اگلے کئی گھنٹے گم صم آنسو بہائے بغیر سالار کے کسی سوال اور بات کا جواب دیے بغیر ایک بت کی طرح وہیں بستر پر بیٹھی رہی تھی۔ یوں جیسے انسان نہیں برف کی سل بن گئی تھی۔ اور برف کی سل نہیں جیسے ریت کی دیوار تھی جو ڈھے گئی تھی۔ اسے لگا تھا وہ اب کبھی زندگی میں اپنی انگلی تک نہیں ہلا سکے گی۔ پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکے گی۔ سانس نہیں لے سکے گی۔ جی نہیں سکے گی۔ کوئی ایسے تو نہیں جاتا۔۔۔ ایسے۔۔۔ اس کی حالت دیکھ کر سالار کو شدید پچھتاوا ہوا تھا اس نے سکندر عثمان کی بات نہ مان کر کتنی بڑی غلطی کی تھی اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔ سالار نے اپنے ایک ڈاکٹر کزن کو بلایا تھا گھر پر ہی اسے دیکھنے کے لیے۔
اس کے بعد کیا ہوا تھا امامہ کو ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔ سالار کو لمحہ لمحہ یاد تھا۔ وہ کئی ہفتے اس نے اسے پاگل پن

کی سرحد پر جانے اور وہاں سے چپکے سے دیکھا تھا۔ وہ چپ ہوئی تو کئی کئی دن چپ ہی رہتی یوں جیسے اس گھر میں موجود ہی نہیں تھی۔ روتی تو گھنٹوں روتی۔ سوتی تو پورا دن اور رات آنکھیں نہیں کھولتی اور جاگتی تو دو دو دن بستر پر چند لمحوں کے لیے بھی لیٹے بغیر لاؤنج سے بیڈ روم اور بیڈ روم سے لاؤنج کے چکر کاٹتے کاٹتے اپنے پاؤں سجا لیتی۔ یہ صرف ایک معجزہ تھا کہ اس ذہنی حالت اور کیفیت میں بھی جبریل کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ جیسے یہ فراموش ہی کر بیٹھی تھی کہ اس کے اندر ایک اور زندگی پرورش پا رہی تھی۔ ذہن یادوں سے نکل پاتا تو جسم کو محسوس کرتا۔

اور وحشت جب کچھ کم ہوئی تھی تو اس نے سالار سے پاکستان جانے کا کہا تھا۔ اسے اپنے گھر جانا تھا۔ سالار نے اس سے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ وہ کس گھر کو اپنا گھر کہہ رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے دو سیٹیں بک کروالی تھیں۔

”مجھے اسلام آباد جانا ہے۔“ اس نے سالار کے پوچھنے پر کہا تو۔ سالار نے بحث نہیں کی تھی' اگر اس کے گھر والوں سے ملاقات اس کو نارمل کر دیتی تو وہ اس ملاقات کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

ہاشم مبین ان کے ہمسائے تھے۔ ان کے گھر میں آنے والی قیامت سے سالار سکندر کا خاندان بے خبر نہیں تھا۔ مذہب کا فرق تھا۔ خاندانی اختلافات تھے' دشمنی تھی۔ اور نفرت بھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی یہ خواہش کبھی نہیں تھی کہ ہاشم مبین کے ساتھ وہ ہوتا جو ہوا تھا۔ بڑھاپے میں جوان اولاد اور وہ بھی دو بیٹوں کو گنوانا کیسا صدمہ تھا' سکندر عثمان اندازہ کر سکتے تھے۔ وہ خود باپ تھے۔ انہوں نے ہاشم مبین کے گھر جا کر ان سے دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ تعزیت کی تھی۔ اس صدمے میں بھی ہاشم مبین نے بے حد سرد مہری کے ساتھ ان کی تعزیت قبول کی تھی۔

سکندر عثمان کو امید نہیں تھی کہ وہ امامہ سے ملیں گے۔ انہوں نے سالار سے اپنے خدشات کا ذکر ضرور کیا تھا' لیکن امامہ کو جس حالت میں انہوں نے دیکھا تھا' وہ سالار کو ایک کوشش کر لینے سے روک نہیں سکے تھے۔ انہیں امامہ کو دیکھ کر دلی رنج ہوا تھا۔

ہاشم مبین نے نہ صرف فون پر سکندر عثمان سے بات کرنے سے انکار کیا تھا' بلکہ سالار کو ان کے گھر پر گیٹ سے اندر جانے نہیں دیا گیا۔ سکندر عثمان اور وہ دونوں مایوسی کے عالم میں واپس آگئے تھے۔ امامہ کی سمجھ میں ان کی مایوسی اور بے بسی نہیں آئی تھی وہ یہاں باپ کے گھر کے برابر والے گھر میں بیٹھ کر سب حالات سے واقف ہونے کے باوجود یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اگر وہ اس کے گھر جا سکتے تھے تو وہ کیوں نہیں جا سکتی تھی۔ گیٹ کے اندر نہ جا سکتی گیٹ تک تو چلی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا تھا۔ وہ اس کی جان لے لیتے۔ بس جان ہی تو جاتی نا۔ وہ تکلیف اور اذیت تو ختم ہو جاتی جس میں وہ تھی۔

سالار اس کے سامنے بے بس تھا' لیکن وہ پہلا موقع تھا جب اس نے امامہ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اس نے امامہ کو اس کے گھر جانے کی کوشش بھی نہیں کرنے دی تھی۔

”تمہیں اگر گھر جانا ہے تو پہلے اپنے باپ سے بات کرو۔ وہ اجازت دیں تو پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گا' لیکن میں تمہیں بغیر اجازت کے وہاں گیٹ پر گارڈز کے ہاتھوں ذلیل ہونے کے لیے نہیں بھیج سکتا۔“

اس کے رونے اور گڑگڑانے کے باوجود سالار نہیں پگھلا تھا۔ امامہ نے اپنے باپ سے فون پر بات کر کے اجازت لینے کی حامی بھر لی تھی۔ مگر اس فون کال نے سب کچھ بدل دیا تھا۔ جو چیز سالار اسے نہیں سمجھا سکا تھا وہ اس فون کال میں ہاشم مبین نے سمجھا دی تھی۔

”یہ جو کچھ ہوا ہے تمہاری وجہ سے ہوا۔ تم جن لوگوں کے ساتھ جا بیٹھی ہو ان ہی لوگوں نے جان لی ہے میرے دونوں بیٹوں کی۔ اور تم اب میرے گھر آنا چاہتی ہو۔ قاتلوں کے ساتھ میرے گھر آنا چاہتی ہو۔“ وہ ہذیانی انداز میں

چلاتے اور اسے گالیاں دیتے رہے تھے۔

"تم لوگ۔" اور "ہم لوگ" فرق کتنا بڑا تھا امامہ کو یاد آگیا تھا۔ آج بھی۔ اس سب کے بعد بھی اس غم کے ساتھ بھی اسے پچھتاوا نہیں تھا کہ اس نے وہ مذہب چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا ایک بار اس کے باپ نے کہا تھا وہ ایک دن گڑگڑاتے ہوئے اس کے پاس آکر معافی مانگے گی۔ اور وہ آج یہی کرنے جارہی تھی۔ پر کیوں کرنے جارہی تھی؟۔

خون کا رشتہ تھا۔ تڑپ تھی۔ وہ کھنچی تھی ان کی طرف۔ اب جب اسے ان سے پہلے کی طرح جان کا خوف نہیں رہا تھا۔ پر خون کا رشتہ صرف اسی کے لیے کیوں تھا۔ تڑپ تھی تو صرف اس کو کیوں تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کے پاس ان لوگوں کے سوا اور کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ جبکہ ان لوگوں کے پاس تھے۔ اس کے پاس سالار تھا۔ لیکن وہ خونی رشتہ نہیں تھا محبت کا رشتہ تھا۔ خون جیسی تڑپ پیدا ہونے کے لیے ابھی اس کو کئی سال چاہیے تھے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ماؤف ہونے کے باوجود اسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ جو غم اسے وہاں کھینچ کر لایا تھا۔ وہ غم اس گھر میں جاکر پچھتاوے میں بدل جاتا۔

ہاشم مبین کی مزید کوئی بات سننے کے بجائے اس نے فون رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ بلک بلک کر روئی تھی۔ اس گھر میں اور اس دنیا میں اب اس کا خونی رشتہ کوئی نہیں رہا تھا۔ اس گھر میں صرف وسیم اس کا تھا۔ اور وسیم جا چکا تھا۔ وہ ایک کھڑکی جو پچھواڑے میں کھلی تھی ٹھنڈی ہوا کے لیے۔ وہ آندھی کے زور سے بند ہو گئی تھی۔ اب اس کھڑکی کو دوبارہ کبھی نہیں کھلنا تھا۔

وہ سالار سکندر کے ساتھ واپس نیویارک لوٹ آئی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا وہ نارمل ہو رہی تھی آہستہ آہستہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ کچھ وقت لگنا تھا۔ امامہ بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا وہاں موجود تنہائی نے امامہ کے اعصاب کو ایک بار پھر مفلوج کرنا شروع کر دیا تھا۔ سالار پی ایچ ڈی کر رہا تھا اور ساتھ ایک آرگنائزیشن میں ہفتے میں تین دن کے لیے پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ وہ صبح پانچ بجے گھر سے نکلتا تھا۔ اور رات کو کہیں آٹھ نو بجے اس کی واپسی ہوتی تھی اور واپسی پر وہ اتنا تھکا ہوا ہوتا تھا کہ ایک دو گھنٹے ٹی وی دیکھ کر کھانا کھا کر وہ دوبارہ سو جاتا تھا۔

امامہ بارہ چودہ گھنٹے ایک بیڈ روم کے آٹھویں منزل کے اس اپارٹمنٹ میں بالکل تنہا ہوتی تھی اور تنہائی کا یہ دورانیہ سالار کے گھر آجانے کے بعد اس کے سو جانے پر اور بڑھ جاتا تھا۔ ایک بیڈ روم ایک لاؤنج اور کچن ایریا کے علاوہ جہاں کچھ بھی نہیں تھا جہاں وہ جاکر کچھ وقت گزار سکتی۔ گھر کا کام بھی بہت مختصر تھا کیونکہ گھر چھوٹا تھا۔ نیند اسے آتی نہیں تھی۔ اور گھر میں کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ صرف سوچنے کے علاوہ۔ کوئی ٹی وی کہاں تک دیکھ سکتا تھا۔ کتابیں کتنی پڑھ سکتا تھا۔ جب ذہن صرف اپنی زندگی کے سارے برُے دنوں کو سوچتے ہوئے وہیں اٹکا رہتا تھا۔ کیا ہو سکتا تھا؟۔ کیا کرنا چاہیے تھا؟۔ کیا کرلیتی تو کس چیز سے بچ جاتی۔ کس چیز سے بچ جاتی تو کون سا صدمہ اسے نہ ہوتا۔ زندگی میں کون کون سی غلطیاں ہوئی تھیں اس سے۔؟ کون سے غلطی زیادہ بڑی تھی۔ کون سی چھوٹی؟۔ کس کو نہ کرنے سے کس سے بچ سکتی تھی وہ۔

وہ سارا دن اسی حساب کتاب میں لگی رہتی تھی۔ وسیم اس کے ذہن سے نہیں نکلتا تھا وہ روز اپنے فون میں موجود اس کے اور اپنے میسجز کو جو سینکڑوں کی تعداد میں ہوتے بیٹھ کر پڑھنا شروع کرتی اور پھر گھنٹوں اسی میں گزار دیتی اسے وہ سینکڑوں میسجز اب جیسے زبانی حفظ ہو چکے تھے لیکن پتا نہیں خود اذیتی کی وہ کون سی سیڑھی تھی جس پر بیٹھی وہ ہر روز ایک ہی کام بھیگی آنکھوں کے ساتھ کرتی رہتی تھی۔ اسے دن میں کب کیا کھانا تھا اسے یاد نہیں رہتا تھا۔ کب کپڑے بدلے تھے اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ اس کا ذہن جیسے کسی نے قید کر دیا تھا۔ لاکھ کوشش پر بھی وہ اس پنجرے سے آزاد نہیں ہوتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کوشش نہیں کرتی تھی۔

وہ بے پناہ کوشش کرتی تھی اپنے ذہن کو ان سب چیزوں اور یادوں سے ہٹانے کی۔ وہ قرآن پڑھتی تھی نماز پڑھتی تھی۔ مگر اس کے بعد وہ وحشت کے اسی جنگل میں ایک بار پھر پہنچ جاتی تھی۔ بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ وہاں اس سے کوئی بات کرنے والا نہیں تھا۔ اٹھارہ' اٹھارہ گھنٹے وہ گونگوں کی طرح چلتی پھرتی اپنے کام میکانیکی انداز میں کرتی تھی۔ سالار کہتا تھا وہ پاکستان فون کرلے۔ وہ پاکستان کس کو فون کرتی وہ یہ نہیں بتا پاتا تھا وہاں کون تھا ایسا جو اپنے کام چھوڑ کر گھنٹوں فون پر بات کرتا۔ وسیم کے علاوہ۔ بات جہاں سے شروع ہوتی تھی پھر وہیں آکر رک جاتی تھی۔ اپنے وجود کے ناکارہ پن اور زندگی کی بے معنویت امامہ ہاشم نے جیسے اس دور میں محسوس کی تھی اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ اس کا اپنا وجود اس کے لیے سب سے بڑا بوجھ بن گیا تھا۔ اسے وہ کہاں پھینک آتی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بستر پر صبح نیند سے آنکھ کھلتے ہی اسے یہ خیال آتا تھا۔ ایک اور دن۔ پھر وہی روٹین۔ پھر وہی تنہائی۔ وہی ڈپریشن۔ وہ آہستہ آہستہ ڈپریشن کی طرف جانا شروع ہوگئی تھی' اور سالار ایک بار پھر اپنے آپ کو بے حد بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے لیے کیا کرتا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جس سے وہ پھر پہلے جیسی ہو جاتی۔ وہ اپنی ورک روٹین نہیں بدل سکتا تھا۔ وہ نیویارک میں رہ رہے تھے اور ان کے جو اخراجات تھے انہیں پورا کرنے کے لیے اسے کام کرنا ہی تھا۔ وہ پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ اسے گھنٹوں لائبریری میں بیٹھنا پڑتا تھا اپنی ریسرچ کے لیے۔ اور وہ یہ کام بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

چودہ گھنٹے تک اپنے کاموں اور سفر سے خوار ہونے کے بعد وہ تھکا ہارا گھر آنے پر بھی امامہ کے کہنے پر کہیں بھی چلنے کے لیے تیار رہتا تھا اور کہیں نہیں تو اپارٹمنٹ کے باہر پارک تک۔ لیکن وہ اس سے کہیں جانے کا کہتی ہی نہیں تھی وہ اس سے معمول کی گپ شپ کرنے کی بھی کوشش کرتا تھا۔ مگر وہ چند جملے بول کر چپ ہو جاتی تھی یوں جیسے اب وہ سالار سے مزید کیا بات کرے' اسے یہی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہونے والی اولاد جوان کی زندگی کا شادی کے بعد سب سے بڑا واقعہ تھا۔ دونوں ہی کے لیے جیسے غیر اہم ہو گیا تھا۔ دونوں کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ وہ بچے کے بارے میں بھی بات کریں تو کیا بات کریں۔ چند جملوں کے بعد ان کے پاس اس کے بارے میں بھی بات کرنے کو لفظ نہیں رہتے تھے۔

تسلی' دلاسا اور دل جوئی کے لیے سالار جو کر سکتا تھا کر چکا تھا۔ وہ اب وسیم کے بارے میں کسی سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ صبح سویرے گھر سے اس کے بارے میں سوچتے ہوئے نکلتا اور رات کو جب گھر واپس آنے کے لیے ٹرین میں بیٹھتا تو بھی اس کے بارے میں سوچ رہا ہوتا تھا۔ امامہ کی ذہنی کیفیت نے جیسے اس کے اعصاب شل کرنے شروع کردیے تھے۔ جبریل کی پیدائش میں ابھی بہت وقت تھا اور وہ اسے اس جہنم سے نکالنا چاہتا تھا۔ جس میں وہ ہر وقت نظر آتی تھی۔

سائیکاٹرسٹ اس کی پریگننسی کی وجہ سے اسے تیز دوائیں نہیں دے رہے تھے مگر اس کا خیال تھا باقاعدہ علاج کے بغیر وہ بہت جلد نارمل نہیں ہو سکتی تھی۔ فیملی کا خیال تھا وہ اگر اسے ساتھ لے جانے کے بجائے کچھ دیر پاکستان میں ان کے پاس رہنے دیتا تو وہ اب تک نارمل ہو چکی ہوتی۔ وہاں فیملی سپورٹ ہوتی ذہن اور دل کو بہلانے کے لیے وہ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے۔ سات سمندر پار بیٹھے وہ اس کے لیے کیا کرتے۔ سالار کو ان کی بات بھی ٹھیک لگتی تھی لیکن وہ امامہ کے بارے میں خائف تھا کہ اسے اکیلا پاکستان چھوڑ جانے پر وہ کسی نقصان کا شکار نہ ہو جائے۔ لیکن جو کچھ اب ہو رہا تھا وہ بھی اس سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے سے پہلے ہی ایک رات امامہ نے ــــ کہا تھا۔

"مجھے پاکستان جانا ہے۔"

"کیوں؟" سالار کو اپنا سوال خود بے تکا لگا۔
وہ بہت دیر چپ رہی یوں جیسے اپنے الفاظ جمع کر رہی ہو پھر اس نے جو کہا تھا اس نے سالار کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔
"کل میں نے وسیم کو دیکھا۔۔۔ وہاں کچن کاؤنٹر کے پاس وہ پانی پی رہا تھا۔۔۔ دو دن پہلے بھی میں نے اسے دیکھا تھا' وہ اس کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔" بات کرتے ہوئے اس کی آواز بھرائی اور وہ شاید اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کے لیے رکی تھی۔
"مجھے لگتا ہے میں کچھ عرصہ اور یہاں رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔ یا شاید ہونا شروع ہو چکی ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتی۔"
اس نے چند لمحوں کے بعد دوبارہ بات کرنی شروع کی تھی۔ وہ اگر واہموں کا شکار ہو رہی تھی تو وہ اس بات سے واقف بھی تھی اور اس سے فرار چاہتی تھی تو یہ جیسے ایک مثبت علامت تھی۔
"ٹھیک ہے' ہم واپس چلے جاتے ہیں مجھے صرف چند ہفتے دے دو سب کچھ وائنڈ اپ کرنے کے لیے۔"
سالار نے جیسے لمحوں میں فیصلہ کیا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے امامہ نے نفی میں سر ہلایا۔
"تم پی ایچ ڈی کر رہے ہو' تم کیسے میرے ساتھ جا سکتے ہو؟"
"میں پی ایچ ڈی چھوڑ دوں گا۔۔۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری ضروری نہیں ہے۔۔۔ تم اور تمہاری زندگی ضروری ہے۔"
سالار نے جواباً" اس سے کہا' کچھ کہنے کی کوشش میں امامہ کی آواز بھرائی وہ کہہ نہیں پائی۔ اس نے دوبارہ بولنے کی کوشش کی اور اس بار وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔
"دو نہیں تم ساتھ نہیں آؤ گے۔۔۔ یہ کیوں ضروری ہے کہ ساری زندگی تم قربانیاں ہی دیتے رہو میرے لیے۔۔۔ اب پی ایچ ڈی چھوڑ دو۔۔۔ اپنا کیریئر چھوڑ دو۔۔۔ تمہاری زندگی ہے۔ قیمتی ہے تمہارا وقت' تم کیوں اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال میرے لیے ضائع کرو۔"
سالار نے کچھ کہنے کی کوشش کی' کوئی اور موقع ہوتا تو اس کا یہ اعتراف اس کو خوشی دیتا' لیکن اب اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے اسی طرح کہہ رہی تھی۔
"I am not suitable for you میں جتنا سوچتی ہوں مجھے یہی احساس ہوتا ہے تمہارا ایک برائٹ فیوچر ہے' تم زندگی میں بہت کچھ حاصل کر سکتے ہو لیکن میرا وجود تمہاری ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ مجھے احساس جرم ہوتا ہے کہ بار بار میری وجہ سے تمہیں پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔"
وہ چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔۔۔ وہ رو رہی تھی اور بول رہی تھی۔ اور وہ چاہتا تھا وہ اور روئے اور بولے۔۔۔ وہ غبار جو اس کے اندر سے چھٹتا ہی نہیں تھا وہ کسی طرح تو چھٹے۔
"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں' لیکن میں بے بس ہوں میں کوشش کے باوجود بھی اپنے آپ کو نارمل نہیں کر پا رہی۔۔۔ اور اب۔۔۔ اب وسیم کو دیکھنے کے بعد تو میں اور بھی۔۔۔ اور بھی۔" وہ بولتے بولتے رک گئی صرف اس کے آنسو اور ہچکیاں تھیں جو نہیں تھمی تھیں۔
"سالار' تم بہت اچھے انسان ہو۔۔۔ بہت اچھے ہو تم بہت قابل ہو۔۔۔ تم مجھ سے بہتر عورت ڈیزرو کرتے ہو۔۔۔ میں نہیں۔

Im a worthless woman

I m a nobody

تمہیں ایسی عورت ملنی چاہیے جو تمہارے جیسی ہو۔۔۔ تمہیں زندگی میں آگے بڑھنے میں سپورٹ کرے۔۔۔

میری طرح تمہارے پاؤں کی بیڑی نہ بن جائے۔"

"اور یہ سب کچھ تم آج کہہ رہی ہو جب ہم اپنا پہلا بچہ expect کر رہے ہیں۔۔۔؟"

"مجھے لگتا ہے یہ بچہ بھی مر جائے گا۔" اس نے عجیب بات کہی تھی۔۔۔ سالار نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"تم کیوں اس طرح سوچ رہی ہو۔۔۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔" سالار پتا نہیں کس کو تسلی دینا چاہتا تھا لیکن اس وقت امامہ سے زیادہ اس کی اپنی حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔

"تم بس مجھے پاکستان بھیج دو۔" امامہ نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر وہی مطالبہ دہرایا تھا۔

"میں تمہیں اسلام آباد نہیں بھیجوں گا۔" سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"میں وہاں جانا بھی نہیں چاہتی، مجھے سعیدہ اماں کے پاس جانا ہے میں وہاں رہ لوں گی۔" وہ اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔ "سعیدہ اماں نہیں تم ڈاکٹر صاحب کے پاس چلی جاؤ۔ اگر وہاں رہنے پر تیار ہو تو میں تمہیں بھیج دیتا ہوں۔" سالار نے یک دم کچھ سوچ کر کہا تھا۔

"ٹھیک ہے مجھے انہیں کے پاس بھیج دو۔" وہ ایک لمحہ کے بھی تامل کے بغیر تیار ہو گئی تھی۔ "اگر تم وہاں جا کر خوش رہ سکتی ہو تو ٹھیک ہے، میں تمہیں بھیج دیتا ہوں واپس کب آؤ گی؟"

وہ پہلا موقع تھا ساری گفتگو میں جب امامہ نے اس سے نظر ملائی تھی۔۔۔ یہ دل بس خواری کا نام ہے عزت لوں اتار کر رکھتا ہے جیسے عزت کوئی شے ہی نہیں۔۔۔ بے عزتی کو اتنا معمولی کر دیتا ہے کہ انسان آنکھ میں پانی بنا کر رکھنے لگتا ہے۔۔۔ پی جانے لگتا ہے۔ وہ ساری دنیا کو اپنی ٹھوکر پر رکھنے والا مرد تھا اور رسی ڈالی تھی تو اللہ نے اس کے گلے میں محبت کی رسی ڈالی تھی۔۔۔ رسی تھی زنجیر نہیں تھی لیکن بیڑی سے زیادہ بڑی اور کڑی تھی۔

امامہ کو لگا تھا وہ اس سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی اور نظریں ملا کے کرنا ہی کیا تھا۔۔۔ کچھ کہنے کے لیے لفظ ہی نہیں تھے۔۔۔ جو بھی گلے تھے اسے اپنی ذات سے تھے۔۔۔ ساری خامیاں اپنے اندر تھیں۔۔۔ سالار کو وہ جیسے بدقسمتی کے اس چنگل سے آزاد کر دینا چاہتی تھی جس میں وہ خود سالوں سے پھنسی ہوئی تھی اور شاید پھنسا ہی رہنا تھا اسے۔۔۔ اس کی بے لوث۔۔۔ بے مول محبت کا وہ اتنا صلہ تو دیتی اسے۔۔۔ کہ اس بدقسمتی میں اسے نہ گھسیٹتی اسے آگے بڑھ جانے دیتی۔

"واپس آ جانا۔" اس کی لمبی خاموشی کو سالار نے مختصر زبان دی تھی۔۔۔ مشورہ نہیں تھا منت تھی۔۔۔ خواہش نہیں تھی بے بسی تھی۔۔۔ جو ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔۔۔ امامہ نے اس کی بات خاموشی سے سن کر خاموشی سے ہی جواب دیا تھا۔

وہ ایک ہفتے کے بعد پاکستان واپس چلی آئی تھی اور جیسے کسی قید سے چھوٹ آئی تھی۔ امریکہ سے واپس آنے سے پہلے وہ گھر میں پڑی ہوئی اپنی ایک ایک چیز وہاں سے ہٹا آئی تھی یوں جیسے رگڑ رگڑ کر سالار کے گھر اور زندگی سے اپنے وجود اور یادوں کے سارے نقوش کو مٹا دینا چاہتی ہو۔۔۔ جیسے سالار کی زندگی کو ہر اس نحوست سے پاک صاف کر دینا چاہتی ہو جو اس کے ساتھ اس کے گھر اور زندگی میں داخل ہوئی تھی۔

وہ واپس نہ آنے کے لیے جا رہی تھی سالار کو اس کا احساس اس کی ایک ایک حرکت سے ہو رہا تھا لیکن وہ پھر بھی اسے جانے دینا چاہتا تھا۔ اگر فاصلہ اور اس سے دوری اسے صحت یاب کر سکتی تھی تو وہ چاہتا تھا وہ دور ہو جائے لیکن ٹھیک ہو جائے۔ چار مہینے اور گزرتے تو ان کی اولاد اس دنیا میں آ جاتی اور وہ اس کی بقا بھی چاہتا تھا اور وہ اپنی ہمت بھی جانتا تھا جو اب آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی تھی۔ وہ ڈپریشن امامہ کے وجود سے جیسے اس کے وجود میں

ٹرانسفر ہونے لگا تھا۔

جس شام اس کی فلائٹ تھی وہ ایک بار پھر دل گرفتہ ہو رہا تھا۔۔۔ اسے لگا تھا اب وہ گھر ٹوٹنے والا تھا جو اس نے بڑی مشکل سے بنایا تھا۔۔۔ امامہ بھی خاموش تھی مگر پتا نہیں سالار کو کیوں وہ پر سکون لگی تھی۔۔۔ پر سکون۔۔۔ مطمئن خوش وہ اس کے چہرے کی کتاب پر اس دن یہ نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔

"مت جاؤ۔" وہ ٹیکسی کے آنے پر اس کا بیگ اٹھا کر بیڈ روم سے لاؤنج میں لایا تھا۔ وہ اپنا ہینڈ کیری کھینچتے ہوئے اس کے پیچھے آئی تھی اور اس نے ہینڈ کیری بھی دوسرے سامان کے ساتھ سالار کو تھمانے کی کوشش کی تھی جب سالار نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس نے خلاف توقع ہاتھ نہیں کھینچا تھا' بس ہاتھ اس کے ہاتھوں میں رہنے دیا تھا۔ بہت دیر سالار اس کا ہاتھ یونہی پکڑے رہا تھا پھر اس نے بہت دل گرفتی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

وہ لمس امامہ کے ساتھ آیا تھا۔ اس قید سے آزاد ہونے کے بعد بھی اسے بے قرار کرتا رہا تھا۔ کئی سال بعد وہ ایک بار پھر ڈاکٹر سبط علی کے گھر پناہ کے لیے آئی تھی۔ اور اسے اس بار بھی پناہ مل گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور اس کی بیوی اس کی ذہنی حالت سے واقف تھے اور وہاں ان کے پاس آکر کم از کم کچھ دنوں کے لیے امامہ نے یونہی محسوس کیا تھا جیسے وہ کسی قید تنہائی سے نکل آئی تھی۔۔۔ مگر یہ کیفیت بھی وقتی تھی۔ وہ جس سکون کی تلاش میں تھی وہ یہاں بھی نہیں تھا۔۔۔ بے چینی اور بے قراری یہاں بھی ویسی ہی تھی اور ڈاکٹر سبط علی ان بیوی اور سعیدہ اماں کی محبت بھی اس کے لیے مرہم ثابت نہیں ہو پا رہی تھی۔ سالار اسے روز فون کرتا تھا' کبھی وہ کال ریسیو کر لیتی کبھی نہیں۔۔۔ کبھی وہ اس سے لمبی بات کرتی کبھی مختصر بات کر کے فون رکھ دیتی وہ پاکستان آکر بھی کسی سے رابطے میں نہیں تھی۔ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لمبی' بے مقصد خوش گپیاں جن کی وہ عادی تھی۔۔۔ فرق اگر صرف پڑا تھا تو یہ کہ یہاں وہ پابندی سے اور وقت پر اچھا کھانا کھانے کی عادی ہو گئی تھی کیونکہ یہ اس کی مجبوری تھی ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی اس کا خیال رکھتے تھے اور اتنا خیال رکھتے تھے کہ کبھی کبھی اسے احساس جرم ہونے لگتا کہ اسے ان کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا اس نے اس بڑھاپے میں ان کی ذمہ داری بڑھا دی تھی۔

پتا نہیں کتنے دن تھے جو اس نے اسی طرح گزارے تھے۔۔۔ سوتے جاگتے یا پھر کبھی وہ گھر سے بے مقصد نکل پڑتی۔۔۔ ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں اور سارے شہر میں گھومتی پھرتی۔۔۔ چلتی ہوئی گاڑی سے نظر آنے والے منظر اس کے ذہن کو وقتی طور پر بھٹکا دیتے تھے اس کی سوچ کو اس کی زندگی سے دوسروں کی زندگی پر لے جاتے تھے۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ گھر سے نکلی تھی اور نہر کے ساتھ سڑک پر چلتے چلتے وہ شہر سے ہی باہر نکل آئے تھے۔ ایک جگہ گاڑی رکوا کر وہ نیچے اتر آئی تھی اور نہر کے ساتھ سبزے پر نہر کے پانی پر بہتی بے کار چیزوں کو دیکھتے دیکھتے وہ اس کے ساتھ چلنے لگی تھی یوں جیسے وہ بھی پانی پر بہنے والی کوئی بے کار چیز تھی پتا نہیں وہ کتنی دیر چلتی رہی تھی پھر ایک جگہ کھڑے ہو کر بہتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگی۔۔۔ گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں موسم سرما میں نہر میں بہتا ہوا وہ پانی برسات کے پانی کی طرح تیز رفتار نہیں تھا' نہ ہی پانی اتنا زیادہ تھا لیکن اس لمحے وہ اسے عجیب انداز میں اپنی طرف کھینچ رہا تھا یوں جیسے وہ اسے اپنے اندر اترنے کے لیے پکار رہا ہو۔۔۔ چند لمحوں کے لیے وہ اس خنکی کو بھی بھول گئی تھی جو اس کے سویٹر اور شال کے باوجود اس کے جسم کو شل کرنے لگی تھی۔ نہر کے دونوں کناروں پر لگے ہوئے اونچے لمبے درخت ہوا سے ہلتے تو ان کے پتوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر نہر کے پانی پر پڑتیں۔۔۔ لحظہ بھر کے لیے اسے روشن کرتیں غائب ہو جاتیں۔

بس صرف ایک لمحہ تھا جس نے اس سے کہا تھا کہ اسے اس پانی میں اترنا چاہیے۔ دیکھنا تو چاہیے وہاں آگے نیچے کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ قدم بڑھا دیتی' کسی عورت کی آواز پر وہ ٹھٹک گئی تھی۔

"یہ ذرا گٹھا تو بندھوا دے میرے ساتھ بیٹی!"

وہ ایک ستر اسی سالہ دبلی پتلی سانولی رنگت اور جھریوں سے بھرے چہرے والی ایک بوڑھی عورت تھی۔ جو ایندھن کے لیے وہاں درختوں کی گری ہوئی خشک لکڑیاں چننے کے بعد اب اسے ایک چادر نما کپڑے میں باندھنے کی کوشش میں اسے مخاطب کر رہی تھی' وہاں دور دور تک ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور وہ بھی کب اور کہاں سے یک دم نمودار ہوئی تھی امامہ کو اس کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔ اس نے کچھ کہے بغیر نہر کے کنارے سے ہٹتے ہوئے اماں کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔ گٹھا اتنا بڑا بنا تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ بوڑھی عورت کبھی بھی اس گٹھے کو سر پر نہیں اٹھا پائے گی۔۔۔ لیکن اس بڑھیا نے امامہ کی مدد سے بڑے آرام سے وہ گٹھا سر پر اٹھا لیا تھا۔

"ذرا میری بکری کی رسّی مجھے پکڑانا۔" اس بوڑھی عورت نے اب دور ایک درخت کے دامن میں اگی گھاس چرتی ہوئی ایک بکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امامہ سے کہا تھا' امامہ کو ایک لمحے کے لیے تامل ہوا لیکن پھر اس نے جا کر تھوڑی بہت جدوجہد کے بعد اس بکری کی رسّی پکڑ ہی لی تھی۔

"آپ چلیں میں ساتھ چلتی ہوں کہاں جانا ہے آپ کو؟"

امامہ کو خیال آیا تھا کہ وہ اتنے بڑے لکڑیوں کے گٹھڑ کے ساتھ بکری کو کیسے تھامے گی۔

"بس یہ یہاں آگے ہی جانا ہے ادھر سڑک پار کر کے دوسری طرف۔" بوڑھی عورت نے نہر کے سبزے سے نکل کر سڑک کی طرف جاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے سمجھایا تھا۔

امامہ بکری کی رسّی کھینچتی ہوئی چپ چاپ اس عورت کے پیچھے چل پڑی تھی' جس کے پاؤں ننگے تھے اور ایڑھیاں کھردری اور پیدل چل چل کر پھٹ چکی تھیں' امامہ اونی جرابوں کے ساتھ بہت آرام دہ کورٹ شوز پہنے ہوئے تھی اس کے باوجود وہ اس بوڑھی عورت کی سبک رفتاری کا سامنا نہیں کر پا رہی تھی جو یوں چل رہی تھی جیسے ٹائلز کے فرش یا کسی مخملیں قالین پر چل رہی ہو۔

سڑک پار کرتے ہی امامہ کو دس بیس کے قریب وہ جھگیاں نظر آئی تھیں' جنہیں اماں اپنا گھر کہہ رہی تھی' وہ جھگیاں بس ٹینٹوں پر مشتمل نہیں تھیں۔ لوگوں نے اپنی جھگی کے گرد سرکنڈوں کی دیواریں کھڑی کر کر کے جیسے احاطے سے بنا لیے تھے جن کے فرش کو مٹی اور گارے سے لیپا ہوا تھا۔ وہ کچھ تامل کے ساتھ ایسی ہی ایک جھگی کے احاطے میں بکری کی رسی پکڑے اماں کے پیچھے چلتی ہوئی داخل ہوئی تھی۔

اس بوڑھی عورت نے احاطے کے ایک کونے میں سر پر لادا ہوا گٹھر اتار پھینکا تھا اور پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے جیسے اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے اپنی سانس بحال کی تھی۔ بکری تب تک امامہ کے ہاتھ سے رسّی چھڑا کر سرکنڈوں کی دیوار کے ساتھ اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں اسے باندھا جاتا تھا اور جہاں زمین پر کچھ مرجھائی ہوئی گھاس پھوس پڑی تھی وہ اب اس پر منہ مارنے لگی تھی۔

احاطے کے ایک دوسرے حصے میں مٹی کے ایک چولہے پر مٹی کی ایک ہنڈیا چڑھی ہوئی تھی جس سے اٹھنے والی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی' احاطہ روپہلی دھوپ سے روشن اور گرمایا ہوا تھا۔ وہاں نہر والی ٹھنڈک نہیں تھی ایک آسودہ سی حرارت تھی۔ وہ جیسے کسی گرم آغوش میں آ گئی تھی۔

بوڑھی عورت تب تک لکڑیوں کا گٹھڑ کھول کر اس میں سے کچھ لکڑیاں نکال کر چولہے کی طرف آ گئی تھی۔

"ارے تو کھڑی کیوں ہے اب تک۔۔۔ بیٹھ کر دم تو لے۔۔۔ میری خاطر کتنا چلنا پڑ گیا تجھے۔۔۔ میں نے کہا بھی تھا میں لے جاتی ہوں بکری کو۔۔۔ میرا تو روز کا کام ہے۔۔۔ پیدا ہوتے سے کرتی آئی ہوں محنت مشقت۔۔۔ پر تو تو شہری کڑی ہے۔ تجھ سے کہاں ہوتی ہے کوئی مشقت۔"

اس نے کہتے ہوئے چولہے سے کچھ فاصلے پر پڑی ایک چوکی کو جیسے اس کے لیے آگے کھسکا دیا تھا۔

"میں بھی مشقت ہی کاٹتی آئی ہوں اماں! یہ مشقت تو کچھ بھی نہیں۔"

امامہ اس سے کہتے ہوئے آگے بڑھ آئی تھی۔ اس کا خیال تھا بوڑھی عورت نے اس کی بات نہیں سنی ہوگی لیکن وہ بوڑھی عورت ہنس پڑی تھی۔

"بس مجھے مشقت نہیں لگتی تجھے لگتی ہے، یہی تو فرق ہے۔۔۔ پر تیرا قصور نہیں سارا فرق جوانی کا ہے۔۔۔ جوانی میں ہر چیز مشقت لگتی ہے۔۔۔ بڑھاپا خود ایسی مشقت ہے کہ باقی مشقتیں چھوٹی بنا دیتا ہے۔"

اس عورت نے اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہا تھا امامہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی وہ اس حلیے اور اس جگہ رہنے والی عورت سے ایسی بات کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

"آپ پڑھی لکھی ہیں؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"بہت زیادہ۔" وہ عورت اس بار بھی چولہے ہی کی طرف متوجہ تھی اور اس بار بھی اس نے بات ہنس کر ہی کہی تھی مگر لہجے میں تمسخر تھا اپنے لیے۔۔۔ جو امامہ تک پہنچ گیا تھا۔ امامہ نے اگلا سوال نہیں کیا تھا وہ اب اس ہانڈی اور چولہے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جس کے پاس وہ بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ اینٹوں سے بنے مٹی کے چولہے پر رکھی ہوئی پرانی مٹی کی ہنڈیا۔ میں ساگ اپنے پانی میں گل رہا تھا۔ اس بوڑھی عورت نے نہر کے کنارے سے چنی ہوئی جھاڑیاں توڑ توڑ کر چولہے میں پھینکنا شروع کر دیا۔ وہ آگ کو اسی طرح بھڑکائے رکھنے کی کوشش تھی۔

امامہ مٹی سے لیپے ہوئے گرم فرش پر چولہے کے قریب آکر بیٹھ گئی تھی۔ پاؤں سے جرابیں اور جوتے اتار کر اس نے اپنے سرد اور سوجے ہوئے پیروں کو دھوپ سے گرم فرش پر جیسے کچھ حدت پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

اماں اس عمر میں بھی پنجوں کے بل بیٹھی لکڑیوں کو توڑ مروڑ کر چولہے میں جھونک رہی تھی۔ آگ میں لکڑیوں کے تڑخنے اور چٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ساگ کی ہانڈی سے اٹھتی بھاپ اور اس میں پڑتے ابال دیکھتی رہی۔

"آدمی کیا کرتا ہے تیرا؟" وہ اماں کے اس اچانک کیے ہوئے سوال پر چونکی پھر بڑبڑائی۔

"کیا کرتا ہے؟" اس نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی پھر کہا۔ "کام کرتا ہے۔"

"کیا کام کرتا ہے؟" ماں نے پھر پوچھا۔

"باہر کام کرتا ہے۔" وہ ساگ کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"پردیس میں ہے؟" بوڑھی عورت نے جواباً" کہا۔ وہ بھی اب اسی کی طرح زمین پر بیٹھ گئی تھی اور اس نے اپنے گھٹنوں کے گرد اسی کی طرح بازو لپیٹ لیے تھے۔

"ہاں پردیس میں ہے۔" وہ اسی طرح ساگ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو تو یہاں کس کے پاس ہے؟ سسرال والوں کے پاس؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"میں کسی کے پاس نہیں ہوں۔" ساگ پر نظریں جمائے اس نے بے ربط جواب دیا۔

"آدمی نے گھر سے نکال دیا ہے کیا؟" اس نے چونک کر اس عورت کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں!"

"پھر تو لڑ کے آئی ہے کیا؟"

"نہیں۔" اس نے بے ساختہ سر ہلایا۔

"تو پھر یہاں کس لیے آئی ہے؟"

"سکون کے لیے۔" اس نے بے اختیار کہا۔

"سکون کہیں نہیں ہے۔" وہ اس عورت کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"توجو چیز دنیا میں ہے ہی نہیں اسے دنیا میں کیا ڈھونڈنا؟" اس نے حیرت سے اس عورت کو دیکھا۔ وہ گہری بات تھی اور اس عورت کے منہ سے سن کر اور بھی گہری لگی تھی اسے۔ جو اس جھگی میں بیٹھی آگ میں لکڑیاں جھونک رہی تھی۔

"پھر بندہ رہے کیوں دنیا میں اگر بے سکون رہنا ہے؟" وہ اس سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہتی تھی جو اس نے پوچھا تھا۔

"تو پھر کہاں رہے؟" لکڑیاں جھونکتی اس عورت نے ایک لحظہ کے لیے رک کر اسے دیکھتے ہوئے ڈائریکٹ پوچھا' وہ کچھ لاجواب ہوتے ہوئے دوبارہ ساگ کو دیکھنے لگی۔

"تیرا آدمی کہتا نہیں واپس آنے کو؟"

"پہلے کہتا تھا۔ اب نہیں کہتا۔" اس نے خود بھی لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے آگ میں پھینکنے شروع کر دیے تھے۔

"بے چارہ اکیلا ہے وہاں؟"

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی۔ "ہاں۔" اس نے اس بار مدھم آواز میں کہا۔

وہ بوڑھی عورت اب پلاسٹک کے ایک شاپر میں پڑا ہوا آٹا ایک تھالی میں ڈال رہی تھی۔

"تو اکیلا چھوڑ کر آ گئی اسے؟" دھوپ میں پڑے ایک گھڑے سے ایک گلاس میں پانی نکالتے ہوئے اماں نے جیسے افسوس کیا تھا۔ وہ بے مقصد آگ میں لکڑیاں پھینکتی رہی۔

"تجھ سے پیار نہیں کرتا تھا؟"

وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی۔

"کرتا تھا۔" اس کی آواز بے حد مدھم تھی۔

"خیال نہیں رکھتا تھا؟" ساگ سے اٹھتی بھاپ اس کی آنکھوں میں اترنے لگی تھی' اسے بڑے عرصے کے بعد پتا نہیں کیا کیا یاد آیا تھا۔

"رکھتا تھا۔" آواز اور بھی مدھم ہو گئی تھی۔

اماں اب اس کے پاس بیٹھی اس تھالی میں دو روٹیوں کا آٹا گوندھ رہی تھی۔

"روٹی کپڑا نہیں دیتا تھا؟" اس نے چادر سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

"دیتا تھا۔" وہ اپنی آواز خود بھی بمشکل سن پائی تھی۔

"تو نے پھر بھی چھوڑ دیا اسے؟ تو نے بھی اللہ سے بندے والا معاملہ کیا اس کے ساتھ۔ سب کچھ لے کر بھی دور ہو گئی اس سے۔"

اماں نے آٹا گوندھتے ہوئے جیسے ہنس کر کہا تھا۔ وہ بول نہیں سکی تھی۔ بولنے کے لیے کچھ تھا نہیں۔ پلکیں جھپکے بغیر وہ صرف اماں کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"تجھے یہ ڈر بھی نہیں لگا کہ کوئی دوسری عورت لے آئے گا وہ؟"

"نہیں۔" اس بار آٹا گوندھتے اماں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"تجھے پیار نہیں ہے اس سے؟" کیا سوال آیا تھا! وہ نظریں چرا گئی۔ اس کی چپ نے اماں کو جیسے ایک اور سوال دیا۔

"کبھی پیار کیا ہے؟" آنکھوں میں سیلاب آیا تھا۔ کیا کیا یاد نہیں آ گیا تھا۔

"کیا تھا۔" اس نے آنسوؤں کو بہنے دیا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" اماں نے اس کے آنسوؤں کو نظر انداز کر دیا تھا۔

"نہیں ملا۔" سر جھکائے اس نے آگ میں کچھ اور لکڑیاں ڈالیں۔
"ملا نہیں یا اس نے چھوڑ دیا؟" اس کے منہ میں جیسے ہری مرچ آئی تھی۔
"اس نے چھوڑ دیا۔" پتا نہیں ساگ ہانڈی میں زیادہ پانی چھوڑ رہا تھا۔ یا اس کی آنکھیں، پر آگ دونوں جگہ تھی۔
"پیار نہیں کرتا ہوگا۔" اماں نے بے ساختہ کہا۔
"پیار کرتا تھا لیکن انتظار نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے پتا نہیں کیوں اس کی طرف سے صفائی دی تھی۔
"جو پیار کرتا ہے وہ انتظار کرتا ہے۔" جواب کھٹاک سے آیا تھا اور اس کی ساری وضاحتوں، دلیلوں کے پرخچے اڑا گیا تھا۔ وہ روتے ہوئے ہنسی تھی، یا پھر شاید ہنستے ہوئے روئی تھی۔ کیا سمجھا دیا تھا اس عورت نے جو دل دماغ کبھی سمجھا نہیں سکے تھے اسے۔
"اس آدمی کی وجہ سے گھر چھوڑ آئی اپنا؟" اماں نے پھر پوچھا۔
"نہیں... بس وہاں بے سکونی تھی مجھے، اس لیے آگئی۔" اس نے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔
"کیا بے سکونی تھی؟" وہ برستی آنکھوں کے ساتھ بتاتی گئی۔
اماں چپ چاپ آٹا گوندھتی رہی اس کے خاموش ہونے پر بھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ خاموشی کا وہ وقفہ بڑا طویل ہو گیا تھا۔ بے حد طویل، اماں آٹا گوندھنے کے بعد رکھ کر ساگ میں ڈوئی چلانے لگی تھی... وہ ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے ساگ کو گھلتے دیکھتی رہی۔
"وہاں نہر کے کنارے کیوں کھڑی تھی؟" اماں نے یک دم ساگ گھوٹتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے سر اٹھا کر اماں کو دیکھا۔
"بہت بزدل ہوں اماں.... مرنے کے لیے نہیں کھڑی تھی۔"
نم آنکھوں کے ساتھ اس نے جیسے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اس بوڑھی عورت سے پوچھا تھا "اسے جیسے اب سمجھ میں آیا تھا وہ وہاں سے اسے یہاں تک کیوں لے آئی تھی۔ اس کے ہنسنے پر جیسے وہ بھی مسکرائی تھی اس کے خستہ حال بوسیدہ دانت دکھے تھے۔
"یعنی تو تو بڑی بہادر ہے۔ میں نے بزدل سمجھا... تُو تو میرے سے بھی بہادر ہے پھر۔"
"نہیں، آپ سے بہادر تو نہیں ہوں میں، میں تو بے حد کمزور ہوں۔ اس بکری سے بھی کمزور جس کو گھیر کے لائی ہوں۔" امامہ نے کہا تھا۔
"تجھے اپنی ہونے والی اولاد کا بھی خیال نہیں آتا؟ پیار نہیں آتا اس پر؟" اس کی آنکھیں ایک بار پھر برسنے لگی تھیں۔
"کوئی اس طرح گھر، آدمی چھوڑتا ہے جیسے تُو چھوڑ آئی۔ مرجاتے ہیں بڑے بڑے پیارے مرجاتے ہیں، پر کوئی ایک پیارے کے مرنے پر باقیوں کو چھوڑ دیتا ہے؟"
برستی آنکھوں کے ساتھ امامہ نے اس کی باتیں سنیں، وہ وہی کچھ کہہ رہی تھی جو اس سے کوئی بھی پوچھتا کوئی بھی کہہ دیتا مگر وہ کسی کو وہ جواب نہیں دیتی تھی جو اس نے اس وقت اس عورت کو دیا تھا جس سے اس کی جان پہچان تک نہ تھی۔ بعض دفعہ انسان دل کا وہ بوجھ جو اپنوں کے سامنے ہلکا نہیں کرتا غیروں کے سامنے کر دیتا ہے۔ وہ بھی وہاں جہاں اسے یقین ہو وہ راز دبا رہے گا۔ کبھی نکل کر نہیں آئے گا۔
"میں اب کسی سے پیار نہیں کرنا چاہتی اماں۔"
بوڑھی عورت نے ساگ کا ڈھکنا اٹھا کر پھر ڈوئی چلائی۔
"مجھے لگتا ہے۔ جس سے بھی میں پیار کرتی ہوں، وہ مجھ سے چھن جاتا ہے... وہ چیز میرے پاس نہیں رہتی۔ تو پھر

یوں اس تکلیف سے گزروں اس بار بار کیوں میں زندگی میں اپنے رکھے رکھوں۔ ان کے بچھڑنا نے اتنی تکلیف دے۔"

اس نے جیسے روتے ہوئے اس بوڑھی عورت کے سامنے سینے کی وہ پھانس نکالی تھی جس نے اس کا سانس روک رکھا تھا۔

"بار بار پیار کروں... بار بار گنوادوں... میں اب اس تکلیف سے نہیں گزر سکتی۔"

وہ روتی جارہی تھی۔ آنسو یوں نکل رہے تھے جیسے آبلوں کا پانی پتا نہیں بوڑھی عورت کی آنکھوں میں ساگ کی بھاپ نے پانی چھوڑا تھا یا اس کے درد نے لیکن اس نے بھی اپنی خستہ حال میلی کچیلی چادر کے پلو سے اپنی آنکھیں رگڑنا شروع کردی تھیں۔

"یہ تو نہیں کرسکتی' یہ کوئی انسان بھی نہیں کرسکتا کہ اپنوں کو اس لیے چھوڑدے تاکہ ان کے بچھڑنے کی تکلیف سے بچ جائے ایک ایک کرکے بچھڑ رہے ہیں تو درد جھیل نہیں پارہی۔ سب کو اکٹھا چھوڑ کر درد جھیل لے گی؟" اس نے جو بات اس سے پوچھی تھی اس کا جواب امامہ کے پاس نہیں تھا... اور اگر تھا بھی تو وہ اس جواب کو دہرانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

"اس جھگی کے اندر میرا 38 سال کا جوان بیٹا ہے... ٹھہرو ذرا میں لے کر آتی ہوں اسے' تمہاری باتوں میں تو بھول ہی گئی تھی میں اسے..."

وہ بوڑھی عورت یک دم اٹھ کر اندر چلی گئی تھی چند منٹوں کے بعد وہ ایک ریڑھی نما ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی باہر لائی جس میں ایک دبلا پتلا مرد ایک بستر پر لیٹا ہوا قہقہے لگا رہا تھا یوں جیسے وہ ماں کی توجہ ملنے پر خوش تھا۔ اس عورت نے اگر اسے یہ نہ بتایا ہوتا کہ اس کی عمر 38 سال تھی تو امامہ اسے 20-18 سال کا کوئی لڑکا سمجھتی... وہ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے معذور تھا۔ بات بھی ٹھیک سے نہیں کرپاتا تھا بس اس بوڑھی عورت کو دیکھ کر ہنستا تھا اور وہ اسے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

اس نے ریڑھی لاکر امامہ کے قریب کھڑی کردی تھی اور خود روٹی پکانے بیٹھ گئی تھی۔

"میرا اکلوتا بیٹا ہے یہ... 38 سال میں نے اس کے سہارے گزارے ہیں اللہ کے سہارے کے بعد۔" وہ پیڑا بناتے ہوئے اسے بتانے لگی تھی۔ "کوئی اور اولاد نہیں آپ کی؟" اس کے آنسو تھمنے لگے تھے۔

"پانچ بیٹے پیدا ہوئے تھے سب صحت مند... پر دنوں میں ختم ہوگئے پھر یہ پیدا ہوا تو شوہر نے کہا اسے کسی درگاہ پر چھوڑ آتے ہیں میں نہیں پال سکتا ایسی اولاد کو... بڑی ذمہ داری ہے پر میں کیسے چھوڑ دیتی اپنی اولاد... مجھے تو پیار ہی بڑا تھا اس سے۔"

بوڑھی عورت نے روٹی اب اس توے پر ڈال دی تھی جس سے کچھ دیر پہلے اس نے ساگ کی ہنڈیا اتاری تھی۔ وہ اب اپنے بیٹے کو یوں پچکار رہی تھی جیسے وہ اڑتیس سال کا نہیں آٹھ ماہ کا تھا اور وہ بھی اس ریڑھی کے اندر ماں کے پچکارنے پر اپنے نحیف' نزار اعضا کو اسی طرح سکیڑ رہا تھا کھلکھلاتے ہوئے جیسے واقعی کوئی ننھا بچہ تھا۔

"شوہر دو چار سال سمجھاتا رہا مجھے پر میں نہیں مانی۔ اللہ نے دی تھی اولاد... اللہ کی دی چیز کیسے پھینک آتی۔ انسان کی دی ہوئی چیز ہوتی تو پھینک آتی۔ کوئی اور بچہ نہیں ہوا اس کے بعد میرے ہاں۔ شوہر کو بڑا پیار تھا مجھ سے پر اسے اولاد بھی چاہیے تھی۔ میرا بھی دل چاہتا تھا خود ہی نکل آؤں اس کی زندگی سے۔ پر میرے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اس لیے وہیں بیٹھی رہی' دوسری شادی سے دس دن پہلے کھیتوں میں اسے سانپ لڑ گیا۔ لوگ کہتے تھے میری آہ پڑی ہے۔ پر میں نے تو کوئی بددعا بھی نہیں دی اس کو۔ میں تو خوش ہی رہی جب تک اس کے ساتھ رہی۔"

اماں کی آنکھوں میں پانی آیا تھا پر وہ دوپٹے سے رگڑ کر... توے پر پھولتی ہوئی روٹی سینکنے لگی۔

"وہ مر گیا تو ساری زمین جائیداد رشتہ داروں نے چھین لی۔ بس بیٹا میرے پاس رہنے دیا۔ یہ ٹھیک ہوتا تو یہ بھی چھین لیتے وہ۔ پر مولا کا کرم تھا یہ ایسا تھا۔ اڑتیس سال سے اس کا اور میرا ساتھ ہے اس کو شوہر کے کہنے پر درگاہ پر چھوڑ آئی ہوتی تو میرا کیا ہوتا۔"

اماں نے روٹی عجیب خوشی اور سرشاری کے عالم میں اس کے سامنے رکھی تھی۔ کوئی بوجھ تھا جو امامہ کے کندھوں سے ہٹ رہا تھا کوئی قفل تھا جو کھل رہا تھا کوئی سحر تھا جو ٹوٹ رہا تھا۔

"جو وہ چھوڑا اللہ دے اس پر صبر کر اور خود کسی کو وہ چھوڑا نہ دے۔ اللہ پسند نہیں کرتا یہ۔"

اس عورت نے روٹی پر ساگ ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"غم بہت بڑا تھا میرا اماں۔" اس نے کہے بغیر سر جھکائے پہلا لقمہ توڑا۔

"اللہ نے تجھے غم دیا تو نے اپنے آدمی کو۔ تو نے اپنا غم کون سا اپنے اندر رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔"

وہ لقمہ ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی، منہ میں نہیں ڈال سکی، آنکھیں پھر دھندلائی تھیں۔ اسے سالار یاد آیا تھا۔ ہاتھ پر اس کا محبت بھرا لمس یاد آیا تھا۔ اسکی محبت اس کی عنایات یاد آئی تھیں۔ اور اس اولاد کا خیال آیا تھا جسے اس نے بھی بڑی دعائیں کر کر کے مانگا تھا اور جب دعا پوری ہو گئی تھی تو وہ کسی بھی چیز کی قدر نہیں کر رہی تھی۔

اس بوڑھی عورت کے احاطے میں بیٹھے اسے پہلی بار وسیم پر صبر آیا تھا۔ سعد پر صبر آیا تھا وہ اس دن وہاں سے اٹھ کر بھاگی تھی۔ اسے اب گھر جانا تھا سالار کے پاس اور واپس گھر آ کر اس نے خود سالار کو فون کر کے واپس آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ حیران ہوا تھا شاید حیران سے زیادہ پریشان ہوا تھا مگر اس نے اس کی ٹکٹ کنفرم کروا دی تھی۔

وہ جانے سے پہلے ایک بار پھر اس بوڑھی عورت سے ملنے آئی تھی اس کے لیے کچھ چیزیں لے کر اسے بے حد کوشش کے باوجود وہ جھگی نہیں ملی تھی۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ آدھا دن نہر کے اس کنارے اس جھگیوں والے علاقے کو ڈھونڈتی رہی تھی۔ ڈرائیور نے وہ علاقہ خود نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ اس دن وہ اسے بہت پیچھے چھوڑ کے نہر کنارے اتری تھی اور پھر وہاں سے پیدل ہی واپس آئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ جگہ وہیں ہونی چاہیے تھی۔ اسی سڑک پر کہیں۔ مگر وہاں وہ جھگیاں نہیں تھیں نہ وہ بوڑھی عورت۔ جس کے ہاتھ کی روٹی اور ساگ کا سواد اسے ابھی بھی اپنی زبان پر محسوس ہوتا تھا۔ نہ وہ اڑتیس سال کی اولاد کی مشقت۔ جس نے اس بوڑھی عورت کے لیے ہر بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔ اور نہ اس بہت زیادہ پڑھی لکھی عورت کی باتیں۔ جس نے چابیوں کی طرح اس کے وجود کے قفل اور گتھیاں کھول کر اسے آزاد کیا تھا۔

جبریل سکندر اپنی پیدائش سے بھی پہلے اپنی ماں کے، بہت سے رازوں کا امین تھا۔

امریکہ کے اس اسپتال کی نیورو سرجری ڈیپارٹمنٹ کے آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر جس شخص کا دماغ کھولے بیٹھے تھے۔ وہ آبادی کے اس 2.5 فیصد سے تعلق رکھتا جو 150 آئی کیو لیول رکھتے تھے اور اس آئی کیو لیول کے ساتھ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

وہ آپریشن آٹھ گھنٹے سے ہو رہا تھا اور ابھی مزید کتنی دیر جاری رہنا تھا یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ ڈاکٹرز کی اس ٹیم کو لیڈ کرنے والا ڈاکٹر دنیا کے قابل ترین سرجن میں سے ایک مانا جاتا تھا۔ آپریشن تھیٹر سے منسلک ایک

کلاس روم میں نیورو سرجری کے ایڈ پرنٹس اس وقت جیسے سحر زدہ معمول کی طرح اس ڈاکٹر کے چلتے ہوئے ہاتھوں کو بڑی اسکرین پر دیکھ رہے تھے جو اس کھلے ہوئے دماغ پر یوں کام کر رہا تھا جیسے کوئی پیانسٹ کی انگلیاں ایک پیانو پر، وہ اپنی مہارت سے سب کو مسحور کیے ہوئے تھا سوائے اس ایک شخص کے جس کی زندگی اور موت اس وقت اس کے ہاتھ میں تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں ان شاء اللہ)

آسیہ رزاقی



مجھے اس کی باتیں عجیب لگتی تھیں۔ بہت گہری اور الجھی ہوئی۔ سمجھنے کے لیے ذہن پر زور دینا پڑتا تھا۔ بہت قابل سمجھتی تھی خود کو' ہر کسی پر اپنی قابلیت کا رعب ڈالتی تھی۔ معلومات کافی وسیع تھیں۔ کس شہر کی کیا چیز مشہور ہے۔ کس صوبے کی کیا تاریخ اور کیسی معاشرت اور رسوم ہیں۔ بلکہ ایشیا خصوصاً" اسلامی ممالک کی تاریخ بھی ازبر تھی۔

افوہ.... میں تو اس سے متاثر ہو گیا۔ کیونکہ تاریخ سے مجھے دلچسپی نہ تھی اور ماموں خود بھی تاریخ کے رسیا۔ انہوں نے بیٹی کو بھی گھٹی میں دنیا کی تاریخ گھول کر پلا دی تھی۔ میں اس سے مرعوب ہو گیا۔ خود کو اس سے کمتر سمجھنے لگا۔ کافی عرصہ میں ماموں کے گھر نہیں گیا تھا۔ امی چاہتی تھیں۔ میں ماموں سے رابطہ' تعلق رکھوں۔ عمران کی قابل لائق بیٹی۔ جسے اکلوتا ہونے کا شرف حاصل تھا۔ یعنی اکلوتی واحد اولاد۔ افوہ! ہیرے موتی جڑی۔ چڑچڑی ہو گئی اس کی قابلیت سے۔

پھر عرصہ بعد ممانی کی وفات پر امی کے ساتھ جانا پڑا۔

ماموں بے حد افسردہ تھے۔ بہت اچھی منتظم محبت کرنے والی بیگم تھیں۔ سمال بھی بہت بکھری بکھری اداس غمزدہ تھی۔ چہرہ آنسوؤں میں بھیگا بھیگا رہتا۔ لال آنکھیں' ہونٹ بسورنے کو ہر دم تیار۔ امی نے اسے اپنی شفیق بانہوں میں لے کر پیار کیا۔ اس کے ساتھ روئیں۔ سمجھاتی رہیں۔ انہیں اس پر بہت پیار آرہا تھا۔

وہ خاصی چڑچڑی اور بدلحاظ ہو گئی تھی۔ ہر بات کا الٹا جواب دے کر سوال کرنے والے کو شرمندہ کر دیتی۔ مگر امی اسے فوراً" دلاسا دے کر بہلا لیتیں۔ مجھے اس کی حرکتیں بری لگ رہی تھیں۔ امی میری ناگواری دیکھ کر چپکے سے کہتیں۔

"بے ماں کی ہو گئی ہے۔ اس لیے اپنا دکھ ظاہر کرتی ہے۔ کوئی بھائی بہن بھی نہیں جو اسے تسلی دیں۔"

"آپ آتو گئی ہیں تسلی دینے۔ کیا یہ کافی نہیں؟ اور بہن بھائی کے نہ ہونے یا ماں کی فوتگی اللہ کی رضا سے ہے۔ دوسروں کو شرمندہ کرنے کا اسے کیا حق ہے۔"

اس دن امی نے اس سے کہا۔ "تمہاری ماں بہت سلیقہ مند اور منتظم خاتون تھیں۔ دیکھو گھر کیسا لش لش کر رہا ہے۔ سجا بنا۔ بس جو چیز جہاں ہے۔ اسے اسی طرح سے رکھنا۔ تاکہ تمہارے باپ کو کسی کمی کا احساس نہ ہو۔ پہلے ہی وہ غم زدہ ہے۔"

"یعنی۔ ابو امی کو فوراً" بھول جائیں۔ یہ چاہتی ہیں آپ۔" وہ بگڑ کر بولی۔ آنکھیں مزید لال۔

"وہ بھولنے والی ہستی نہیں تھی بیٹا۔ میرا مطلب ہے۔ احد کو گھر اسی طرح نظر آئے۔ جیسے روحانہ کی زندگی میں تھا۔ احد یہی محسوس کرے کہ وہ یہیں ہے۔ جدا نہیں ہوئی۔ اس کی سجائی ہوئی چیزیں اپنی جگہ موجود ہیں۔ جہاں اس نے جو چیز رکھی ہے وہیں ہے۔ احد کو اس سے تسلی ہو گی۔"

"لیکن میں تو چاہتی ہوں ہر چیز گڑبڑ ہو جائے۔" وہ کچھ سوچ کر بولی "تاکہ ابو کو امی کی کمی محسوس ہوتی


مکمل ناول

رہے۔ وہ ایک منٹ کو بھی امی کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ اگر سب کچھ پہلے جیسا رہا تو تو رہی نہیں ہوگی امی کی۔" (جھلی نہ ہو تو فضول لڑکی)

امی چپ ہو گئیں۔ مگر وقتاً" فوقتاً" سمجھانے میں کمی نہ کی۔ سخت زہر لگتی تھی مجھے اس کی فضول گوئی اور فضول حرکتیں۔ ماموں کی موجودگی میں کوئی برتن اس کے ہاتھ گر جاتا۔ چھناکے کے ساتھ اس کی ہائے ہائے۔ کبھی میز پر رکھی فروٹ کی پلیٹ نیچے جا پڑی۔ خود ہی گرا کے خود ہی واویلا کرتی۔ اچھی بھلی چائے کی پیالی میز پر الٹ جاتی۔ چائے میز پر پھیل جاتی اور یہ چوروں جیسی شکل بنائے انگلیاں مروڑ رہی ہوتی۔ امی اور ماموں کی تسلیاں۔ اف! ابھی غم سے لبریز آواز کو مزید موٹی کر کے کہتی۔

"ہائے... اف... امی کو یہ واٹر سیٹ کتنا پسند تھا۔ گلاس میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔ اللہ جی... امی ہوتیں تو ابھی مجھ کو تھپڑ مارتیں اور کہتیں۔ لڑکی کے ہاتھ میں سوراخ ہیں کیا۔ ہائے امی... کل پلیٹ بھی میرے ہاتھ سے پھسل کر گر گئی۔ سچ امی مجھے بہت ڈانٹتیں۔ اب بھلا کون ہے، جو مجھے ڈانٹے مارے۔ میں تو مر ہی جاتی تو اچھا ہوتا۔"

ماموں فوراً" اٹھ کر اسے گلے لگاتے پیار کرتے۔ یا باتیں کرتے کرتے اٹھ کر باہر چلے جاتے۔ مجھے اس کی بناوٹی ایکٹنگ پر غصہ آتا تھا۔ مکار لڑکی۔ امی نے اس کے اسکول جانے کے بعد ماموں سے بات کی۔ کہ اب کس طرح گھر چلاؤ گے۔ لڑکی تو گھر سنبھالنے کے قابل نہیں۔ سوچتی ہوں۔ میں رہ جاؤں۔ کچھ دن اسے سنبھلنے میں لگیں گے۔ میری وجہ سے اسے اپنی تنہائی کا احساس نہ ہو گا... نوکروں کو بھی سمجھانا ہے۔ تم کیسے نپٹو گے۔ ان معاملات سے۔ مگر ماموں نے انہیں اطمینان دلا دیا۔

"آپا! آپ کب تک اپنا گھر بار چھوڑ کر رہ سکتی ہیں نوکروں کو سمجھا دیں۔ ویسے تو سب پرانے ہی ہیں۔ بوا موجود ہیں۔ سماں کی دیکھ بھال کر لیں گی۔ اب وہ بڑی ہو رہی ہے۔ سمجھ دار ہے۔ میں بھی دیکھ بھال کر لوں گا۔"

"سماں سمجھ دار ہے؟" مجھے ہنسی آگئی۔ جھلی ڈرامہ باز۔ ہم واپس آگئے اور کافی عرصہ میں تو پنڈی گیا ہی نہیں۔ کبھی کبھار امی ابا چلے جاتے۔ میں نے پوچھا بھی نہیں کہ ماموں کی بیٹی نے اب اور کون سا بہروپ اختیار کیا۔



پھر کافی دن امی بھی نہیں جا سکیں۔ اور ایک دن خبر آئی۔ ماموں نے شادی کر لی۔ جس نے سنا حیرت ظاہر کی۔ یعنی مرحومہ بیوی کی یادوں کو دماغ سے نکال دیا۔ شاید دل سے بھی... اور اب۔ وہ پگلو... جھلی لڑکی کس طرح باپ کو ماں کی محبت کا احساس دلاتی ہو گی۔ امی بہت پریشان تھیں۔ انہیں شکوہ تھا کہ نہ بھائی نے اطلاع دی نہ بھتیجی نے۔ کس سے شادی ہوئی۔ کون ہے؟ کیا ہے؟ اتنی رازداری!!

ابا کی بیماری، اس کے بعد یک بیک فوتگی کی وجہ سے امی جا سکیں نہ میں۔ ماموں کو فون کیا۔ تو وہ مری بھوربن کی سیر کو چلے گئے تھے۔ ہیں؟ ہنی مون۔ بڈھے منہ مہاسے۔ لوگ چلے تماشے... ارررے۔ ہنسی آنے لگی۔ وہ جھلی لڑکی موجود تھی بمع اپنی نستعلیق بوا کے۔ بوا ہی لقمے دیتی رہیں۔

"کہہ دو گئے ہیں کہیں کام سے۔ ارے بھئی ہمیں کیا علم کس سے شادی کی... کہہ دو ایک ہفتہ بعد فون کریں اور ہاں بتا دو... کہ تم پڑھائی میں مصروف ہو۔ فون سننے کی فرصت نہیں۔"

بوا بولتی رہیں، وہ دہراتی رہی۔ اس کے علاوہ۔ اوں۔ آں کے گونگے اشارے توبہ۔ امی نے خود بوا سے بات کی ہو تو پتا نہیں پھر۔ وقت تھوڑا اور گزرا۔ اجو بھیا کا ٹرانسفر پشاور ہو گیا۔ وہ بھابھی کو لے کر چلے گئے۔

امی کو اب بے چینی شروع ہو گئی۔ ایک تو ماموں نے ابا کے انتقال کے بعد بھی یہاں آنے کی زحمت نہ کی تھی۔ مری سے آکر فون کر لیا اور کوئی مجبوری بیان کر دی۔ فون تو کئی بار آئے مگر بیگم کے سوال پر کچھ

ہچکچاتے رہے بتایا نہیں کہ کس پری چہرہ کو ان کی بیگم بننے کا شرف نصیب ہوا ہے۔

امی مجھے لے کر پنڈی پہنچیں۔ ماموں گیٹ پر ہی مل گئے۔ بہت فٹ فاٹ۔ چاق و چوبند۔ اندر ممانی سے تعارف ہوا۔ نئی ممانی۔ خاصی مایوسی ہوئی۔ کافی عمر کی کچھ زیادہ ہی صحت مند۔ سانولی اور۔۔۔ بھدی رومانہ مامی کے برعکس خیر مجھے کیا۔

امی کا موڈ خراب تھا۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ کچھ عام سے روایتی جملوں کے بعد انہوں نے یعنی ممانی نے با آواز بلند پکارا۔

"سما۔ او سماں۔ ارے بھئی تمہاری پھوپھی آئی ہیں۔ کچھ چائے پانی بھی لے آؤ۔ ذرا جلدی۔"

پھر امی سے مخاطب ہوئیں "آپا! پتا نہیں کس قسم کی لڑکی ہے۔ میں مہینوں سے اس کی تربیت کر رہی ہوں۔ مگر پتا نہیں کیا مزاج لائی ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں۔ نہ جانے کن خیالوں میں گم رہتی ہے۔ آپا! آپ ہی سمجھائیں۔ گھر میں گھر کی لڑکی کی طرح رہنا سیکھے مہمان نہ بنی رہے۔"

منہ بگاڑ کر بڑی بے تکلفی سے کہہ رہی تھیں۔ نہ جانے گھر کی لڑکی سے کیا مراد تھی؟

چند منٹ بعد وہ مہمان لڑکی اندر آئی اور امی سے لپٹ گئی۔ امی نے اسے پاس بٹھا لیا۔ بجھی بجھی سی تھی۔ سر نیچا کیے امی سے کچھ کہہ رہی تھی۔ کہ نئی اماں جان نے اپنی کراری کڑکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"لو' آ گئیں اور جو میں نے کہا تھا کہ کچھ چائے پانی لے آؤ۔ اس کا ذکر ہی نہیں۔ لڑکی! میری کوئی بات کبھی تو مان لیا کرو۔"

وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ تو امی نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ اور ترشی سے بولیں۔

"رہنے دو ہمیں چائے پینے نہیں۔ کئی دن رہنے کے لیے آئی ہوں۔ جب۔ جس چیز کا دل چاہے گا۔ مانگ لوں گی۔ مہمان نہیں ہوں۔ تم بیٹھو میرے پاس۔ ہاں' اب کس کالج میں ہو؟"

نئی اماں کی بولتی بند کرا کے اب پھپھی بھتیجی راز و نیاز میں مصروف ہو گئیں۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ کئی دن رہنے کا کہہ کر ممانی کو پریشان ضرور کر دیا تھا۔ میں نے اپنے بیگ گیسٹ روم میں رکھے ماموں کو بتا کر گھر سے نکلا ادھر ادھر مٹر گشت کے بعد گھر آیا تو کھانا لگ رہا تھا۔

مومانی نے ماموں کو بلایا۔ ہم سب کھانے کے لیے کمرے میں آئے۔ ہم بیٹھ گئے تو سماں گرم گرم روٹیاں لے کر آئی۔ امی نے پیار سے کہا۔

"آؤ سماں۔ روٹی خانساماں لے آئے گا۔ تم کھانا کھاؤ۔"

اس نے گردن جھکا کر کچھ من من کی۔ ممانی نے کر ختگی سے ترجمانی کی۔

"آپا! اسے گرم روٹی لانے دیں۔ یہ بعد میں کھا لے گی۔" امی کی تیوری پر بل آ گئے۔

"کیوں یہ روٹی کیوں لا رہی ہے؟ خانساماں لے آئے گا۔ کیا یہ نوکر ہے کہ بعد میں کھا لے گی۔ اور یہ بوا کدھر ہیں۔ نظر نہیں آ رہیں۔ کب سے آئی بیٹھی ہوں۔"

"وہ۔۔۔ آپا بہت ضعیف ہو گئی تھیں تو اس لیے ہم

نے انہیں فارغ کر دیا۔"

ماموں نے کچھ خجالت سے کہا تو امی جیسے چونک گئیں۔ ہاتھ میں لیا ہوا چمچہ میز پر رکھ دیا۔

"کیوں بھئی اتنی پرانی۔ سماں کے پیدا ہونے سے پہلے کی آئی ہوئی۔ روحانہ کی کس قدر خدمت اس نے کی۔ اس خدمت کا سماں کو پالنے کا یہ صلہ دیا اسے؟ ارے اس بوڑھی کو دو روٹیاں نہیں کھلا سکتے تھے تم؟"

امی نے ایک ہاتھ سے سر تھام لیا تھا۔

"یہ اس وفادار شریف' وضع دار اور اعلا ظرف عورت کو انعام دیا گیا۔ ساری جوانی جس نے تمہارے دروازے پر گزار دی۔ روحانہ کے بعد گھر کا انتظام سنبھالے رکھا۔ کوئی طلب نہ تقاضا خوددار اتنی کہ اپنے دکھ' بیماری میں خود علاج کرتی۔ اپنی تنخواہ سے کپڑے بناتی ہر ضرورت خود پوری کی۔ کبھی تم سے سہولت نہیں مانگی۔ احد! اتنے کم ظرف اور خسیس کب سے ہو گئے تم۔ شادی کیا کرلی۔ اپنی فطرت ہی بدل لی اچھا اور وہ خانساماں بھی کیا بوڑھا ہو گیا تھا۔ کدھر ہے؟"

"وہ... آپا! یہ سماں روٹی بنانا سیکھ رہی ہے تو سوچا اچھا ہے سیکھ لے۔"

"تمہارے گھرانے کی تو کوئی لڑکی۔ خانساماں مردوٹے سے روٹی بنانا نہیں سیکھتی۔ تم نے نیا قانون بنا لیا۔ خود بناتیں تو وہ سیکھ لیتی۔"

"نہیں آپا۔ خانساماں نہیں۔ عورت ہے۔ اس کے ہاتھ کی روٹی آپ کے بھائی کو پسند نہیں۔ اس لیے سماں نے کہا... کہ وہ روٹی پکالے گی۔"

ممانی چڑ چڑ ناگوار انداز میں بوٹی چباتے ہوئے کہنے لگیں۔ امی کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے کھانا شروع ہی نہیں کیا تھا۔ ماموں بھی پلیٹ پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ ممانی مگر سماں کی لائی ہوئی دو عدد گرم روٹیاں کھا چکی تھیں۔ اب بوٹی اور ہڈی سے نبرد آزما تھیں۔

"اچھا۔ میں دیکھتی ہوں۔" امی نے کہا اور کرسی کھسکائی۔ ماموں نے اشارہ کیا۔ ممانی نے امی سے کہا۔

"ارے' ارے آپا' آپ کہاں چلیں۔ کھانا تو کھائیں۔ گرم روٹی۔"

"میں سمی کے ساتھ کھالوں گی بعد میں تم کھاؤ۔" کہہ کر وہ باہر نکل گئیں۔

میں نے ماموں کے اشارے پر سالن نکالا اور کھانا شروع کر دیا۔ امی دو روٹیاں لے کر آئیں۔ میز پر رکھ کر جانے لگیں۔ ممانی نے کہا۔

"آپا! وہ گھر کی لڑکی ہے۔ اسے کرنے دیں۔ آپ کیوں تھک رہی ہیں۔ آپ سفر کر کے آئی ہیں۔ مہمان ہیں۔ بڑی بہن۔"

"میں کہہ چکی ہوں۔ میں مہمان نہیں ہوں۔ میں روٹی پکا رہی ہوں۔ تم لوگ کھاؤ۔ ویسے بھی تم نے ابھی کہا تھا کہ سماں... مہمان بنی رہتی ہے۔ یہی کہا تھا ناں تم نے تو مہمان سے روٹی پکوانے کا شاید تمہارے گھرانے کا رواج ہو گا۔"

اسی وقت سماں روٹی لے کر آئی۔ امی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چلو بیٹھو۔ اب تم میرا ساتھ دو۔ گوہر کھا چکی ہے۔ باقی روٹیاں وہ پکالے گی۔" ماموں نے امی کو بتایا۔

"آپا! آپ کو بہت فکر تھی سماں کی۔ اب اس نے سب کچھ سیکھ لیا ہے۔ کھانا پکانا اور سلائی وغیرہ۔"

فخریہ انداز تھا۔ امی نے چڑ کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"اچھا! اسے اسی لیے کالج سے اٹھا لیا' پڑھائی ختم کر دی کہ یہ نوکروں والے کام کرے۔"

ماموں کسمسا کر بولے۔ "آپا! اپنے گھر کے کام کر کے کوئی نوکر بن جاتا ہے؟"

"جن کے ماں باپ باحیثیت ہوں اور ان کی اولاد ذہین اور پڑھنے کی شوقین ہو۔ ان کی تعلیم بہ جبر ختم کروا کے۔ خانساماں کو ہٹا کے' پرانے نوکروں کی چھانٹی کر کے... خرچ تو بچا لیا۔ بچی کو کچن کے حوالے کر دیا۔ کتنی بچت ہوئی ہو گی احد! بہت کفایت شعار ہو گئے ہو۔ اب اور کتنی بچت کی اسکیم ہے۔؟" سماں کا سر نیچے جھکتا چلا گیا۔

"بچت؟ آپا۔ بچت کیسی؟ سماں میری بیٹی ہے۔ اس پر جبر کیوں کروں گا میں۔ اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ

ہو گیا تھا۔ بس۔" ماموں اندر ہی اندر تلملا رہے ہوں گے۔

"اگر بیٹی سمجھتے تو اس سے ایک بار پوچھ لیتے' وہ پڑھنا چاہتی ہے یا گھر بیٹھنا۔ اگر اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا تو ٹیوشن رکھ کر زبردستی پڑھاتے۔ آج کل تو لڑکیوں کی تعلیم پر بہت توجہ دی جاتی ہے سماں کی تو ماں بھی ایم اے پاس تھی۔ جب گوہر کے ذمے بچی کی تربیت ہو گی۔ تو جو اس نے خود کیا ہے زندگی بھر وہی تو اسے سکھائے گی۔ ظاہر ہے کچن سنبھالنا۔ روٹیاں تھوپنا برتن دھونا۔"

ممانی روٹیاں لے آئی تھیں اور انہوں نے سب سن لیا تھا۔ مگر امی... دیکھ نہ سکیں۔ ممانی کے چہرے پر سیاہی دوڑ گئی تھی۔ چہرہ ناگواری کا غماز تھا۔ مگر کہا تو یہ۔

"آپا! یہ مٹر قیمہ تو چکھیں۔ میں نے خود بنایا ہے۔ کھائیے نا۔ آپ کچھ لے نہیں رہیں۔"

"لوں گی۔ ہاں ہاں لے لوں گی تمہارے ہاتھ کا پہلی بار تو نہیں کھا رہی۔ روحانہ کی زندگی میں دسیوں بار تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھایا ہے۔ نئی کون سی بات ہے۔ غلط تو نہیں کہا کچھ؟"

امی کی فطرت تو ایسی نہ تھی پتا نہیں ممانی سے کس بات کا بدلہ لے رہی تھیں۔ سماں سے تو کھایا ہی نہیں جا رہا تھا۔ امی نے اس کی پلیٹ میں قیمہ ڈالا۔

"کھاؤ بیٹا۔ گرم روٹی لو۔ قیمہ کھاؤ۔ کھانا تو ہمیشہ گوہر اچھا پکاتی تھی۔ روحانہ کو بھی پسند تھا۔ تب ہی..."

چپ ہو گئیں۔

خود کو مزید کچھ کہنے سے روک لیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر امی نے ماموں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اچھا میں کل سماں کو لے کر کالج جاؤں گی۔ مس پروین سے بات کرتی ہوں۔ اپنی تعلیم مکمل کرو بیٹا۔"

اب سماں سے مخاطب ہوئیں۔

"کیا' میں... پھپھو اب کیا ضرورت ہے۔" وہ منمنا رہی تھی۔

"تمہیں ضرورت نہ ہو گی۔ ہمیں تو ہے۔ میں تمہیں خاندان کی دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں جاہل دیکھنا پسند نہیں کروں گی۔ تمہیں احساس ہے کہ اب مقابلے کا دور ہے۔ تعلیم ہی انسان کو عروج پر پہنچاتی ہے۔ تعلیم ہی زندگی کے مقاصد سے آگہی دیتی ہے۔ تعلیم ہی ہے جو آدمی کو انسان بناتی ہے۔ تمہارے باپ کو تو جاہلوں کی صحبت نے بے حس بنا دیا ہے۔ ورنہ اس سے زیادہ تو تعلیم کا حامی کوئی نہیں تھا۔ بھلا بتاؤ! جس کی ماں ایم اے گولڈ میڈلسٹ ہو۔ اس کی بیٹی جاہل رہے۔ ستم ہے کہ نہیں؟ آج کل لوگ خاندان اور تعلیم کو اہمیت دیتے ہیں۔ تم تو ہمیشہ ہر کلاس میں فرسٹ آتی تھیں۔ اسپورٹس میں' تقریری مقابلوں میں میڈل ملتے تھے۔ اب کیا ہو گیا۔ یا تم پر بھی جاہل صحبت نے اثر ڈال دیا ہے۔ اپنی عمر کے بچوں میں سب سے زیادہ قابل تھیں تم۔"

امی کی تقریر تو ابھی جاری تھی۔ ماموں اٹھ کر چلے گئے۔ سماں بھی سٹپٹائی ہوئی سی لگی۔ ممانی کے ہاتھوں کی لرزش معاملے کی سنگینی کی خبر دے رہی تھی۔ ان کے چہرے پر مزید سیاہی پھیل گئی تھی۔ مگر وہ میں دیکھ سکتا تھا۔ امی نہیں' جوش خطابت اور بھتیجی کی محبت میں انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے امی کے یہ مکالمے ڈائیلاگ ان کا رویہ پسند نہیں آیا۔ بھئی ٹھیک ہے۔ بھتیجی کے مسائل سے آگہی ہے مگر دوسروں کو طنز کا شکار بنانا۔ کمرے میں آئیں تو میں نے برملا ناگواری کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا۔

"تم کو کچھ علم نہیں۔ تم مت بولنا۔ میں اس بچی کی بھلائی کے لیے جو کچھ ہو سکا۔ کروں گی۔ ضرورت پڑی۔ تو احد کی پٹائی بھی کر دوں گی۔ ہاں ہاں۔" بچپن سے ہی مجھ سے پٹتا آ رہا ہے۔ اب بڑھاپے میں کیا چھوڑ دوں گی... بے وقوف۔"

مجھے ہنسی آئی تو امی بھی ہنس دیں۔ "امی! ماموں بے وقوف نہیں۔ سیدھے ہیں۔"

"ہاں سیدھے ہیں۔ بلکہ ایسے عقل سے پیدل کہ کوئی بھی الو بنا دیتا ہے۔ اب اسے بھی ٹھیک کروں گی۔"

امی کے ارادے خاصے خطرناک تھے۔



سماں کی امی۔ روحانہ امی کی بچپن کی دوست کلاس فیلو اور اتفاق سے پڑوسن بھی تھیں۔ دونوں میں دوستی محبت بہت تھی۔ پھر ماموں سے ان کی شادی بھی ہو گئی۔ تعلق مزید گہرا ہو گیا۔

امی بتاتی تھیں کہ وہ بچپن میں بہت بیمار ہو گئی تھیں۔ اسکول چھوٹ گیا۔ پڑھائی سے دل اچٹ گیا۔ روحانہ نے انہیں اکسایا اور زبردستی پڑھائی پر راضی کیا۔ پھر وہ دونوں ایک کلاس میں داخل ہوئیں۔ امی ان سے عمر میں بڑی تھیں۔ مگر روحانہ ممانی عقل میں ان سے زیادہ تھیں۔ اور تعلیم کی افادیت پر یقین رکھتی تھیں۔

امی کی شادی ہو گئی۔ وہ پڑھتی رہیں۔ ہر بار ہر کلاس میں فرسٹ آتی رہیں۔ آخر گولڈ میڈل حاصل کر لیا۔ وہ تو پی ایچ ڈی کرنا چاہتی تھیں۔ مگر والدین کو ان کی شادی کی جلدی تھی۔ ماموں اچھی پوزیشن حاصل کر چکے تھے۔ بہت خوشگوار زندگی تھی۔ خوب صورت اور خوش حال۔ ان کی جواں مرگی کا امی کو بہت صدمہ تھا۔ مگر بچاری نئی ممانی کا اس میں کیا قصور تھا۔ جو امی ان کو سنا رہی تھیں اپنی ناگواری۔ ماموں کی شادی کا بھی دکھ تھا۔ حالانکہ ماموں کو ضرورت تھی گھر سنبھالنے کے لیے سماں کی دیکھ بھال کے لیے۔ بوا جب تک رہیں۔ کام چلتا رہا۔



اگلی صبح وہ سماں کو لے کر کالج چلی گئیں۔ ممانی سخت مضطرب اور طیش کے عالم میں بڑبڑاتی رہیں۔ ماموں آفس چلے گئے۔ میں کمرے میں لیٹا ناول پڑھتا رہا۔ کچن سے ممانی کی برتن پٹخنے کی آوازیں آتی رہیں۔

امی آئیں تو بہت خوش تھیں۔ سماں تو سیدھی کمرے میں جا گھسی۔ امی نے بتایا۔ داخلہ ہو گیا ہے۔ بہت آسانی سے۔ پرنسپل حیران تھیں کہ اتنی قابل، لائق، ذہین اسٹوڈنٹ نے یک لخت کالج کیوں چھوڑ دیا۔ ماموں آئے تو انہیں بھی خوش خبری سنائی۔

"میں نے تو مس پروین کی خوب خبر لی کہ ایک ذہین قابل، اسٹوڈنٹ کے کالج چھوڑنے کا انہوں نے کیوں نوٹس نہ لیا۔ یہ زمانہ، جہالت نہیں ہے کہ لاپروائی برتی جائے۔ وہ بھی کہہ رہی تھیں کہ میں خود حیران تھی کہ وہ کیوں گھر بیٹھ گئی۔ وہ تو کالج کی سب سے بہترین اسٹوڈنٹ۔ کالج کی کریم کہلاتی تھی۔ مگر اس کے والد نے خود کہہ دیا کہ وہ پڑھنا نہیں چاہتی۔ مجھے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن دوسرے کی اولاد پر ہم کیسے اختیار حاصل کر سکتے ہیں۔ اب سماں کو کچن سے چھٹی دلاؤ۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ کہ اسے اب صرف پڑھنا ہے اور کمی پوری کرنی ہے اور احد! اب کچھ اپنی عقل اور حق استعمال کرنا سیکھو۔ کچھ دن بعد اسے یونیورسٹی جانا ہو گا۔ تمہاری ذمے داری ہے کہ اسے پہنچاؤ۔ اور لاؤ۔ میں کسی اور پر بھروسا نہیں کر سکتی۔"

ماموں نے جھجکتے سے کچھ کہا۔ تو امی بگڑ گئیں۔

"کیا مشکل ہے۔ ساری دنیا میں ماں باپ یہ ذمے داری نبھاتے ہیں۔ ماں اس کی نہیں تو پھر کیا تم بھی اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔ یاد نہ ہو تو میں یاد دلا دوں، تمہاری بیٹی کے لیے کہہ رہی ہوں۔ جس کی ماں ایم اے گولڈ میڈلسٹ تھی جو اپنی بیٹی کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتی تھی۔ وہ بیٹی۔ جو تمہاری اکلوتی بیٹی ہے کسی اور کی نہیں۔" امی سخت ناراض تھیں۔

ماموں الجھ کر بولے۔ "آپا! میرا مطلب ہے مجھے اتنا ٹائم ملتا ہی نہیں پابندی سے... کوئی بھی کام کرنا میرے لیے انتہائی مشکل ہے۔"

"اچھا پھر تو کون یہ ذمے داری لے گا؟ کوئی پڑوسی؟ یا پھر تم کہنا چاہتے ہو کہ اس کو کالج میں داخلہ دلانا میری غلطی ہے؟ ٹھیک ہے۔ اب یا تو میں مستقل رہ کر سماں کو کالج لے جانے اور لانے کی ڈیوٹی دوں یا پھر اسے لاہور لے جاتی ہوں۔ بہرحال میں کسی طور اس بچی کو تمہارے جاہلانہ ماحول سے بچانے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ اور ہاں۔ آفس کی ذمے داری کے سوا اور کون سی مشقت تم کرتے ہو؟ پہلے تو تمہارے اور روحانہ کے دوست احباب فیملیز باقاعدہ یہاں آیا

کرتی تھیں۔ اب تو۔۔۔ میں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے کہ روحانہ کے عزیز بھی نہیں آتے۔ کنی کتراتے ہیں۔ ظاہر ہے اس جاہلانہ ماحول میں آکر کون وقت ضائع کرے گا لوگ آتے تھے۔ ادب پر سماجی معاملات اور سیاست پر گفتگو ہوتی تھی۔ ارے احد۔ کیسا دلچسپ دور تھا۔ بہت پر لطف۔۔۔ وہ تھا نا۔۔۔ کمال زاہد' کہاں ہے۔ کیسے لطیفے فی البدیہہ سناتا تھا۔ محفل زعفران زار ہو جاتی تھی۔"

امی کے لیکچر نے ماموں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ چہرہ کھل گیا۔

"جی آپا! کمال روحانہ کا بھتیجا تھا۔ امریکہ میں ہے۔"

دونوں پرانے وقت میں کھو گئے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ ماحول خوشگوار ہو گیا۔ اور دو دن کچھ بہتر گزرے۔ وجہ یہ کہ سماں کالج جانے لگی۔ ماموں نے بخوشی اس کی لے جانے اور لانے کی ذمہ داری نبھائی۔ امی سماں کے کپڑوں' جوتوں کا بھی معائنہ کرکے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتی رہیں۔ شام کو اسے ساتھ لے جاکر بہت اچھے ڈریس بھی لے آئیں۔ اور تاکید کہ کالج میں بدحالی کی تفسیر بن کر جانے کی ضرورت نہیں۔ خوش لباسی خوش پوشاکی سے بھی شخصیت نکھر جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ تین چار دن بعد ہم واپسی کے لیے گھر سے نکلے۔ ماموں چھوڑنے آرہے تھے۔ امی نے ایک بار پھر ماموں کی کلاس لے ڈالی۔

"سماں کی فکر رہے گی۔ مگر ہر مہینہ آتی رہوں گی۔ تم بھی ذرا بچی کی صحت کا خیال کرو۔ اس کی غذا کی طرف توجہ دو۔ بہت دبلی ہو رہی ہے۔ پتا نہیں تم اتنے لاپروا کیوں ہو گئے ہو۔ وہ تمہاری بیٹی ہے۔ تمہیں ہی اس کی فکر ہونی چاہیے۔ مگر۔۔۔ نہ جانے کیوں اتنے بے نیاز ہو گئے ہو۔ ارے بابا۔ اکلوتی بیٹی۔ کسی کی پالی ہوئی نہیں۔ تمہاری اپنی۔ اس کے سوا اور کون ہے۔ گوہر سے تو امید نہ رکھنا اولاد کی۔ اس قدر چربی چڑھالی ہے وجود پر کھا کھا کر۔ پہلی نظر میں تو میں نے پہچانا بھی نہیں۔ توبہ۔ گوشت کا پہاڑ بنالیا خود کو۔"

ماموں شرما گئے۔ (میں بھی) امی نے ان کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا کرتی رہیں تقریر۔



لاہور آکر میں نے نورین کو بتایا۔ "امی ماموں کے پیچ کس کر آئی ہیں خوب۔"

"ہائیں۔ ماموں کے پیچ کس نے ڈھیلے کیے تھے؟"

"نئی ممانی نے یا شاید پتا نہیں بہت ناراض تھیں۔"

"بھائی! آپ کو پتا ہے امی ماموں سے کیوں ناراض ہیں۔"

"مجھے کیا پتا' نہ میں نے پوچھا نہ امی نے کچھ بتایا۔"

"افوہ آپ بھی ناں' بہت بھولے بادشاہ ہیں یاد ہے روحانہ مامی کی زندگی میں' ہم لوگ جب گئے تھے۔ تو ان کے گھر ایک کھانا پکانے والی تھی۔ بہت مزے دار کھانے بناتی تھی۔" نورین آنکھیں پھاڑ کر حیران کرنے والے لہجے میں بولی۔

"پتا نہیں۔ ہو گی۔" میں نے بیزاری ظاہر کی۔ بھئی مجھے کیا کھانے پکانے والی سے۔"

"توبہ ہے۔ خیر تو روحانہ مامی نے اس کی ادائیں دیکھ کر۔ اسے جواب دے دیا تھا۔ خانساماں رکھ لیا۔ اب وہی خانسامن ..... نئی ممانی کے روپ میں جلوہ گر ہوئی ہیں۔"

میں بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔ "ہاں بھائی۔ مامی کی وفات کا سن کر وہ آگئی۔ اور چھا گئی۔ یعنی کہ..... خانساماں کا پتا صاف کر کے..... اپنی جگہ ہموار کر لی اور پھر کچھ ایسی تدبیر کی کہ ہمارے بے چارے بھولے بھالے ماموں ان کے چکر میں پھنس گئے۔ اور چپکے سے شادی کر لی۔ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ اسی لیے امی خفا ہیں کہ کرنی تھی تو کسی اچھے خاندان کی لڑکی یعنی کہ عورت مل ہی جاتی۔"

نورین مجھے حیران کر کے چلی گئی۔ اب امی کے تمام مکالمے میری سمجھ میں آگئے۔ امی نے اب اپنا پروگرام بنا لیا۔ ہر دو ماہ بعد وہ پنڈی چلی جاتیں۔ بھتیجی کے سر پر دست شفقت پھیرنے اور ماموں کو باور کرانے کہ وہ ابھی اپنی نگرانی سے غافل نہیں ہوئی ہیں۔ یا پھر تصدیق کرنا مقصد ہو۔ کہ بھابھی صاحبہ ان کی بھتیجی پر ظلم کے پہاڑ تو نہیں توڑ رہیں (حسب سابق) مجھے بھی اس لڑکی سے کچھ ہمدردی ہو گئی۔ جو لاڈلی اور اکلوتی تھی۔ ماں کی جدائی میں صدمے سے چور۔ مگر اپنے احساسات کا بھرپور اظہار اوٹ پٹانگ حرکتوں سے کرتی تھی۔ وہ اس کا بچپن یا لڑکپن تھا۔

اب وہ کالج گرل تھی۔ مگر کمزور اور مرجھائی ہوئی۔ ماں کے اس نئے رشتے کو قبول کر سکی یا نہیں۔ یا مجبور کر دی گئی۔ کچھ علم نہ ہوا۔ مجھے تجسس بھی نہ تھا۔ امی کی خفگی نے کچھ ظاہر کر دیا تھا۔ مجھے اس معاملے سے کیا سروکار تھا۔



میں ذرا الگ تھلگ رہنے کا عادی تھا۔ گھر میں بھی بس اپنی پڑھائی سے سروکار تھا۔ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ کس طرح امی گھر کے اخراجات کا حساب کرتی ہیں۔ ابا کی کتنی پنشن ہے۔ ہاں ایک بار اجو بھیا آئے تو امی سے ان کا مباحثہ چل رہا تھا۔ وہ اخراجات کی رقم دے رہے تھے' امی لیت و لعل سے کام لے رہی تھیں۔

"تمہارے بھی گھر کے اخراجات ہیں۔ میں نہیں چاہتی' تم تنگی اٹھاؤ۔"

"تو مجھے بھی گوارا نہیں کہ آپ تنگی اٹھائیں۔" اجو بھیا خاصے سنجیدہ تھے۔

"دیکھو۔ اپنی بیوی بچے کے حق تلفی کر کے۔"

"حق تلفی کیسی امی! آخر مجھ پر آپ نے جو خرچ کیا ہے۔ محبت' شفقت' ممتا لٹائی ہے۔ تو کیا آپ کے بچوں کی حق تلفی نہ تھی۔ تب تو آپ نے کنجوسی سے کام نہ لیا۔ اب میں اپنے چھوٹے بہن بھائی کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں تو آپ روک رہی ہیں۔ مجھ پر بھی ان بہن بھائی کا کچھ حق ہے۔ امی پلیز۔ دعا کریں میری ترقی ہو جائے تو پھر مجھے دل کھول کر خرچ کرنے میں ذرا بھی تکلف نہ ہو گا۔ اور ویسے تو اب بھی مجھے کمی نہیں

ہو گی۔ آصفہ بہت سلیقے سے گھر چلاتی ہے۔ بچا بھی لیتی ہے۔"

"اور میں نہیں چاہتی۔ آصفہ کو ہم لوگوں کی طرف سے کوئی شکایت ہو اور اسے مزید کفایت کرنی پڑے۔ اخراجات کنٹرول کرنے میں دقت ہو۔"

"اوہ۔ اس کی فکر نہ کریں۔ اسے۔ جو دیتا ہوں۔ ملتا رہے گا۔ اس میں کمی نہیں ہو گی۔ میری کمائی میں میرے بہن بھائی کا بھی حق ہے۔ یہ رقم میرے ذاتی پروگرام کا حصہ ہے۔ جو اس گھر کے لیے، آپ کے لیے ہے۔ امی! آپ نے مجھے بیٹا کہا بھی۔ مانا بھی ہے۔ اب بیٹا بنا بھی لیں۔"

ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ امی نے انہیں لپٹا لیا۔ اور کچھ منٹ دونوں جذبوں کے اسیر بنے کھڑے رہے۔ میرا دل بھی اجو بھیا کی محبت کا اسیر ہو گیا۔ وہ واقعی عظیم انسان تھے۔ ہمیشہ ہم بھائی بہن کے لیے بے چین رہتے تھے۔

ابا کی زندگی میں بھی ہماری پڑھائی۔ لباس اور مشاغل کے متعلق دریافت کیا کرتے تھے۔ چپکے چپکے کچھ نہ کچھ ہمیں دے بھی دیتے۔ امی نے بھی ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ ہمیشہ انہیں اپنا بڑا بیٹا کہا۔ لیکن آپا! وہ مختلف مزاج کی تھیں گو کہ امی نے ان کے ساتھ بھی بہت اپنائیت برتی۔ ظاہر ہے اجو بھیا کی بہن ہی تھیں۔ ہماری بھی بہن ہیں لیکن وہ ہم سے اتنی بے تکلف کبھی نہیں ہوئیں جیسے کہ اجو بھیا۔

نورین کا خیال تھا کہ ہم سے نہیں مگر امی سے انہیں شکوے ہیں۔ یہ کہ وہ سوتیلی ماں ہیں۔ (ان کی) اور سوتیلی کا تو نام برا۔ پھر یہ کہ ابا ان کی مرحومہ ماں کے مقابلے میں۔۔۔ ہماری امی سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ ان کی ہر بات مانتے ہیں۔ اور انہیں یعنی آپا کو یہ بات پسند نہیں۔

اس لیے وہ امی سے کبھی بے تکلف نہ ہوئیں۔ نہ ہم سے ویسی محبت کر سکیں۔ جیسی اجو بھیا کرتے تھے۔ اور انہیں بڑی بہن ہونے کے ناتے ہم سے بہرحال محبت ہونی چاہیے تھی۔ بھلا اس میں امی کا یا ہمارا کیا قصور بس یہ کہ ابا سے وہ بھی شکایت نہ کر سکیں۔ لیکن ابا کی زندگی میں ان کی شادی ہو چکی تھی۔ اور اس شادی کے لیے آپا کی خالہ نے زور دیا تھا۔ اجو بھیا کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ ان ہی کی ننھیال کی لڑکی تھی اور بہت ہی اچھی تھی۔ عین اجو بھیا کے مطابق۔

وہ ایک سال سے پشاور میں تھے۔ مگر اجو بھیا کسی بھی چھٹی پر خود آجاتے۔ کبھی آصفہ بھابھی کو بھی لے آتے۔

میرا رزلٹ بے حد شان دار رہا۔ مجھے فوراً ہی بہت اچھی جاب بھی مل گئی۔ میں دل و جان سے اس میں منہمک ہو گیا۔ کئی اچھے دوست بھی مل گئے آفس میں۔

مہرین آپا کے شوہر نام دار جو خاصے اکھڑ تھے۔ میرا ان سے بہت کم سامنا ہوتا تھا۔ آپا کے بچوں سے میری البتہ دوستی تھی۔ ان ہی بچوں کی وجہ سے میں ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتا۔ لوڈو اور لطیفوں کی محفل سجتی۔ خوب ہنسی مذاق ہلا گلا ہوتا۔ بچے بہت خوش ہوتے تھے۔ میری شکل دیکھتے ہی ان کے دل کی کلی کھل جاتی۔

ان کے ابا جان۔۔۔ بچوں کے لیے کسی ظالم دیو سے کم نہ تھے۔ بلکہ ظالم جن۔ مجھ سے بھی بہت روکھے لہجے میں مخاطب ہوتے تھے۔ مگر مجھے ان کے رویے کی کبھی پروا نہ ہوئی۔ میں تو اپنی بہن سے ملنے بھانجے بھانجی سے کھیلنے جاتا تھا۔



آپا کی ایک نند بھی تھیں۔ نہ جانے ان کے ساتھ کیا ٹریجڈی ہوئی تھی کہ اب تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ آپا سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ مجھے عجیب سے احساس نے گھیر لیا۔ ہوا یہ کہ میں تو خود بھی کسی سے زیادہ تعلقات کا قائل نہ تھا۔ لوگ بھی مجھ میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ہوا یوں کہ میری جاب شروع ہونے کے بعد لوگوں کو نہ جانے مجھ میں کیا خاص نظر آنے لگا۔ عزیز رشتے دار بھی ملنے لگے۔

بعض لوگ تو چائے پر بلواتے۔ کئی لوگوں نے کھانے کی دعوت دی۔ جو میں نے معذرت کے ساتھ لوٹا دی۔ کمال تو جب ہوا' جب بھائی جان مجھ سے تپاک برتنے لگے۔ ایک دن کہنے لگے۔

"یار! میں تو تمہاری امی کو کریڈٹ دیتا ہوں۔ انہوں نے تم سب کی تربیت بہت اعلا کی ہے۔ میں جانتا ہوں مہرین تمہاری ماں جائی نہیں ہے۔ اظہر اور مہرین اور تم دونوں میں انہوں نے کوئی فرق نہیں رکھا۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے ان میں۔"

"جی۔ جی! بس۔" میں کچھ کہہ نہ سکا۔ وہ مگر مزید کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے۔

"ایسا ہے میاں عادل' کہ میری خواہش یا آرزو ہے کہ ہمارا رشتہ کچھ اور مضبوط ہو جائے اور وہ اس طرح... کہ تم میری بہن سے شادی کر لو۔ تمہاری بہن کی خوشیوں کی گارنٹی اسی طرح ہو گی۔"

"بہن؟" ایک چھناکا ذہن میں ہوا۔ قریب تھا کہ میں اچھل پڑتا۔ مگر افسوس کامیابی نہ ہوئی۔ میری گود میں ان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ حیرانی' پریشانی میرے چہرے پر تحریر تھی۔

"اس میں کوئی حرج نہیں۔ بس یہ ہے کہ.... میرے دل میں جو تھا۔ وہ میں نے بتا دیا ہے۔ اب تم خود ہی سمجھ دار ہو۔"

بہت مطمئن تھے۔ ان کا بیٹا مگر میری خاموشی سے بے چین ہوا۔ باپ کے سامنے کچھ کہہ نہ سکا۔ اتر کر باہر بھاگ گیا۔ میری گود خالی ہوئی۔ زبان کھل گئی۔

"بھائی جان۔ یہ کیسے ممکن ہے.... میں تو ابھی شادی کے لیے تیار نہیں ہوں اور یوں بھی.... وہ مجھ سے بہت بڑی ہیں۔ آ' آپ نے یہ سوچا بھی کیسے۔"

"اب تم خود سوچ کر جواب دینا۔ تم ذمہ دار ہو اپنی بہن کی خوشیوں کے۔"

اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے آپا کو دیکھا۔

"آپا! بھائی جان کو سمجھائیے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ صاف بلیک میلنگ۔" وہ نظر چرا کر دوسری طرف مڑ گئیں۔

"ان کا دماغ اسی طرح کی باتوں میں الجھا رہتا ہے۔ جو ذہن میں آجائے۔ اس سے ایک انچ کم پر راضی نہیں ہوتے۔ فائدے' نقصان سے کوئی سروکار نہیں۔ اب دیکھو۔" خاصی فکر مند تھیں۔

"آپا! مزنہ آپی مجھ سے سات سال بڑی ہیں۔ بہت عزت کرتا ہوں میں ان کی۔"

"ہاں تو۔ کرتے رہنا عزت۔ کیا حرج ہے؟"

وہ بالکل لاپروا ہو گئیں۔ میں جھلا کر اپنے گھر آگیا۔ بھلا یہ کیسی خواہش ہے اور میں تو ابھی شادی کے لائق تھا بھی نہیں۔ نہ ہی ابھی گھر میں کوئی ذکر ہوا۔ بھائی جان نے سوچا بھی کیسے؟ اور اگر رشتہ مضبوط کرنا تھا۔ تو چار سال پہلے اجو بھیا سے کیوں نہیں کہا۔ ان کی شادی سے پہلے ایسی خواہش کرتے تو ممکن بھی تھا۔ مزنہ آپی کا ان سے جوڑ بھی تھا اور آپا کی خاطر نہ چاہتے ہوئے بھی۔ اجو بھیا مان جاتے۔ ان پر بھی یہ ظلم ہوتا۔ (نہ چاہنے کا)

مگر میرے اوپر تو ستم در ستم کہ ابھی شادی کرنا نہیں اور مزنہ آپی سے تو ہرگز نہیں۔ شاید آپا کو میں اس حد تک نہیں چاہتا تھا کہ ان کے گھر کی خاطر زہر کا پیالہ چڑھا جاؤں۔ دو دن اس بات سے الجھتا رہا۔ پھر آفس کے کام میں مصروف ہو کر سب کچھ بھلا دیا۔ یورپ سے ایک وفد آنے والا تھا۔ میں اس سلسلے میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ہمیں ہر قیمت اس وفد سے کامیاب مذاکرات کرتے تھے۔ آرڈر لینے تھے۔ ان کے لیے بہترین ہوٹل کا قیام۔ گاڑیوں کا انتظام۔ کافی ہلچل تھی آفس میں۔ ایک دن بھائی جان کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران ہو گیا۔

"پھر' کیا سوچا تم نے؟ کرسی پر سامنے بیٹھتے ہوئے آفس کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں اس وقت فون پر اپنے منیجر کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر جز بز ہو گیا۔ سوال سن کر اور بھی۔

"بھائی جان پلیز۔ بہت کام ہے مجھے۔ آفس میں کسی سے ملاقات بہت مہنگی پڑے گی۔ ٹائم ضائع ہو گا۔ آپ.... گھر آجائیں۔"

"گھر۔۔۔ مناسب نہیں، جواب لینے آیا ہوں۔ وقت ضائع کرنے نہیں۔ہاں یا ناں۔"

"بھائی جان۔ میرا ابھی چار سال شادی کا ارادہ نہیں۔ امی بھی اگر کہیں گی۔ انہیں بھی یہی جواب دوں گا اور زبردستی تو بالکل نہیں۔ اپنی پسند اور مرضی سے کروں گا۔ یہی جواب امی کو بھی دوں گا۔"میں نے زیادہ ہی دلیری سے کام لیا تھا شاید۔

"امی سے تم نے بات کی؟"سنجیدگی۔

"نہیں جب کسی قابل ہو جاؤں گا۔تب شاید امی سے بات کروں۔ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"کچھ سوچ رکھا ہے شاید؟"گہری نظروں سے میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

"جی نہیں۔ ابھی ٹائم نہیں ملا۔ زندگی کا فیصلہ بہت فرصت چاہیے۔ سوچنے اور کر گزرنے کے لیے۔ بہت اہم معاملہ ہوتا ہے۔ آپ تو واقف ہیں۔ جب بھی ایسا کرنا ہوگا۔ صرف اپنی مرضی، خوشی اور پسند سامنے رکھ کر کسی دباؤ میں آکر نہیں۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ دوٹوک جواب دے دوں۔ کام بہت باقی تھا اور بھائی جان کی موجودگی میرے کام میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

"ٹھیک ہے پھر۔۔۔ نتیجے کے ذمہ دار بھی۔۔۔ تم ہو گے۔"

کہہ کر چلے گئے۔ شکر کا سانس لیا۔ مگر یہ سکھ کا سانس۔۔۔ بہت مہنگا پڑا۔ شام کو گھر آکر آپا کو دیکھا۔ بہت پریشان تھیں۔

"کیا کہہ دیا تم نے اپنے بھائی جان سے۔ بہت غصے میں تھے۔" امی بھی بے حد فکر مند سر پکڑے بیٹھی تھیں۔

"لو بھلا اس شخص کے تو مزاج ہی ساتویں آسمان پر ہیں۔ مجھے صبح پنڈی جانا ہے اور یہاں یہ قضیہ شروع ہو گیا۔ اب مہرین کو چھوڑ گئے ہیں کہ تمہیں نفع نقصان سمجھائیں۔ خیر اب پریشان نہ ہو۔ میں دو دن کے بعد وہاں سے آکر مزاج دار داماد سے بات کروں گی۔ شاید کچھ سمجھ میں آجائے۔"

امی نے مجھے پریشان دیکھ کر کہا۔ میں واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

"آپا! آپ ذرا طریقے سے سمجھائیں۔"میں نے بڑی لجاجت سے آپا سے کہا۔ "یہ کوئی مذاق نہیں۔ نہ گڈے گڈیا کا کھیل ہے۔ ایسی فضول بات کہتے ہوئے انہیں خود شرم آنی چاہیے۔"

"ہاں۔ کروں گی بات۔ مگر اس آدمی سے تو بات کرنا بھی۔۔۔ جان جوکھوں میں ڈالنے کے برابر ہے۔ جو فیصلہ ایک بار کر لیا۔ پھر۔۔۔ اسے انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔"

آپا متفکر تھیں۔ شام کو گھر چلی گئیں، امی مجھے ڈانٹنے لگیں کہ میں نے بھائی جان سے روکھے لہجے میں بات کی "اس لیے وہ خفا ہو گئے۔ میں کیا بتاتا" آفس کا ماحول "ان کا بات کرنے کا لہجہ" میری مصروفیت "معقول بات ہوتی۔ تو میں تسلی سے بات کرتا۔

وہ تو شکر ہے کہ بھائی جان کے جانے کے بعد یورپی ڈیلی گیشن کے دورے کا ٹائم آگے بڑھنے کی خبر ملی۔ جس سے سب کو کچھ آرام ملا۔ اب میں دو تین دن چھٹی کر کے آرام کر سکتا تھا۔ بہت محنت کی تھی۔

امی کو پنڈی روانہ کر کے گھر آگیا۔ شام کو جی چاہا کہ آپا کے گھر چلا جاؤں۔ بچوں سے ملنے کھیلنے کے لیے، وہ منتظر رہتے تھے۔ لیکن بھائی جان کی ناراضی "اور یہ اچھا ہی ہوا کہ میں کہیں نہیں گیا۔ ٹی وی پر میچ دیکھتا رہا۔



رات کو امی کا فون آگیا۔

"عادل! تم صبح ہی چھٹی لے کر آجاؤ۔ بلکہ۔۔۔ ابھی روانہ ہو جاؤ تو بہتر ہے۔ بعد میں بتاؤں گی۔۔۔ نورین کو میں خود سمجھا دوں گی کیا کرنا ہے۔ وہ اپنی دوست شمائلہ کو بلا لے گی۔"

مجھے سوالات کرنے کی عادت نہ تھی۔ نورین کو امی نے کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ بے فکر تھی۔ میں نے دو جوڑے بیگ میں ڈالے۔ احتیاطاً" کیا پتا۔۔۔ رکنا پڑے۔ صبح ہی ماموں کے گھر پہنچ گیا۔

شکر ہے ماموں ٹھیک تھے۔ یعنی میرے اندیشے غلط

تھے۔ ممانی چڑی ہوئی تھیں اور ابی مطمئن۔ ناشتہ کر کے میں گیسٹ روم میں جا کر لیٹ گیا۔ ذہن اور جسم کی تکان نے بہت جلد مجھے نیند کی وادیوں میں پہنچا دیا۔ نہ جانے کتنی دیر سوتا رہا۔ آنکھ کھلی۔ گھڑی پر نظر پڑی اور گھبرا گیا۔ کمال ہے کسی نے جگایا بھی نہیں۔

برابر کے کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ کوشش کے بغیر سماعت تک آ پہنچیں۔ اجنبی آواز تھی۔ کوئی لڑکی۔۔۔

"سنا ہے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ میں تو سنتے ہی بھاگی بھاگی آئی ہوں۔ کس کے نصیب جگا رہی ہیں بنو۔" اشتیاق کی فراوانی آواز میں رچی ہوئی تھی۔

میں حیران ہو گیا۔ شادی کس کی؟

"پتا نہیں۔" میں نے سماں کی آواز سنی۔ "پرسوں اماں نے مجھ سے کہا کہ وہ میری شادی کر رہی ہیں۔ تو میں چپ رہی۔"

"تمہارے ابو نے۔۔۔ کچھ تو بتایا ہو گا۔ تم خود ان سے پوچھ سکتی تھیں کہ۔۔۔"

"نہ ابو نے کچھ کہا نہ میں نے پوچھا۔ کیا پوچھتی؟"

"بہت ہی نکمی ہو سماں۔ شادی کی تیاری ہوتی نظر نہیں آ رہی۔ کیا بوجھ اتارا جا رہا ہے۔" بہت ہی منہ پھٹ لڑکی تھی۔

"شاید۔" سماں کی بوجھل آواز آئی۔

"تم نہایت فضول لڑکی ہو۔ خیر میں آنٹی سے خود ہی پوچھ لوں گی۔ یہ بتاؤ۔ شادی کے دن کس رنگ کا ڈریس پہننا چاہتی ہو۔ میں آنٹی کو بتا دوں گی۔ وہ لڑکے والوں کو تمہاری پسند بتا دیں گے۔"

"میں۔۔۔ میں تو سرخ رنگ کا غرارا سوٹ پہنوں گی۔ دوپٹے کی پٹی سبز رنگ کی جس پر کام بنا ہو اور۔۔۔ سرخ یعنی کہ روبی کا سیٹ زیور کا۔"

"رہیں وہی پرانے زمانے کی۔ ارے آج کل تو نارنجی، گلابی، زعفرانی، نیلا، سفید یا فیروزی رنگ کا لباس پہنتی ہیں لڑکیاں۔ کاسنی بھی ان ہے۔"

"لو یہ تو عام رنگ ہیں۔ سب لوگ ان ہی رنگوں کے کپڑے پہنے ہوں گے۔ بھئی دلہن کو دلہن لگنا چاہیے۔ نہ کہ عام مہمان۔" سماں کی آواز میں شوخی تھی۔ "اور میں۔۔۔ اماں کو بتا دینا۔ بیوٹی پارلر سے تیار ہوں گی ہاں۔"

"بیوٹی پارلر۔ بہت مہنگا ہوتا ہے۔ تمہارے ابا افورڈ کر لیں گے۔"

"ہونے دو مہنگا۔ شادی کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ ایک ہی بار تو ہوتی ہے۔ اسے یادگار ہونا چاہیے۔" سماں اب کھل کر بول رہی تھی۔ یقین نہیں آیا۔ یہ وہ سماں تو نہیں۔

"ہاں مذاق نہیں ہوتی۔ مگر بعض لوگ اسے مذاق بنا لیتے ہیں۔" دوسری لڑکی دھیمے لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب شادی کا مطلب ہے خوشی اور نا سمجھی میں بعض لوگ اسے ضد بنا لیتے ہیں۔ اس لیے تم کو خبردار کر رہی ہوں۔ تم سوچ سمجھ کر شادی کرنا اور اگر کوئی غلط قسم کے لوگ ہوں۔ تو۔۔۔ انکار کر دینا۔ مجھے خوف ہے کہ۔۔۔ تمہاری اماں کوئی۔۔۔ انتقامی کارروائی میں تمہیں بھاڑ میں نہ جھونک دیں۔"

"نہیں۔ ایسا کیسے کر سکتی ہیں وہ۔ ابو بھلا۔۔۔ کیوں مانیں گے۔ اور اب تو پھپھو بھی آ گئی ہیں۔"

"اچھا خیر گھبراؤ نہیں۔ میں ذرا ان کی سن لیتی ہوں جا کر۔ تمہاری پھپھو سے ہی پوچھ لوں گی اور ہاں۔ ایک نصیحت بھی کرنی ہے۔ سسرال کو میاں جی کا گھر سمجھ کر رہنا۔ خالہ جی کا گھر نہیں یعنی لاکھ وہ تمہارا گھر ہو گا۔ مگر تمہارا وہاں پر کوئی اختیار نہ ہو گا۔ کیونکہ حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ اختیار نہیں۔"

"اُفوہ۔ دادی اماں! تم میں یہ بوڑھی روح کہاں سے آ ٹپکی۔ ہمیشہ نصیحت کرتی ہو۔ میں کوئی بچہ ہوں۔" سماں چڑ گئی تھی شاید۔

"ایک بات بتاؤ۔ جب بھی تم نے میری نصیحت پر عمل کیا۔ فائدے میں رہیں۔ کہ نہیں۔ بہن میری، یہ دنیا بہت مکار ہے۔ بہت بے نیاز ہے۔ تم نے عقل کو آواز دے کر دماغ سے کام لینا ہے۔ ورنہ میری آپا کی طرح۔"

"ارے ارے... تمہاری آپا جن کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ کیا ہوا انہیں۔"

"وہی ہوا جو ہوتا رہتا ہے نا سمجھی میں۔ نہ آپا سسرال والوں کی توقعات پر پوری اتر سکیں۔ نہ اپنی منوا سکیں۔ اپنا میاں اپنا گھر سمجھ کر کچھ اصلاحات کی کوشش کر رہی تھیں۔ نامنظور اور پھر نامقبول ہو کر میکے بٹھادی گئیں۔"

"ہائے اللہ تو تمہارے ابا انہیں سمجھاتے۔ ان کے میاں کو بھی...."

"وہ کہتی ہیں۔ شادی کی ہے۔ غلامی نہیں کروں گی سسرال والوں کی ضد اور تحکمانہ انداز دیکھ کر میاں سے کہا۔ الگ گھر میں رہوں گی۔ وہ بھی مرد ہو گئے۔ اب گھر بیٹھی ہیں۔ جاب بھی بہت اچھی مل گئی ہے۔"

"ارے اللہ۔ کوئی انہیں سمجھاتا نہیں۔ گھر تباہ کرنے سے زندگی بھی خراب ہوتی ہے۔"

"دیکھو سماں! ان کا نظریہ بھی غلط نہیں ہے۔ جہاں عزت نہ ہو۔ وہاں خود پر جبر کر کے رہنا۔ اپنی ذات کی نفی کرنا ہے۔ ہاں یہ کہ اگر ان کے میاں اسے انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ تو شاید مفاہمت ہو بھی جائے۔ ابا کوشش تو کر رہے ہیں۔"

میں اب پوری طرح ہوشیار ہو گیا تھا۔ نیند کی کسل مندی سے جان چھوٹ گئی۔ باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر نکلا تو دوسرے کمرے میں سناٹا تھا۔ ڈرائنگ روم میں امی اور ماموں بیٹھے تھے۔

"آؤ عادل!" ماموں نے ساتھ والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ کچھ فکر مند سے تھے۔ امی نے مجھ سے کہا۔

"عادل! میں نے تم سے پوچھے بغیر سماں کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ احد کو تو اعتراض نہیں ہے۔ احد کی تسلی کے لیے تم سے پوچھ رہی ہوں۔"

مجھ پر تو حیرت کا پہاڑ آگرا۔ یہ کیا شوشہ چھوڑا ہے امی نے سماں اور میں.... ؟ سچی بات ہے.... مجھے سماں کوئی خاص پسند نہ تھی۔ اس نظریے سے نہ دیکھا تھا نہ سوچا تھا۔ امی مجھے متوقع نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اندازہ تھا۔ امی کبھی کوئی کام بلاوجہ بلا ضرورت نہیں کر سکتی تھیں۔ میری زندگی کا فیصلہ امی کریں گی۔ یہ میں نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن ان کی نیت پر شک کرنا بھی گناہ کے مترادف تھا۔ امی کبھی میرے لیے برا نہیں چاہ سکتیں۔ اس کا یقین تھا۔ میں نے امی کے چہرے پر بے چینی دیکھی۔

"میں نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے۔ اس سے پہلے کہ سماں کو کسی جاہل شخص سے بیاہ دیا جائے۔ میں کیوں نہ یہ کام کر ڈالوں۔"

"آپا!" ماموں نے کسمسا کر کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بہت اچھی پوزیشن ہے بہت کمائی ہے۔ شہرت ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بہت مانگ ہے۔"

"اچھا اور تعلیم کتنی ہے؟ خاندان کیا ہے۔ ذات کون سی ہے۔ بیٹی بہت قیمتی اثاثہ ہوتی ہے۔ اسے بے مول نہ کرو۔ اور تمہاری بیٹی۔ ہیرا ہے۔ تمہارا خون ہے۔ روحانہ کی لخت جگر۔ اس کے لیے تو بہت اعلا تعلیم یافتہ خاندانی رشتہ بہ آسانی مل سکتا تھا اور تم نے کیا سوچا؟"

امی خاصی مشتعل تھیں۔ ماموں کے بعد میری طرف متوجہ ہوئیں۔ "اب تم جواب دو۔"

میں نے اپنا اعتماد بحال کیا۔ "آپ نے میرے لیے بہت ہی اچھا سوچا ہو گا امی! میں نے کبھی آپ کی کوئی خواہش رد کی ہے؟ آپ میری بہی خواہ ہیں۔ جو فیصلہ کریں گی۔ مجھے منظور ہو گا۔ میں انکار کی جرأت کر ہی نہیں سکتا۔"

امی کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ ماموں مسکرائے۔ اور میرے کندھے کو تھپکا۔ اس وقت ممانی کا غضب ناک چہرہ دروازے سے نمودار ہوا۔ بلکہ وہ پوری کی پوری نمودار ہو گئیں۔

"اور میں نے جو رشتہ طے کر دیا ہے۔ اسے کیا جواب دوں گی۔ سوچا ہے آپ نے؟" وہ تلملا کر امی سے مخاطب ہوئیں۔ ادھر ماموں کا ہاتھ کندھے سے پھسل کر ان کی اپنی گود میں جا گرا۔

"میری بھی کچھ عزت ہے آپا! آپ کے بھائی کے

طفیل سہی۔ وہ لوگ میری جان کو آجائیں گے۔ اور آپ بھی سن لیں عبدالاحد صاحب۔ اب ان کا سامنا آپ کریں گے۔ آپ ہی جواب دیں گے انہیں کہ اچانک یہ ارادہ کیوں تبدیل ہو گیا۔" ممانی بہت زیادہ مشتعل تھیں۔

"میں کیوں؟" ماموں نے بھی حوصلہ دکھایا۔ "نہ میں نے رشتہ کیا ہے۔ نہ میں جواب دہ ہوں۔ اگر تم نے مجھ سے مشورہ کیا ہوتا۔ تو میں خود دیکھتا۔ تم نے تو اچانک بم دے مارا کہ میں نے رشتہ طے کر دیا ہے اور فلاں دن بارات آئے گی۔ تمہیں یاد ہو گا۔ میں نے تو مخالفت کی تھی کہ کوئی جوڑ نہیں نہ عمر کا نہ تعلیم کا۔" وہ بھی غصے میں بولے۔

"ہاں۔ مگر۔ اتنی سختی سے نہیں کہا۔ اب جو بہن کو دیکھا۔ تو بیٹی کی محبت پھٹ پڑی۔ کمائی کا سن کر ہی چپ ہو گئے تھے۔ میں نے بھی پوزیشن ہی دیکھی تھی۔ دولت برس رہی ہے۔"

امی ماموں کو دکھی اور شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"احد! یہ کیا سن رہی ہوں میں۔ کیا تم نے جو کچھ کمایا ہے۔ وہ کم ہے؟ تم ایک خانساماں کی دولت سے مرعوب ہو گئے؟ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ یا بیٹی میں کیا نقص ہے۔ خاندان والوں سے کیا کہہ کر تعارف کراؤ گے؟ تعلیم کی اہمیت سے نابلد ہو گئے۔ افسوس ایک خانساماں اور داماد!"

"آپا! خانساماں نہیں ہے۔ بہت بڑے ہوٹل کا شیف ہے۔ ہر طرف مانگ ہے اس کی۔" ممانی فخریہ لہجے میں گل کھلا رہی تھیں۔ "جاہل نہیں ہے۔ ایف اے پاس ہے۔"

"گوہر! شیف کون ہوتا ہے؟ وہی کھانا پکانے والا ماہر۔ اپنی حیثیت کی پہچان نہیں ہے تمہیں۔ احد مرعوب ہو سکتا ہے۔ خاندان والے شیف سن کر ہی اعتراض کریں گے۔ مجھے تو تم لوگوں کی ذہنیت پر افسوس ہو رہا ہے۔" امی دکھ سے بولیں۔

ممانی بھی غصے میں آگئیں۔ ماموں نے سر جھکا لیا۔

بھی کر سکتے تھے وہ۔

"ہاں جی۔ ہم تو کم ذات ہیں۔ ہماری عزت ہی نہیں ہے۔ آپ جیسے دولت مند لوگ کچھ بھی کر لیں۔ خاندانی کہلائیں گے۔ میں نے تو بھلا چاہا تھا۔ مگر میں کچھ بھی کر لوں۔ سوتیلی کہلاؤں گی۔ اب بھلا میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں؟" ممانی جزبز ہو گئیں۔

"کہہ دینا، تمہیں علم نہ تھا کہ اس کا رشتہ بچپن سے طے ہے۔ یا پھر کہہ دینا۔ پھوپھی کو یہ رشتہ قبول نہیں۔ بلکہ کسی کو بھی قبول نہیں۔"

امی نے مشورہ تو دے دیا۔ مگر ممانی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ امی نے ماموں کو دیکھا۔

"مجھے گوہر کا بھروسا نہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

مگر رات کو امی نے ممانی کو سمجھایا۔ ٹھنڈا کیا۔ اپنائیت کی باتوں سے بہلایا۔ اپنی طرف سے صفائی بھی دی۔ لیکن ممانی کا موڈ آف تھا۔ گو کہ ظاہر کر رہی تھیں کہ سب ٹھیک ہے۔ مگر کسی سوچ میں گم تھیں۔ رات کھانے پر سیماں نہ تھی۔ ممانی حسب عادت خاطر مدارات کر رہی تھیں۔

امی کو شاید فکر کی وجہ سے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ بہت دیر تک جاگتی اور کروٹیں بدلتی رہیں۔ مجھے سوالات کرنے کی یا جستجو کی عادت نہ تھی۔ پھر بھی معلومات میں اضافہ کے لیے پوچھ لیا۔

"امی! میں یہاں کب تک رہوں گا؟"

"تمہیں کیا جلدی ہے؟"

"میرا آفس میں بہت زیادہ کام ہے۔ میرا مطلب ہے کہ منگنی وغیرہ کرنی ہے تو جلدی سے کر لیں۔ تاکہ میں جاؤں واپس۔ آپ کیا ابھی رکیں گی؟" عادت کے خلاف کئی سوال کر لیے۔ امی نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا! منگنی کی جلدی ہے۔ خیر اجو کو بلایا ہے وہ آجائے تو پھر ...."

امی ہر مرحلے پر اجو بھیا کو یاد رکھتی تھیں۔ لیکن آپا اور نورین۔ کیا یہ منگنی میں نہیں آئیں گی؟ لیکن اتنے سوالات کر چکا تھا۔ اس اہم سوال کو ٹال گیا۔ ظاہر

ہے اجو بھیا آئیں گے تو یہ دونوں بھی آئیں گی۔ چادر سر سے تان کر بے خبر ہو گیا۔ صبح ہم ناشتہ کر رہے تھے تو میں نے مای کو عجلت میں کہیں جاتے دیکھا۔ امی نے بھی دیکھا مگر کچھ بولیں نہیں۔ پھر وہ سماں کو پکارتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ میں بھی ان کے پیچھے گیا۔ اندر سے سوال جواب کی آواز بھی آ رہی تھی۔

"یونیورسٹی کیوں نہیں گئیں؟" اماں کا سوال۔

"پھپھو اماں نے کہا کہ وہ مجھے مارکیٹ لے کر جائیں گی۔ اس لیے آج چھٹی کرلی۔" سماں کا جواب۔

"لیکن وہ تو کہیں باہر چلی گئی ہے۔ دوپہر ہو گئی ہے... اچھا تم ایسا کرو۔ کہ گوہر آکر تمہیں لے جانا چاہے تو کہہ دینا۔ پھپھو نے روکا ہے۔ کوئی کام ہے۔ سنا۔ اصل میں میرے سسرال والے مجھ سے ملنے آ رہے ہیں۔ تو... تم ذرا چائے وغیرہ کا خیال کرلینا۔"

"جی اچھا۔ پھپھو کتنے لوگ ہوں گے میں رانی کے ساتھ مل کر سب کرلوں گی۔"

نہ جانے امی کیا کہہ کر دوسرے کمرے میں آگئیں اور فون اٹھا کر میرے چچا اور ان کے بیٹوں سے بات کرنے لگیں۔ کافی دیر ہو گئی۔ ممانی نہیں آئیں' البتہ ان کا فون ماموں نے سنا۔ وہ دیر سے آنے کی اطلاع دے رہی تھیں۔

دوپہر کا کھانا بھی کھالیا گیا۔ معلوم نہیں امی کیا سٹرپٹر کر رہی تھیں اور معلوم نہیں ممانی کہاں تھیں اور وہ وہاں (جہاں بھی گئی تھیں) کیا کر رہی تھیں۔ عجیب پراسرار کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ میں کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ پھر کچھ آواز آئی۔ مانوس... اور... اجو بھیا' میں اٹھا تو وہ آکر مجھ سے لپٹ گئے۔

"آپ اجو بھیا یہاں۔" حیرت کا اظہار کرنا پڑا'

"پشاور سے۔"

"امی سے ملنے آگیا اور یاد کرو' میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ امی نے فون کیا تھا۔"

"آج عادل کا نکاح ہے اور تم اس کے بڑے ہو۔ نکاح کے وکیل ہو۔"

امی آئیں اور دھماکہ کرکے چلی گئیں۔ اجو بھیا مسکرائے از سر نو مجھے گلے لگایا۔ امی بہت مصروف نظر آ رہی تھیں۔ نہ مجھ پر نظر ڈالی نہ میری اصلی والی حیرانی پر جملہ کسا۔ اللہ! منگنی سے پہلے نکاح یہ ہو کیا رہا ہے۔ منگنی تو... کچا بندھن ہوتا ہے۔ لیکن... اور میں نکاح کے لیے تیار بھی نہ تھا۔

اجو بھائی ہنستے ہوئے مجھے پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ جہاں ماموں اور... چند مہمان جمع تھے۔ پھر چچا جان آگئے۔ ان کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے اور بہوئیں بھی تھیں اور بھی چند خواتین بلکہ لڑکیاں بھی ہنستی کھلکھلاتی آئیں اور امی سب خواتین کو سماں کے کمرے میں لے گئیں۔ مولوی صاحب آگئے۔ میں مٹی کا مادھو بنا سب کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں بھی مہمان ہوں۔ اجنبی انجان' ماموں اور چچا جان سر جوڑے فارم فل کرنے میں منہمک تھے اور پھر چند منٹ بعد مولوی صاحب نے خطبہ شروع کر دیا۔

تین لوگ جن میں اجو بھیا اور چچا جان کے دونوں صاحبزادے تھے۔ سماں سے پوچھنے اس کے کمرے میں چلے گئے۔ مسکراتے ہوئے واپس آئے۔ اب مجھ سے کچھ سوال کیے گئے۔ میں بھی رٹو طوطے کی طرح "قبول ہے قبول ہے" کہتا گیا۔ پھر نہ جانے کس جہان سے چھوہارے برآمد ہوئے اور سب کھانے لگے۔

سب نے مجھے گلے لگایا۔ مبارک باد دی۔ ماموں مجھے سینے سے لپٹا کر آبدیدہ ہو گئے۔ ہائے نہ جانے کیوں مجھے بھی رونا آگیا۔ پھر نوجوان پارٹی مجھ سے لپٹ گئی۔ یعنی چچا زاد بھائی اور ماموں کے کوئی کزن جن سے میں بہت کم ہی کبھی ملا تھا۔ سب نے بزور مبارک باد دی۔ (ایسی ویسی؟) پسلیاں دکھا دیں۔ ماموں کرسی پر بیٹھے آنکھیں رگڑ رہے تھے۔ اجو بھیا انہیں تھپکتے ہوئے تسلی دے رہے تھے۔

"ماموں! فکر نہ کریں۔ ان شاء اللہ سماں اپنے چاہنے والوں کے گھر جا رہی ہے۔ بہت خوش رہے گی۔"

"لو جی۔ میرے ماموں ان پر بھی اجو بھیا کا قبضہ۔ پھر

امی کے ساتھ رانی صاحبہ نمودار ہوئیں۔ چائے کے لوازمات کے ساتھ۔ امی نے بھی اپنے ذہن رسا کی بدولت کیا کیا انتظام کرڈالا۔ چھوہارے۔ مٹھائی۔ کیک۔ دہی بڑے۔ سموسے۔

رانی کی بے پایاں خوشی۔۔۔ اس کے چمکتے دانت گواہی دے رہے تھے۔ کن اکھیوں سے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتی پھر شرما کر ہونٹ دانتوں میں دبالیتی۔ اف عجوبہ بنادیا مجھے۔

پھر پڑوس کے کمرے سے لڑکیوں کے پرجوش گانوں نے سماں باندھ دیا۔ ادھر بھی کمی نہ رہی۔ راشد بھائی اجو بھیا اور جمیل زور زور سے گانے لگے۔

ساجد بھائی میز کا طبلہ بجانے لگے۔ کسی نے منہ سے میوزک کی آواز نکالی۔

میرا یار بنا ہے دولہا
اور پھول کھلے ہیں دل کے
ارے میری بھی شادی ہو جائے
دعا کرو سب مل کے

"مولوی صاحب کہئے آمین آمین آمین۔" ساجد بھائی نے کہا۔

امی مسکراتی ہوئی آئیں تو ساجد بھائی نے فرمائش کی "چچی آپ ہی میری شادی کرائیں گی۔ میرے ابا کو تو میری فکر نہیں ہے۔ بس اسی طرح فٹافٹ۔"

امی نے انہیں دعا دی تسلی بھی ساتھ لگا دی "ضرور بیٹا ضرور۔"

امی سب سے مبارک باد قبول کررہی تھیں۔ تو ممانی کی کڑک سنائی دی۔

"یہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔" دروازے میں کھڑی تھیں۔ پریشان۔

ساجد نے لپک کر ایک چھوہارا ان کے منہ میں ٹھونسا۔ "ہو رہا نہیں ہو گیا۔ سماں اور عادل کا نکاح۔ آپ کو مبارک ہو۔"

ممانی حسب توقع آگ بگولہ ہو گئیں۔ چھوہارا اخ تھو کر کے وہیں گرا دیا۔ پھر۔

"احمد صاحب۔ ذرا ادھر تو آیئے۔" پکار پڑی۔ مگر ماموں نے شور میں سنا نہیں وہ گردن نیچی کیے چچا جان سے باتیں کررہے تھے۔ کرتے رہے۔

"کیا مذاق ہے؟" ممانی پھر چلائیں اور کوئی شنوائی نہ ہونے پر تن فن کرتی دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور فوراً" ان کی چنگھاڑیں ادھر سے ادھر سفر کرتی سب کی سماعت میں گونجنے لگیں۔ امی فوراً" اٹھ کر چلی گئیں۔ یقیناً" بھتیجی کی سرپرستی کے لیے۔

پھر ماموں بھی اٹھ گئے۔ ممانی کی چیخ پکار نے مجبور کر دیا۔ حالات کا اندازہ کر کے مہمان بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ امی نے سب کو شکریے کے الفاظ کے ساتھ اللہ حافظ کہا۔ ماموں اندر ممانی کے جوش غضب کو ٹھنڈا کرنے کی سبیل کر رہے تھے۔ رانی کمرے میں آئی۔ مجھے دیکھ کر شرمائی۔ کھلکھلائی۔ اس کے دانت باہر ہی رکھے تھے۔ اندر جانے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ خوشی بے پایاں۔ (بھلا تمہیں کیوں؟)

"خوش ہو؟" اجو بھیا میرے چہرے پر خوشی کی رمق تلاش کرنے میں ناکام ہو گئے۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سمجھ گئے' سمجھانے لگے ہوتا ہے ایسا ہوتا ہے۔ جب پروگرام کے بغیر زندگی کے فیصلے کیے جائیں۔ لیکن میں مطمئن ہوں میں نے اس لڑکی کے چہرے پر حیا' وفا' پاکیزگی اور استقلال دیکھا ہے۔ ذہین ہے۔ تم پچھتاؤ گے نہیں۔ ماموں محبت کرنے والے پر خلوص انسان ہیں۔ تمہیں بھی انہیں مطمئن کرنا چاہیے۔ وہ خوش ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ امی کبھی کوئی فیصلہ بلاوجہ نہیں کرتیں۔"

وہ میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ مجھے ان کی آنکھوں میں کوئی نرم گرم سی کیفیت نظر آئی۔ غم کی نمی' آواز میں ٹھہراؤ۔ ہاتھوں میں لرزش (کیا اجو بھیا پچھتا رہے ہیں؟)

ماموں کے کمرے سے ممانی کی غراتی آواز۔ ماموں کی معنی خیز خاموشی لاؤنج میں چند لڑکیاں (غالباً" سماں کی سہیلیاں) سماں کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ سماں نے ہلکے گلابی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ گھٹنوں

میں سر رکھے بیٹھی تھی۔ پتا نہیں اس کے محسوسات کیا تھے۔ ہمیں دیکھ کر لڑکیاں اٹھ کر آگئیں۔ تعارف
"میں شیما ہوں۔ سماں کی کلاس فیلو۔ بیسٹ فرینڈ۔ میں ارسٹین ہوں۔ بیسٹ فرینڈ۔ میں وہ ہوں۔ میں وہ ہوں۔ ارے۔ میرا تو کوئی فرینڈ نہ تھا۔ تو بیسٹ فرینڈ کا تو کہیں ذکر ہی نہیں۔

دوسرے کمرے میں امی متفکر سی بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ گلے لگا کر پیار کیا۔ جذباتی ہو رہی تھیں۔ بلکہ میرے چہرے پر خوشی نہ دیکھ کر پریشان بھی۔

"تمہارا شکریہ۔ اقرار کر کے میری عزت کا' ماماتا کا بھرم رکھ لیا" گلوگیر لہجہ میں بے چین ہو گیا۔

"امی' آپ کی عزت میرا ایمان ہے۔ میں بھلا کیسے؟ آپ نے یہ سوچا بھی کیوں کہ میں آپ کو کبھی بھی انکار کروں گا؟" میں فرماں بردار بیٹا تھا۔ واقعی۔

"مگر.... یہ تمہاری زندگی.... پوری زندگی کا معاملہ تھا۔ تم انکار کر سکتے تھے۔"

"امی پلیز۔ آپ کبھی میرا برا نہیں چاہیں گی۔ یہ یقین ہے مجھ کو۔" میں نے انہیں یقین دلایا۔

"میں جذباتی ہو گئی تھی۔" امی کھوئے کھوئے لہجے میں بول رہی تھیں۔ "سماں کی فکر نے مجھے کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہ دی۔ روحانہ کی روح مجھ سے پوچھے گی۔ تم نے میری بچی کو اندھیروں سے بچانے کے لیے کیا کیا؟ عادل مجھے اپنی زندگی سے بڑھ کر تم دونوں عزیز ہو۔ خدا میرے ارادوں کو مضبوطی اور خوشنودی عطا کرے اور تم دونوں کی خوشیاں میرے یقین کی ضامن بنی رہیں۔ میرے پاس تم لوگوں کے لیے دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

وہ بہت سنجیدہ تھیں۔ میں نے ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ وہ خوش ہو گئیں شاید پھر کچھ یاد آنے پر بولیں۔

"تم دونوں بیٹھو۔ میں ذرا احد کی خبر لوں۔ گوہر کے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہوں گے۔" وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ اجو بھیا باہر جا کر سماں کو پکڑ لائے.... جھجکتی ہوئی آکر کرسی پر بیٹھ گئی اور ہاتھ کی انگلیوں پر نظریں جما دیں۔ بغیر مہندی' بغیر کیوٹکس' بے چاری اس کے تو سارے خواب ادھورے رہ گئے۔ بلکہ چکنا چور ہو گئے۔ امیدوں کی عمارت دھڑام.... نہ سرخ رنگ کا جوڑا' نہ میک اپ' روئی روئی آنکھیں۔ پھیکا سیٹھا چہرہ...

اجو بھیا چپکے سے باہر نکل گئے۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"اب تم یونہی بسورتی رہو گی؟ بھئی' میرا تو کوئی قصور نہیں۔ اپنی پھپھو سے کہو۔ ان کی عجلت نے یہ دن دکھایا ہے۔ نہ تمہیں سرخ جوڑا نصیب ہوا۔ نہ بیوٹی پارلر کی نوبت آئی۔"

وہ تیزی سے میری طرف گھوم گئی۔ "ہیں؟ کیا؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"یا تو جذبات کے اظہار کو کنٹرول کرو یا آواز کو قابو میں رکھو کہ دوسرے کمرے والا نہ سن سکے۔ صحیح کہہ رہا ہوں ناں۔" میں نے شوخ لہجہ اختیار کیا۔

بے چاری' سارے خوابوں کو آگ نہ لگے۔ نہ جانے کتنے خواب بے تعبیر ہو گئے ہوں گے۔

"ہائے اللہ!" کہہ کر دانت زبان میں دبا کر منہ موڑ لیا۔ پھر انگلیاں چٹخانے لگی۔

"خیر' فکر نہ کرو۔ امی کو بھی علم ہے کہ.... لال جوڑا کتنا ضروری ہے۔ وہ بنوالیں گی' میک اپ بھی بیوٹی پارلر سے ہو جائے گا۔ مگر ابھی نہیں۔ رخصتی کے وقت اور اس میں ابھی دیر ہے۔ وہ "ہائے اللہ" کہہ کر پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔ مجھے ہنسی آگئی۔

"اچھا چلو' ابھی چلتے ہیں کسی بیوٹی پارلر۔ اپنا ارمان پورا کر لو۔ لیکن فائدہ ہی کیا ہے؟ میں نے تو تمہیں اس حلیے میں دیکھ ہی لیا ہے اور اگر دوسروں کو دکھانے کے لیے۔ میک اپ ضروری ہی ہے۔ تو اب تو سب مہمان رخصت ہو چکے۔ کیا بن سنور کر آئینہ دیکھتی رہو گی۔ خوش ہونے کے لیے اس میں بھی حرج تو کوئی نہیں ہے۔ آؤ پھر۔"

وہ بھنا کر اٹھی' چہرے پر غصہ کی علامات تھیں۔

واش روم میں گھس کر دروازہ زور سے بند کیا۔ مجھے اس کے غصے پر اور اس حرکت پر زور کی ہنسی آئی۔ اب ہنسی روکی تو نہیں جا سکتی۔

"جائیں یہاں سے۔" اندر سے اس کی آواز آئی۔ جھلاتی ہوئی۔

مجھے پھر ہنسی آگئی۔ اس کے باہر نکلنے کے آثار نہ تھے۔ اس لیے اسے بتا کر کہ میں جارہا ہوں۔ باہر نکل آیا۔ ڈرائنگ روم میں امی پریشان سی کھڑی تھیں۔ اجو بھیا سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"عادل تم اور سماں۔ ابھی چلے جاؤ اظہر کے ساتھ لاہور۔" ان کے انداز میں عجلت اور فکر مندی تھی۔

میں اپنی جگہ ٹھٹک گیا۔ "ابھی؟"

"ہاں ابھی۔ تم نے وعدا کیا تھا کہ میری ہر بات مانو گے۔ اب کوئی سوال نہیں کرنا۔ بہتری اسی میں ہے۔ مجھے کچھ خطرہ نظر آرہا ہے۔"

اجو بھیا نے بھی کہا۔ "امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ چلو اس سے پہلے کہ......"

"کیا اس سے پہلے میں سمجھا نہیں۔ کیا رخصتی اس طرح...... امی کو کیا ہو گیا ہے۔" ہونقوں کی طرح امی کو دیکھنے لگا۔ اجو بھیا نے تیزی دکھائی۔ وہ سماں کو لے کر آگئے نہ جانے اس سے کیا کہا ہو گا۔ امی نے اسے گلے لگایا۔

"بیٹا میری جان! مجھے معاف کر دینا۔ سب کچھ اس طرح نہیں ہو پا رہا۔ جیسا میں چاہتی تھی۔ مگر کبھی کبھی حالات ہمیں مجبور کر دیتے ہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ تم لوگ اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے گوہر سے کسی نیک ارادے کی امید نہیں۔"

سماں سٹپٹائی ہوئی تھی۔ "پھپھو پاپا؟"

"اسے گوہر کمرے میں لے کر بند ہو گئی ہے۔ نہ جانے کیا منصوبے بنا رہی ہے۔ میں اس کی فطرت سے واقف ہوں۔ وہ تمہارے لیے کچھ اچھا نہیں سوچ سکتی نہ اپنی شکست قبول کر سکتی ہے آسانی سے۔ میں بعد میں آؤں گی۔ یہاں حالات کو کنٹرول کرنے کے بعد۔ چلو دیر نہ کرو شاباش۔"

اجو بھیا نے سماں کا ہاتھ پکڑ کر اسے تقریباً" دھکا سا دیا۔ دوسرا دھکا مجھے میں تو ہکا بکا۔ معمول بنا ہوا تھا۔ اجو بھیا نے اپنی گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھالا۔ اس سے پہلے وہ پچھلی سیٹ پر سماں کو بٹھا چکے تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ پیچھے سے سماں کی سسکیاں۔ اف کیا یہ واقعی رخصتی ہوئی ہے۔ یا امی کی بدگمانی۔

"پاپا پاپا۔" سماں کی آواز فریاد کر رہی تھی۔

"سماں بیٹا! روتے نہیں۔" اجو بھیا نے اسے تسلی دی۔ "امی تمہارے پپا کو لے کر آئیں گی۔ مل لینا ابھی تم دونوں کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" وہ خاصے فکر مند تھے۔

"اجو بھیا۔ آخر بات کیا ہے۔ مجھے تو امی نے کچھ بتایا نہیں۔"

"بتاتا ہوں۔ امی جو کر رہی ہیں۔ وہ صحیح ہے۔ دراصل۔ تمہاری ممانی کو اپنی ذلت کا دکھ ہے۔ وہ ماموں سے...... تم دونوں کی علیحدگی کی بات کر رہی ہیں کہ تم پر دباؤ ڈال کر طلاق دلوائی جائے۔ اور ان کی طے کی ہوئی شادی کو وقت مقررہ پر ہونے دیا جائے۔"

مجھے سکتہ ہو گیا نہ جانے...... یہ کہاں تک درست تھا۔

"امی جب ماموں کے دروازے پر دستک دینے لگیں۔ کیونکہ وہ کافی دیر سے اندر تھے۔ تو امی نے ممانی کی آواز سے اندازہ لگایا اور پھر بغیر دستک دیے آگئیں۔ اور مجھ سے مشورہ کیا۔ کیا یہ غلط فیصلہ تھا؟ تم ہی بتاؤ۔"

اجو بھیا نے مجھے دیکھ کر کہا۔

سماں کی سسکیاں بھی رک گئیں۔

"امی نے صبح ہی ممانی کے گھر سے غائب ہونے پر ان کی نیت بھانپ کر تمہارے نکاح میں عجلت کی۔ دیکھو قدرت کو یہ ملاپ منظور تھا۔ تو سب وقت پر پہنچ گئے۔ اور سب کچھ ہو گیا۔ ورنہ ان کا منصوبہ تو آج رات کو اس شیف کے ساتھ نکاح اور رخصتی کا تھا۔ ہم ان سے زیادہ تیز نکلے۔ ان ہی کے منصوبے پر...... اپنا

عمل کر دکھایا۔ کیوں کیسی رہی۔"

اب وہ ہنس رہے تھے۔ "ہاہاہا" گاڑی کی رفتار کچھ تیز تھی۔ میں نے اس طرف اشارہ کیا تو کہنے لگے۔

"ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں نکلے۔ جو عورت اس قدر سازشی ذہن رکھتی ہو۔ وہ کسی کو ہمارے تعاقب میں بھی بھیج سکتی ہے۔ ظاہر ہے ہماری منزل لاہور ہی ہے۔ اب سوچ رہا ہوں۔ لاہور کے بجائے ہم پشاور کا پروگرام بنا لیتے تو وہ زیادہ محفوظ تھا لیکن اللہ نے اب تک مدد کی ہے تو آئندہ بھی وہی مدد کرے گا ان شاء اللہ۔۔۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلا شبہ ان کا چچا جان پر ہو۔ ان کے گھر بھی کسی کو دوڑا دیں۔ تصدیق کے لیے۔"

"لیکن آخر۔۔۔ وہ اس شیف سے کس لیے متاثر ہیں۔ آخر کوئی وجہ یا لالچ یا کوئی اور مقصد' لیکن کیا؟"

"سمال سے ضد یا وہ شخص بڑے خاندان کا داماد بن کر کوئی مالی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو یا پھر صرف اعلا با رسوخ خاندان کا فرد بننا ہی مقصد ہو۔ کچھ بھی ممکن ہے۔ بہر حال ہمیں ذہن تھکانے کی ضرورت نہیں۔"

"اجو بھیا آپ کا کل آفس ہے۔ آپ ہماری وجہ سے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں بس میں بٹھا دیں۔"

"نہیں۔ دیکھوں گا خیر' رات میں کسی وقت نکل جاؤں گا پشاور کے لیے۔

اصل میں۔۔۔ آصفہ بہت ڈرتی ہے۔ رات میں تنہائی کے بھوت اسے تنگ کرتے ہیں۔ اس لیے واپس جانا ضروری ہے۔"

"اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ ہم بس سے جا سکتے ہیں۔" میں نے زور دیا۔ لیکن اب پنڈی شہر پیچھے رہ گیا تھا۔ اور اجو بھیا بہت مگن انداز میں ڈرائیو کر رہے تھے۔ پچھلی سیٹ پر خاموشی تھی۔ نہ جانے کیا سوچ رہی ہو گی۔ شیف سے شادی۔ کھانے تو مزے دار ملتے۔

☼ ☼ ☼

لاہور آ گیا۔ ہم اپنے محلے میں داخل ہو گئے۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ اجو بھیا نے واقعی بہت جلد منزل پر پہنچا دیا تھا۔ گیٹ پر نورین پھولوں کی پتیاں لیے کھڑی تھی۔ (استقبال ؟) چند سہیلیاں اور پیچھے آپا بھی موجود۔ ہم گاڑی سے اترے۔ گل پاشی ہوئی۔ انہوں نے چند گانے گا کر ہمیں خوش آمدید کہا۔

اجو بھیا نے دونوں بہنوں کو لپٹا لیا لڑکیوں سے بھی مخاطب ہوئے۔ پھر آپا سے کہا۔

"ارے تمہارے ہاتھوں میں پھول کیوں نہیں ہیں؟"

"میں خود بھی خالی ہاتھ ہوں اجو بھیا۔" آپا کی آواز رندھ گئی۔

میں نے نورین کے سر پر چپت رسید کی "یہ کیا ڈرامہ کر رہی ہو تم۔"

"واہ جی۔ ایک تو اس قدر افراتفری میں آپ کی شادی ہوئی۔ ڈراما آپ نے کیا۔ میں تو لگ گئی کام سے۔ سب دوستوں کو بلایا۔ کھانا پکایا۔ آپ کو ایسی کیا آفت تھی۔ یا سمال کہیں بھاگی جا رہی تھی؟ وہ تو سدا آپ کی ہی تھی۔ پھر یہ۔ جو میرے بغیر آپ نے شادی رچالی ہے۔ جرمانہ بہت شدید ہو گا۔ یعنی کہ ہزاروں۔۔۔"

"امی سے لینا۔ میرا اس میں کوئی دخل نہ قصور۔"

یہ کہہ کر میں تو اپنے کمرے میں جا گھسا۔ لاؤنج میں لڑکیوں نے محفل جمائی تھی۔ سمال کو بیچ میں بٹھا کر گانے شروع ہو گئے۔ میں نے جھانکا۔ اجو بھیا بھی وہیں کرسی پر براجمان تھے۔ آپا بھی اررے۔ مگر یہ کیا۔ کیا یہ میرا کمرہ ہے۔ اب غور کیا۔ ہر طرف چمکیلی پتیوں والے مصنوعی پھولوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ گلدانوں میں بھی نقلی پھولوں کی سوکھی بہار۔ پلنگ پر جو چادر تھی۔ گلابی رنگ کے پھولوں سے مزین۔ درمیان میں ایک لال پری اڑتی نظر آئی۔ اف یہ چادر کہاں سے نکالی گئی ہے اس قدر پھول دار پری سمیت۔

"نورین' نورین۔" میں نے اسے پکارا۔ "یہ' یہ کیا حشر کیا ہے میرے کمرے کا۔"

"اتنا اچھا تو لگ رہا ہے۔ کس مشکل سے مارا مار جا



کر خریدی تھیں یہ لڑیاں۔ اصلی پھول بہت مہنگے تھے ناں بھئی۔" بے چارگی کی تفسیر بنی کھڑی تھی۔ اجو بھیا آگئے۔ ہنسنے لگے۔

"ٹھیک تو ہے۔ اب جلدی کا کام تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" ذرا سماں کو تو بلا کر لاؤ۔ وہ بھی دیکھے اپنا حجلہ عروسی۔"

میں نے جب تک دو لڑیاں ہی دیوار سے اتاری تھیں جب سماں کو وہ آفت زدہ لڑکیاں پکڑ لائیں۔ اف یہ مضحکہ خیز صورت حال۔ میں بھنا کر باہر آگیا۔ اور صوفے پر گر گیا۔ اجو بھیا نے آکر کہا۔

"ارے گاڑی جہاز کی رفتار سے میں نے چلائی۔ تھک تم گئے۔ واہ نورین چائے۔"

چند منٹ بعد ہی نورین چائے لے آئی۔ "کڑک چائے بنائی ہے۔ تاکہ آپ لوگوں کی تھکن اتر جائے۔"

"وہ اپنی کارگزاری کا ڈھول نہ پیٹے' کیسے ہو سکتا تھا۔

"اور سماں کو امی کے کمرے میں لے جا کر لٹا دیا ہے تاکہ وہ بھی اپنی تھکان اتار لے۔ یہاں تو شور ہو رہا ہے اور بھائی نے اپنے کمرے کو کباڑ خانہ بنا دیا ہے۔"

"صرف دو لڑیاں اتار کر پھینکی ہیں۔ تم انہیں اٹھا نہیں سکتیں؟ اور ہاں یہ کباڑ آپ کا ہی مہیا کیا ہوا ہے۔" میں چڑ گیا۔

"نورین! تم سماں کو بھابھی نہیں کہو گی؟" اجو بھیا نے ٹوکا۔

"عمر بھر نام لیا ہے۔ مجھ سے چھوٹی ہیں محترمہ صاحبہ۔" منہ بنا کر توجیہہ پیش کی۔

لڑکیوں نے پھر ڈھول سنبھال لیا تھا۔ شادی کے گھر کا ماحول بن گیا۔ آپا خاصی ست سی تھیں۔ مجھے یک لخت یاد آیا۔

"بھائی جان ۔۔۔ انہوں نے یقیناً" کوئی فساد برپا کیا تھا۔ آپا بلاوجہ چپ نہیں رہ سکتیں۔ ان کو غصہ بھی آتا تھا۔ اور وہ ہم لوگوں پر بگڑنا اور جھگڑنا اپنا حق سمجھتی تھیں۔ مگر بھائی جان خود بہت غصے والے تھے۔ خاصے گستاخ واقع ہوئے تھے۔ لحاظ و مروت سے عاری۔ آپا ان کے غصے سے ڈر جاتی تھیں۔ اجو بھیا نے آپا کو اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا اور میری ناگہانی شادی کا حال سنانے لگے۔ نورین بھی آگئی۔

"اب ایسا ہے کہ ۔۔۔ کھانے کے بعد میں چلا جاؤں گا۔ راشد بھائی سے مل کر آتا ہوں۔ تب تک تم کھانا لگاؤ۔ مہرین کو بھی چھوڑ دوں گا گھر بچوں سے گپ شپ ہو جائے گی۔" وہ کھڑے ہوئے تو آپا بھی کسمساتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔

"میں گھر میں بیٹھ کر کیا کروں گا۔" میں نے کہا۔ "میں بھی چلتا ہوں۔"

"تم؟ کیوں؟ یار! تم تو گھر میں رہو۔" اجو بھیا نے کہا۔

"میں بھی بچوں سے مل لوں گا۔ لڑکیوں میں بیٹھ کر کیا کروں؟" میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"صرف لڑکیاں ہی نہیں ہیں۔ تمہاری ایک عدد دلہن بھی ہے یہاں۔ اس کو تسلی دو۔ دل بہلاؤ۔"

میں جھینپ گیا۔ "آپ اجو بھیا۔ وہ سو چکی ہے۔"

"بھائی کھانا کھا کر ہی چلے جاتے۔ ابھی لگا دیتی ہوں آپا بھی کھا لیتیں۔" نورین نے مشورہ دیا۔

"نہیں میں وہیں کھا لوں گی۔ دیر ہو گئی ہے۔ سب سو نہ گئے ہوں۔" آپا بے چین تھیں بھائی جان گھر پر ملے۔ جاگ رہے تھے۔ اجو بھیا نے بہت محبت سے انہیں گلے لگایا۔ میرا مصافحہ کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ مانی شانی کو پکارنے لگے۔ ساریہ دوڑتی ہوئی آئی۔ آپا سے لپٹ گئی۔ پھر میری طرف مسکراتی ہوئی آئی۔ ابھی میں نے اس کا ہاتھ پکڑا ہی تھا کہ بھائی جان نے ناگواری سے کہا۔

"ساریہ! اندر جاؤ۔ بوا سے کہو چائے بنا لیں۔ ماں تو تمہاری بھائیوں کی خوشی میں آداب میزبانی بھول گئی ہیں۔ مہمان بن گئی ہیں۔"

ساریہ ڈر کر پیچھے ہٹی اور اندر بھاگ گئی۔ آپا بھی شرمسار سی اندر چلی گئیں۔

اجو بھیا کو عجیب سا لگا۔ بولے "ارے نہیں راشد بھائی۔ ہم مہمان تو نہیں ہیں۔" اصل میں دو سال بعد مہرین سے ملا ہوں میں۔ اس لیے کچھ جذباتی ہو رہی

ہے اور آپ عادل کو تو مبارک باد دیں ... آنا" فانا" ان کو دولہا بنا دیا۔ بے چارہ پکڑا گیا۔ "حکم حاکم مرگ مفاجات" کی مانند۔"

وہ دانت پیس کر بولے "ہوں ہوں۔ جانتا ہوں۔ کس لیے آنا" فانا" یہ کام ہوا ہے۔ میری ضد میں۔"

پھر جو شروع ہوئے تو کسی کو بولنے نہ دیا۔ وہی شکوہ گلہ کہ امی نے محض ان کی ضد میں یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ ورنہ کوئی اس طرح اپنے اکلوتے لائق فائق بیٹے کی شادی کر سکتا ہے۔ جس میں کوئی شریک نہ ہو۔ یہ محض داماد کو ذلیل کرنے کے لیے ڈراما کیا ہے۔"

اجو بھیا نے ان کے چپ ہوتے ہی صفائیاں دینا شروع کیں۔ انہیں سمجھانا چاہا کہ اس وقت سچویشن ہی ایسی ہو گئی تھی کہ مجبورا" اس طرح عجلت میں نکاح کرنا پڑا۔ ورنہ یہ رشتہ تو امی نے بچپن سے ہی ان لوگوں کا طے کیا ہوا تھا بلکہ اس معاملے کو عادل اور سمال سے بھی پوشیدہ رکھا تھا۔ کہ جب بڑے ہو جائیں گے تو ظاہر کیا جائے گا۔ لیکن سمال کو والدہ کی فوتگی اور دوسری ماں کی کوشش کہ ان کی مرضی سے سمال بیاہی جائے۔ امی کو مجبورا" یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ عادل کو تو منگنی کی نیت سے بلایا تھا۔ مجھے بھی مگر۔۔۔ حالات ایسے ہو گئے۔ میں نے خود عادل کو سمجھا کر فوری نکاح کے لیے راضی کیا تھا۔"

اجو بھیا تو حقیقت بیان کر رہے تھے۔ مگر بھائی جان بھلا کس کی سنتے ہیں۔ ضدی اڑیل پھر سے شروع ہو گئے۔ اور کھل کر بتانے لگے کہ وہ عادل سے اپنی بہن بیاہنا چاہتے تھے۔ اور یہ عمل۔۔۔ اب بھی ممکن ہے۔ اجو بھیا میری طرف دیکھنے لگے۔ میں مجرموں کی طرح گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ بھائی جان دانت پیس رہے تھے۔ ہونٹ چبا رہے تھے۔ اجو بھیا نے غور نہیں کیا۔ مگر میں چونک گیا۔ اب بھی ممکن ہے۔" کا مطلب کیا تھا۔ وہ اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔

"اجو بھیا! چلیں۔" میں نے کھڑے ہونے میں عافیت سمجھی۔ اجو بھیا کھڑے ہو گئے۔

"جاتے ہوئے اپنی بہن کو ساتھ لے جانا۔ میری بہن میرے گھر تمہاری بہن تمہارے گھر۔"

اجو بھیا حواس باختہ ہو گئے۔ یہ کیسی جاہلانہ فرمائش تھی۔ میں تو جانتا تھا اس لیے پرسکون تھا۔

"بھائی! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔"

"ہے تو سہی۔ مگر اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولے۔

اب دونوں میں نئے سرے سے بحث شروع ہو گئی۔ دلیل، تاویل، معذرت، صفائیاں، وضاحتیں، سب فضول، بیکار۔ ایک ضدی، ہٹ دھرم، جاہل (میری نظر میں) محض اڑا ہوا تھا، بچوں، گھر کی تباہی کا کسی کی اہمیت نہ تھی۔ اہمیت تھی تو اپنی ذات کی، اپنے فرمودات کی۔

"بھائی! خدا کا خوف کریں۔ بے قصور عورت کو کس بات کی سزا دینا چاہتے ہیں آپ۔۔۔ بچوں کو ماما سے محروم کر کے گناہ مول لے رہے ہیں۔" بھیا زچ ہو کر گڑگڑانے لگے۔ تقریبا"۔

"تو جس کا قصور ہے۔ اس سے کہو۔ اب بھی وقت ہے۔ میری بات مان لے۔ میری عزت رکھ لے۔ بہنوئی سمجھتا ہے تو اس کا وقار بھی قائم رکھے۔"

"جی؟ میں سمجھا نہیں۔ کیسے؟ یعنی کہ" اجو بھیا گڑبڑا گئے۔

"ایسے کہ میری بہن سے شادی کر لے۔ ابھی وقت گزرا نہیں۔" اجو بھیا بوکھلائے۔ میں تلملایا بلکہ ہونق بن گیا۔

"صاف بات ہے۔ میری بہن کی عادل سے شادی، تمہاری بہن کی آبادی۔ اب اجو بھیا ہونق بن گئے۔ پہلے مجھے پھر بھائی جان کو دیکھا۔ بے یقینی سے۔"

"مگر عادل کی تو شادی ہو چکی ہے۔"

"رشتہ تو میں نے پہلے دیا تھا۔ مجھے ذلیل کرنے کے لیے آنا" فانا" وہاں جا کر رشتہ طے کر دیا۔ کیا قیامت پیچھا کر رہی تھی کہ لڑکی بھاگی جا رہی تھی۔"

"استغفار بھائی کس طرح کی سوچ ہے آپ کی۔ خاندانی معاملے میں ایمرجنسی ہو بھی جاتی ہے۔ بتایا تو

تھا ابھی آپ کو۔" سخت حیران تھے اجو بھیا مگر ضدی اڑیل شوہر گرمانے پر تیار نہ تھا۔ راشد مسعود نام کا۔

"اگر میری بہن کی آبادی کے لیے یہی شرط ہے آپ کی۔ تو میں مانے لیتا ہوں۔ میں کرلوں گا آپ کی بہن سے نکاح۔" اجو بھیا پسپا ہو گئے۔

"چونک گئے۔ کندھے اچکائے۔" میں تمہارا بسا بسایا گھر کیوں اجاڑوں؟ جانتا ہوں تم اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے ہو۔ عادل نے تو ابھی اسے دیکھا بھی نہ ہو گا۔ زبردستی کی شادی ہوئی ہے۔ اسے سمجھالو۔ بس۔"

منہ موڑا اور اندر غڑاپ۔۔۔ سفید چہرہ لیے آپا بھی اندر چلی گئیں۔ اجو بھیا سکتے کی سی کیفیت میں کھڑے تھے۔ میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ جہاں اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ کوئی جگنو نہ تھا۔ نہ سکھ کا اجالا۔ نہ اطمینان کی کرن۔ صرف تاریکی۔ اندیشے اور فکر۔

میں نے دل کو ٹٹولا کیا مجھے قربانی دینی چاہیے؟ آپا کے سکھ کی خاطر۔ بچوں کی خاطر۔ بھائی جان کے وقار کے ثبوت کے لیے۔ لیکن کیوں؟ بھائی جان یہ کیوں نہیں سوچ رہے۔ اجو بھیا کا بسا ہوا گھر کیوں اجاڑیں۔ اپنا ہی اجاڑلیں۔ مقصد؟ فضول۔۔ بہن کی شادی اب سے دس سال پہلے ہو جانی چاہیے تھی۔ نہیں ہو سکی تو ہمارا کیا قصور۔ اب ہوش آیا ہے؟ واہ بھئی میں ہی مٹی کا مادھو ملا انہیں۔ کوئی راستہ۔ کوئی حل' آسان سی کوئی تدبیر کچھ نہیں۔۔۔

"چلیں؟" میں نے خیالوں میں گم اجو بھیا کی آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا۔ مایوسی اور صدمہ ان کے خوب صورت چہرے پر رات کی تاریکی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ ہم دونوں مڑے۔ پیچھے سے آپا کی آواز آئی۔

"ٹھہرو' مجھے بھی جانا ہے۔" اجو بھیا نے مجھے ہمیں نے مڑ کر آپا کو دیکھا۔ وہاں وہی تاریکی تھی۔ اندر سے بچوں کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ ساریہ بلبلا رہی تھی۔ اف۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ گھر میں رہو۔ بچوں کے پاس۔" اجو بھیا انہیں ڈانٹ رہے تھے۔

"نہیں رہ سکتی۔ جانے کا علم ہوا ہے۔"

"کچھ دن رہ کر سمجھاؤ تسلی سے 'مزنہ کو کہو وہ سمجھائے۔"

"انہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں۔ صرف فرشتے سمجھا سکتے ہیں اور میں اور مزنہ فرشتے نہیں۔" عجب سا صبران کے لہجے میں تھا۔ میں ٹھٹھرنے لگا۔

"اچھا رکو۔ میں ایک کوشش اور کر کے دیکھتا ہوں۔"

اجو بھیا گھر کے اندر چلے گئے۔ میں اندھیرے کی چادر آگے بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ آپا شاید کوئی آس کا سرا تھامے کھڑی تھیں۔ میں جانتا تھا۔ بھائی جان اب کوئی دلیل نہیں مانیں گے ان کی انا درمیان میں تھی۔ وہی ہوا صبر آزما چند منٹ جو شاید گھنٹوں پر محیط تھے۔ گزر گئے۔

اجو بھیا۔۔۔ آگئے تھے۔ سیاہی نے ان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے آئے اور آگے کو چل پڑے۔ میں نے بیگ آپا سے لے لیا۔ ان کا بازو پکڑ کر میں بھی باہر نکل آیا۔ گھر میں۔۔۔ اب خاموشی تھی۔ نورین نے کھانا میز پر رکھ دیا تھا۔ آپا کو بیگ سمیت آتا دیکھ کر کوئی سوال نہیں کیا۔

"سماں نے کھانا کھالیا؟" اف اجو بھیا کا خیال۔ ان حالات میں بھی انہیں سماں کی فکر۔

"جی۔ میں نے سماں نے 'سب سہیلیوں نے۔ اجو بھیا' مانی شانی اور ساریہ کو بھی لے آتے۔"

آپا جو محض اجو بھیا کی خاطر کھانے لگی تھیں میز پر سر رکھ کر رونے لگیں۔ سب نے ہاتھ روک لیے۔ بھیا بے چینی سے ٹہلنے لگے۔

"اف مہرین! میرے ساتھ چلو۔ میں ان حالات میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ رک بھی نہیں سکتا۔ مجھے آج ابھی روانہ ہونا ہے۔ آصفہ نے ڈرنا شروع کردیا ہو گا۔"

"نہیں بھائی۔" آپا نے سر اٹھا کر کہا۔ "آپ جائیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" ان کی سرخ آنکھیں الفاظ کی نفی کر رہی تھیں۔

"تم چلو میرے ساتھ۔ دو تین دن بعد چھٹی لے کر آجاؤں گا ساتھ آجانا۔ ایک بار اور کوشش کرلوں۔"

مگر آپا نے کچھ سوچ کر فیصلہ کرلیا تھا۔

"نہیں بھیا! میں ٹھیک ہوں۔ آپ جائیں۔" وہ باہر برآمدے میں نکل گئیں۔ اجو بھیا کو ہم نے زبردستی باہر بھیجا۔ میں نے اور نورین نے انہیں گاڑی میں بٹھایا۔

"اجو بھیا! فکر نہ کریں۔ بھائی جان بد مزاج ہیں مگر بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کچھ وقت گزرے گا تو۔ غصہ کم ہوجائے گا۔"

"کاش آپ بھابھی کو بھی لے آتے۔ تو میں کبھی آپ کو آج جانے نہ دیتی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ امی کو خیال ہی نہ آیا کہ..... ایک بڑی بہن ایک چھوٹی بہن ایک اکلوتی بھابھی بھی شادی میں شریک نہ ہوئیں۔ دیکھیے گا۔ میں ان سے کتنا لڑوں گی اس بات پر۔"

سخت خفا تھی۔ اجو بھیا مسکرانے لگے۔ پھر نورین کو گلے لگالیا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ان کی نظریں نہ جانے مجھ سے کیا کہہ رہی تھیں۔ کوئی سوال کوئی خواہش شاید آپا۔

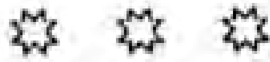
میں نے انہیں نظروں ہی نظروں میں تسلی دی۔ پھر وہ چلے گئے۔ اور اندر گھر میں آنے تک میں نورین کے سوال کا جواب دے چکا تھا۔ آپا کی بیگ کے ساتھ تشریف آوری۔ نورین جاننا چاہتی تھی۔ ایسا کیا ہوا جو وہ بچوں کے بغیر پہلے بھی اور اب دوبارہ بھی آگئیں۔ آج سے پہلے کبھی ایسا ہوا نہ تھا۔

اور جب میں نے بھائی جان کی فرمائش 'ضد' حکم سنایا وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے چپ کی چپ رہ گئی۔

اندر آکر اس نے فون اٹھایا اور آصفہ بھابھی سے بات کی انہیں اجو بھیا کی روانگی کا بتا کر تسلی دی۔

"پریشان نہ ہوں بھابھی' بس کسی وجہ سے دیر ہو گئی۔ لاہور' ہاں ہاں لاہور آگئے تھے نا۔ بہت فاسٹ ڈرائیو کرتے ہیں بھیا۔ ان شاء اللہ جلدی پہنچ جائیں گے۔ آپ تب تک ٹی وی ڈرامے دیکھیں۔ جی میں نے آیت الکرسی پڑھ کر دم کردیا بھیا پر بھی گاڑی پر بھی۔ فکر نہ کریں..... وہی آکر بتائیں گے آپ کو لاہور آنے کی وجہ۔ اور دیر ہونے کی وجوہات۔ اللہ حافظ۔"

پوری دادی اماں بن جاتی تھی سب کی۔ میں کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی نیند کا حملہ ایسا شدید کہ کچھ ہوش نہ رہا۔ حالانکہ نہ ذہن مطمئن تھا' نہ دل پر سکون۔



صبح ہر، حسب معمول اجلی اور روشن۔ بوا نے ناشتہ میز پر رکھ دیا تھا۔ خوشبودار آملیٹ اور پراٹھے۔ نورین چائے کی کیتلی لیے آرہی تھی۔ حسب عادت کچھ بولتی ہوئی۔ میں نے آپا کے متعلق پوچھا۔ منہ بنانے لگی۔

"انہیں کیا ہونا ہے۔ ٹھیک ہیں۔ چپ چپ سی ہیں۔ اپنی دلہن کے بارے میں تو پوچھیں۔ بے چاری آدھی رات کو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ روتی رہی۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"لو..... مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ بھئی امی کی وجہ سے۔ اپنی بے تکی شادی کی وجہ سے..... اور آپ نے پلٹ کر خبر تک نہ لی۔"

"میں؟ میں کیا خبر لیتا؟ مجھے تو خود ہی کچھ عجیب عجیب سا لگ رہا ہے۔ بھائی جان نے مجھے چور بنا دیا ہے۔ اجو بھیا کس قدر پریشانی میں گئے ہیں۔ آپا الگ..... بلا خطا کے سزا کی مستحق ٹھہرائی جارہی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے۔ یہ شادی ہی غلط وقت پر ہوئی ہے اور امی نے اپنی بھتیجی کی محبت میں..... سب کو امتحان میں ڈال دیا ہے میرے بارے میں تو سوچا ہی نہیں۔" افوہ میں بھی

"اچھا جی تو شادی کے وقت کیوں چپ رہے۔" نورین بد مزاج نہ تھی۔ مگر اس وقت وہ بھی اپنی کزن کی حمایت میں بگڑ رہی تھی۔ "سب کی بے چاری نظر آرہی ہے۔ وہ بے چاری معصوم بے خطا پڑی ہے ادھر۔ روتی رہی غریب۔"

"اچھا، اچھا آپا کو بلا کر لاؤ اور سماں کو بھی۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"بلایا ہے۔ آجائیں گی۔ سماں کو امی کی فکر ہے۔ گوہر جان سے کچھ بعید نہیں وہ.... کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ ماموں کو مٹھی میں لے رکھا ہے۔"

"امی بہت بہادر اور ہمت والی ہیں۔ انہیں کوئی ڈرا نہیں سکتا۔ میں ماموں کے آفس فون کر کے خیریت پوچھ لوں گا۔ گھر پر شاید ممانی کو اچھا نہ لگے۔"

آپا آگئیں۔ سماں کو نورین لے کر آئی۔ آپا کے چہرے پر غصہ، کرختی اور بے زاری صاف نظر آرہی تھی۔ وہ سماں کو نظروں سے جلا کر بھسم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ظاہر ہے انہیں سماں قصوروار لگ رہی تھی۔ سماں سر جھکائے ناشتہ کر رہی تھی۔ نورین اس کی خاطر میں لگی ہوئی تھی۔ اور کچھ دلچسپ فقرے بھی چست کر رہی تھی۔

آپا کو نورین پر بھی غصہ آرہا تھا۔ وہ اسے جھڑک دیتیں۔ مگر نورین کو پروا نہ تھی۔ اسے سماں کو خوش کرنا تھا۔ سماں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ پتا نہیں۔ اسے ہنسی آ بھی رہی تھی یا نورین فضول بول کر.... شاید آپا کو ہی غصہ دلا رہی تھی۔ ان کو تو اپنے میاں صاحب پر غصہ آنا چاہیے تھا۔ مگر وہاں تو گم صم تھیں۔

"آپا! آپ بھائی جان کو سمجھاتیں۔ کتنی غلط ضد اور فضول فرمائش مجھ سے کر رہے ہیں۔ اور آپ کو بھی بے قصور.... یہ تو زیادتی ہے۔"

"میں کچھ کر سکنے کی پوزیشن میں ہوتی تو سمجھاتی۔ تم نے مجھے موقع دیا نہ حق۔" ان کا لہجہ تلخ، بیزاری اور شکوے سے پر تھا۔

"آپا.... آپ پہلے ہی.... یہ موقع آنے ہی نہ دیتیں۔ مزنہ آپا مجھ سے کتنی بڑی ہیں۔ اور میں پچھلی بار یعنی جب پہلی دفعہ بھائی جان نے تجویز دی تھی۔ تب ہی انکار کر چکا تھا۔ میں.... مزنہ آپا کی عزت کرتا ہوں۔ بہن سمجھتا ہوں۔ کتنے غلط موقعے پر انہوں نے یہ شوشا چھوڑا ہے۔ اور اب تو...."

"ہاں۔ اب تو تم مجبور ہو۔" وہ جھلا گئیں۔ "ایک بہن کی خاطر کیا یہ کڑوا گھونٹ نہیں پی سکتی تھے۔ اگر میری جگہ نورین ہوتی۔ اس کی خوشی کی خاطر۔ کیا یہی کرتے؟ نہیں کیونکہ وہ تمہاری سگی بہن ہے۔ میں' مجھے بھلا یہ حق کس نے دیا ہے.... ماں جائی نہیں ہوں میں اس لیے...." وہ زہریلے لہجے میں بولیں۔

میں دنگ رہ گیا۔

"آپا! خدا کا خوف کریں۔ ہم نے کبھی آپ کو خود سے الگ سمجھا ہے؟ آپ میری بڑی بہن ہیں۔ جیسے نورین چھوٹی۔ امی نے ہمیں یہ تعلیم نہیں دی۔ انہوں نے خود بھی کبھی آپ کو بیٹی کے درجے سے کم نہیں سمجھا۔ کبھی انہوں نے آپ کی حق تلفی کی؟ ہمیشہ یہی سمجھایا کہ آپ ابا کی بیٹی ہیں۔ اجو بھیا بیٹے ہیں جیسے تم دونوں ہو۔ خون کا رنگ کیا الگ ہوتا ہے۔ آپ کے دل میں یہ خیال آیا کیسے؟"

میری آواز بھی کچھ بلند ہو گئی۔ نورین اور سماں جا چکی تھیں۔ میں نے آپا کی ہمدردی میں یہ ذکر چھیڑا تھا۔ آپا جزبز ہو رہی تھیں۔

"اب کیا بتاؤں۔ خیال پر پابندی تو نہیں لگائی جا سکتی۔ کہنے کو الفاظ بھی نہیں رہے میرے پاس۔ میں تو خالی ہاتھ لاوارث ہو گئی۔" آواز ان کی بھی تھرتھرا رہی تھی۔

"آپا! میرے سوالوں کے جواب دینے کے بجائے۔ خود پر مظلومیت طاری نہ کریں۔ بچے آپ کے بڑے ہو گئے ہیں۔ آپ نے لمبا عرصہ بھائی جان کے ساتھ گزارا ہے۔ پھر بھی آپ ان سے کچھ منوانے میں کامیاب نہیں ہوئیں۔ آپ کو میں ملزم نظر آرہا ہوں۔ بھائی جان کی ہٹ دھرمی میں اس پر غور کر لیتا۔ اور سوچئے آخر کیوں؟ میں اپنی زندگی کے ایسے اہم موقع پر.... اپنی مرضی یا اپنی ماں کی خواہش کے بجائے۔ بھائی جان کی فرمائش کیوں پوری کروں۔ آپ غور کریں۔ ایک سال پہلے تک تو وہ مجھے مخاطب تک نہیں کرتے تھے۔ میں آپ کی اور بچوں کی وجہ سے آپ کے گھر جاتا تھا۔ بھائی جان میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیتے تھے۔ حقارت کی نظر سے دیکھتے اور منہ پھیر کر

الگ بیٹھ جاتے۔ انہوں نے کبھی مجھے اپنے ہم پلہ نہیں سمجھا۔ عزت تو دور کی بات ہے۔ کبھی بات کرنے کے لائق نہیں جانا۔"

میں نے دل کے پھپھولے آج پھوڑ دیے۔ جو حقیقت تھی۔ میرے دل کو اکثر ان کے ناواجب رویے کی چبھن اذیت میں مبتلا کر دیتی۔ امی سے میں نے کئی بار کہا۔۔۔ وہ لاپروائی سے کہہ دیتیں۔

"دبعض لوگ سسرال والوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ تمہیں ان سے کیا۔ اپنی بہن سے ملنے جاتے ہو۔ بچوں کی خاطر ملتے ہو۔ وہ مخاطب نہ ہوں۔ مگر تم سلام بھی کرو اور مخاطب بھی ہوا کرو۔ بعض گھرانوں میں اب بھی یہ طریقہ ہے۔ اسے نظرانداز کر دینا چاہیے۔ مگر عزت میں کمی نہ ہو۔"

اور اب آپا شاید غور کر رہی تھیں۔ لیکن ان کی ضد اور بدگمانیوں کی حد نہ تھی۔ بچپن سے ہم نے ان کو ہر کسی سے لڑتے۔ روٹھتے دیکھا تھا۔

"اگر بہن سمجھتے' میری بربادی کی فکر ہوتی۔ تو کوئی راستہ نکالتے۔ مجھے بے یارومددگار نہ چھوڑتے۔"

آپا بھائی جان سے کم نہ تھیں۔ انہیں سمجھانا۔ ان سے کچھ منوانا۔۔۔ پہاڑ سر کرنے کے برابر تھا۔ ادھر اجو بھیا تھے۔ نرم مزاج' نرم گفتار' صاف دل۔ محبت کرنے والے۔ امی کی تابع داری فرض سمجھتے۔ آپا دراصل اپنی ننھیال کے زیر اثر تھیں۔ جہاں انہیں امی کی طرف سے ورغلایا جاتا۔ سوتیلی ماں کے ظلم و ستم کی داستانیں سنا کر انہیں نفرت پر مجبور کر دیا جاتا۔ اب بھی وہ اپنی مظلومیت پر قائم تھیں۔ ارے بابا۔ وٹہ سٹہ اور اتنا اتھل' بے جوڑ۔

جھک مار کر میں اٹھا۔ اور آفس کے لیے روانہ ہوا۔ جاتے ہوئے بے ارادہ میری نظر سماں کی طرف گئی۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ ہراساں اور پریشان بچاری مجھے غصہ آ رہا تھا۔ ہر کسی پر۔ امی' ماموں' سماں بھائی جان کوئی بھی یہ نہیں سمجھ سکے گا۔ کہ سب نے میرے ساتھ کیسی زیادتی کی ہے۔ میں تو باقاعدہ الو بنایا گیا ہوں۔ ظلم ہوا ہے مجھ پر۔ زبردستی ایک زنجیر سے باندھ کر میرے صبر و ضبط کو آزمایا جا رہا ہے۔ میں کیا اتنا گیا گزرا ہوں۔ شادی۔ افوہ! کسی کی شادی ایسے ہوتے دیکھی نہ سنی۔

اور سماں۔ اس پر سب سے زیادہ غصہ تھا۔ وہ تو کچھ بولتی۔ اپنی خواہش کا اظہار کرتی۔ اکلوتی اولاد تھی۔ وہ ماموں سے کہتی ۔۔۔ اسے یہ شادی منظور نہیں بھئی میں کب اس سے شادی کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ فضول لڑکی امی کی لاڈلی تھی بس۔ پتا نہیں وہ کیا سوچتی ہوگی۔ میری بے اعتنائی آپا کی نفرت۔

افوہ! میں تو امی کی تابعدار اولاد ہونے کے جرم میں سزا بھگت رہا ہوں۔ مجھے امی پر یقین ہے۔ وہ بہت سمجھ دار اور پرشفقت ماں ہیں۔ میرے لیے غلط نہیں سوچیں گی۔ وہ اجو بھیا اور آپا کے لیے اتنی مہربان اور شفیق ماں تھیں۔ میں تو پھر ان کی اولاد ہوں۔ انہوں نے یقیناً"سماں کے لیے بھی اچھا سوچا ہوگا۔ افراتفری اور عجلت کے اس بندھن کو ۔۔۔ مضبوط بنانا اب میری ذمے داری تھی امی نے یہی سمجھایا تھا اور میں ۔۔۔ اف میرا ذہن ۔۔۔ کس قدر منتشر ہو رہا تھا۔

آفس پہنچتے ہی ماموں کو فون کیا۔ بہت خوش تھے۔ سماں کے بارے میں سوال کیا۔

میں نے امی کا پوچھا۔ انہوں نے بتایا۔

"وہ بہت مصروف ہیں۔ جلد آجائیں گی۔"

"افوہ۔" کیوں وہاں رکی ہوئی ہیں؟ بے وجہ کوئی کام نہیں کرتیں۔ یہ تو اہم معرکہ سر کر کے آئیں گی ورنہ ۔۔۔ لاڈلے سپوت اور جان سے پیاری بھتیجی کو اس طرح کیسے چھوڑ سکتی ہیں۔ ڈرتے ڈرتے اللہ کا نام لے کر امی کو ماموں کے گھر ہی فون کر لیا۔ شاید فون کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ شکر ادا کیا۔ پھر ناز بھرے شکوے۔

"آتیں کیوں نہیں آپ حد ہو گئی۔ میں لینے آجاؤں؟ اکیلا چھوڑ دیا مجھے۔ یہاں معاملات خاصے گمبھیر ہیں۔ آئیں نا۔ آکر سدھاریں۔" وغیرہ وغیرہ۔

"فضول باتوں کے لیے فون کیا ہے؟ اب تک تو چپ کی مہر لگائے بیٹھے تھے۔ بے وقوف وہاں کے

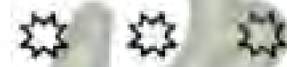
معاملات کیا ہیں؟ اندازہ ہے مجھے۔ نورین کافی ہے سنبھالنے کے لیے۔"

فون کھٹ یعنی بند' چلو یہ جواب تھا اتنے شکووں کا وہ نورین؟ اسے امی نے اپنی ساس یعنی میری دادی کا درجہ دے دیا۔ واہ ہم بے وقوف رہے۔ دانت پیس کر دفتر کے رجسٹر کھول لیے۔ اسٹاف کو خوب ڈانٹا۔ دن بھر چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرکے۔

گھر آیا۔۔۔ یہاں آپا کا موڈ خراب۔ نورین بھی بدمزاجی کے مظاہرے کرتی رہی۔ سماں۔۔۔ اوہ! وہ تو غائب تھی۔ یقیناً" نورین کی تحویل میں ہوگی۔ نورین کو اللہ موقع دے۔ امی کی کمی پوری کرنے کے لیے ہمہ تن مستعد۔ قائم مقامی میں اس کا ثانی ملنا مشکل تھا۔

کھانا کھا کر ایک دوست کی طرف چلا گیا۔ دیر تک وہاں لطیفوں کا مقابلہ ہوا۔ گھر آیا۔ نورین نے غصے سے مجھے دیکھا۔ اس سے زیادہ قہر آلود نظروں سے میں نے اسے گھورا۔ اور بغیر کچھ بولے اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔

بھئی اب دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ جبکہ۔۔۔ امی کی جواب دہی کا خوف بھی نہ ہو۔ اور دوستوں کی دلچسپ محفل۔



اور یہ دوستوں کی محفل اگلے تین دن' رات گئے تک جاری و ساری' جگمگاتی رہی۔ مسائل سے بچنے کا بہترین طریقہ۔ لیکن۔۔۔ نا یہ کے۔۔۔ نورین سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ (یا میں نے خود نہ دیا) لیکن وہ بھی کم نہ تھی۔ آگئی۔

"بھائی! آپا کا غصہ بڑھ رہا ہے۔ سماں کی مایوسی۔ کچھ آپ بھی اپنا حصہ ڈالیں۔"

"میں؟ میری بے سکونی دیکھ رہی ہو۔ اف امی کہاں رہ گئیں۔ "فون پر بھی نہیں ملتیں۔" میں بھنا گیا۔

دن بھر فون کرتا رہا تھا۔ مجال ہے کسی نے اٹھایا ہو۔ ماموں بھی۔۔۔ مصروف تھے۔ یا بات کرنے میں انہیں بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا۔ چپ۔

"اچھا؟ بے سکونی کا مداوا۔ ہوں دیکھ رہی ہوں میں مسکراتے ہوئے آتے ہیں آئے کمرہ بند۔ پھر صبح ہی باہر نکلے ناشتہ کیا۔ روانہ' کہاں؟ اللہ جانے؟"

میں گڑبڑا گیا نہ تو۔۔۔ بے سکونی کا مداوا نہ کروں۔ بیٹھا رہوں گھر میں؟ فضول۔"

"اچھا اپنی بے سکونی کا مداوا کرنے کا ہفتہ بھر کا شیڈول طے کرلیا۔ یہاں جو گھر میں سب بے سکون ہیں۔ آپ ان کا بھی کچھ خیال کریں۔ سماں کو تو آپ نے بھلا ہی دیا۔ وہ بے چاری۔"

وہ بے چاری' آپا بے چاری اور میں بے چارہ کیا کروں؟" "تم جو ہو چارہ گر۔ سب کی دادی۔۔۔ بھلا بھائی جان کے غصے کے لیے میں کس طرح جادو کی چھڑی لے کر ان پر اپنا کمال آزماؤں جو وہ خوشی خوشی آپا کو آپ لے جائیں۔"

میرے خیال میں تو یہی علاج تھا بھائی جان کو سیدھا کرنے کا۔ کوئی جادو کی چھڑی۔ آپا کا غم زدہ وجود۔ بچوں سے جدائی کا دکھ' گھر سے دور ہونے کا دکھ۔

"پتا نہیں بھائی جان کا غصہ کب ختم ہوگا۔ اس کے ساتھ سب کی پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔"

"بھائی! آپا اسکول گئی تھیں۔" نورین نے انکشاف کیا "بچوں سے ملنے۔ وہ اسکول نہیں گئے تھے۔ آپا اپنے پڑوسیوں کے گھر گئیں۔ وہاں پتا چلا بھائی جان بہن کو رائے ونڈ خالہ کے گھر چھوڑ کر بچوں کو لے کر کہیں چلے گئے ہیں۔ گھر بند ہے۔"

میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"چلے گئے ہیں؟ یہ بھی آپا کو تنگ کرنے کی کوئی ترکیب ہوگی۔ آپا بہت پریشان ہو گئی ہوں گی؟" مجھے ان پر ترس آگیا۔ بے چاری۔

"پریشان؟ جی نہیں۔ ان پر جنون طاری ہو گیا۔ غصہ' جلال' آگ بگولہ۔۔۔ نہ کھایا پیا۔ نہ ہمیں کھانے دیا۔ سب بھوکے بیٹھے ہیں۔"

نورین۔۔۔ اس لیے زیادہ مشتعل تھی۔ بھوک کی کچی تھی۔۔۔ نہ کہ دن بھر کھانا ہی نہ ملے۔۔۔ بے چاری۔

"کچن کی نگرانی کر رہی ہیں۔ کسی کو اندر جانے کی

اجازت نہیں ہے۔ کہتی ہیں۔ میں بھوکی مروں تم لوگ کھاؤ۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ سب مریں گے ساتھ، یہ حال ہے۔"

"اچھا چلو تم کچن میں، میں آپا کو بہلا کر مناؤں گا۔ انہیں سمجھانا مشکل ہے۔ مگر کچھ کرنا پڑے گا۔"

میں آپا کے پاس آگیا۔ ان کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہونا پڑا۔ نورین کے لیے راستہ صاف کرنا ضروری تھا۔ اب میں نے۔۔۔ کچھ اداکاری اور زیادہ دلی محبت سے انہیں بہلانا شروع کیا۔ پیار سے، لجاجت سے، گڑگڑا کر وہ دن بھر شاید روتی رہی تھیں۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں منہ لال ہو رہا تھا۔ میری تسلیاں دلاسے مزید دکھی کرنے لگے۔ پھر سے آنسو بہانے لگیں۔

گھنٹہ بھر لگا۔ مگر میں نے انہیں کچھ منا ہی لیا۔ نورین کو پکار کر چائے لانے کا کہا۔ خود بھی پی انہیں بھی پلائی۔ بسکٹ کھلائے۔ زبردستی ان کے منہ میں ڈالے۔ غرض کچھ طبیعت بحال ہوئی۔ رات تک ان کے پاس بیٹھا تسلیاں دیتا رہا گو کہ مجھے بھائی جان سے کوئی خاص امید نہ تھی کہ وہ بچوں کا خیال کر کے اپنی ضد سے باز آئیں گے۔ لیکن آپا کو میں یہی باور کرا رہا تھا کہ بچوں کے اصرار اور ضد سے مجبور ہو کر وہ آپا کو لینے خود آئیں گے۔ اس میں کوئی دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں۔

ان کا موڈ بحال ہوا۔ پھر نورین نے کھانے کے لیے بلایا۔ تو میں ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر لے چلا۔ ان سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ ساریہ کی۔ مانی شانی کی۔ کھانے میں پلاؤ تھا۔ مجھے پلاؤ بہت پسند تھا بریانی کے مقابلے میں، سماں بھی آگئی تھی۔ نورین سلاد، رائتہ اور ٹماٹر کی چٹنی لے آئی۔

"واہ!" میرے منہ سے نورین کے لیے تعریف نکلی۔ پھر میں نے آپا کی پلیٹ میں بھی سلاد اور رائتہ ڈال دیا۔

"کھائیے آپا۔۔۔ آپ نے تو کم خوراکی میں سماں کو بھی مات دے دی ہے۔ واہ مزے دار ہے۔ لگتا ہے پلاؤ آپ کی ترکیب اور مسالوں سے پکایا ہے نورین نے آپ نے بھی تو امی سے ہی سیکھا ہے۔ بالکل امی کے ہاتھ کا ذائقہ ہے۔"

"ہونا ہی چاہیے۔ تمہاری امی کی بھتیجی نے جو بنایا ہے۔"

ان کی آواز ٹھٹھری ہوئی تھی۔ ہر لفظ سے تلخی لپٹی ہوئی تھی۔ تمہاری امی اور بھتیجی کے لفظ میں نفرت کا عنصر زیادہ ہی تھا۔ میں نے ٹال دیا۔ نورین سماں کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔ اس کی پلیٹ میں کبھی رائتہ، کبھی بوٹی، کبھی سلاد ڈالتی جا رہی تھی۔ روز یہی ہوتا تھا ورنہ وہ بے چاری (بے چاری کیوں؟) بھوکی ہی اٹھ جاتی۔ سر نیچا کیے سستی سے کھا رہی ہوتی تھی۔ پتا نہیں اسے کیسا کھانا پسند آتا ہوگا۔

اچھا، اچھا او ہو! کمال ہے۔ سماں! تم اتنا اچھا کھانا پکا لیتی ہو۔ اور پلاؤ تو مجھے بہت پسند ہے۔ اور یہاں تم خود اتنا کم کھاتی ہو بھلا کیوں؟"

سماں نے خفیف سی گردن اٹھا کر مجھے دیکھنا چاہا۔ یا (شاید) مجھے ایسا ہی لگا۔

"اور کیا۔" نورین ایک چمچ پلاؤ اس کی پلیٹ میں ڈال کر بولی۔ "کھاتی کیا ہیں محترمہ؟ سوچتی ہیں۔ میں نہ زبردستی کھلاؤں تو چڑیا جیسی ہو جائیں اور خود سارا دن کچن میں گھسی رہتی ہیں۔ کبھی پکا رہی ہیں، کبھی برتن دھو رہی ہیں۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ یونیورسٹی کی گولڈ میڈلسٹ ہیں۔" پیار بھرا تھا، لہجے میں۔

"اچھا؟ مجھے کسی نے نہیں بتایا۔" میں حیران ہوا۔ واقعی، مجھے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ اس نے پڑھا کیا ہے۔ میں تو اسے محض کالج گرل سمجھتا تھا۔ اتنی سی تو ہے۔ نورین سے بھی کچھ چھوٹی۔ میں نے تعریفی نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ گلابی ہو رہی تھی۔ آپا کے پلیٹ کھسکانے کی آواز تو نہیں سنی میں نے۔ البتہ کرسی کھسکا کر جانے کو ہوئیں۔ تو میں نے تعجب سے کہا۔

"ارے۔ آپا! کھانا تو کھالیں۔ کیا اچھا نہیں لگا؟"

"تم کو پسند آرہا ہے۔ تم کھاؤ۔" کہہ کر باہر نکل گئیں۔ سماں کا رنگ اڑتا ہوا میں نے دیکھا۔ خوف زدہ نظروں سے آپا کو جاتے دیکھ رہی تھی۔

نورین کندھے اچکا کر بولی۔ "کھاؤ جی کھاؤ ہمیں تو بہت مزا آرہا ہے۔"

مگر سماں نے چمچہ پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ وہ گم صم سی ہو گئی تھی۔ پھر اس کی پلکیں بھیگنے لگیں اور ٹپا ٹپ آنسو ٹپکنے لگے۔ ہائے معصوم دل دکھ گیا۔ (میرا)

"کیا ہے سماں؟" نورین ہمدرد لہجے میں اسے ڈانٹنے لگی۔ "کیوں پروا کرتی ہو۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے۔ مجھے کوئی بلاوجہ' بے قصور مجرم سمجھے میں تو اس کا منہ توڑ دوں سیدھی بات ہے۔ تم اس کان سے سنو۔ اس دوسرے والے کان سے نکال دو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ کیوں بھائی؟" داد طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔

"لیکن آپا بھی تو بے قصور ہیں۔ رنجیدہ ہیں۔ بچوں کا کیا قصور ہے؟"

"وہ ان کے میاں کا اور ان کا آپس کا معاملہ ہے۔ خود نپٹیں ہمیں کیوں سزا دے رہی ہیں اور بچے؟ خوہ۔ فضول' نکمے' بزدل بچے۔ ارے ماں کا ہاتھ تھام کر باپ کی ٹانگ کھینچ لیتے۔ چھوڑتے ہی نہیں۔ پھر دیکھنا تھا تماشا۔ مگر...."

نورین کے لیے تو ہر بات معمولی سے بھی کم درجے کی ہوتی تھی۔ کم از کم وہ خود اس مشکل مرحلے کو آسان بنانا جانتی تھی۔ بولنے کی بیماری تھی اسے۔

"میں تو بھئی ایسا ہی کرتی۔" وہ مجھے جز بز ہوتا دیکھ کر کندھے اچکانے لگی۔ "اور کرنا چاہیے بھی۔ ماں کا درجہ باپ سے زیادہ بلند ہے۔ انہیں ماں کے ساتھ ہی آجانا چاہیے تھا۔ بھاگ کر۔" کچر کچر کھیرا چبا رہی تھی۔

میں چڑ گیا۔ گھر سے باہر آگیا۔ اف آپا کا بھی کیا قصور ہے۔ بچوں کے بغیر رہنا۔ کتنی اذیت میں تھیں بے چاری مگر نورین کو کیا فکر۔ وہ تو آپا کی جگہ ہوتی تو شاید بھائی جان کو (یعنی اپنے متوقع شوہر کو) مارنے سے بھی گریز نہ کرتی۔ چیخ چیخ کر محلہ سر پر اٹھالیتی۔ وہ شوہر کو گھر سے نکال دیتی' خود گھر میں جمی رہتی۔ جی' لیکن آپا کو۔ سماں سے کیا کد ہے۔ اس بے چاری نے تو کچھ کیا نہ تھا۔ اور بھئی' یہ امی آخر کہاں اٹک گئی ہیں۔ ساری خرابی یہ ہے۔

جھلا کر ایک پتھر کو ٹھوکر ماری۔ جو سڑک کے کنارے چپ چاپ پڑا تھا۔ بے چارہ لڑھک کر بیچ سڑک پر جا گرا۔ ہاہ اس کا کیا قصور۔ معصوم کنارے پر آرام کر رہا تھا۔ میری پر جلال ٹھوکر نے اس کو کتنی اذیت دی ہو گی۔ ابھی کوئی گاڑی آئے گی۔ اور ظالم پہیوں سے کچل دے گی۔ توبہ۔ میں دوڑ کر پتھر کے پاس پہنچا۔ پتھر اٹھا کر اسے ذرا سہلا کر کنارے پر رکھا۔ سوری بھی کہہ دیا۔ ہاں بھئی غلطی پر معافی مانگنا چاہیے۔ خاصی واک ہو گئی گھر چلنا چاہیے۔

حیرت۔ کمرے میں نورین سماں کو لیے بیٹھی تھی۔ باتیں۔۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور تحکمانہ انداز میں کہنے لگی۔

"بھائی! بس بہت ہو گئی مروت۔ سماں آج سے یہیں رہے گی۔ اور سماں! خبردار جو یہاں سے کہیں گئیں۔ یاد رکھو۔ تم اس گھر کی بہو ہو۔ تمہیں یہیں رہنا ہے۔ بھائی کے کمرے میں۔" سر اٹھائے باہر نکل گئی۔ میں بے بسی سے سر سہلاتا رہا۔

"میں' میں تو اصل میں سوچ رہا تھا کہ امی آجائیں۔ وہ رخصتی وغیرہ کے بغیر تو پھر۔" فقرے ادھورے رہ گئے۔ نورین نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ بولی۔ "اور ہاں خود کو خطاوار سمجھنا چھوڑ دو۔ امی ہیں ہر بات کی ذمے دار۔ آئیں گی تو دیکھنا کیا کرتی ہیں۔" دھمکی (شاید مجھے)

"میں تو ہوں نا اصل قصوروار۔ میری وجہ سے آپا کے بچے جدا ہوئے۔" سماں کی دبی ہوئی آواز میری سماعت میں آ ٹکرائی۔ اوہو محترمہ بول سکتی ہیں۔

"تو پھر تو بھائی بھی ذمے دار ہوئے۔ انہیں ہی سب بھگتنے دو۔ تم کیوں؟"

کمرہ' میں پھر۔ میں اور سماں نورین دروازہ بند کر

کے جا چکی تھی اور وہ انگلیاں مروڑ رہی تھی یا چٹخا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے بسی تھی۔ شاید ناخوشی یا پتہ نہیں۔ مجھے چہرے پڑھنے سے دلچسپی نہ تھی۔ نہ مجھ میں ایسی کوئی صلاحیت تھی۔

نورین مجھے بدھو کہتی تھی۔ مجھے کچھ بولنا چاہیے۔ شاید سماں منتظر ہو مگر کیا بولوں۔ مجھے سماں سے دلچسپی تھی نہ لگاؤ۔ میں اسے فضول سی جھکی' بے تکی' لڑکی سمجھتا تھا۔ یہ معلوم ہی نہ تھا کہ بچپن سے ہی ہمیں۔۔۔ کسی بندھن میں باندھا جا چکا تھا۔ امی کے بقول۔۔۔ اب۔۔۔ ایسا کچھ ہو ہی گیا ہے۔۔۔ تو کچھ اظہار میری طرف سے بھی ہونا چاہیے۔

"وہ سماں۔" میں نے خود کو بولتے سنا۔ (حیرت سے) تم یوں کیوں بیٹھی ہو؟ نورین کہہ رہی تھی تم سارا دن کچن میں کام کرتی رہتی ہو۔ تمہیں بھلا کب عادت ہے۔۔۔ تھک جاتی ہوگی۔۔۔ آرام کرو۔" روانی سے بات کر کے میں نے تصور میں اپنی پیٹھ ٹھونکی۔ واہ میرے شیر۔

اس کا چہرہ گلاب ہو گیا۔ کھڑی ہو گئی۔ "میں نماز پڑھ لوں۔"

وہ واش روم میں چلی گئی۔ پھر کچھ دیر بعد آئی۔ جاء نماز کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔ میں نے تکیے کے نیچے سے جاء نماز نکال کر اسے پکڑائی اور خود اخبار میں سر گھسا لیا۔ اس نے نماز میں کافی دیر لگائی۔ جب وہ جاء نماز تہ کر رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے لے کر تکیے کے نیچے رکھ لی۔ وہ کھڑی رہی۔ پھر ہچکچاتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں۔۔۔ یہاں سو جاؤں؟" اس کی نظریں ٹو سیٹر صوفے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ہنسی آگئی۔

"میرا خیال ہے۔ بچوں والی کاٹ لا کر رکھ دیتا۔ تم اس میں بھی سو سکتی تھیں۔ لیکن یہ صوفہ ناکافی ہے۔ تم کروٹ کے ساتھ نیچے گر جاؤ گی۔ ویسے میرا یہ بیڈ کافی وسیع و عریض ہے۔ کبھی آپا کے ساتھ بچے آتے ہیں۔ تو تینوں بچے اور میں یہ آرام اس پر ہی سوتے ہیں۔"

میں نے اسے دیکھا۔ انگلیاں مسل رہی تھی۔ گریز' ہر تکلف یا شرم۔ میں نے کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے بیڈ کی طرف لانا چاہا۔ وہ واقعی پریشان سی لگی۔ بے خیالی میں یا اسے تسلی دینے کے خیال سے میرا ہاتھ اس کی کمر پر جا رکا۔ وہ جیسے کپکپا گئی۔ "اف۔" کر کے اس نے کمر اندر کی طرف سمیٹی۔ مجھے عجیب سا لگا۔ کوئی تکلیف؟ اس کے چہرے پر کسی اذیت کے آثار لگے۔ ہاتھ پھر سے کمر پر لگایا تو انگلیوں کو ناہمواری کا احساس ہوا۔ وہ پھر پیچھے کو ہٹی۔ اب مجھے کوئی نئی سی یا عجیب کیفیت کا ادراک ہوا۔

"کمر پر کیا ہوا ہے؟" میرے منہ سے نکلا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کوشش کو ناکام بناتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کی قمیص پیٹھ کی طرف سے اوپر پلٹ دی۔ کمر صاف نظر آ رہی تھی۔ جیسے کسی نے اسے فرش پر گھسیٹا ہو یا ناخنوں سے نوچا ہو۔ سرخ لمبی ابھری ہوئی دھاریاں سفید جلد پر نمایاں تھیں۔

"کیا ہوا ہے؟ یہ زخم کیسے ہیں سماں؟" میں چیخا تھا۔

اس نے بے بس زخمی نظروں سے مجھے دیکھا۔ آنکھیں سرخ ہوئیں پھر لبالب پانی سے بھر گئیں۔ اف کس قدر دکھی' فریادی نظریں تھیں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں سماں سے کبھی بے تکلف بھی ہو سکوں گا۔ اتنا قریب یا اس سے ہمدردی' لیکن عجیب لمحہ تھا اور انتہائی قربت کا احساس۔ گرم جذبات اور میرا درد مند دل۔۔۔

میں نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔ اور تسلی دینے کے لیے اس کے شانے تھپکنے لگا۔ کچھ بولے تو' بتائے تو سہی۔ ہوا کیا ہے۔ اتنی تکلیف ہو رہی ہوگی بے چاری۔

"ہاں بولو' کیسے چوٹ لگی یہ۔" اس کے نرم گرم جسم سے اپنائیت کی مہک میرے جسم میں پیوست ہو رہی تھی۔ ہاں تو وہ اپنی تو تھی ہی ماموں زاد۔

"چوٹ نہیں ہے۔" وہ بول پڑی۔ رندھی ہوئی آواز میں "آپا نے مارا ہے۔ وہ مجھے روز مارتی ہیں۔ آج' آج زمین پر گرا کر چپل سے۔۔۔ بہت زور سے مارا۔"

میں مارے حیرت کے منجمد ہو گیا۔ اپنا ہاتھ ہٹا کر۔ اسے دور کر کے گھور کر دیکھا۔

"میں چیخی۔ تو زور سے میرا منہ ہتھیلی سے بند کر دیا۔ بولیں۔ کسی کو بتایا تو جان نکال لوں گی۔ میں نے نورین کو بتا دیا۔ پھر انہوں نے دوبارہ بھی مارا۔"

"تم ہم... آ' آپا۔" میں واقعی ہونق بنا کھڑا تھا۔

"ہاں جی۔ مارتی جاتی ہیں۔ روتی جاتی ہیں۔ میری وجہ سے ان کا گھر اجڑا ہے۔ میری وجہ سے بچے جدا ہوئے۔ اس لیے مجھ سے ہی بدلہ لیتی ہیں۔"

وہ روتی جاتی تھی۔ آنسو دوپٹے سے پونچھتی جا رہی تھی۔ عجیب سین تھا۔ مجھے وہ چار سال کی بچی لگ رہی تھی۔ جو چوٹ کھا کر روتی ہوئی فریاد کر رہی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا۔ پھر الماری سے زخم کی ٹیوب نکال کر اس کی کمر پر کریم کا لیپ کیا۔ جس طرح بن پڑا۔ اس کی دل جوئی کرتا رہا۔ زبان سے الفاظ سے پیار سے محبت سے۔

ارے ہاں مجھے تو خبر نہ تھی کہ... محبت ہوتی کیا ہے۔ کیسی ہوتی ہے۔ کیونکر ہوتی ہے۔ لیکن آج لگا کہ ہو گئی ہے یا پہلے بھی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہے۔ وہ بھی سماں سے۔ جو (بظاہر) مجھے خاص پسند نہ تھی۔ لیکن آج اس کی فریاد کرتی آنکھیں۔ فریاد کرتی زبان۔ اس کی بے خطا ہستی۔ سزا اف آج میں نے پہلی بار اس کی قربت پاتے ہی کیسے اس محبت کو کھوج نکالا۔ جو میرے نہاں خانہ دل میں عرصہ دراز سے پل رہی تھی۔

ابھی آج احساس ہوا کہ میں تو اسے ہمیشہ سے ہی چاہتا تھا۔ چاہتا ہی رہا ہوں۔ امی کی لاڈلی نہ جانے کب میرے دل کی رانی بن گئی تھی۔ اور میں۔ ایک اس قدر مضبوط رشتے سے بندھنے کے بعد بھی نظر انداز کرتا رہا۔ اپنی محبت شریک حیات کو' جائز ملکیت کو خود سے دور۔ اف۔ لاپروائی۔ سزا مجھے ملنے چاہیے تھی یا شاید مجھے مل رہی تھی۔ سماں پر ظلم کی صورت۔

آپا کے خلاف میرا سینہ شعلوں سے بھر گیا۔ دماغ میں طوفان برپا تھا۔ اب صبح ہوتے ہی آپا کو خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں معاف تو نہیں کروں گا اور اگر امی نے آپا کی حمایت میں مجھے کچھ سمجھانا چاہا۔ خون کے رشتے میو مروت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ یہی تو نصیحت تھی۔ گھٹی میں گھول کر پلایا تھا۔ بہن بھائی کی محبتوں کا احساس اور یقین۔ ارے تو اگلے کو بھی ایسی نصیحت کیوں نہ کی۔ مجھے آج سماں میں اپنا وجود نظر آ رہا تھا۔ جیسے میں اور وہ۔ وہ اور میں۔ ہم دو نہیں۔ ایک ہو گئے ہیں۔ مجھے اتنی ہی اذیت ہو رہی تھی۔ جتنی سماں کو ہوئی تھی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ میں تڑپ رہا تھا۔ اس کی مظلومیت میری محبت بن گئی۔ شاید یہ قدرت کی کوئی مصلحت ہو کہ میں اس نہج پر آ کر محبت کروں۔

بس اب امی کی نصیحت بھی نہیں سنوں گا میں۔ اگر انہوں نے میل ملاپ کی کوشش کی۔ میں سماں کو لے کر چلا جاؤں گا۔ سب سے الگ ہو جاؤں گا۔ مجھے اب ہر رشتہ نقلی اور بناوٹی نظر آ رہا تھا۔ سماں میرا سب کچھ بن گئی تھی۔ سب کچھ محبت نہیں میں عشق کرنے لگا سماں سے۔ وہ جو مجھے کبھی خاص نہیں لگی۔ آج وہ خاص الخاص ہو گئی تھی۔ نہ جانے میں نے کتنی بار اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔

کس قدر چاہت کا اظہار کیا۔ کتنی ہمت بڑھائی۔ دلاسے دیے۔

صبح، صبح ہو گئی۔ ظاہر ہے صبح روشن چمک دار ہوتی ہے۔ آج کی صبح حسین تھی۔ مہربان اور پر یقین۔ ناشتہ بہت ہی زبردست تھا۔ نورین کی بدولت۔

سماں نے مجھے پر امید نظروں سے دیکھا۔ آپا... آ گئی تھیں۔ ناشتہ کرنے میں مزے سے ناشتہ کرتا رہا۔ آپا کو قطعی نظر انداز کر دیا۔ (یہ سزا کافی تھی نا بھئی)

میں انہیں کچھ کہہ نہیں سکا۔ کہہ سکتا ہی نہ تھا۔ اتنی بڑی تھیں مجھ سے' امی کہتی تھیں۔ بڑی بہن ماں جیسی ہوتی ہے۔ تو ماں کو بھلا کوئی کیا کہے گا۔ وہ تو محبت اور ممتا سے لبریز ہوتی ہے۔ پتا نہیں آپا بھی محبت ممتا کو مانتی تھیں یا نہیں)

لیکن بس اتنا ہوا کہ میں ان کے سامنے سماں پر توجہ دے رہا تھا۔ اسے کھانے کی چیزیں دے رہا تھا۔ "یہ لو

یہ کھاؤ یہ چکھو اور آپا کے خلاف جو رات کو میں شعلوں کی تپش میں جھلس رہا تھا۔ اب بھی اس کی حرارت چہرے پر ضرور تھی۔ اور آپا اسے یقیناً" سمجھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر میرے خلاف ناگواری کے جذبات ظاہر ہو رہے تھے۔ میں نے پروانہ کی۔

یہ حقیقت ہے۔ جواب میری سمجھ میں آرہی تھی کہ میں کسی سے نفرت کرہی نہیں سکتا تھا۔ کسی اپنے سے بڑے کو۔۔۔ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ ناگواری کے اظہار کے سوا جو چہرے سے ظاہر ہو جائے۔ اتفاقاً" یا ضرورتاً" تو وہ میں کر رہا تھا۔ آفس سے چھٹی لے لی۔ صرف سماں کے لیے۔ اسے آج کے دن آپا کی مار سے بچانے کے لیے۔

میں اسے پورے گھر میں ساتھ لیے گھومتا رہا۔ چھت پر نیچے لان میں۔ ہم دونوں نے مل کر گھر کی صفائی کر ڈالی۔ امی کا کمرہ نورین کا کمرہ۔ چیزیں سمیٹ کر الماریوں میں رکھیں۔ فرنیچر کی ترتیب بدلی۔ گملے ادھر سے ادھر کیے۔

نورین کچن سے ہمیں دیکھ کر مسکراتی اور آنکھوں کے اشارے سے شاباشی دے رہی تھی۔ (چالاک ماسی) آپا۔۔۔ آپا بھی کچن میں مصروفیت ظاہر کر رہی تھیں۔ مگر ان کی آنکھیں۔ ہم دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اور ایسے دہک رہی تھیں۔ جیسے۔۔۔ تنور فل گرم ہونے کے بعد ۔ان کی آنکھوں کے لپکتے شعلے سماں کو بھسم کرنے کے لیے لپک رہے تھے لیکن میری موجودگی ان کو اپنے شکار سے محرومی کا غصہ۔

سماں نے پورا برآمدہ دھو ڈالا۔ میں وائپ کرتا جاتا۔ وہ گملوں میں پائپ سے پانی ڈالتی۔ میں نل کھولتا بند کرتا ۔وہ جو رات غصے میں میں سوچ رہا تھا کہ۔۔۔

جیسا کہ میرا خیال تھا۔ میں آپا کی اچھی خبر لوں گا۔ انہیں وارننگ دوں گا کہ اگر آپ نے سماں کو آئندہ کبھی ہاتھ بھی لگایا۔ تو انجام بھی یاد رکھیے گا۔ اور اگر امی نے آپا کی حمایت کی تو میں سماں کو لے کر کہیں بھی چلا جاؤں گا۔ کرتی رہیں آپا یہاں حکومت۔

تو وہ سب اس طرح نہیں ہوا۔ میں واقعی بہت بزدل۔ بدھو یا زیادہ ہی شریف ہوں یا سب سے محبت کرتا ہوں۔ کسی کو ناراض نہیں کر سکتا۔ پتا نہیں یہ میری خوبی ہے یا خرابی وقت کے ساتھ غصے کے انگاروں پر نورین ہنسی مذاق کے چھینٹے ڈالتی گئی۔ سب کچھ نارمل ہو گیا۔

آپا کی خاموشی کو نظرانداز کر کے میں سماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ آہا میرا کمرہ جو پہلے کباڑ خانے کا نمونہ ہوتا تھا۔ آج۔۔۔

کتنا صاف' فراخ اور روشن لگ رہا تھا۔ سماں کی بدولت ۔وہ بھی اس وقت بہت حسین لگ رہی تھی۔ کل سے بھی زیادہ اور کل تک میں نے اسے غور سے دیکھا بھی نہ تھا۔

آج تو۔۔۔ عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید مسکراہٹ تھی۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اس وجہ سے (کیا یہ بھی مجھے بدھو سمجھتی ہے؟ پہلا خیال) اس کے کھلتے گندمی رنگ میں ہلکی سی شوخ چمک چہرے کو چمپئی آتشی سا رنگ دے رہی تھی۔ آنکھیں تو جھکی ہوئی تھیں لیکن پلکیں اوپر نیچے ٹمٹما رہی تھیں۔ ارے! آج مجھے ہو کیا گیا ہے۔ مجھے تو کبھی کسی رنگ کا فرق تک معلوم نہ تھا۔ یہ آج چمپئی' گندمی' آتشی کیسے تشبیہات سوجھ گئیں۔ یہ تو پتا نہ تھا کہ وہ کس رنگ کے لباس میں ہے۔ بھئی ہو گی۔ مجھے اس کے کپڑوں کے رنگ سے کیا لینا دینا۔ خود سماں سے ہی واسطہ ہے۔ اچھی ہے بس کافی ہے اور وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہے؟ اس سے بھی کچھ لینا دینا نہیں۔ بس وہ میری ہے۔ کچھ بھی سوچتی رہے۔

رات گئے تک میں اس کی دل جوئی کرتا رہا۔ دن بھر اس کے ساتھ تعاون۔ اب کیا یہ کافی نہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے اظہار کرنا چاہیے کہ۔۔۔ کہ وہ پہلے نہ سہی۔ اب بہت ہی اچھی لگ رہی ہے اور پہلے کا ذکر بھی کیوں ؟ پہلے وہ میری بیگم تو نہ تھی۔ ہیں نا بھئی۔ چلو پھر میاں عادل شروع ہو جاؤ۔ سنا ہے عورتیں (لڑکیاں؟ پتا نہیں اپنی تعریف مردوں کے منہ سے سن کر بہت خوش ہوتی ہیں۔ اور ساری زندگی خوش رہتی ہیں۔ اور

ساری زندگی مرد تعریف کرتا رہے۔ یہ ممکن نہیں کم از کم میں ان مردوں میں شامل ہونا پسند نہیں کروں گا۔ مجھے اور بہت سے ضروری کام۔۔۔ افوہ۔ ابھی تو معاملہ سیٹ کرلے بھائی۔

"آہم سماں! یہ تم نے کس رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ نیلے دیکھو میں رنگوں کے بارے میں ذرا کمزور ہوں۔ مجھے نیلا رنگ اسکول کے بچوں کے یونیفارم میں اچھا لگتا ہے۔ تم اگر یہ آج نہ پہنتیں۔"

"میں یہ کیا کر رہا تھا۔ محبت کے بجائے رعب جمانے کی کوشش ہائیں۔

"اول تو یہ نیلا نہیں۔ سبزی مائل فیروزی ہے۔" اس نے ترنت جواب پکڑایا۔

"دوسرے یہ کہ میرے پاس جو رنگ ہوگا۔ وہی پہنوں گی۔ آپ اپنی پسند کالا کردیں گے۔ تو وہی پہن لوں گی۔ سرخ' سبز' گلابی۔"

یہ ٹھیک ہے۔ مگر اس کے پاس یہ رنگ کیوں نہیں۔ سوچنے کی بات ہے۔

"رنگوں سے کیا ہوتا ہے۔ انسان کا رنگ اچھا ہونا چاہیے۔ ایمان کا رنگ' ضمیر کا رنگ کپڑے تو پرانے ہو کر بدرنگ ہو جاتے ہیں۔ مگر انسان کی خوبیوں کا رنگ ہمیشہ چمک دار رہتا ہے۔"

یہ سماں تھی۔ بولنے میں خاصی تیز ہے۔ بچاری دلہن بننے اور سرخ رنگ پہننے کی تمنائی تھی۔ لیکن مایوس میں آگے بڑھ کر اسے مایوسی سے بچانے کے لیے کچھ کہنے لگا تھا کہ کمرے کے دروازے پر زوردار دستک نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ اللہ خیر۔ کہیں آپا نے خودکشی۔

نورین تھی۔ اس نے کہا۔ "امی آگئی ہیں۔" اور رفوچکر ہوگئی۔

میں نے سماں سے کہا۔ "امی آگئی ہیں۔" اور میں نے سماں کے چہرے پر پھوٹتی شفق کا نظارا کرنے کے بجائے امی کے کمرے کی طرف دوڑ لگائی۔ امی کے کمرے میں تو محفل جمی ہوئی تھی۔ میں کھلے دروازے میں ہکابکا کھڑا رہ گیا۔ جنبش کیا پلکیں جھپکنا بھول گیا۔

اجو بھیا ہنستے ہوئے آئے اور لپٹ گئے۔ آصفہ بھابھی نے میرے سر پر چپت رسید کی۔ ارے۔۔۔ آپا کے تینوں برخوردار ان سے لپٹے بیٹھے تھے۔ آپا کے چہرے پر بھی خوشی کا گلال بکھرا ہوا تھا۔ اور کیا نظارا تھا۔ مجھ جیسے انسان کے لیے حواس باختہ ہونے کے مواقع آتے رہتے ہیں۔ بھائی جان راشد خان صاحب کرسی پر براجمان تھے۔ کچھ شرمندہ یا پچھتاوا میں اندازہ ہی نہ کرسکا۔ جادو کی چھڑی' کیا کمال ہے۔

سماں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ بس آئی اور امی سے لپٹ گئی۔ اب سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ پھر ایک غلغلہ سا اٹھا۔ بھائی جان اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے۔ ساتھ ہی آپا بچے سب کمرے سے باہر آگے پیچھے۔

اس رات چشم فلک نے ایک حیران کن نظارہ ملاحظہ کیا۔ بھائی جان نے مجھے گلے لگا کر کہا۔

"سوری۔"

"آپا نے کمرے لپٹ کر کہا۔ "سوری عادل!" اور ساتھ ساتھ آگے بڑھ گئے۔

اجو بھیا نے کہا۔ "اچھا راشد بھائی۔ کل ان شاء اللہ ملاقات ہوگی صبح آؤں گا آصفہ کو لے کر' سب ہو جائے گا انتظام۔"

حیرانی۔ "بھائی جان مسکرائے۔ پھر دوبارہ مجھے گلے لگایا۔

"اررے۔ واہ بھئی آپا نے بھی میرے ہاتھ پکڑ کر پیار کیا۔ مزید اررے آنسو پونچھتی گھر سے نکل گئیں۔ میں اپنے ہاتھ گھورتا رہ گیا۔ را' را' را را۔ یہ میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ اور آپا کو کیا ہوا کہ۔۔۔

اجو بھیا انہیں گیٹ تک پہنچا کر آئے۔ مجھے اپنی جگہ کھڑا دیکھ کر میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولے۔

"بس حیرانی کا دورانیہ ختم۔ چلو اندر یہ دنیا عجیب واقعات سے بھری ہوئی ہے اور ہماری زندگی میں اس سے بھی حیران کن واقعات وقوع پذیر ہونے کے امکان ہیں۔ اس لیے کسی بھی انہونی کے لیے خود کو تیار رکھو۔ چلو آؤ۔"

میں کسی معمول کی طرح ان کے پیچھے چلتا ہوا امی

کے کمرے میں آگیا۔ ابھی تک سب کچھ صاف نہ ہوا تھا۔ شک کے بادلوں میں گھرا ہوا۔ چھپا ہوا موسم۔ میں کسی غبار میں چلتا ہوا کمرے میں آیا۔

اندر نورین اپنی پرشور آواز میں کوئی کتھا کہانی لیے بیٹھی تھی۔ آصفہ بھابھی مسکرا رہی تھیں۔ سماں امی کے بازوؤں میں منمنا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی امی نے بازو پھیلا دیئے۔ ان کے لبوں پر مشفقانہ تبسم تھا۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں خفگی سے منہ پھلائے کھڑا رہا۔"

اتنی دیر۔ "بھول ہی گئیں کہ یہاں بھی سب آپ کے اپنے انتظار۔۔۔"

امی نے اجو بھیا سے کہا۔ "سن رہے ہو ایک ہفتہ انہیں اتنی دیر لگ رہا ہے۔" "اتنی دیر نہ لگاتی۔ تو نہ مہرین کا گھر بستا نہ کسی کو سکون ملتا۔"

"تم نے پوچھا ہی نہیں۔ امی کے ساتھ میں اور آصفہ کیسے آئے؟" اجو بھیا میرے ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں دوسری کرسی پر ڈٹ گیا۔

"میں تو حیران ہوں۔ بھائی جان آپ لوگوں کے ساتھ کہاں سے آگئے۔" میں نے کہا۔

"تو سنو۔ کل شام۔۔۔ مزنہ کی منگنی ہے۔ جو ممکن ہے نکاح میں بدل جائے۔"

میری کانوں میں کوئی بم دھماکا ہوا۔ "منگنی۔۔۔ کس یعنی کس سے۔"

"گھبراؤ نہیں۔ مجھ سے یا تم سے نہیں یہ کارنامہ امی نے انجام دیا ہے۔ جانتے ہو بھائی راشد خان کو منانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ پھر یہ کہ راضی کرنا۔ اف۔"

"لیکن کیسے رشتہ کہاں سے ملا؟"

"اللہ کی طرف سے ہوا یوں کہ میں تم دونوں کو لے کر لاہور کے لیے وہاں سے نکلا۔ ادھر گوہر صاحبہ کے رشتے والے بارات لے کر آگئے۔ یہاں پنچھی اڑ چکا تھا۔ پنجرہ خالی تھا۔ گوہر صاحبہ کو بھی ہماری روانگی کی خبر بعد میں۔ بارات کے پہنچنے کے بعد ہوئی نہ پوچھو۔ انہوں نے کیسا شور غل کیا۔ ظاہر ہے۔ یہی ہونا تھا۔"

"میں اندر گئی۔" امی نے اب بولنا شروع کیا۔ " دولھا کو دیکھا۔ اس کے والد سے ملی۔ انہیں حالات سے آگاہ کیا۔ معقول لوگ تھے۔ انہیں بتایا کہ لڑکی اعلا تعلیم یافتہ ہے۔ بچپن سے اپنے کزن سے منسوب تھی۔ گوہر کی جلد بازی یا خود مختاری کہ نہ باپ کی مرضی پوچھی۔ نہ میری۔ غرضیکہ صاف صاف اپنا معاملہ ان کے آگے پیش کیا۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ہمیں خود سے کسی کے بارے میں رائے قائم کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ نہ ہی کسی کو حقیر سمجھنا چاہیے۔ گوہر جاہل اور بدنیت عورت ہے۔ اسے سماں سے چڑ تھی۔ بہرحال جو بھی تھا۔ مگر دولہا کے والد بہت سمجھ دار اور شریف آدمی ہیں۔ گوہر کے میکے کے پڑوسی تھے۔ اچھے تعلقات تھے ان کے گوہر نے کچھ ایسی من گھڑت کہانی انہیں سنائی کہ وہ یقین کر بیٹھے یہاں تک کہہ دیا کہ باپ لڑکی سے خفا ہے۔ کسی سے بھی شادی کرسکتے ہیں۔ مجھے اختیار دیا ہے لیکن خیر۔ ان کی مہربانی کہ انہیں میری بات معقول معلوم ہوئی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ چاہیں۔ تو میں ان کے بیٹے کی شادی ایک معزز گھرانے میں کرا سکتی ہوں۔ لڑکا بے شک شیف ہے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں اس کے کنٹریکٹ ہیں۔ باہر کے ملک سے ٹریننگ لے کر آیا ہے۔ جاہل نہیں بلکہ بہت سے اعلا تعلیم یافتہ لوگوں سے زیادہ ذہین اور کھلے دل کا شائستہ آدمی ہے۔"

دونوں باپ بیٹے نے میری بات شائستگی سے سنی اور کھلے دل سے مانی۔ میری معذرت پر شرمندہ ہوئے۔

اس وقت تو وہ اپنے آٹھ دس آدمیوں کو لے کر چلے گئے۔ اجو نے مجھے فون پر رات گئے راشد کا غصہ اور ضد کا حال بتایا۔ میں نے گوہر کو اس کے حال پر بکتا جھکتا چھوڑا۔ اور صبح ہی اس لڑکے کے گھر پہنچی۔ دوبارہ معذرت کی اور تلافی کے طور پر اس کا رشتہ کروانے کا وعدہ کرلیا۔ لڑکے کے والد بہت متاثر ہوئے۔ وہیں سے میں نے راشد کو فون کیا۔ انہیں اچھے رشتے کا بتایا ۔ بمشکل وہ مانے۔ میں نے لڑکے کے والد کی راشد سے بات کروائی۔ اور گھر آکر احد کو بتایا۔ راشد کی عقل بھی سیدھے راستے پر آگئی تھی۔ دوسرے دن

بچوں سمیت آگئے۔ مزنہ کی تصویر میری فرمائش پر لائے گوہر کی ناگواری کے باوجود میں نے راشد کو روک لیا۔ احد کے گھر ہی لڑکے اور اس کے والد کو بلا کر بات کروائی۔ آسانی سے ماننے والے تو راشد تھے نہیں مگر لڑکے کے والد سے کچھ جان پہچان نکل آئی۔ دو دن بات چیت میں اور گزر گئے۔ پھر راشد نے مجھے اختیار دیا کہ مزنہ کو اپنی بیٹی سمجھ کر اس کے لیے فیصلہ کروں۔ اور فیصلہ تو میں کر چکی تھی۔" امی خوش تھیں بہت۔

"واہ امی۔ اپنی بھتیجی کے لیے تو آپ کو وہ خانساماں لگا تھا۔ مزنہ باجی کے لیے آپ راضی ہو گئیں۔ یہ تو اور حیرت کہ بھائی جان مان گئے۔ مگر آپ کا یہ فیصلہ مجھے پسند نہیں آیا۔" میں اب بھی خفا تھا۔

"تو بیٹا جی! پھر آپ ہی مان لیتے راشد کی بات۔" امی بھی خفگی سے بولیں "دوسری بات یہ کہ لڑکے کی عمر زیادہ ہے۔ مزنہ کے لیے مناسب ہے۔ بھتیجی کے لیے اس لیے مناسب نہ لگا کہ نہ صرف کم تعلیم یافتہ۔ عمر زیادہ' سب سے بڑھ کر یہ کہ بچپن سے تمہارا رشتہ طے تھا۔ گوہر تو انتقام میں یہ کر رہی تھی۔ میں نے اجو کو فون کر کے بلایا۔ انہوں نے بھی ان لوگوں سے ملنے کے بعد اس کو پسند کیا۔ راشد کو بھی منا ہی لیا۔ وہ فکر مند تھے کہ اتنی عجلت میں سب کیسے ہو گا۔ تو اجو اور آصفہ مل کر ان کی مدد کریں گے۔ مزنہ ہی نہیں میں نے مہرین کے لیے بھی راشد سے وعدے لیے ہیں۔ بہت شرمندہ کیا۔ بہرحال چند دن میں انہیں بھی دن میں تارے نظر آنے لگے تھے۔ مہرین کے بغیر بچوں کی ضدیں۔ ماں کے لیے بھوک ہڑتال اور پتا نہیں کیا کچھ۔ مزنہ بھی ان دنوں چپ نہ رہی۔ خیر سب کی مدد شامل رہی ہے تو یہ حل نکلا۔ بس اتنی زیادتی میرے ساتھ ہوئی کہ' میں اپنے بیٹے کی شادی چپ چھپاتے کرنے پر۔ خود سے' اور تم سے شرمندہ ہوں۔ لیکن اس دوران مجھے بہت سے تجربے ہوئے۔ سب کی نیت کا اندازہ ہوا۔ توبہ کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ اللہ کے سامنے شرمندہ ہوئی۔ اللہ مجھے معاف کرے۔

کسی بھی شخص کو کمتر سمجھنا۔ کسی کام کو حقیر جاننا۔ انسان کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ وہ شیف جسے میں معمولی خانساماں کہہ کر حقیر سمجھتی تھی بے حد اعلا ظرف اور شریف النفس تھا۔ اس کی شہر میں خاصی عزت توقیر ہے۔ آمدنی کے لحاظ سے بھی کسی سے کم نہیں۔ اپنے گھر کے حالات درست کرنے کی جدوجہد میں اس نے عمر کے بڑھنے کی پروانہ کی۔ دیکھے جانے بغیر محض قیاس آرائی کرنا بھی غلط ہے۔ کوئی محنت کر کے روزی کماتا ہے۔ کم آمدنی سہی۔ حق حلال کی روٹی بچوں کے پیٹ میں جاتی ہے۔ موچی نہ ہو۔ تو ہم سفید پوش لوگ ننگے پاؤں پھریں گے۔ پالش کرنے والا ہمارے تمہارے جوتے ہاتھ میں پکڑ کر کس محبت اور لگن سے پالش کرتا ہے۔ اس کی روزی اس جوتے سے وابستہ ہے۔ جوتوں کو چمکا کر چھوٹے بڑے لوگوں کی عزت بحال کرتا ہے۔ خاکروب بھی کسی سے کم نہیں۔ جو صفائی کے لیے اپنی نیند' آرام تج رہا ہے۔ واقعی محنت میں عظمت ہے۔ اور ہر محنت کش عزت احترام کے لائق ہے۔"

"دیکھو امی کی ہفتہ بھر کی کلوش نے کتنے مسائل حل کیے۔ بلکہ اصلاحی پہلو بھی اجاگر ہوا۔ چلو اب

سوتے ہیں۔ گھر تو بہت صاف ستھرا چمک رہا ہے۔ کہیں بھی بستر بچھائیں۔

"اچھا جی۔" نورین چڑ کر چیخی۔ "آج سماں بیگم نے گھر کی صفائی کر دی تو آپ کو گھر چمکتا ہوا لگ رہا ہے۔ پہلے میں جو اپنی ہڈیاں گھس کر اس پرانے گھر کو اجالنے کی کوشش کرتی تھی۔ تو کسی نے داد نہ دی۔" نند بھاوج کی روایتی چپقلش شروع؟

"اوہو میری محنت کش ننھی منی بہنا! مجھ سے ناراض نہ ہو۔ بے شک 'بے شک' آپ کی محنت بھی کسی سے کم نہیں۔ مگر ہم تو.... انجانے میں گھر کی تعریف کر رہے تھے۔ کسی خاص شخصیت کی نہیں۔" اجو بھیا نورین کو منانے کے لیے اس کی خوشامد کرنے لگے۔

"خیر چلیں۔ میں تو ویسے ہی.... آپ نے آخر یہ مان لیا کہ سماں نے آج کی محنت سے گھر کو چمکا دیا ہے۔ محنت کش وہ ہے۔ امی آپ کو محنت کش بہو مبارک ہو۔" نورین کا مزاج پل میں رنگ بدلتا تھا۔

"اچھا۔ ایسا کرتے ہیں۔ کل مہرین کے گھر سماں کو لے جاتے ہیں۔ آصفہ، سماں کے ساتھ مل کر گھر کو چمکائے۔ بھئی مزنہ کی بارات آنی ہے آخر۔"

اجو بھیا کی تجویز پر نورین نے سماں کو دیکھا۔ دونوں مسکرائیں۔ پراسرار مسکراہٹ۔

میں نے امی سے شکوہ کر ڈالا۔ "آپ نے مجھ سے پوچھا تک نہیں کہ آپ کے بغیر مجھ پر کیا گزری؟"

میں کب تک چپ رہتا آخر۔ میرا شکوہ بے جا نہیں تھا۔

"خفا ہو؟" امی نے کس سادگی سے سوال کیا۔ اف امی کی معصومیت۔ جی جل کر خاک ہوا۔

"نہیں جی۔ بہت خوش ہوں۔ اگر آپ دو دن اور نہ آتیں۔ میں تو گھر سے بھاگ جاتا۔" میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں غصہ ظاہر کیا۔ آپا کا نام نہ لیا۔

"مجھے لے کر۔" سماں نے کھلکھلا کر کہا۔

"ہائیں یہ۔" اس نے میرے دل کا راز کیسے جان لیا۔ میں نے تو اس سے کچھ کہا نہیں تھا۔

"سن رہی ہیں امی۔ بیٹے، بہو کے ارادے۔"

نورین کو گہرائی میں جا کر راز معلوم کرنا پسند تھا۔

"چالاکو" اجو بھیا نورین کے سر پر چپت لگا کر ہنسے۔ تو مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ آصفہ بھابھی بھی کھلکھلا کر ہنسیں۔ امی بھی ہنس رہی تھیں۔

"کاش۔ اس وقت آپا بھی ہوتیں۔ پھر مزا آتا۔"

نورین نے شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔

میری ہنسی بند ہو گئی۔ میں نے منہ پھلا لیا۔

سماں اور نورین ایک دوسرے کو دیکھ کر قہقہے لگا رہی تھیں۔ یکدم سماں نے امی کے گلے میں بازو ڈال کر شکایتیں شروع کر دیں۔ میں ہکا بکا۔

"پھپھو بہت خراب ہیں آپ کے بیٹے۔ جی... اتنے دن مجھ سے بات نہیں کی۔ میں یہیں آپ کے بیڈ پر سوتی تھی۔ رات بھر روتی تھی۔ سچی۔ بس اب میں آپ کے پاس ہی سوؤں گی۔" (لاڈو کہیں کی) وہ جو رات میں نے خوشامد میں گزار دی۔ گھر تک چھوڑنے کو تیار ہو گیا۔

زن مرید۔ اف میں زن مرید۔ زن مرید کہیں کا۔

میں بھنا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ سماں کے بغیر کمرہ اداس اداس کیوں لگ رہا تھا۔ پتا نہیں ظالم جادوگرنی ... بے مروت۔ وہ تو وہاں ہنسی کے دریا بہا رہی تھی (شکایتیں)

میں چڑ کر سمٹی ہوئی چیزیں ادھر ادھر بکھراتا رہا۔ تکیہ ادھر، جاء نماز صوفے پر۔ گھڑی کھڑکی پر۔ جوتے دروازے کے باہر۔ آدمی کو غصہ راس نہیں آتا۔ سماں کی جھلک دیکھتے ہی۔ مجھے ساری چیزیں سمیٹنی تھیں۔ انہیں جگہ پر رکھنے کے لیے۔ ہائے دن بھر کی محنت اور پھر از سر نو محنت۔ سماں کو ________ کوئی چیز بے جگہ دیکھنے سے الجھن ہوتی تھی۔ اس لیے اس کی ترتیب سے سب رکھنا تھا۔ (اگر وہ آئی)

اب پتا نہیں وہ مجھے کس جگہ رکھے گی؟ ناشکری۔

سوال یہ ہے کہ.... آئے گی بھی؟ یا انتظار پر ٹرخائے گی۔

نازیہ جمال

آخری عید

"یا اللہ! تو مجھے ساتھ والی ماسی کبریٰ کے گھر پیدا کر دیتا تو کتنا اچھا ہوتا؟ یا ماسی کبریٰ نہیں تو چاچی حلیمہ، ماما خیر دین کسی کے گھر بھی پیدا کر دیتا، مگر یہ گھر نہ ہوتا۔"

زیبی نے حسرت سے اور دعائیہ لہجے میں ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تو ساتھ بیٹھی کریلے چھیلتی زاہدہ کے چہرے پہ ناگواری چھا گئی تھی۔ چھری رکھ کر لاڈلی بیٹی کے "دہائی نما شکوے" کی وجہ کڑے لہجے میں استفسار کی۔

"تاں، ساتھ والی کبریٰ کے گھر میں من و سلوی اترتا ہے یا خیر دین ڈی سی لگا اپنے بچوں کو نان مربے کھلا رہا ہے۔ جو تجھے اٹھارہ سال بعد اپنا گھر "کڑوا" لگنے



لگا ہے۔"

"سکون، فراغت، خاموشی اور آرام بھی من وسلویٰ اور نان مربے سے کم نعمتیں نہیں ہیں، جن کا بد قسمتی سے ہمارے گھر میں فقدان پایا جاتا ہے۔" وہ اب کے کسی قدر طنزیہ انداز میں بولی۔

"صبح سے لے کر شام بلکہ رات نہیں آدھی رات تک پھرکی کی طرح گھومتی کام کرتی رہتی ہوں۔ ایک پل سکون کا نصیب نہیں ہوتا۔ یہ گھر ہے یا آزمائش ہے۔ ذرا جو دن کو سر رکھ کر اونگھنے لگوں تو کوئی نہ کوئی بچہ سر پہ آکر بھونپو بجانے لگتا ہے۔" وہ سخت اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

"تو تمہیں دن کو سونے کی کیا ضرورت ہے۔ رات کس لیے ہوتی ہے؟" زاہدہ نے کریلوں پر نمک چھڑک کر مسلتے ہوئے آرام سے مشورہ دینے والے انداز میں کہا تو وہ جی جان سے سلگ اٹھی تھی۔

"ساری دنیا دوپہر کو قیلولہ فرماتی ہے۔ آخر گرمیوں کے دن ہوتے کس لیے ہیں؟ اگر میں بھی ذرا استالوں تو آخر کیا برا ہے اور رات کی خوب کہی، آپ کے بے ڈھنگے صاحب زادے توحید کو سوتے میں نجانے کیسا پیٹ میں مروڑ اٹھا تھا کہ میری ساری رات اسے چورن اور پھکیاں چٹاتے گزر گئی۔ رات بھر جاگنے سے میرا سر دکھ رہا ہے، سوچا تھا نیند کی کمی دن میں پوری کرلوں گی۔"

اس کے جذباتی لہجے پہ نمی کو غالب آتے دیکھ کر زاہدہ نے تیزی سے بات کاٹ دی۔

"تو آج اسکول نہیں گئی؟"

"کل گئی تھی نا۔ تیری بے ڈھنگی "اولاد" نے مجھے عزت سے میٹرک پاس نہیں کرنے دینا ہے۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"اب ان معصوموں نے تیری کتابیں پھاڑی ہیں، جو یہ الزام بھی ان کے سر پر۔" زاہدہ برا مانتے ہوئے بولی۔

"پو پھوٹتے وقت سے ناشتا بنانا شروع کرتی ہوں۔ پرات خالی ہوجاتی ہے، مگر یہ "یاجوج ماجوج" کی قوم پیٹ بھرنے کا نام نہیں لیتی۔ ان کو نہلا دھلا کر اسکول رخصت کرنے کے بعد خود جب دن چڑھے اسکول پہنچتی ہوں تو چپڑاسی میرا ماما نہیں لگتا جو ہر روز مجھ پہ ترس کھا کر گیٹ کھول دے گا اور نہ ہی کوئی مس میری پھپھی سگی لگتی ہے جو روزانہ پہلے تین پیریڈ چوک جانے پہ مجھے معاف کردے گی۔ کل تو حد ہوگئی جرمانہ الگ لگا، بے عزتی الگ ہوئی اور نام خارج کرنے کی دھمکی۔۔۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ اپنے علاوہ تیرے چھ کے چھ بچوں کے سر پھاڑ دوں۔"

وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔

"ہاں ایسے آسانی سے پھاڑ دے گی اور میں تجھے معاف کردوں گی ویسے بھی چھوٹے بہن بھائی تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ کتنا پیار کرتے ہیں تجھ سے۔ کیا ہے جو تو ان کے چھوٹے موٹے کام نمٹا دیتی ہے۔ بڑی بیٹی کو ماں کا بازو بننا ہی ہوتا ہے۔ کوئی ساری عمر تجھے تنگ تھوڑی کریں گے۔ ذرا بڑے ہوئے تو سمجھ دار اور باتمیز ہو ہی جائیں گے۔"

زاہدہ نے اب کے نرمی سے اسے "ٹھنڈا" کرنا چاہا۔ پھر ہاتھ دھو کر چارپائی کے ساتھ بندھی کپڑے کی جھولڑی میں قلقاریاں مارتے اپنے آٹھ ماہ کے بچے کو نکال کر فیڈ کرانے لگی۔



ظہور احمد نے پانی لینے کی خاطر جستی گلاس مٹکے میں ڈالا تو گلاس خالی پیندے سے ٹکرا کر زور کی کھنک پیدا کر گیا تھا۔ طیش کی ایسی لہر اندر سے اٹھی کہ گلاس زور سے زمین پہ دے مارا۔

"زیبی! کدھر مر گئی ہے۔ مٹکا کیوں نہیں بھرا تو نے؟" ظہور احمد نے دھاڑ کر پوچھا تو وہ گھبرا کے کپڑے دھونا چھوڑ کر باپ کے پاس چلی آئی جو سخت تیور لیے کھڑا تھا۔

"ابا! میں نے بیس منٹ پہلے ہی مٹکا بھرا تھا، مگر ان بچوں نے کھڑے کھڑے سارا پانی ختم کر ڈالا۔" اس نے شرمندگی سے وضاحت دی۔

اوائل جون کی تیز تپتی دھوپ میں دکان سے پیدل چل کر گھر آتے ہوئے حلق میں کانٹے سے اگ آئے

تھے۔ ظہور احمد کا دل چاہا کہ خالی مٹکا ہی اٹھا کر زمین پر دے مارے۔

"یہ گھر ہے یا عذاب ہے۔ جہاں بندے کو ٹھنڈے پانی کا گھونٹ تک نصیب نہیں ہوتا۔" باقی کا غصہ چھپر تلے بیٹھی شریک حیات زاہدہ پر نکالا۔

"بچوں سے بھرا گھر ہے۔ جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ اکیلی لڑکی کدھر کدھر جان کھپائے۔ میں نکے کو سنبھالوں یا پانی بھرتی رہوں۔" بے نیاز انداز... ٹھوس جواز۔ ظہور احمد چپ ہو گیا۔ زیبی چاچی بلقیس سے جا کر ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آئی اور لا کر باپ کو تھمانے کے بعد بچہ پارٹی کی تلاش میں گھر میں نظریں دوڑائیں۔ صرف آم چوستا زبیر ہی ہاتھ لگ سکا۔ بازو موڑ کر کمر سے لگانے کے بعد لگاتار کئی دھموکے اس کی کمر پہ جڑے۔

"اب اگر مٹکے کے قریب دکھائی دیا تو جان سے مار دوں گی۔" وہ غصے و گرمی کی آمیزش سے سرخ چہرے کے ساتھ دھمکاتے ہوئے بولی۔

"زیبی! چھوڑ بھائی کو۔ گرمی کا موسم ہے۔ کون ذی روح پانی نہیں پی رہا۔" زاہدہ نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے صاحب زادے کی جان بخشی کروائی تھی۔

"اور چاچی! تو اپنی پلٹن کو ادھر اپنے پاس ہی سنبھال کے رکھ تیرا کوئی بچہ ادھر دکھائی دیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دوں گی۔" وہ بلقیس کی جانب انگلی اٹھا کر سنگین لہجے میں بولی۔ باپ کی ڈانٹ نے اسے رنجور کر دیا تھا۔

صبح سے لے کر اب تک وہ بلا مبالغہ دسویں بار مٹکا بھر چکی تھی۔ اپنے چھ عدد بہن بھائیوں نے کیا کم دق کیا ہوا تھا جو چاچی کے بھی بلا کے شرارتی و بدتمیز بچوں کو بھی برداشت کر لیتی اور وہ بھی تعداد میں پورے پانچ۔

"توبہ ہے زیبی! بھلا بچوں کو بھی کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ اپنے چچا زادوں کے بغیر وہ کیسے کھیل کود سکتے ہیں۔" بلقیس نے اس کی سنجیدگی سے دی گئی دھمکی کو "دیوانے کی بڑ" سے زیادہ اہمیت نہ دی اور چھپر کے نیچے جا کر جیٹھانی سے باتیں کرنے لگی۔

بے حد پھرتیلی ذمہ دار طبیعت کی حامل زیب النساء نہ تو کام چور تھی نہ ہی سہل پسند' مگر اس کی گھر کی روٹین صرف اس کی ایک ہی تصویر پیش کرتی۔

بے حد جھنجلائی' چیختی' زبان دراز' ہتھ چھٹ' نالاں' گریزاں' ہمہ وقت شکوہ کناں۔

گھر میں کسی بہن بھائی کی پیدائش اسے سرتاپا خوشی سے معمور کر دیتی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ ننھے مہمان کو خوب بوسے دے۔ اسے کمر پہ ٹکا کے محلے کی سیر کرانے لے جائے' اس کی جھولڑی کو لوری دیتے ہوئے خوب جھونٹے دے۔ مگر اس خوشی کو مایوسی' بددلی اور دکھ میں تبدیل ہوتے زیادہ دیر نہ لگتی جب زاہدہ اسے پاس بلا کر نرمی سے کہتی۔

"دیکھ زیبی! تو میری پہلی اولاد ہے۔ تجھے میرا سہارا بننا ہے۔ اب میں چارپائی پہ پڑی ہوں تو اچھی بیٹی کی طرح تیرا فرض بنتا ہے کہ تو گھر کا خیال رکھے۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی ضرورتوں سے آگاہ رہے۔"

وہ تابع داری سے سر ہلا دیتی۔

صفائی' دھلائی اور کھانا پکانا یہ سارے کام وہ بے حد چھوٹی عمر میں اس امید پہ کیے جاتی کہ جب اس کا بہن یا بھائی بڑا ہو گا تو اس کی ماں واپس اپنے کاموں پہ آجائے گی اور اتنی مشقت بھری روٹین سے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔

مگر اس کی ساری امیدوں پہ پانی پھر جاتا جب ادھر اس کا بھائی پاؤں پاؤں چلنے لگ جاتا اور ادھر اس کی ماں نئے مہمان کی آمد کی تیاریوں میں... بچپن کا شیڈول ساری زندگی پہ محیط ہو گیا۔ پھر تو بہن بھائیوں اور کزنز کی ایک تواتر سے آمد نے اسے بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔ چاچا منظور کے بچے بھی گھر ایک ہونے کی وجہ سے ادھر ہی اودھم مچائے رکھتے۔

شور' ہنگامہ' بے ترتیبی' کام کی زیادتی' سکون کی قلت۔ اس لیے تو وہ ہر وقت با آواز بلند شکوہ کناں رہتی۔

"یا خدا! اگر ادھر پیدا ہونا قسمت میں تھا تو ہاتھ کم از کم آٹھ دے دیتا۔"

صحن میں ٹوئنٹی ٹوئنٹی کھیلا جا رہا تھا۔ پوری ٹیم موجود تھی۔ بلال کے شاٹس فیلڈرز کو محلے کے گھروں کی چھتوں سے گیند لانے پر مجبور کر رہے تھے۔

زیبی ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ سفید کڑھائی شدہ پلازو پر پرنٹڈ لان کا دوپٹا اور شارٹ شرٹ میں اس کا اسمارٹ سراپا بے حد نمایاں لگ رہا تھا۔ صحن میں جابجا پھیلی مرغیوں کی بیٹ سے بچنے کے لیے وہ پلازو کو اڑسے ہوئے تھی۔

اب کے بلال کی گیند نے صحن میں لگے انرجی سیور کا نشانہ لیا۔ انرجی سیور چھناکے کی آواز کے ساتھ زمین پہ آرہا۔

"بلال کے بچے! یہ کیا کردیا۔" وہ اس کا کان کھینچتے ہوئے بولی۔ چہرے پہ ایک دم فکر مندی چھا گئی تھی۔

اسی دم دروازے پہ کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی۔ چھت پہ بیٹھ کے میچ کی کمنٹری کرتے اسد نے اونچی آواز میں مطلع کیا تھا۔

"مہمان آگئے ہیں۔" اس نے ایک دم سے بلال کا کان چھوڑا اور سیدھی چاچے منظور والی سائیڈ پہ آگئی۔

آج اس کا پہلا پہلا بر دکھوا تھا۔ ہتھیلیاں گرمی سے زیادہ گھبراہٹ سے پسیج رہی تھیں اور تیزی سے دھڑکتا دل۔ بلقیس اس کی حالت سے خوب محظوظ ہو رہی تھی۔

چند ماہ پہلے خاندان کی تقریب میں ایک خوش پوش باوقار آنٹی ٹائپ خاتون اس سے بے حد اخلاق سے ملی تھیں۔ ان خاتون کی محبت اور لگاوٹ بھری گفتگو اسے تو نہیں البتہ زاہدہ کو خوب سمجھ میں آرہی تھی۔ اکلوتے بیٹے کی دبئی میں ملازمت کا تذکرہ' خاندانی اوصاف' واضح الفاظ میں زیبی کے لیے اظہار رغبت۔

"میری زیبی تو کھڑے کھڑے حسینہ باجی کے دل میں اتر گئی تھی۔ بس کسی دن ان کی بیٹی نے لاہور سے آکر اسے پسند کرکے بات پکی کرنی ہے۔"

تقریب سے واپسی پہ زاہدہ نے خوشی سے کھنکتے لہجے میں ظہور احمد کو بتایا تھا۔

نم بالوں کو سلجھانے کے بعد اس نے کیچر لگا کر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ چھوٹے سے ٹوٹے کناروں والے تکونی شکل کے آئینے میں اسے تیار ہوتے ہوئے کافی مشکل پیش آرہی تھی۔

آنکھوں کے کاجل' ہونٹوں کے گلوس اور ناک کی لونگ کا الگ الگ جائزہ لینا پڑ گیا تھا۔ پورا چہرہ جو آئینے میں نہیں سما رہا تھا۔

"اچھا خاصا بڑا شیشہ تھا' مگر ان بچوں نے ٹوٹے ٹوٹے کردیا۔" بلقیس نے الماری سے گلاس اور پلیٹیں نکالتے ہوئے مصروف انداز میں بتایا۔

"صبح سے گھر کا کونہ کونہ چمکانے میں لگی تھی' مگر ان بدتمیز بچوں نے سارا صحن خراب کردیا۔ اگر یہ بھی خراب نہ کرتے تو اماں کی لاڈلی مرغیاں.... ان کی بدبو۔ اف مہمانوں پہ نجانے کیسا تاثر پڑ رہا ہوگا۔"

وہ دل ہی دل میں خود سے بولتے ہوئے مضطرب ہو رہی تھی۔

"جو لاہور والی باجی ہیں۔ وہ بڑی خوب صورت ہیں۔"

"ان کا بیٹا فر فر انگریزی بولتا ہے' جیسے ٹی وی والے بولتے ہیں۔"

چھوٹیاں حسنہ اور فروا وقتاً" فوقتاً" آکر اسے متاثر کن لہجے میں مطلع کر رہی تھیں۔

اپنے بہترین جوڑے میں ملبوس' ہلکا سا میک اپ کیے وہ فطری گھبراہٹ اور خود پہ یقین کے ملے جلے احساس میں گھری مہمانوں کو سلام کرنے آگئی۔

صحن میں رات کا اندھیرا پوری طرح اتر چکا تھا۔ سیور ٹوٹنے کے بعد بلال نے ڈیوڑھی کا سو واٹ کا بلب صحن میں لگا دیا تھا۔

گرمیوں کا عام مسئلہ بجلی کے وولٹیج کی کمی۔ بے حد مدھم زرد ملگجی سی روشنی دیتا بلب اپنی "متوقع" نند کا چہرہ دکھانے سے قاصر تھا۔ تاہم اس کے لباس کی خوشبو کے ساتھ ساتھ اس کی محبت' اپنائیت اور گرم جوشی کی مہک نے اسے لمحہ بھر کے لیے دم بخود کردیا تھا۔

"میں نے تو جب زیب بٹی کو دیکھا تو اسی وقت میرے دل نے گواہی دی کہ منصور کے لیے اس سے بہتر لڑکی کوئی ہو نہیں سکتی۔" حسینہ محبت بھرے لہجے میں بولیں۔

"امی نے تو زیب کی اتنی تعریفیں کی ہیں کہ بس۔ زیب کے بال اتنے گھنے ہیں، آنکھیں ایسی گہری۔" بشریٰ نے مسکراتے ہوئے ماں کے توصیفی انداز کو آگے بڑھایا۔ زاہدہ نے چارپائیوں کے درمیان میز لگا کر لوازمات چن دیے۔ وہ سر جھکا کر سیب کاٹتے ہوئے بشریٰ کی باتوں کا مدھم انداز میں جواب دیتی رہی۔ اس کی تعلیم، مشاغل، دلچسپیاں، مگر بشریٰ کی اگلی بات نے اسے سخت دھچکا لگایا۔

"روشنی میں جب تم سے ملوں گی تو یقیناً" تمہیں امی کی بتائی ہوئی کوالٹیز کے مطابق پاؤں گی۔ ان شاء اللہ۔" دانت پیستے ہوئے اس نے فوراً" ارادہ باندھا کہ ان کے جاتے ہی بلال کی چٹنی بنائے گی۔

"منحوس! نہ سیور توڑتا، نہ یہ الفاظ مجھے سننے کو ملتے۔ اپنی ساری تیاری یوں ضائع جانے پہ اسے سخت صدمہ ہوا تھا جب وہ مہمانوں کے صرف ہیولے دیکھ رہی تھی تو یقیناً" انہیں بھی اس کی شبیہہ نظر آرہی ہوگی۔"

"آپی! مجھے کیلا دو ناں۔" پانچ سالہ نصیر اس کے پاس آکر بولا۔

"میری جان! آپ جاؤ، کھیلو۔" اس نے محبت بھرے انداز میں اسے وہاں سے ٹہلانا چاہا، مگر اس کا مطالبہ زور پکڑتا گیا۔

"ارے کیوں بچے کو رلا رہی ہو۔ یہ لو۔" حسینہ نے کیلے کے ساتھ سیب کی ایک دو قاشیں کمال شفقت سے نصیر کو تھمائیں تو وہ خوشی خوشی دوڑ گیا۔

اسے دیکھ کر باقی سب دوڑے چلے آئے اور چارپائی کے گرد گھیرا باندھ لیا۔ زیبی کا غصے اور شرمندگی سے برا حال تھا۔ وہ بشریٰ اور آنٹی حسینہ کو منع کرتی رہی، مگر وہ مسلسل دائیں بائیں کچھ نہ کچھ بچوں کو اٹھا کر دیتی رہیں۔

"بچے تو ہوتے ہی کھانے پینے کے شوقین ہیں۔ انہیں بھلا تکلفات کی کیا پروا۔ ہمارا احزم بھی ہر چیز شوق سے کھاتا ہے۔" بشریٰ گود میں بیٹھے اکلوتے بیٹے کے ماتھے پہ پیار سے بوسہ دیتے ہوئے اسے شرمندگی سے نکالنے کی خاطر بولی۔

"احزم اپنے بابا کی طرح چٹورہ اور۔۔۔"

بشریٰ بولتے بولتے ایک دم رک گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ پیچھے سے اسے کوئی کھینچ رہا ہے، اس کی لینن کی شرٹ کہیں پھنسی ہوئی تھی۔ چھڑانے کی خاطر ہاتھ مارا تو دل دھک سے رہ گیا۔ میدانی بکرا کب سے کھڑا اس کی قمیص چبا رہا تھا۔

"یہ کم بخت مارا کب کھونٹے سے چھوٹ کر ادھر آن مرا۔" زاہدہ تیر کی سی تیزی سے اٹھ کر بکرے پر جھپٹی۔ لگاتار کئی تھپڑ جانور کے منہ پہ مارے اور کھینچ کر دوبارہ کھونٹے پہ باندھ آئی۔

پیچھے قمیص کا نصف حصہ تقریباً" غائب تھا۔ اپنے نئے مہنگے بوتیک سے خریدے سوٹ کا حشر دیکھ کر بشریٰ کو ایک دم چپ لگ گئی تھی۔ پھر زاہدہ کی بار بار معذرت پہ اسے کہنا پڑا۔

"اٹس اوکے آنٹی! جانور سے کیا شکایت۔ آپ پلیز شرمندہ نہ ہوں۔"

احزم کو لمبے لمبے کانوں والا میمنا بہت پسند آگیا تھا۔ یوں ہی بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے اچانک اس کے حلق سے اذیت سے بھرپور چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہ پاؤں پکڑے اونچی آواز سے رو رہا تھا۔

"مائی پرنس، میری جان کیا ہوا؟" بشریٰ اور حسینہ چارپائی سے اتر کر فوراً" احزم کی طرف آئیں۔ احزم کی نرم و گداز ایڑی میں کانچ گھس گیا تھا۔ ٹوٹے انرجی سیور کا کانچ۔ جو کسی کو اٹھانا یاد نہیں رہا تھا۔ کانچ کا ٹکڑا نکالتے ہی خون بہہ نکلا۔ اکلوتے، منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والے بیٹے کو درد سے بے حال ہوتا دیکھ کر بشریٰ بھی اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔

ہی کہتے ہیں کہ تم میکے جاکر بیٹے کو دیکھ کر آئی ہو اب بلیڈنگ کا سنیں گے تو نجانے کیا حشر اٹھا دیں گے۔"
بشریٰ رونے روالی ہو رہی تھی۔
"بشی! حوصلہ کرو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں سے سیدھا ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ میں نے ڈرائیور کو کال کردی ہے۔ وہ بس آتا ہی ہوگا۔" حسینہ بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے بولیں۔ بشریٰ کی پریشانی کچھ غلط نہ تھی۔ احزم شادی کے سات سالوں بعد کافی دعاؤں اور منتوں سے پیدا ہوا تھا۔ بشریٰ کی اس میں جان تھی تو باپ بھی کم دیوانہ نہ تھا۔ ہلکی سی کھانسی چھینک پہ دونوں ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھتے تھے۔ زاہدہ نے خون صاف کرنے کے بعد ہلدی اور سرسوں کا تیل ملا کر زخم پہ لگا دیا۔ ساتھ ہی اپنے دوپٹے کو تیزی سے پھاڑ کر پاؤں پہ پٹی باندھ دی۔ احزم کی مرہم پٹی کی مصروفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بچہ پارٹی لوازمات پہ ٹوٹ پڑی تھی۔ گاڑی کا ہارن سنتے ہی بشریٰ نے تو سب کو اجتماعی خدا حافظ کہا، مگر حسینہ فردا" فردا" سب سے ملیں، زیبی کو ساتھ لگا کر خوب پیار کیا اور ہاتھ میں ہزار روپے تھما کر روانہ ہو گئیں۔ ساری رات زیبی کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔



روزے کا ہے مہینہ
بخشش کا بن کے سایہ
تیرے لیے مسلمان
رمضان بن کے آیا

"حق ہا! کیا بات ہوتی تھی۔ سیالوں "سردیوں" کے رمضان کی۔" چارپائی کی رسی کستے ہوئے بلقیس نے ایک ٹھنڈا ٹھار ہنکارا بھرا تھا۔
"چھوٹے چھوٹے دن، نرم گرم دھوپ میں ذرا دیر کو آرام کرنے کے بعد افطاری کی تیاری۔ پتا بھی نہ چلتا کہ روزہ کھل جاتا۔"
"تو تو ایسے سردیوں کے روزے یاد کر رہی ہے جیسے گرمیوں کے روزوں نے تجھے نڈھال کر رکھا ہو۔" زاہدہ نے ہنستے ہوئے دیورانی پہ چوٹ کی تو وہ کھسیا کر

"بھابھی! یہ ٹکے ٹکے بچوں کے ساتھ بھلا کیسے روزے رکھ سکتی ہوں۔ اوپر سے گھر کا کام۔ تمہارے ساتھ تو زیبی لگ جاتی ہے، مگر گرمیوں کے روزے.... بس اللہ معاف کرے۔ پہلے روزے نے اتنا نچوڑا کہ ابھی تک ناتوانی نہیں جا رہی۔ ان شاء اللہ سردیوں کے پورے روزے رکھوں گی اگر سانسوں نے وفا کی تو۔"
رسی کے آخری سرے کو زور سے گرہ لگانے کے بعد بلقیس تناؤ محسوس کرنے کی خاطر چارپائی پہ آبیٹھی۔ زیبی عصر پڑھ کر باہر آئی تو بے ساختہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی تھی۔ بلال اور احمد کنچوں کے ساتھ ساتھ آملوں کو بھی ملا کر کھیل رہے تھے جو اس نے بالوں پہ لگانے کی خاطر خرید کر رکھے تھے۔ روزوں کی وجہ سے آملوں کو نہ پینے کا ٹائم ملا نہ ہی سر پہ لگانے کا۔ ان شرارتیوں کے ہاتھ نجانے کیسے لگے تھے۔
"اماں! دیکھ اپنے لاڈلے سپوت کا حال۔ آملوں کو کنچوں کے ساتھ ملا لیا۔ پھر تو کہتی ہے کہ میں خواہ مخواہ ان پہ غصہ ہوتی ہوں۔" وہ کمزور سی آواز میں زاہدہ سے شکایتی انداز میں مخاطب ہوئی۔ آج تئیسواں روزہ تھا۔ مسلسل روزوں سے جسم کے ساتھ آواز بھی کمزوری غالب آگئی تھی۔ جولائی کے سخت گرم دن، طویل لوڈشیڈنگ، پانی کی قلت گویا نفس کو کچلنے کا مکمل سامان۔ زاہدہ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ہمسائی حلیمہ کی طرف متوجہ تھی جو کوئی برتنے کی چیز لینے آئی تھی۔
"زاہدہ! تیری بیٹی کو جو لوگ دیکھنے آئے تھے۔ بڑی لمبی سی گڈی میں۔ سنا ہے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ کیا جواب دیا پھر ان لوگوں نے؟" حلیمہ کے اپنائیت بھرے انداز میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔
"ہاں بس۔ ہم نے انکار کر دیا۔ ظہور کہتا ہے کہ زیبی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اتنی کم عمری میں ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈال سکتے۔" زاہدہ اب اس کے علاوہ اور کیا کہتی۔ حلیمہ والا سوال تقریباً" خاندان کے ہر فرد نے اس سے کیا تھا۔ اب کیا کہتی کہ اس رات کی "عزت افزائی" کے بعد انہوں نے دوبارہ پلٹ کر نہیں

پوچھا۔

☼ ☼ ☼

دعا عبادت کا مغز ہے۔ مومن کا ہتھیار ہے۔ زندگی کی تلاطم خیز موجوں میں چلنے والا سفینہ۔ چلتے پھرتے' گھر کے کام نمٹاتے اسے یونہی بشریٰ کی قمیص کا ستیاناس ہونا' احزم کا زخمی ہونا اور گھر کے بچوں کا شور اور ندیدہ بن یاد آتا تو دل پہ بوجھ سا آن پڑتا' روح بے کیفی کا شکار ہوجاتی' جسم وجاں پہ عجیب سی بے حسی طاری ہوجاتی' مگر یہ ساری کیفیت لمحہ بھر کی ہوتی' خشوع وخضوع سے روزے رکھتے ہوئے' دل لگا کر عبادت کرتے ہوئے' دل سے پورے یقین کے ساتھ اپنے لیے "خیر" کی دعا مانگتے ہوئے یہ سارا اضطراب' ساری بے کیفی' بے حسی پل بھر میں اڑنچھو ہوجاتی تھی۔

آج چاند رات متوقع تھی۔ یعنی رمضان المبارک کا آخری یوم۔ ظہور سب بچوں کے کپڑے اور جوتے لے آیا تھا اور وہ اپنی سہولت کے لیے مارکر سے واضح نشان بناتی جارہی تھی کہ کل کہیں عید کے دن سارا سامان گڈمڈ نہ ہوجائے۔

"یہ نیلا جوڑا نصیر کا' براون بلال کا۔" ایک ایک بچے پہ قمیص رکھ کر نشان لگانے کے بعد انہیں کھونٹیوں پہ لٹکاتی جارہی تھی۔ صحن سے آتی نامانوس آوازوں پہ کام کو روک کر وہ باہر چلی آئی پھر اسے دروازے پہ ہی رکنا پڑ گیا تھا۔ سامنے بشریٰ اور آنٹی حسینہ موجود تھیں۔

"کیسی ہو زیب! بہت کمزور لگ رہی ہو۔ لگتا ہے' پورے روزے رکھے ہیں۔" بشریٰ ہنستے ہوئے اس کے گلے آلگی۔ حسینہ آنٹی بھی اپنے سابقہ پرجوش انداز میں ملیں۔

"بشریٰ نے میری بیٹی کی عیدی آخری عشرہ لگتے ہی خریدنا شروع کردی تھی۔ کل اس کی شاپنگ مکمل ہوئی تو ہم ادھر چلے آئے۔" حسینہ اس کے شرگیں چہرے کو دیکھتے ہوئے محبت سے بولیں۔

"باجی! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا کہ بغیر اطلاع کے آگئے۔ میری بچی کی پہلی پہلی عیدی آرہی تھی۔ آخر کچھ تو اہتمام کرتی میں۔" زاہدہ خوشی سے بے قابو ہوتے دل کو سنبھالتے ہوئے عاجزی سے بولی۔

"پہلی عیدی ہی نہیں! بلکہ آخری عیدی بھی دینے آئے ہیں زیب کو۔" بشریٰ نے ہنستے ہوئے تصحیح کی۔

"مطلب؟" وہ دونوں نہ سمجھیں۔

"منصور کو دبئی سے واپس آئے ہفتہ ہوچکا ہے۔ ہمارا ارادہ عید کے فوراً" بعد شادی کرنے کا ہے۔ اگر آپ کا ارادہ ہو تو۔"

زیبی سے وہاں ٹھہرنا محال ہورہا تھا۔ شرم سے تپتے چہرے کے ساتھ اندر چلی آئی تو نظر بے ساختہ سامنے لگے چارٹ پہ پڑی۔ "دعا کے فضائل" وہ قریب چلی آئی۔

"خشوع وخضوع' عجز وانکساری اور خلوص کے ساتھ مانگی ہوئی دعا کبھی بارگاہ الٰہی میں رد نہیں کی جاتی۔" وہ نم آنکھوں کے ساتھ بار بار اس سطر کو پڑھ رہی تھی۔

"تم واقعی امی کی بتائی ہوئی خصوصیات پہ پورا اترتی ہو۔ خوب صورت' نازک' من موہنی۔" عیدی کے بیگز اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بشریٰ نے اس سے کہا تھا۔ اس کی نگاہیں بے ساختہ اپنی سانولی کلائیوں پہ اٹھ گئیں۔ بازوؤں پہ موٹے موٹے گرمی دانے تھے۔ صرف بازوؤں پہ کیا موقوف چہرہ' گردن گرمی دانوں سے اٹے ہوئے تھے۔ سانولی رنگت موسم کی شدت سے سیاہی مائل ہوچکی تھی۔ تن پہ اس وقت گھسا پرانا اڑے رنگوں والا لان کا جوڑا تھا۔ اپنا جائزہ لینا موقوف کرکے وہ انجانے روپہلے احساس میں گھری بیگز کھولنے لگی۔

بے حد قیمتی جوڑے' جوتے' پرس' کاسمیٹکس۔ آسودہ' مطمئن اور خوش حال مستقبل کے یقین سے سجی روشن آنکھوں کے ساتھ وہ اپنی پہلی عیدی کو بہت محبت اور احترام سے دیکھنے لگی۔ صرف پہلی نہیں بلکہ آخری عیدی کو بھی۔

☼

رضوانہ ارشاد الحق

عید ہو جائے

بلا کی گرمی بھرا دن اپنے اختتام کی طرف گامزن تھا۔ دھوپ آم کے درخت کی گھنیری شاخوں کے پیچھے چھپنے کی سعی کر رہی تھی مگر حبس کا وہ عالم تھا کہ درخت کے پتے تک ہلنے سے انکاری تھے..... اور بجلی صاحبہ کے تو کیا ہی کہنے..... کسی کرپٹ سیاستدان کی نخریلی بیگم کی طرح ہمہ وقت گھر سے غائب رہنے کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔

کبھی لوڈشیڈنگ تو کبھی شارٹ سرکٹ، تو کبھی فیوز غائب، جب ہی تو اس کے نخروں کا عادی ہونے کے باوجود جاذب ہمہ وقت دہائی دیتا پایا جاتا تھا۔

جھلک دکھلا جا، جھلک دکھلا جا
ایک بار آجا آجا آجا، آ..... جا

"کمبخت..... روزہ دار ہے..... کچھ تو شرم کر لے....." جس چٹائی کے پنکھے سے چاچی خود کو ہوا جھل رہی ہوتیں وہی پنکھا اسے کھینچ مارتیں..... صحن پر ڈالی ٹین کی چھت کے نیچے دری پر لیٹا گرمی کی مار سہتا گنگناتا جاذب پنکھے کی مار کھا کر بلبلا اٹھتا.....

"میں کون سے گناہ کما رہا ہوں..... لائٹ کے آجانے کی دعائیں ہی تو مانگ رہا ہوں....."

"ہرگز نہیں چاچی.....!" یہ دراصل لائٹ کے بہانے اپنے محبوب گلوکار ہمیش کو یاد کر رہا ہے....." میں جلے پر نمک چھڑکتی۔ مجھے علم تھا جاذب موٹو کو ہمیش ریشمیا کی آواز اس کے گائے ہوئے چھچھورے گانے کس قدر پسند تھے..... کیوں پسند تھے یہ وجہ بھی میں آپ کو بتاتی چلوں.....

تو جناب وجہ بھی ہماری پڑوسن منی خالہ کی گوری





چٹی موٹی بھینس صبوحی ہے' جو عرف عام میں صبی کہلاتی تھی۔

مجھے تو سو فیصد یقین تھا اس موٹی بھینس نے اپنے بگر ارے موٹے موٹے ڈیلوں سے چھت پر آتے جاتے نین مٹکا کر کے ہی جاذی کو پھنسایا تھا۔ ورنہ بقول جاذی کے عمر بچپن کی دل پچپن کا کے مصداق اسے بچپن سے ہی اس موٹی سے عشق تھا اور لڑکپن تک آتے آتے عشق کا بوجھ اتنا بھاری ہو گیا کہ وہ چاچی کے گھٹنے سے چمٹ گیا۔

"ماں... پیاری اماں... صبی تمہاری بھی تو لاڈلی ہے... منی خالہ سے تمہاری ڈانٹ کاٹے کی دوستی ہے' اسی دوستی کا پاس رکھ لو... میری محبت رسوا نہ ہو اس لیے میں اپنی محبت کو "منگنی" کے ڈبے میں بند کرنا چاہتا ہوں' پلیز اماں... پیاری اماں... مان جاؤ نا..."

چاچی کی منتیں ترلے کر کے اس موٹو جاذی نے اس موٹی صبی سے منگنی کروا کر ہی دم لیا... چاچی کون سا ظالم سماج تھیں' سیدھی سادھی معصوم سی چاچی کو دنیا کی ہر لڑکی "پیاری بچی" لگتی تھی' ظالم سماج تو میں تھی۔

"اریبہ سہیل" اپنے اماں ابا کی "اکلوتی" بیٹی... لاڈلی اس لیے نہیں کہا کہ مجھے تو آج تک کوئی ایسے آثار نہیں دکھے جس سے پتا چلتا ہو میں اپنی اماں کی لاڈلی یا ابا کی دلاری ہوں' ابا بلاشبہ میرے لیے ہٹلر نہیں تھے' مگر اماں ضرور مجھ غریب پر ہٹلر کی جانشیں مقرر ہوئی تھیں۔

"اریبہ..." اماں کی دھاڑ پر صبینہ نے میرا بازو جنجھوڑا تھا۔

"بڑی اماں آواز دے رہی ہیں۔"

"کیا ہوا... لائٹ آ گئی کیا...؟" میں کہانی بنتے بنتے ہڑبڑائی۔

"لائٹ نہیں بڑی اماں کا بلاوا آیا ہے..." وہ مسکرائی۔

"یوں کہو منکر نکیر کا بلاوا آیا ہے۔" میں چپل پیروں میں اڑستی نیچے بھاگی۔

"یار...! زندگی کا منکر نکیر زیادہ خوفناک ہوتا ہے یا مرنے کے بعد ملنے والا..." جاتے جاتے بھی میں شوشہ چھوڑنے سے باز نہ آئی۔

"کہاں تھی تو...؟ ہوش ہے یا نہیں' دھوپ ڈھل رہی ہے... افطاری کی تیاری کرنی ہے' یہ نہ ہوا کہ دو گھڑی ماں کے پاس بیٹھ کر کچھ کام دھام کر لے... چپکی ہو گی اسی ناس پیٹے موبائل فون سے..."

"ماں تم تو اپنی سوتن (اگر ہوتی) سے بھی اتنا خار نہ کھاتیں جتنا میرے بچارے موبائل فون سے..." میں بڑبڑاتے ہوئے آلو چھیلنے لگی... ایک تو روزہ رکھنا مجھے بہت صبر آزما کام لگتا تھا' اس پر گرمی اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ نے مت ماری ہوئی تھی۔ اب بچی کھچی "مت" کے خزانے اس "ڈبے" پر کڑھ کڑھ کر خرچ ہو رہے تھے۔ جس میں موٹی صبی کی محبت بند تھی...

روزہ افطار کے بعد نماز مغرب اور پھر بچی کھچی افطاریوں پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد فارغ بیٹھی تو خالی دماغ شیطان کا کارخانہ' کے مترادف تیزی سے چلنے لگا۔ سوچا عشاء میں کچھ ٹائم ہے۔ کیوں نہ صدیقہ پھوپھی کی زارا سے بات کر لوں...

"ہائے زارا... کیسی ہو... روزے کیسے جا رہے ہیں...؟" میری ہر کسی سے بات چیت عموماً "میسج" کے ذریعے ہوتی تھی۔

"کیا بتاؤں یار...! عید کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی ہوں... پتا ہے ساحر میرے لیے "پاری" سے بہت خوبصورت جوڑا لایا ہے۔ اب ظاہر ہے "عیدی" آئے گی تو عید کے جوڑے کے ہمراہ ڈھیر سارا اور سامان بھی تو ہو گا۔ اس پر ساحر سے "چوری چھپے" عید ملنے کا سرور... اف تمہیں کیا پتا اریب! منگنی ہو جانے کے بعد عید کے دن کا الگ ہی مزہ ہوتا ہے... میں تم سے کیوں یہ سب کہہ رہی ہوں... بندر کیا جانے ادرک کا مزہ..." زارا کا

طویل میسج موصول ہوا جسے پڑھ کر میرے پتنگے لگ گئے۔۔۔۔ تب کر میں نے فون ہی آف کر دیا۔

"اس سانولی سلونی، چوہیا جیسی کزن کو ساحر بھائی جیسا ہینڈسم منگیتر کیا مل گیا۔۔۔ یہ مجھے "بندر" کہہ رہی ہے، مزہ نہ چکھایا تو میرا نام اریبہ نہیں۔۔۔۔" میں نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔



صبح سے بادل چھائے ہوئے تھے، بوندا باندی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اور اتنے خوبصورت موسم میں آم کے پیڑ پر جھولا نہ ڈالوں۔ ایسا بھی سڑیل مزاج نہ تھا میرا بس لوگوں کا منگنی نامہ اور محبت نامہ سن سن کر دماغ تھوڑا اپنی جگہ سے کھسک جاتا تھا، مگر دیگر معاملات میں، میں بالکل سیٹ تھی۔ اسی لیے ہلکی ہلکی پینگیں لیتی میں اپنے سیل فون میں آئے ہوئے اجنبی نمبرز کے میسجز پڑھ رہی تھی، رانگ نمبرز پہ بات کرنا یا انجان نمبر پر میسجز کرنا مجھے بالکل پسند نہ تھا۔ اریبہ سہیل بھلا کیوں کسی کی "دل پشوری" کا سامان بنے۔

میرے مزار پہ آکے دیئے جلائے گا
وہ میرے بعد میری زندگی میں آئے گا

میں منتظر تھی تو اسی ایک شخص کی جسے میری زندگی میں آنا تھا، اسی لیے مندرجہ بالا شعر اکثر آہ کی صورت میرے لبوں پہ چہکار ہتا تھا۔

میرے ساتھ کی تقریباً" ساری سنگی سہیلیاں اور کالج کی دوستیں "منگنی شدہ" ہو چکی تھیں۔ بس میں ہی کسی ایکس وائی زیڈ کے نام کا ٹھپہ لگائے بغیر بے رنگ سی زندگی گزار رہی تھی۔

"کیا بتاؤں۔۔۔۔ منگنی سے شادی تک کا پیریڈ کتنا رومانٹک ہوتا ہے یار۔۔۔۔! ایسی لائف کے لیے تو میں اپنی شادی کو دس سال تک ملتوی کرنے کو تیار ہوں۔" ندا چوہدری نے آنکھیں میچ کر کچھ اتنے سرور سے کہا تھا کہ بے اختیار تب سے ہی مجھے یعنی اریبہ کو ہو کا اٹھا تھا منگنی کروانے کا۔

"ماں۔۔۔۔! دنیا جہاں کی لڑکیوں کا رشتہ آتا ہے اور جھٹ پٹ منگنی شادی ہو جاتی ہے۔ میں بھی کوئی اندھی، کانی لنگڑی لولی تو نہیں ہوں۔۔۔۔ پھر میرا کوئی رشتہ کیوں نہیں آتا۔۔۔۔ مجھے بھی منگنی کروانی ہے اماں بس۔ میں نے کہہ دیا۔"

اس روز کالج سے آکر میرے صبر کا پیمانہ چھلک چکا تھا۔ کالج کے دوسرے سال سے لے کر اس چوتھے سال کے آخر تک میری تمام کالج فیلوز ٹھکانے لگ گئی تھیں، کسی کی "ارینج" ایںگیجمنٹ تھی تو کسی کی "لو" اور اب فیئرویل کے بعد سب ایک دوسرے سے جدا ہونے والی تھیں، اپنے اپنے قصوں سمیت، پر میرے پاس میرے مسٹر رائٹ کا کوئی جی کو گرمانے والا قصہ نہ تھا، یوں میں نے افسردگی میں اماں سے شکوہ کر ڈالا تھا۔

"تو لنگڑی اور کانی تو نہیں ہے بیٹا پر اس سے بھی بڑی خامی ہے تجھ میں کہ۔ تیرے سر کا تربوز خالی ہے۔" اماں نے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے کچھ اس قسم کا طنز کیا جو میرے سر پر سے گزر گیا تھا۔ جس پر وہ مزید سیخ پا ہونے لگیں۔

"شاباش ہے تجھ پر۔۔۔۔ لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی، پر عقل تری گٹوں میں ہی دبی رہ گئی۔ ماں سے ایسی فرمائش کرتے شرم تو نہ آئی ہو گی تجھے۔۔۔۔"

"لو۔۔۔۔ ایسا کیا غلط کہہ دیا میں نے۔۔۔۔ جس پر شرم کروں۔" اپنا کالج بیگ کندھے سے اتار کر پرے پھینکتے ہوئے میں ان کے سامنے صوفے پر پیر پسار کے لیٹ گئی۔

"اب گھر میں آپ کے علاوہ ہے ہی کون۔۔۔۔ میری کوئی چھوٹی بہن، باجی یا بھائی تو نہیں، جن سے میں اپنی دل کی بات کہوں۔۔۔۔"

"کرتی ہوں میں ترے دل کی فکر بے حیا۔۔۔۔" اماں کی جوتی نے بہت تلملا کر میرا استقبال کیا تھا بہت دیر تک میری پشت جلتی رہی تھی۔۔۔۔ اب میں بھی کیا کروں۔ جو دل میں ہو وہ زبان پر لانے سے ہرگز نہیں رک سکتی تھی، اب تو سکھیوں کی ان کے

منگیتر اور لورز سے ہونے والی رومان پرور گفتگو سنتے ہی مجھے طیش آجاتا تھا۔

"کاش! کوئی تو میرا دکھ مٹانے والا آجائے۔۔۔" دل سے کراہ بھری دعا نکلی۔ موبائل کی میسج ٹون نے میرے دل جلے خیالات کا سلسلہ توڑا تھا۔ میسج کا "ڈبا" کھولا۔

"تمہارے سر پر کوئل بیٹھی کوک رہی ہے' فریاد کررہی ہے' پکے ہوئے آم توڑ کر ملک شیک بنانا تو اخلاقاً" جگ بھر کر صبوحی کے لیے بھی دے آنا۔۔۔ بیچاری روزے رکھ کر۔۔۔۔ کمزور ہورہی ہے۔۔۔" میسج ڈبو۔۔۔ میرا مطلب ہے منگنی کو "ڈبا" بنا کر اپنی موٹی محبوبہ کو رسوائی سے بچانے والے جازی کا تھا۔

"موٹی کے ملک شیک میں نیلا تھوتھا نہ ملادوں۔۔۔" زہریلی سوچ کا پُرپیچ سفر طے کرتے ہوئے' میں نے اس کا دوسرا میسج کھولا۔۔۔ جو ابھی ابھی آیا تھا۔

"مجھے پتا تھا تم میری پیاری سی صبوحی کے لیے میری معصوم سی خواہش پر لال پیلی ہوجاؤ گی' اس لیے بڑی اماں سے پہلے ہی کہہ دیا تھا' وہ ایک جگ میرے لیے اور ایک جگ صبوحی کے لیے ضرور بھیجیں گی۔۔۔ ایک ریکوئیسٹ ہے تم سے' افطاری کے بعد لڑنے آنا۔۔۔ ابھی میں اور تم دونوں روزہ دار ہیں۔۔۔ بائے۔۔۔" اس میسج پر مزید پیچ و تاب کھانے لگی تھی۔ "اس دشمن نمبر ون سے تو میں ابھی نبٹ لیتی ہوں' پھر اللہ میاں سے توبہ کرلوں گی۔" جھولا روک کر اترنے کا قصد کیا۔

"لگی رہ کمبخت۔۔۔ اسی موئے فون پر آنکھ لگائے رکھنا' یہ بخشش کروائے گا' یہ نہیں ہوتا کہ فارغ وقت میں کام آنے والی پڑھائی کرلے۔۔۔" ماں کے ایک زبردست دھموکے نے ہی مجھے جھولے سے اتار کر از خود دو فٹ دور لڑھکا دیا۔۔۔

"کیا ہے اماں۔۔۔! اگر بیٹی نہ سہی روزہ دار سمجھ کر ہی ہاتھ ہلکا رکھا کریں۔۔۔" میں بری طرح تلملائی تھی' پیٹ پہلے ہی خالی تھا' سحری میں اماں نے میرے سامنے بھنڈی گوشت رکھا تھا' جو مجھے سخت ناپسند ہے' انڈا سحری میں کھانا ممنوع تھا تو وہ بھی رات گھر کا راستہ بھول گئی تھی' مجبوراً" تھوڑا سا چائے پر اٹھا زہر مار کرلیا تھا۔ اور روزے کی نیت میں دن بھر میں اناللہ (بھوک سے) نہ ہوجانے کی دعا بھی کی تھی۔

"جو تیرے کرتوت ہیں نا۔۔۔ تو تیرے کھانے پینے سے فاقہ کرنے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ دن بھر فاقہ کرکے چند منٹوں کے لیے پانچ وقت جائے نماز پر کھڑے ہوجانے سے روزہ کا حق ادا نہیں ہوتا بیٹا۔۔۔! باز آجا۔۔۔ دن بھر تو اس موئے فون کو خزانے کی طرح مٹھی میں دبائے بد روحوں کی طرح پورے گھر میں بھٹکتی رہتی ہے' کام کی نہ کاج کی' دشمن اناج کی۔۔۔" ان کی تلملاہٹ کسی طور کم نہ ہورہی تھی۔

"اب اور کیا کروں آپ کے لیے۔۔۔ بی اے تک پڑھ تو لیا ہے' اب بیاہ کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ جس سے پوری طرح چشم پوشی کررہی ہیں آپ۔۔۔ سچ کہہ رہی ہوں اماں۔۔۔ اس وقت میرا خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے' جب وہ ڈبی موٹی۔۔۔ میرا مطلب ہے صبی جازی سے ہونے والی ساری باتیں دوپٹے کا پلو مروڑ کر مجھے سناتی ہے۔"

"میں کہتی ہوں نا۔۔۔ تیری عقل اب تک گھٹنوں میں اٹکی ہے' مگر اب لگتا ہے حالات زیادہ خراب ہوتے جارہے ہیں' تیری عقل گھٹنوں سے بھی نیچے سرک کر ٹخنوں میں آگئی ہے' علاج ضروری ہوگیا ہے۔ فی الحال جا۔۔۔ جاکر اپنے عقل مند پیروں پر ٹھنڈا پانی بہا تاکہ تیرے سر سے گرمی اترے۔۔۔ پھر کچھ کام کاج کر۔۔۔ کرتی ہوں تیرا بھی کچھ۔۔۔" اماں کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہتی جارہی تھیں' اور میں سچ مچ صحن میں لگے نل کے نیچے پاؤں رکھے ٹھنڈا پانی بہانے لگی۔

☼ ☼ ☼

آج ماہ مبارک کا تیسرا عشرہ لگ چکا تھا۔ ابا اعتکاف کے لیے مسجد جا چکے تھے۔ چاچی نے اماں سے کہہ دیا آخری دس روزے وہ چاہتی ہیں میں اور اماں ان کی طرف اوپری پورشن میں گزاریں۔ میرے تو مزے ہی ہو گئے تھے' اماں کے تھانیداری والے عتاب سے چاچی بارہا مجھے بچا لیتی تھیں۔

دوسرے سبوینہ کے ساتھ رات بھر گپیں مارنا' سحری تک جاگ کر سحری بنانا' کھانا اور پھر نماز فجر کے بعد جی بھر کر سونا کتنا خوش کن تھا یہ سب..... سال میں ایک سے دو بار ہی اماں مجھے سبوینہ کے ساتھ سونے کی اجازت دیتی تھیں۔

"سبوینہ..... سمجھا لے اپنے بھائی کو..... ورنہ یہ میرے ہاتھوں ضائع ہو جائے گا.....!" لائٹ جانے کے بعد صحن میں چارپائی پر بیٹھے میں اور سبوینہ باتیں کر رہے تھے کہ میں نے جازی کی چوری پکڑلی' وہ ہینڈز فری کان میں ٹھونسے بڑی دھیمی آواز میں یقیناً "صبوحی" سے باتیں کر رہا تھا' کیوں کہ چھت کی منڈیر پر کہنی رکھ کر باہر جھانکنے کا ڈراما کرتے اس کی والہانہ نگاہ بار بار منی خالہ کی چھت کی منڈیر تک جا رہی تھی۔

"ہاں بھئی میرے ڈبے.....! ہو گئیں اس موٹی سے باتیں' کر لیا دیدار؟" ایک ہی جست میں اس تک پہنچ کر میں نے پہلے اس کے کانوں سے تار کھینچا پھر اس کی کھنچائی کی..... ہم دونوں میں دو سال کا فرق تھا' مگر اس کی بڑائی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں ہمہ وقت اس سے الجھنے کو تیار رہتی تھی' جیسے اس وقت کیا تھا۔

"دیکھ اریبہ.....! میری صبوحی کی شان میں کوئی گستاخی نہ کرنا ورنہ....." وہ فربہی مائل گداز بدن والی صبوحی کو موٹی کہنے پر ہمیشہ کی طرح چڑ گیا۔

"نہ..... مجھے بتاؤ..... تمہیں اس سارے زمانے میں یہی کمرے کے برابر کمر والی موٹی بھینس ملی تھی' جسے پلو مروڑ کر اترانے کے سوا کوئی کام آتا ہی نہیں..... اور یہ تم اتنی چیپ قسم کی باتیں اس سے کیسے کر لیتے ہو؟ شرم نہیں آتی تمہیں.....؟"

کرنے کی شرم اس نے چھوٹے کرم..... جب تمہاری منگنی ہو جائے گی نا تب پوچھوں گا....." جازب نے ایک دم میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ٹھیک ہے بچہ جی.....! سلوا لو عبایا..... ایک کے بجائے تین سلوانا وہ بھی اپنی "پاکٹ منی" سے....." میں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

یہی تو بات بہت باعث خوشی ہے مجھے
وہ آنکھ کتنی محبت سے دیکھتی ہے مجھے

"اللہ نہ کرے جو میں تمہیں محبت سے دیکھوں....." میں تلملائی۔

"یا اللہ! کسی طرح اس چڑیل کو بھی منگنی شدہ کر دیں۔" وہ ہاتھ اٹھا کر دعا گو ہوا..... "تاکہ میں بھی اس سے گن گن کر اپنی صبوحی کی بے عزتی کا بدلہ لے سکوں۔" میں اس کی پہلے جملے والی دعا پر آمین کہتی ہاتھ

جھاڑ کر واپس پلٹ آئی تھی۔

"یہ عبایا کا کیا قصہ ہے۔۔۔" مبینہ بے چینی سے مجھ سے پوچھ رہی تھی میں نے صبوحی کی بات بتادی۔

صبوحی میری اچھی پڑوسن اور دوست تھی، مگر جب سے اس نے میرے ہی کزن جاذب نصیر سے اپنے عشق کی راز و نیاز والی باتیں مجھے بتانی شروع کیں، اور پھر میرے لاکھ سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود جاذی نے اس سے منگنی کروا کر ہی دم لیا۔ تب سے مجھے ان دونوں سے دشمنی ہو چلی تھی، مگر مصیبت تو یہ تھی کہ وہ موٹی صبی مجھے اپنی پکی سہیلی سمجھ کر بہت شرماتے لجاتے اور اتراتے ہوئے اپنے اور جاذی کے درمیان ہونے والی بے حد نجی باتیں بھی مجھے جب تک بتا نہ لیتی اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھتے رہتے تھے۔۔۔ ابھی حال ہی کی بات ہے جاذی کے کہنے پر میں اور مبینہ چاچی کی تیار کی ہوئی عیدی کا سامان چاند رات سے پہلے ہی اسے دے کر آئے تھے۔ بانو تب سے تو وہ مزید ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

ستائیسویں شب کی نفلی عبادات کے بعد سحری کر کے میں سوئی تھی۔ ارادہ تو تھا کئی گھنٹے سونے کا، مگر اماں نے جھنجوڑ کر جگا دیا۔۔۔ وقت دیکھا تو صبح کے ساڑھے نو بجے تھے۔۔۔

"اماں۔۔۔! کچھ دیر تو اور سونے دیں۔۔۔"

"اٹھتی ہے یا لگاؤں ایک جھانپڑ۔۔۔ اٹھ کر منہ دھو، بال بنا اور ذرا تمیز سے اپنی چاچی کے کمرے میں آجانا، وہاں مدیحہ آئی ہوئی ہے۔۔۔" اماں کے لہجے کی غراہٹ نے میری نیند تو اڑا ہی دی تھی۔ مبینہ کا بستر دیکھا وہ بھی خالی تھا۔

"کیوں مدیحہ آنٹی نے مجھے اپنے "بانسری" جیسے بیٹوں میں سے کسی کے لیے دیکھا ہے کیا۔۔۔ اگر ایسی بات ہے تو میرے طرف سے انکار ہے۔۔۔ چار سال پہلے دیکھا تھا، مگر ان کی شکل سے ہی لگتا تھا ان میں "عقل" کا فقدان ہے، رومانس کرنا کیا خاک جانتے ہوں گے۔۔۔" حسب عادات میری زبان بلا سوچے سمجھے فرائے بھر کر چپ ہوئی تو اماں کی طرف نظر ٹھہری۔ اف کیسی غضیلی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں، ان کے عتاب سے بچنے کو میں چادر پھینک کر جھپاک سے باتھ روم میں گھس گئی۔

میری شکل تو خیر! اللہ نے اچھی دی تھی، البتہ عقل کی طرف سے اماں تھوڑی فکر مند رہتی تھیں، جبکہ میں مکمل طور پر پُر اعتماد تھی۔ میں نے الماری سے سادہ سالان کا جوڑا نکالا جو مبینہ نے شاید ایک بار بھی نہ پہنا تھا، اب اس جوڑے کی مجھ پر ہی رونمائی ہونی تھی۔ میری بلا سے مبینہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔۔۔ میری بدتمیزی کا چرچا عام ہو جاتا اور پھر مدیحہ آنٹی اپنے لمبوترے بانس جیسے کسی ایک بیٹے کے لیے مبینہ کا ہاتھ مانگ لیتیں۔

میرے لیے تو کوئی ایسا بندہ ہونا چاہیے جو شکل سے بھی بے حد رومانٹک لگتا ہو۔۔۔ جیسا کہ۔۔۔ جیسا کہ عمران ہاشمی! نن نہیں۔۔۔ اب ایسا بھی رومانٹک نہیں۔۔۔ عمران ہاشمی کی فلمیں دیکھتے ہوئے تو زیادہ تر نگاہیں مارے شرم کے اسکرین کے بجائے زمین پر سجدہ ریز ہوتی ہیں۔۔۔

خیالات کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے میں ست قدموں سے چاچی کے کمرے میں چلی آئی۔۔۔

"ارے۔۔۔! یہ اتنا سارا سامان۔۔۔ مم میرا مطلب ہے یہ تو "عیدی" کا بڑا روایتی سا، سامان ہے، مگر کس کے لیے۔۔۔؟ مدیحہ آنٹی کو سلام کر کے (مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے کے ساتھ بڑے نفیس سے "ڈبا پیکنگ" میں جوڑا، چپل، چوڑیاں، مہندی، جیولری، ہر ایک چیز اپنی چھب دکھلا رہی تھی) میرے منہ سے چیخ برآمد ہوئی تھی، ایک ایک چیز کو چھو کر دیکھتے میں نے خوشی خوشی پوچھا تھا۔

"یہ سب تمہارے لیے ہے۔۔۔" مدیحہ آنٹی نے بے حد پیار بھرے لہجے میں جواب دیا۔ تو میری آنکھیں چر گئیں۔

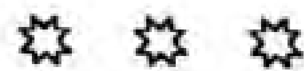
"بالکل اریب۔۔۔! مدیحہ آنٹی تمہارے لیے "عیدی" لائی ہیں" مبینہ کے لہجے میں بھی خوشی

ہلکورے لے رہی تھی۔۔۔ اس کی خوشی میں وہ اپنے سوٹ کا غم بھی بھول بیٹھی تھی۔۔۔

"مگر دیحہ آنٹی۔۔۔! میں نے آپ کے بیٹے کو نہیں دیکھا ہے۔" کندھے اچکاتے ادھر میرا منہ کھلا ادھر اماں نے میرا بازو پکڑ کر مجھے گھسیٹا اور مدیحہ آنٹی کے برابر میں لا کر صوفے پر پٹخ دیا۔ ساتھ میں اک دردناک چٹکی بھی بھری تھی، جو شاید خاموش رہنے کا اشارہ تھا، مگر وہ اریبہ سہیل ہی کیا جو موقع محل کے لحاظ سے زبان کھولے۔۔۔ سو میں نے اپنی معصومیت (بے وقوفی) کا ریکارڈ قائم رکھا۔

"مدیحہ آنٹی۔۔۔؟ اماں نے یقیناً میری افلاطونی طبیعت کے باعث بالا ہی بالا میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔۔۔ جب ہی تو آپ میرے لیے عیدی لائی ہیں۔۔۔ سب کچھ بہت خوبصورت اور ایکسپینسو ہے، مجھے بہت پسند آیا ہے۔۔۔ لیکن اگر مجھے آپ کا بیٹا پسند نہ آئے تو۔۔۔؟؟؟؟ پلیز۔۔۔ آپ ہی مجھے بتائیں نا وہ دیکھنے میں کیسے لگتے ہیں۔۔۔ ڈل اینڈ بورنگ یا پھر رومان۔۔۔ آہم۔۔۔" آگے فل اسٹاپ لگا دینا چاہیے اس روز مجھے خود بخود احساس ہوا تھا۔۔۔ اماں کا بی پی یکدم لو ہوا تھا۔ وہ گرنے کے قریب تھیں بھلا ہوا مدیحہ آنٹی کا جن کی تسلی بھری بات نے اماں کو سنبھالا دیا۔

"میں شاہ زیب کو یہیں بلوا لیتی ہوں کتنا عرصہ ہو گیا ہے اسے یہاں آئے ہوئے سب ہی اس سے مل لیں گے۔۔۔ کیوں رابعہ۔۔۔! بہت سریلا لہجہ تھا مدیحہ آنٹی کا جیسے انہوں نے میری بات کا قطعاً" برا نہ مانا ہو۔ ان کے اجازت لینے پر اماں کا سر اثبات میں ہلا اور میں ان کے عتاب سے بچنے کو پھر سارا دن ان سے دور دور رہی۔۔۔



"کمبخت تیری تو زبان کے آگے خندق ہے، کبھی تو اپنے منہ کا بھی صحیح استعمال کر لیا کر۔۔۔ ضروری ہے جو دل میں ہے وہ پھٹے بانس کی طرح ہر کسی کے سامنے بک دے۔۔۔"

"یہ اگر مدیحہ نے بچپن میں تجھے نہ مانگا ہوتا شاہ زیب کے لیے تو آج میں تیرے لیے سر پکڑ کر رو رہی ہوتی۔۔۔"

"اف۔۔۔" میں سارا دن اماں سے بچ بچا کر جونہی سبرینہ کے ساتھ اس کے بستر پر لیٹی، اماں کا زبردست دھمو کا میری پیٹھ سا لگا گیا۔ پھر اس کے بعد جو ان کی زبانی کیسٹ چلنے ہوئی تو میں زخم زخم ہکا بکا سر نیہوڑائے سنتی رہی۔۔۔

"اماں! اگر مجھ پر حملہ کرنا ہی تھا تو دبے پاؤں کیوں آئیں؟" ان کے چپ ہوتے ہی میں اپنی پیٹھ سہلاتے دہائی دینے لگی۔

"ہاں! پورا لشکر لے کر بھونپو بجاتے ہوئے آتی کہ میری لاڈلی مہارانی نے اپنی ہونے والی ساس کے سامنے کیسی بے حیائی کا مظاہرہ کیا ہے چلو اسے شاباش دے آؤں۔۔۔" ان کے انداز گفتگو پر سبرینہ کی ہنسی چھوٹ گئی تو میں نے اسے گھورا۔

"ایک انڈا دیا میرے مولا، وہ بھی چیچا ہوا۔۔۔"

"ایک انڈا وہ بھی گندا درست محاورہ ہے بڑی اماں۔۔۔!" اماں کے شکوہ پر جاذی نے سر اندر کر کے جھٹ یاد دلایا تھا۔ یقیناً وہ دروازے کے اوٹ میں ہو کر میری درگت بنتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا۔

"اور جلو میری پیاری صبوحی سے۔۔۔" اماں کے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔

"میں نے خون کے گھونٹ پیتے سبرینہ کے ساتھ بنائے گئے پلان پر عمل کرنے کے لیے سبرینہ کو اشارہ کیا۔

"آہم۔۔۔ جاذب۔۔۔! وہ کیا ہے کہ میں سوچ رہی تھی شاہ زیب بھائی کو دیکھے ہوئے اک عرصہ ہو گیا ہے، کم از کم ان سے بات تو کر سکتی ہوں۔۔۔ تو پلیز۔۔۔" سبرینہ آگے بڑھ کر اس کے کاندھے دبانے لگی۔۔۔ تم ابھی کسی طرح مدیحہ آنٹی سے شاہ زیب بھائی کا سیل نمبر لا دو۔۔۔ پلیز۔۔۔" وہ گھٹنے کے بل اس کی پشت پر

بیٹھی اس کے شانے دباتی منت بھرے لہجے میں بول رہی تھی۔

"یہ اس چالاک لومڑی کی فرمائش ہوگی۔ ہرگز نہیں میں مدیحہ آنٹی کے پاس نہیں جاؤں گا' اس وقت تو وہ سو بھی چکی ہوں گی۔ لیکن ضروری بات تو یہ ہے کہ میں اس جل ککڑی کے کام آؤں کیوں' یہ کون سا میرا خیال کرتی ہے۔۔۔" اس نے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔ جس پر میں میدان میں اتری۔

"دیکھو جازی۔۔۔؟ پہلی بات تو یہ کہ مدیحہ آنٹی ابھی جاگ رہی ہیں یعنی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ دوسری بات۔۔۔ اب میں کبھی بھی تمہاری موٹی منگیتر' اوہ سوری میمی کے خلاف کچھ نہیں بولوں گی اور نہ تمہاری برائی کروں گی۔ پرامس۔" میں نے جھٹ دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

"مجھے اور سبینہ کے لیے عبائے کی فرمائش بھی نہیں کروگی۔۔۔" اس خبیث نے فوراً مطلب کی ساری باتیں منوانے کی ٹھان لی۔

"اس کے علاوہ چاند رات کو مجھے صبوحی سے ملوانے کے لیے کوئی راستہ نکالو گی۔۔۔"

"ڈن۔۔۔" میں اپنا کام نکلوانے کو فوراً اس کی ساری باتیں مانتی چلی گئی۔۔۔ نتیجتاً اگلے آدھے گھنٹے میں شاہ زیب کا نمبر میرے سیل فون میں آچکا تھا' میسج بکس کھول کر میں نے ایک خوشی سے نعرہ لگایا تھا۔

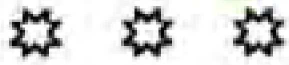
آم یا کیریوں سے۔

کیوں کہ اماں ان دونوں ماں بیٹے کے جانے کے بعد میری خوب تواضع (چپلوں اور زبان سے) کرتی تھیں' کہ میں نے شربت کیوں گرایا تھا' ان کے لیے رکھے ریفریشمنٹ کو خود فٹافٹ چٹ کیوں کر گئی۔۔۔ فالتو باتیں کیوں کیں' تمیز سے کیوں نہ بیٹھی رہی۔۔۔ ایسے بہت سے اعتراضات اماں کی یادداشت میں فٹ رہتے تھے' سو میں لمبو بانس کے الوداعی کلمات سنتے ہی جو وہ اماں سے کہہ رہا ہوتا تھا' سن کر سرعت سے درخت پر چڑھ کر شاخوں میں جا چھپتی تھی۔ اور اس لمبو کے گیٹ تک پہنچتے پہنچتے ایک دو کیریاں تو اس کا مزاج پوچھ ہی لیتی تھیں' پھر بعد میں پیچھے پیچھے مدیحہ آنٹی اماں کی ہمراہی میں نکلتیں تو وہ بے چارہ اپنی درگت پر "آہ" کیے بنا جھٹ بائیک اسٹارٹ کرنے لگتا۔

مدیحہ آنٹی کے دو لمبو میں سے جانے کس نے مجھ سے زیادہ مار کھائی ہے' ان کی شکلوں پر تو میں نے کبھی غور بھی نہیں کیا تھا۔

چار سال پہلے تک یہ سلسلہ چلا پھر وہ لوگ اسلام آباد شفٹ ہوگئے تھے' مدیحہ آنٹی کے شوہر نے اپنی پوسٹنگ کروالی تھی۔ جازی نے بتایا تھا' ان کے دونوں سپوت اسلام آباد کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں مائیگریشن کروا کر وہیں اپنی پڑھائی مکمل کر رہے تھے۔۔۔ اب اللہ جانے کیا بنا ان کا۔۔۔ مجھے تو بس اپنی منگنی اور ایک عدد منگیتر کی ہی خواہش تھی۔





مدیحہ آنٹی اماں کی چچازاد بہن تھیں۔ بقول چاچی کے' میرے بچپن میں ہی انہوں نے اپنے بڑے بیٹے شاہ زیب کے لیے مجھے اماں سے مانگ لیا تھا۔ جب تک وہ کراچی میں رہیں اکثر و بیشتر اماں سے ملنے آیا کرتی تھیں' جہاں تک مجھے یاد ہے ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ گورے چٹے' سوکھے لمبے بانس جیسے۔۔۔ ان میں سے ایک جو اپنی اماں کے ہمراہ آیا کرتا تھا مجھ سے بہت مار کھاتا تھا' ہاتھ سے نہیں جناب درخت پر لگے

"یار سبینہ۔۔۔! کہاں سے آغاز کروں۔۔۔"

موبائل ہاتھ میں پکڑے شش و پنج میں گھری میں نے سبینہ سے پوچھا۔

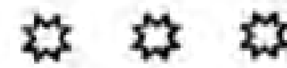
"جس دن تم پیدا ہوئیں اس وقت سے اور جب تمہارا نام اریبہ قیامت رکھا گیا تب سے شروعات کرو۔۔۔ بے وقوف نہ ہو تو۔۔۔" سبینہ بری طرح چڑی۔

"یار۔۔۔" وہ اگر واقعی میرا منگیتر بن گیا ہے تو مجھے

اس سے کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے' جس سے میرا امیج خراب ہو......" اماں کی دعائیں رنگ لارہی تھیں شاید مجھے تھوڑی تھوڑی عقل آرہی تھی۔

"تو پھر ایسا کرو' اس فون کو الماری میں بند کرکے رکھ دو چاند رات کو جب شاہ زیب بھائی آئیں گے تب ان سے روبرو گفتگو کرکے ہی امیج بنالینا' اوکے......"
صبوحہ نے مجھے چڑایا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

ہاں...... مگر مجھے نیند کہاں آنی تھی...... وہ ظالم ان دیکھا منگیتر میرے حواسوں پر طاری تھا...... اللہ اللہ کرکے مجھے بھی نیند آہی گئی۔



اگلے دن اٹھائیسواں روزہ تھا' سحری کے بعد سے ہی اماں اور چاچی نے مجھے اور صبوحہ کو عید کی رہ جانے والی تیاری کے سلسلے میں صفائی ستھرائی اور دیگر کاموں میں لگا دیا اسی دن جاذی سب کے کپڑے ٹیلر کے ہاں سے لے آیا تھا' اب انتیسویں روزے کی شام تک کپڑے پریس کرکے الماری میں تیار رکھنے تھے۔ کیوں کہ اماں کا فرمان تھا کہ چاند رات کو چونکہ شاہ زیب اور جہانزیب بھی آچکے ہوں گے تو مہمانوں کی موجودگی میں کوئی فالتو کام یا شاپنگ وغیرہ کا بکھیڑا نہ پھیلایا جائے۔

اور میں تو بازاروں میں پھرنے کے معاملے میں یوں بھی اول نمبر کی کاہل تھی۔

میرا کمرہ تو مدیحہ پھپھو کے لیے پہلے ہی تیار کرکے انہیں دے دیا گیا تھا' اب باری تھی جاذی کے کمرے کی...... جس میں دونوں لمبوؤں کو رہنا تھا' اور جاذی بے چارہ شاید چچا میاں کے کمرے میں ان کے ساتھ باادب' باملاحظہ' ہوشیار کی صورت رہتا سوتا' مجھے تو جاذی کی حالت سوچ کر ابھی سے مزہ آرہا تھا۔

رات کو تھک ہار کر بستر پر لیٹی تو ذہن شاہ زیب کے گرد ہی چکرا رہا تھا۔

"کیا کروں...... اسے ایک میسج کرکے دیکھ لیتی ہوں ریلائی آتا ہے یا نہیں......" مگر پھر...... خود ہی اپنا فیصلہ بدل ڈالا......

"کیا پتا کس مزاج کا بندہ ہو۔ لے کر اماں سے شکایت لگاتے ہوئے میرا لکھا میسج دکھادے تو اماں تو میری عید غارت کردیں گی...... ویسے...... عیدی تو شاندار سی آئی ہے......" مجھے دن میں صبوحی کا تبصرہ یاد آرہا تھا۔

"یہ تیرا منگیتر میرے جاذی سے زیادہ اچھا نہیں ہوسکتا۔"

"عیدی شاندار ہے تو منگیتر بھی اس سے زیادہ شاندار ہوگا......" میں جل کر جواب دینے سے باز نہ آئی......

"اوہو...... اتنا یقین...... ویسے رابی خالہ......! آپ نے اریب سے اس کے بچپن کا منگیتر چھپا کر اچھا نہیں کیا۔ بچاری خود ترسی کا شکار ہورہی تھی......" اس کا دھیرے سے کہا گیا آخری جملہ مجھے سلگا گیا تھا۔ جی چاہا اس کے منڈیرے سے جھانکتے بوتھے پر ایک کرارا سا ہاتھ لگادوں۔ پردھیان اماں کے جواب پر چلا گیا۔

"ہاں ہاں...... سالوں پہلے اسے اس کا رشتہ طے ہونے کا بتادیتی نا بیٹا......! تو اب جو عقل اس کی ٹخنوں میں اٹکی ہے تب سے جاننے کے بعد تو یہ ٹخنے اوپر اور سر نیچے کیے گھومتی۔ اب مہینہ بھر میں اس کے ہاتھ پیلے کرکے جان چھڑاؤں اس کی بے عقلی و بدحواسی سے...... ساس کی زبان سے چار چوٹ کھائے گی تب ہی عقل اس "خالی تربوز" میں آن سمائے گی......" اماں بھی جی بھر کے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

"خیر۔ میں میسج کرنے کا سوچ رہی تھی۔

"آہا......" کچھ یاد آنے پر میں اچھل کر اٹھ بیٹھی' فٹافٹ اپنا فون تکیے کے نیچے سے نکالا اور میسج لکھنے لگی۔

"ساحر بھائی......! زارا کو خسرہ کی خطرناک بیماری لگی ہوئی ہے ان دنوں...... یقیناً" بے چاری نے آپ سے یہ بات چھپائی ہوگی۔ لیکن میں ٹھہری آپ کی پکی ہمدرد۔ اس لیے آپ کو یہ مخلصانہ مشورہ دے رہی ہوں پلیز ابھی تین سے پانچ روز تک تو زارا کے قریب

بھی پھٹکنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ خسرہ کا وائرس بہت تیزی سے لگتا ہے' امید ہے آپ اپنے خوبصورت چہرے کو چیچک کے بدنما داغ سے سجانا گوارہ نہیں کریں گے۔ میں نے آپ کو زارا کا حال بتادیا ہے اس کا ذکر زارا سے مت کیجئے گا پلیز۔۔۔ آپ کی ہمدرد زارا کی کزن اریبہ۔" میسج سینڈ کر کے میں بہت مسرور ہونے لگی۔

اب ملو چوری چھپے عید۔۔۔ تمہاری عید کی دال پر خسرہ کا ایسا تڑکا لگایا ہے زارا میڈم کہ اب شادی کے بعد ہی تم ساحر بھائی سے مل پاؤ گی۔۔۔ "میں بدلہ لینے پر خوش تھی۔۔۔

پھر ایک اور میسج ٹائپ کرنے لگی۔

ایک معصوم سی خواہش ہے اگر یاد نہ ہو
تری سوچوں کے جزیرے میں اترنا چاہتی ہوں
آؤ "چاند رات" کو میرے گھر میں اجالے لے کر
اپنے گھر کی "لائٹ" پر بھروسا نہیں کرنا چاہتی ہوں

(شاعر سے معذرت کے ساتھ) شعر میں تھوڑا ردوبدل کر کے میں نے اس شعر کو شاہ زیب کے نمبر پر بھیج دیا۔ اگلے دو منٹ میں ہی جوابی میسج کی ٹون بجی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔ جلدی جلدی میسج کا ڈبا کھولا۔ اک شعر ہی درج تھا۔

شکیب اپنے تعارف کے لیے بس اتنا کافی ہے
ہم اس سے بچ کے نکلتے ہیں جو رستہ "آم" برسائے۔۔۔

"نہیں۔۔۔ "میری پھٹی ہوئی نگاہیں لفظ "آم" پر جمی رہ گئیں۔ "چلو جی گل ہی مک گئی۔۔۔ یہ تو وہی لمبو نکلا جس نے میرے ہاتھوں آم سے خوب مار کھائی۔۔۔

سبرینہ یا کسی کو بھی رات والے میسج کا بتانا اپنی بے عزتی کروانے کے مترادف تھا سو میں دن بھر منہ پر ٹیپ لگائے گم صم رہی۔۔۔ جانے سامنے آنے پر "مار کھانے" والے کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ منگیتر سے کیا جانے والا رومانس تو گیا کھڈے میں۔۔۔ اب کس طرح خود کو بے عزت ہونے سے بچاؤں۔۔۔ منگیتر اگر بدلہ لینے پر اتر آیا تو۔۔۔

"اماں! کیا تھا اگر سالوں پہلے مجھے بتادیتیں کا شاہ زیب میرا منگیتر ہے تو کم از کم میں اسے آموں کی مار تو نہ مارتی۔۔۔ "میں مارے افسوس کے اماں سے ہی الجھ پڑی مگر ہائے رے کچی زبان کی نادانی۔۔۔ اماں کی جرح پر بچپن کا سچ بتانا ہی پڑا۔ "جوابا" اماں کا زور بیاں کیا سناؤں' سب روز ازل سے آپ پر عیاں ہے۔۔۔

اماں کی کھنچائی کا صدمہ' شاہ زیب کے آنے کا صدمہ' اور اس کے اپنے منگیتر ہونے کا صدمہ۔۔۔ روزہ افطار کے وقت کون کون سے صدمات خدشات میرے ہمراہ نہ تھے۔ حلق سے کوئی چیز اتر ہی نہ رہی تھی۔ جب ہی مدیحہ آنٹی نے ٹوک دیا۔

"اریبہ۔۔۔ بیٹا! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔۔۔ تم نے کچھ بھی تو نہیں کھایا۔۔۔" ان کی فکر جائز تھی' آخر میں دو دن سے ان کے سامنے ڈٹ کر کھا تی تھی۔۔۔

"وہ۔۔۔ میں نماز کے بعد کھالوں گی۔۔۔ "میں فورا" نماز مغرب کے لیے اٹھ گئی۔۔۔ نماز کے بعد صدق دل سے دعا کی۔۔۔

"یا اللہ۔۔۔ عزت رکھنا میری' میرا منگیتر آم سے مار کھانے کا طعنہ مجھے نہ مارے۔۔۔ اماں کی طرح مجھ پر گرجنے برسنے والا نہ ہو۔۔۔ "دعائیں مانگ رہی تھی کہ مسجد سے چاند نظر آجانے کا اعلان نشر ہونے لگا۔۔۔

باہر سب ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔۔۔ کسی کو بھی بعد نماز دستر خوان پر رکھی بچی ہوئی افطاری کھانے یا سمیٹنے کی پروا تک نہ تھی' اماں ابا۔۔۔ چاچی اور چچا کو لے کر نیچے میرے کمرے میں مدیحہ آنٹی کے پاس چلے گئے۔۔۔ اللہ جانے انہیں کیا خفیہ باتیں کرنی تھیں۔۔۔ سوائے سبرینہ کے کسی نے بھی مجھے مبارکباد نہ دی تھی' حتی کہ میرا سیل فون بجا نہ اس پر کوئی میسج ٹون بجی' جس سے میں سمجھتی کسی کو میرا خیال ہے۔

"ہائے رے بے قدری"۔ میں سبرینہ کے کمرے سے نکل کر صحن میں آئی تو جازی اچک کر منی خالہ کی چھت پر جھانکنے کی سعی کر رہا تھا۔ دونوں گھروں کی درمیانی دیوار ذرا اونچی تھی' جبکہ سامنے والی منڈیر

سے جھک کر بآسانی منی خالہ کی منڈیر پر کھڑا کوئی بھی نظر آسکتا تھا' مگر مسئلہ یہ تھا کہ چاند نظر آجانے کی وجہ سے پوری گلی کی رونق اور گہما گہمی بڑھ چکی تھی' سو وہ چھت کو ملانے والی درمیانی دیوار کا سہارا لے رہا تھا۔
میں اندر سے اسٹول لائی اور جاذی کے پاس پٹخ دیا۔
"مو اس پر.... کھڑے ہو کر اس موٹی بھینس' مطلب اپنے چاند کا دیدار کرو....."
"اوہ تھینک یو میری بہنا....! صرف رشتہ لگنے سے ہی کافی سدھر گئی ہو...." وہ اسٹول پر چڑھ کر دوسری طرف جھانکتے ہوئے مسرت سے گنگنایا۔
"بکو مت...." مجھے بے حد غصہ آیا... "تم نے شاہ زیب کو میرا نمبر کیوں دیا...." مجھے "آم" والا میسج آنے پر سخت رنج ہو رہا تھا.... یعنی اسے پتا ہے میں نے ہی اسے میسج کیا تھا۔
"کیوں کہ انہوں نے مانگا تھا...."
"کیا....؟؟؟ مگر اس نے کیوں مانگا تھا؟" میں ہکا بکا اسے دیکھنے لگی کیوں کہ میں نے انہیں بتایا تھا.... تم زندگی میں سب سے زیادہ محبت اپنے سیل فون سے کرتی ہو.... نظر آگیا.... میرا چاند مجھے نظر آہی گیا...." دوسری طرف دیکھ کر مجھے جواب دیتے دیتے جاذی نے نعرہ بلند کیا تھا.... جھٹ پٹ اس نے اپنے سیل فون کا بٹن دبایا تھا۔
"عید کا چاند نظر آجانا مبارک میرے چاند....!" خوشی سے بھرپور مگر بے حد دھیمے لہجے میں دی گئی جاذی کی مبارک باد بھی میرے حساس کانوں سے بچ نہ پائی۔
"جاذی کے بچے اتر جاؤ۔ نیچے اترو...." میں نے اسٹول کو ہلا کر اسے اترنے پر مجبور کر دیا۔ وہ دھڑام سے نیچے کودا....
"تو یار....! تم نے وعدہ کیا تھا' ظالم سماج نہیں بنو گی۔" جاذی فون بند کرتے ہوئے جھنجلا کے بولا۔
"جب میں خوش نہیں ہوں تو تمہیں بھی خوش ہونے کا کوئی موقع کیوں دوں.... فوراً بتاؤ تم نے اور کیا کیا میری برائیاں کی ہیں شاہ زیب سے؟" میرے تیور خطرناک ہو رہے تھے۔ اگر شاہ زیب نے مجھ سے منگنی کا ارادہ بدل دیا تو میرا کیا ہو گا....؟
"تمہاری برائیوں کی لسٹ اتنی طویل ہے کہ چند منٹوں میں بیان نہیں ہو سکتی.... مجھے لگتا ہے تمہیں شاہ زیب بھائی کے اب تک نہ آنے کا غم ستا رہا ہے...." اس نے سینے پر ہاتھ باندھ کر مجھے چڑایا تھا۔
"تو کیا وہ نہیں آرہے؟" پریشانی میں میں اپنی برائیوں کی لسٹ بھی پوچھنا بھول گئی....
"اطلاع تو یہی ہے...."
اس کی بے نیازی پر میں ہاتھ لٹکائے کچھ مایوس سی کچن میں چلی آئی جہاں صبرینہ سب سمیٹنے میں لگی ہوئی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ بددلی سے کام کروانے لگی.... فارغ ہوئی تو پھر سے ہاتھ میں کھجلی ہوئی اور شاہ زیب کو بے اختیار ایک شعر بھیج دیا۔

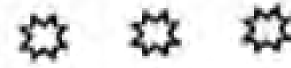
ہلال عید کے واسطے کوئی دعا کر دیکھیں
بجھتے ہوئے دیے کو پھر سے جلا کر دیکھیں
وہ آئے نہ آئے یہ اس کی رضا ٹھہری
جشن عید ہے' آؤ گھر کو سجا کر دیکھیں

پورا گھر صاف ستھرا ہو کر جس کے لیے محو انتظار تھا وہ تو آہی نہیں رہا تھا' جانے کیوں' میرا دل بجھ سا گیا تھا' اسی پل میسج ٹون بجی.... میں نے بڑی بے تابی سے میسج کھولا۔ اور پڑھنے لگی۔

مسکراتی' گنگناتی' جھومتی آئے گی عید
تیرے دامن میں بہاروں کی مہک لائے گی عید
ہم پہ کب موقوف ہے رونق تمہارے بزم کی
چاہے ہم نہ ہوں' مگر آئے گی عید

"کیا مطلب ہوا اس جوابی شعر کا...." میں بے حد جھنجلائی۔
"مطلب یہی ہو گا کہ شاہ زیب بھائی نے تمہارے ماضی کی دہشت گردی کو سامنے رکھتے ہوئے آئندہ کچے پکے آموں کی نشانہ بازی سے بچنے کی خاطر تم سے منگنی یا شادی کا ارادہ کینسل کر دیا ہو گا...."
"تمہارے منہ میں خاک...." صبرینہ کی طویل

تشریح پر میں نے جل کر اسے تکیہ کھینچ مارا اور مہندی وغیرہ لگانے کا ارادہ موقوف کرتی اپنے تکیے میں منہ گھسائے سو گئی۔



☼ ☼ ☼

عید کی صبح تقریباً" پونے آٹھ بجے اماں کے دوہتڑوں سے آنکھ کھلی تھی۔

"کیا ہے اماں... ! میرا جی نہیں چاہ رہا ابھی اٹھنے کو..." میں دوبارہ سر سے پیر تک چادر تان کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ تب ہی میرے نتھنوں میں مہندی کی بھینی سی خوشبو آئی تھی۔

"عید کا دن ہے' یوں سر جھاڑ منہ پہاڑ ساس کو سلام پیش کرے گی..." انہوں نے دوبارہ چادر کھینچ کر اتار دی۔

"ارے ہاں... آج تو عید ہے' عید مبارک میری پیاری اماں!" ایک جوش سے اٹھ کر میں ان کے گلے لگی۔

"اچھا بس بس... یہ جوڑا لے اور جا کر نہا لے... سارے مرد حضرات عید کی نماز کے لیے جا چکے ہیں... ان کے آنے تک مدیحہ کی لائی ہوئی عیدی کی سب چیزیں پہن کر تیار ہو جانا' کمرے میں ہی رہنا کچن میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اور شمسہ (چاچی) کھانوں کی تیاری دیکھ لیں گے..." اماں کا لہجہ پہلی مرتبہ تھوڑا نرم ہوا تھا' مگر مجھے کچھ خاص خوشی نہ ہوئی تھی۔

"چھوڑیں اماں... ! جب شاہ زیب نے مجھ سے منگنی' شادی ہی نہیں کرنی تو اس کی عیدی کا جوڑا پہننے کا کیا فائدہ..." میں نے جوڑا پرے سرکا دیا... پھر اپنے دونوں ہاتھ آگے کیے۔ اور مہندی کا بے حد خوبصورت ڈیزائن دیکھا۔

"ماں... یہ مہندی میرے ہاتھوں میں کس نے لگائی ہے..."

"صبوحی آئی تھی لگانے... تو تو گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی' صبوحی نے ہی تیرے ہاتھ سیدھے رکھنے میں بڑی رسہ کشی کی ہے۔" اماں یقیناً "رات کا منظر سوچ کر ذرا سا مسکرائی تھیں۔

"اچھا اب جا' جیسے میں نے کہا ہے ویسے تیار ہو' مزید فضول بک بک نہ سنوں... آج کے دن زبان کو ذرا لگام دے کر رکھنا... اور سب کے سامنے تمیز سے رہنا..." وہ شاید یہ کہنا چاہ رہی ہوں گی کہ مدیحہ اور اس کے بیٹوں کے سامنے تمیز سے رہنا۔"

"اور بیٹا تو آیا ہی نہیں تھا' ہونہہ کیئر..." میں سر جھٹک کر اماں کے حکم کے مطابق تیار ہونے چل دی تھی۔

"یار سبرینہ ! جان تو چھوڑو میری... تم تو ایسے مجھ سے چمٹی ہوئی ہو جیسے منگنی یا شادی کی دلہن تیار کر رہی ہو..."

سبرینہ نے جب ہلکا پھلکا میک اپ کرنے کے بعد میرے لمبے بالوں کی چوٹی بنا کر مانگ میں بندیا ٹکائی تو میں کہے بغیر نہ رہ سکی' خود تو وہ صرف عید کا جوڑا پہنے سادہ سی تیار تھی... پر اس کی مسکراہٹ مجھے کسی جیمز بانڈ جیسی لگ رہی تھی۔

جب وہ چوڑیاں بھی میرے ہاتھوں میں پہنا چکی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف گھسیٹا... ابا اور چچا شاید نماز پڑھ کر آ چکے تھے اب ہم دونوں کو ان سے عید کی مبارکباد دینے کا معاوضہ (عیدی) وصولنا تھا... میں سینڈل پہنے کھٹ کھٹ زینہ اترتی نیچے پہنچی تھی' مگر یہ کیا...

ابا کے کمرے میں گھستے ہی سامنا ایک نئی شکل سے ہوا تھا۔

"یہ کون ہے..." کاندھے سے پھسلتا دوپٹا سنبھالتے میں نے سبرینہ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"مجھے کیا پتا... عمران ہاشمی کی طرح تو نہیں لگتا۔" سبرینہ کی سرگوشی مجھ سے زیادہ اونچی تھی۔

"دفع دو... گولی مارو اس کو۔ یہ تو اس سے زیادہ ہینڈسم ہے' پر یہ ہے کون...؟" مجھے فکر ہوئی تھی کہ کمرہ تو ابا کا ہی تھا۔

"آئی ڈونٹ نو... شاہ زیب یا جہاں زیب' تم خود

ہی پوچھ لو، میں چلتی ہوں۔۔۔" سبرینہ کمینی چپکے سے کھسک گئی، بھید نہ کھولا کہ وہ رات میں اس سے مل چکی ہے۔۔۔

"اہم۔۔۔ آئی ایم شاہ زیب مصطفیٰ۔۔۔ وہ ذرا سا آگے کو ہو کر پشت پر ہاتھ باندھے سر کو ہلکا سا خم کر کے اپنا تعارف کرانے لگا۔ غالباً" ہم دونوں کی سرگوشی سن لی تھی، جب ہی لب مسکرا رہے تھے۔

"ککچھو تلی۔۔۔ دونوں انکلز لوگوں سے عید ملنے میں اتنے بزی تھے کہ میں خود ہی یہاں چلا آیا، اصل میں۔۔۔ میں کرتا شلوار میں کافی ان ایزی فیل کرتا ہوں سو آتے ہی چینج کر لیا۔۔۔ کوئی یہاں مائنڈ تو نہیں کرے گا۔۔۔؟؟؟" اس نے اپنے جینز اور ریڈ اینڈ بلیک ٹی شرٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"مانا کہ خوبرو ہوں مگر تم بھی کم نہیں۔۔۔" مجھے یک ٹک اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ پھر گویا ہوا تو میں گڑبڑائی۔ ساتھ ہی اماں کا خشمگیں چہرہ تصور میں آنے لگا۔

"میں چلتی ہوں۔۔۔" میں سرعت سے پلٹی کہ بھاگ لوں۔ مگر مجھ سے زیادہ پھرتی دکھائی تھی شاہ زیب نے اگلے ہی پل میرا بازو اس کے شکنجے میں تھا، مگر جلد ہی آنکھوں کے تنبیہی اشارے پر اس نے فوراً "میرا بازو چھوڑ دیا۔

"عید مبارک نہیں کہو گی؟" بڑی شرافت سے پوچھا۔

"میں ہرا یرے غیرے کو مبارک نہیں کہتی۔"

"اچھا جی۔۔۔ آٹھ سال پرانا منگیتر ایرا غیرا ہو گیا۔۔۔" وہ خفا ہونے لگا۔ "پورے چار سال آموں کے ہر سیزن میں تم سے کچے پکے آموں سے مار کھائی ہے۔ صرف اسی لیے کہ تم میری منگیتر تھیں اور مجھے اچھی لگتی تھیں۔

چڑ کر ہی سہی اس نے اعتراف تو کیا تھا، مگر میں سدا کی الٹی کھوپڑی۔

"آٹھ سال مجھے اپنی منگیتر سمجھا تو مجھے کیوں لاعلم رکھا؟"

"کیوں کہ تمہاری اماں کو لگتا تھا کہ تمہاری اخلاقی تربیت پر برا اثر پڑے گا۔ لہٰذا شادی سے چند ماہ پہلے بتایا جائے۔"

میرے تیکھے پن کا اس سے بھی زیادہ تیکھا جواب ملا تھا۔ "اف میری اماں۔۔۔ منگنی کا اتنا اچھا آٹھ سالہ پیریڈ مس کروا دیا۔۔۔" دل ہی دل میں مجھے بے حد قلق ہوا۔

"چھوڑو پرانی باتوں کو آج کی بات کرتے ہیں، آج کے دن کو جیتے ہیں۔۔۔ جب تم میرے پاس ہو۔۔۔ اتنے پاس کہ ہاتھ لگا کر تمہیں چھو سکتا ہوں۔۔۔ سالوں اسی عید کے خواب دیکھا کرتا تھا۔۔۔ مگر آج تم خواب نہیں حقیقت کی طرح میرے سامنے ہو۔۔۔" اس کی آنکھوں میں شوخی تھی، شرارت تھی، مستی تھی اور ۔۔۔ محبت کی نرم نرم روشنی لو سی دینے لگی تھی۔

"پلیز اب تو مجھ سے ایک بار "عید مبارک" کہہ دو۔۔۔ دیکھو میں تمہارے لیے کتنا خوبصورت تحفہ لایا ہوں۔"

اس نے ٹیبل سے ایک فریم میں لگی تصویر اٹھا کر میرے سامنے کی تھی، جس میں۔۔۔ میں آم کے درخت کی گھنیری شاخوں میں بندر کی طرح اکڑوں بیٹھی ہاتھ بڑھا کر آم توڑ رہی تھی۔۔۔ اور وہ آم یقیناً" شاہ زیب کو کھینچ مارنے کے لیے ہی توڑ رہی تھی کیوں کہ میرے چہرے کے تاثرات بڑے کڑوے سے تھے۔

تصویر دیکھ کر میں بے ساختہ ہنستی چلی گئی تھی، ساتھ میں شاہ زیب بھی مجھے پیار بھری نگاہوں سے تکتے مسکرا رہا تھا۔

تمام عمر کی وابستگی کی خواہش تھی
یہ کب کہا تھا میرا شہر چھوڑ جائے وہ
میرے بھی من کے دریچوں میں عید ہو جائے
میرے افق پہ اگر چاند بن کے چھائے وہ

اماں کے ڈر سے ابا کے کمرے سے نکل کر میں کڑی دھوپ میں آم کے پیڑ تلے جھولے پر آ بیٹھی، اور دھیرے دھیرے ایک سرور میں جھولتے ہوئے شاہ زیب کو میسج بھیجا۔

"عید مبارک شاہ زیب۔۔۔" میرے لب گنگنانے لگے۔

یہ عید میرے لیے دلی مسرت کا پیغام لائی تھی۔

☆

میمونہ صدف



"پرندے بڑے صوفی مزاج ہوتے ہیں۔ اپنے ساتھ کی جانے والی نیکیاں خوب یاد رکھتے ہیں اور اندر کہیں دل سے دعا دیتے ہیں۔"

اسے اماں کی اوق اوق باتیں شاذ ہی سمجھ آتیں۔ نہ جانے اماں اتنی مشکل زبان کہاں سے لاتی تھیں۔ وہ سن کر محض سر ہلا دیتا۔ اماں کی باتوں میں معنویت ہوتی اور وہ اصل ڈھونڈتا رہ جاتا۔

"رازق سے رزق وصول کرتے جاتے ہیں اور شکر ادا کرتے ہیں۔ ناشکروں میں سے نہیں ہوتے۔ پروں، پنجوں میں رزق چھپا کر اڑتے نہیں ہیں۔ اپنے حصے کا کھا کر باقی ماندہ دوسروں کے لیے صدقہ کر دیتے ہیں۔ کیا تم سمجھ رہے ہو میرے بچے کہ پرندوں سے کیسے سیکھا جاتا ہے؟"

اور وہ کچھ کچھ سمجھ جاتا کہ اماں اسے کیا سمجھا رہی ہیں۔

اماں مٹی کی کٹوریوں کو روزانہ باجرے اور پانی سے بھر بھر کر لکڑی کے بنے ان تھڑوں پر رکھتیں جو انہوں نے خاص پرندوں کو سورج سے بچانے کی خاطر بنائے تھے۔ پرندے آ آکر ٹھہرتے، پیاس، بھوک مٹاتے، ستاتے اور اڑ جاتے۔

اماں اسے صدقہ کہتی تھیں۔ غریبوں کا صدقہ، چھوٹی مگر مستقل نیکی۔ گرمیوں کے موسم میں دوسروں کے لیے کی جانے والی بھاری نیکی۔

"اماں میں جا رہا ہوں۔ دعا کرنا پھل بک جائیں ورنہ گرمی میں جلدی خراب ہونے لگتے ہیں۔"

"جو رب کی مخلوق کے لیے آسانی پیدا کرے، رب اس کے لیے وہاں سے آسانی پیدا کرتا ہے جہاں سے اسے امید بھی نہیں ہوتی۔"

وہ اماں کی بات پر جی جان سے ایمان لے آتا اور روز ٹھیلا دھکیلتا گلی کوچوں میں نکل پڑتا۔

وہ چھوٹا تھا مگر محنتی تھا۔ ابا کی وفات کے بعد اس نے ابا کا ٹھیلا سنبھال لیا تھا۔ گھر میں دو ہی افراد بچے تھے۔ اماں جو گھر میں ہی کپڑوں کی سلائی کا کام کرتیں اور اقبال عرف بالا جو پھلوں کا ٹھیلا لگاتا۔ وہ محنت سے ہرگز گھبراتا نہیں تھا بس آگ کا گولا جو آگ برساتا اس سے حالت پتلی ہو جاتی۔ ٹھیلا گھسیٹتے گھسیٹتے ہاتھ اور ٹانگیں جواب دینے لگتیں۔ پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ سر پر کپڑے لپیٹے وہ لو کے تھپیڑوں سے بچنے کی کوشش کرتا اور پیاس کی صورت میں راستے میں رکھے کسی مٹکے سے گرم تپتا پانی اندر اتار لیتا۔

روز ہی اس کے سارے پھل بک جاتے اور جو ایک آدھ دانہ بچ جاتا وہ کوڑا کرکٹ چننے والے بچوں میں تقسیم کر دیتا کہ اس نے پرندوں سے یہی تو سیکھا تھا کہ رازق روز رزق بانٹتا ہے اور جو آج دیتا ہے، وہ کل بھی دے گا سو جمع مت کرو۔

"تو پاگل ہے بالے۔ جو پھل بچ جاتا ہے اسے مفت میں بانٹ کیوں دیتا ہے؟ اپنا نقصان کرتا ہے۔ اسی پھل کو اگلے روز باقی پھلوں میں چھپا کر بیچ دیا کر۔" چاچا رحمو اسے عقل سکھاتا۔

"اماں کہتی ہے کہ بے ایمانی سے مال کبھی نہ بیچنا۔ برکت اٹھ جائے گی۔ پاپ الگ چڑھتا ہے۔ میں بے ایمانی نہیں کرتا چاچا! تب ہی میرا مال روز بک جاتا ہے اور اللہ میرا نقصان نہیں کرتا۔"

چاچا رحمو اس کی تضحیک کرتا۔ خوب ہنستا اور پاگل



کہتا اور وہ صرف مسکرا دیتا۔ بھلا چاچا کب سمجھ سکتا تھا جو اس کی سمجھ میں آتا تھا۔

اس روز وہ صبح سویرے ہی گرمی سے ہلکان ہو چکا تھا۔ گرمی کا بہت زور تھا اور ہمت مفقود... پانی کے مٹکوں سے پانی پیتا رہا، مگر گرم سیال مادہ اندر یوں اترتا کہ گویا انتڑیاں سڑ کر بھسم ہو جائیں گی۔ پیاس کہاں بجھنا تھی بھلا اور ایسے موسم میں پانی، وہ بھی ٹھنڈا ٹھار سے بڑھ کر نعمت مترقبہ کیا ہو گی۔ "سوہنے رب! جیسے میری اماں تیری مخلوق کو سایہ اور پانی دیتی ہے تو کہیں سے ٹھنڈا پانی پلا دے۔"

وہ پسینہ پونچھتے درخت کے سائے میں ڈھے گیا۔ ٹھیلا قریب ہی کھڑا تھا اور ہمت رخصت ہو چکی تھی۔ صدائیں لگا لگا کر گلا خشک تھا اور تپتا آب سیراب نہ کر سکتا تھا... آگے کا دن اب کیسے گزرنا تھا... اور یوں بیٹھے بیٹھے پھل کیسے بکنا تھا؟

"بھائی..." آواز پڑنے پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے گھر سے جھانکتی بچی بوتل ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ غیب کی طرف سے بھیجی جانے والی مدد...

"یہ برف والی بوتل لے لو... گرم پانی ٹھنڈا کر کے پیتے رہنا۔" اس نے لپک کر بوتل تھام لی اور اسے آفتاب کی کرنوں سے بچانے کے لیے بوری کے نیچے چھپا دیا۔

"روز برف کی بوتل لے جایا کرو... مگر پچھلے روز کی بوتل دینا مت بھولنا... بوتلیں کم پڑ گئیں تو پھیری والے زیادہ ہو جائیں گے۔ سو کل یہ بوتل ضرور لانا۔" اور بالا تشکر سے اسے دیکھتا سر ہلا کر رہ گیا۔

صدقہ ایسا بھی ہوتا ہے... اتنا آسان، اتنا بھاری... دوسروں کے لیے آسانی پیدا کرتا ہوا۔ جیسا اس کی اماں کرتی تھی۔ جیسا وہ کرتا تھا اور جیسا اس بچی نے کیا۔

کرم کیے جانے والوں پر کرم ہی ہوتا ہے۔ یہ ہی کریم کا وعدہ ہے۔ وہ وہاں سے نوازتا ہے جہاں سے امید بھی نہیں ہوتی۔

☆



حاصل

نمرہ احمد

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے، جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بد ظن ہو جاتی ہے۔ بد ظن



مکمل ناول

ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہوچکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

فارس غازی' ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں' جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہوجاتا ہے۔

والد کے کہنے پر زمر' سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی' ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیرواں سے' جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے' بہانے سے پاس ورڈ حاصل کرکے سعدی کو سونیا کی سالگرہ میں دے دیتی ہے۔

پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی' ہاشم کے کمرے میں جاکر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور' ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے' جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم' خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کرکے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمیج ہو جاتی ہیں۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے' حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آنس اپور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس 'زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فہد سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی' ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی' ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم' خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں' بہت مجبور ہو کر ہاشم' خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث' فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم' فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زرتاشہ مرجاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی' زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً" بچ جاتی ہے' مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔

حنین کی بیسٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین' وارث کیس کی اپیل بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں' مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں' جس کی بنا پر زمر کو دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات' زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے' اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھا لیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی' فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالر شپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی، علیشا کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔

ہاشم، حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ہاشم، علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔

جواہرات، زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کر رہا ہے۔

فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے، لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر لے جا چکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے، کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے، لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات، زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا، جسے انکار کر دیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر، جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہو چکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔

ہاشم، حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے، کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے، جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً بعد کی تصویر ہوتی ہے، جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین، نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے، وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔ سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔

سعدی، زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

"مثلاً "کون؟" "زمر نے پوچھا۔

"مثلاً "....مثلاً "ہاشم کا کردار...." سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔

زمر کو ہاشم کا کردار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی، زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین، علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کر لی ہے۔ جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو اپنا ہے۔

ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں، جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔

ریحان خلجی عدالت میں زمر کو لاجواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔

فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔

زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتا کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔

جیل سے علیشا، حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کے علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔

حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے بڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔

اورنگ زیب، نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کر کے ______ پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کر لیتی ہے۔

بارہویں قسطِ اول

"یا صاحبی السجن"

اے میرے قید خانے کے دو ساتھیو!

ایک دن میرا وقت بھی آئے گا۔
اور تم قیمت چکاؤ گے اپنے کیے کی۔
اور تم دیکھو گے کہ میں قطعاً" اچھی نہیں ہوں۔
ایک دن میں آسیب کی طرح تمہیں ڈراؤں گی۔
یہ میرا وعدہ ہے جس کا ابھی تم کو اندازہ نہیں۔
مگر تم تب خواہش کرو گے کہ کاش۔۔۔
ہم کبھی نہ ملے ہوتے۔
ایک دن!
کیوں کہ میں کبھی نہیں بھولوں گی۔
اور تمہیں رحم کے لیے گڑگڑاتے کوئی نہ سن پائے گا۔
کیوں کہ ابھی تو تم نے کچھ نہیں دیکھا۔
سو غور سے سنو۔
ایک دن تم جواب دو گے اپنے اعمال کا۔
بس انتظار کرو اور دیکھو۔

اور تب تم جانو گے میرے خاندان کو۔
نقصان پہنچانے کے بعد کیا ہوتا ہے!
ایک دن میں تمہیں ڈھونڈ لوں گی۔
مجھے پروا نہیں کہ اس میں کتنی دیر لگتی ہے۔
یا مجھے اس کے لیے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔
کیوں کہ میں کبھی اپنا وعدہ۔۔۔
توڑا نہیں کرتی!

(Petite Magique کی نظم انتقام سے)

سعدی یوسف کی گمشدگی کے پانچ گھنٹے بعد

آج صبح چھوٹا باغیچہ ویران پڑا تھا۔ سورج کی تپش نے سارے پھول جھلسا دیے تھے۔

اندر لاؤنج میں ندرت کے رونے کی آواز سب سے اونچی تھی۔ وہ چہرہ جھکائے نفی میں سر ہلاتی روئے جارہی تھیں۔

"ہم اس کو ڈھونڈ لیں گے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔" فارس 'ندرت کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھے ان کو تسلی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں رت جگے کے باعث سرخ تھیں اور چہرے پہ تکان تھی۔

"اب کہاں ڈھونڈو گے؟ اب تک تو وہ اسے۔۔۔"

اور دوپٹے میں چہرہ چھپائے اور زور سے رونے لگیں۔ ان کا کندھا سہلاتی حنین بھی "امی خود کو سنبھالیں۔" کہتی پھر سے رونے لگی تھی۔ سیم سر گھٹنوں میں دیے کارپٹ پہ بیٹھا تھا۔ سامنے بڑے ابا' گردن جھکائے' خاموش آنسو گرا رہے تھے۔

"وہ بالکل ٹھیک ہوگا' اور اس کا خیال رکھا جارہا ہوگا۔" سنگل صوفے پہ گھٹنے ملا کر بیٹھی زمر نے بے تاثر سے انداز میں کہا تو وہ سب اس کو دیکھنے لگے۔ وہ اب بھی اسی طرح گم صم' چپ سی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا؟" ابا نے سر اٹھائے بغیر گیلی آواز میں پوچھا۔

"جو بھی ہے بلٹ انجری مہلک نہیں تھی۔ اگر انہوں نے اسے مارنا ہوتا تو پہلی دفعہ میں مار دیتے' یا پھر جیسے نکال کر لے گئے ہیں' اسی طرح آپریشن ٹیبل پہ مار دیتے۔ ان کو وہ زندہ چاہیے۔ اس لیے وہ اس کا خیال رکھیں گے۔"

"مگر کون ہیں وہ لوگ؟ بھائی نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟" حنین نے بے بسی سے روتے پوچھا۔

زمر نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔ "مجھے نہیں پتا۔" اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پرس اٹھایا' چابیاں نکالیں۔ حنین نے تحیر سے اسے دیکھا۔

"آپ کہاں جارہی ہیں؟" زمر نے جواب دیے بنا اسٹریپ کندھے پہ ڈالا' موبائل بیگ میں رکھا۔ فارس نے اس کی طرف نظریں اٹھائیں۔

"میں جارہا ہوں تھانے' آپ مت جائیے۔"

"میں گھر جارہی ہوں۔" کسی سے نگاہ ملائے بنا وہ مڑ گئی۔ حنین کی آنکھوں میں صدمہ اترا۔

"آپ بڑے ابا' امی' سب کو اتنی تکلیف میں چھوڑ کر جارہی ہیں؟"

زمر کو عقب سے اس کی آواز آئی' مگر وہ قدم قدم آگے بڑھتی رہی۔ حنہ نے بے دردی سے آنکھیں رگڑیں۔

"ٹھیک ہے۔ جائیے۔ ہمارا بھائی جیے یا مرے۔ آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ نے تو ویسے بھی چار سال سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔" زمر کے قدم لمحے بھر کو تھمے' پھر وہ آگے بڑھ گئی۔

"حنین! کم از کم اس وقت لڑائی مت کرو۔" وہ خفگی سے ٹوکتا اٹھا۔ حنہ نے صرف ملامتی نظروں سے اسے دیکھا اور رخ پھیر گئی۔ امی گھٹا گھٹا سا ابھی تک رو رہی تھیں اور بڑے ابا کے ضعیف چہرے پہ آنسو ہنوز بہہ رہے تھے۔

"وہ اب کسی کو نہیں ملے گا' میری امید کھو گئی ہے۔" وہ دکھی دل سے کہہ رہے تھے۔



جو خیال تھے نہ قیاس تھے' وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے

جو محبتوں کے اساس تھے، وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے

اس نے انیکسی کا دروازہ کھولا تو اندر سناٹا تھا۔ وہ اسی زرد چہرے اور ویران آنکھوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ پھر لکڑی کے زینے پہ قدم رکھتی چڑھتی گئی۔ ایک ہاتھ ریلنگ پہ تھا۔ دوسرے میں پرس اور خاکی لفافہ تھام رکھا تھا۔

اپنے کمرے میں آکر زمر نے پرس فرش پہ ڈال دیا۔ پھر خاکی لفافہ کھولا۔ فل سائز تصاویر نکالیں۔ پھٹے ہونٹ، سرخ نشانوں اور زخموں والا چہرہ لیے، بند آنکھوں سے لیٹا سعدی۔ خون آلود لباس۔ زمر نے ایک کے بعد ایک تصویر سامنے کی۔ اس کی بھوری آنکھیں اس لڑکے کی بند آنکھوں پہ جمی تھیں۔ خشک بھوری آنکھیں۔

پھر یکایک ان میں پانی بھرا۔ اتنا کہ وہ ڈبڈبا گئیں اور آنسو چہرے پہ تیزی سے بہنے لگے۔ اس نے زور سے وہ تصویریں سامنے دیوار پہ دے ماریں اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی۔ چہرہ جھکائے، مٹھیاں فرش پہ رکھے، وہ ایک دم بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

"کیوں اللہ۔۔۔ کیوں؟" روتے روتے اس نے گیلا چہرہ اٹھا کر چھت کو دیکھا۔ "کیا اتنے سال اسے اس لیے بڑا کیا تھا کہ کوئی آئے اور گولی مار کر چلا جائے؟ کیا ہم اپنے بچوں کو اس لیے بڑا کرتے ہیں؟ کیا آپ کی دنیا میں کوئی قانون نہیں؟ کوئی انصاف نہیں؟"

اس نے زمین پہ بیٹھے بیٹھے چہرہ بیڈ پہ رکھ دیا۔ دائیں گال پر آنسو بہتے دکھائی دے رہے تھے۔

"میں نے اسے کہا تھا کہ میں اس کا خیال رکھوں گی۔ کئی سال پہلے جب ہم کلام میں تھے۔ ایک چشمے کے کنارے اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اس کا کوئی بھائی نہیں، تو اس کا کیپ کون ہوگا؟ میں نے کہا، میں ہوں گی۔ دو سال بعد سیم پیدا ہوا، مگر اسے تب بھی پتا تھا کہ اس کی کیپر زمر ہوگی ہمیشہ اس کا خیال رکھے گی، مگر میں اس کا خیال نہیں رکھ سکی۔ میں اسے نہیں بچا سکی۔ کیوں اللہ، کیوں؟" وہ سسکیوں سے روئے جا رہی تھی۔

"میں اب پہلے کی طرح آپ سے بات نہیں کرتی، میں ویسے دعا نہیں مانگتی۔ کیونکہ مجھے لگتا تھا، میرے پاس کھونے کو کچھ نہیں بچا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ میرے پاس سعدی تھا۔" ماتھا بیڈ سے ٹکائے وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے کہہ رہی تھی۔

"کیسے کسی نے اس کو گولی مار دی؟ کیسے اس کو اتنی تکلیف دی؟ اللہ۔۔۔ کوئی جانور کو بھی ایسے نہیں مارتا، وہ تو پھر انسان تھا۔" وہ بولتی جا رہی تھی۔ "میں نے اللہ۔۔۔ میں نے چار سال اس سے تعلق نہیں رکھا، میں نے چار سال ضائع کر دیے۔ میں کہاں سے وہ وقت واپس لاؤں؟ پلیز میرے ساتھ یہ مت کریں۔" سر بیڈ کنارے سے لگائے وہ بچوں کی طرح روئے جا رہی تھی۔

کتنے لمحے بیتے، سورج کتنا تیز ہوا، معلوم نہیں، وہ اسی طرح بے خبر سی روتی رہی۔ یہاں تک کہ دروازہ دھیرے سے کھٹکا۔ پھر کھلا۔ چوکھٹ میں کھڑے فارس نے اندر دیکھا تو ساری پولیس فوٹوگرافس بکھری نظر آئیں اور وہ زمین پہ بیٹھی، بیڈ کے کنارے پہ سر رکھے رو رہی تھی۔ نیچے رکھا اس کا موبائل مسلسل زوں زوں کر رہا تھا۔

"زمر!" وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا قریب آیا۔ آنکھوں میں تکلیف لیے زمر کو دیکھا۔

"مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" اس نے چہرہ اٹھایا، نہ آنسو پونچھے۔ بس آپ جناب کا تکلف بھی آج ختم کیا۔

"نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ بہت ہلکے سے بولا تھا۔ پھر جھک کر اس کا موبائل اٹھایا۔

"بصیرت صاحب کا فون ہے۔"

"مجھے تنہا چھوڑ دو فارس۔" وہ چہرہ اٹھا کر اسے متنفر نظروں سے دیکھتی ایک دم چلائی۔ "جب بھی تم ہماری زندگیوں میں آتے ہو، کچھ نہ کچھ غلط ہو جاتا ہے۔ ہر چیز ہمیشہ تمہاری وجہ سے ہوتی ہے۔" وہ چپ چاپ کھڑا دکھ سے اسے دیکھے گیا۔

"مجھے نہیں پتا اسے کس نے مارا' لیکن اگر اس کا کوئی دشمن بنا ہے تو صرف تمہاری وجہ سے۔ تم نے ایک پڑھنے لکھنے والے بچے کو جیل کچہری اور عدالتوں کے چکر میں دھکیل دیا۔ تم نے اس کو پتا نہیں کتنوں کا دشمن بنا دیا۔ مجھے تمہاری شکل سے بھی نفرت ہے۔" ملامت سے اسے دیکھتی وہ چیخ چیخ کر کہتی پھر سے رونے لگی تھی۔

فارس خاموشی سے اس کے ساتھ اکڑوں بیٹھا اور گھٹنوں کے گرد بازو پھیلائے۔ پھر گردن گھما کر اسے یاسیت سے دیکھا۔

"مجھے پتا ہے اس کے دشمن میری وجہ سے بنے ہیں' میں نے اسے کہا تھا کہ میرے لیے غلط چیزوں میں انوالو مت ہونا۔ مگر وہ ہوا۔ میں جیل میں تھا۔ اسے نہیں روک سکتا تھا۔" وہ بدقت بول رہا تھا۔ اس کے انداز میں شدید تکلیف تھی۔

"تم ایک ہی دفعہ ہماری زندگیوں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ تمہاری وجہ سے ہم اور کتنا نقصان اٹھائیں گے؟ خدا کی قسم میرا دل چاہتا ہے' تمہیں جان سے مار دوں۔" دکھ پہ اب غصہ غالب آنے لگا۔ وہ اس سے تین فٹ کے فاصلے پہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ ان الفاظ پر بھی چہرے پہ کوئی غصہ' کوئی تلخی نہ ابھری۔ بس تکان سے اسے دیکھے گیا۔

"آپ جو کرنا چاہتی ہیں' میرے ساتھ کرلیں۔ میں آپ کو نہیں روکوں گا۔"

"بے فکر رہو۔" زمر نے تلخی سے سر جھٹکا۔ "میں تمہارے ساتھ کچھ نہیں کروں گی۔ مجھے تم سے شادی بھی نہیں کرنی چاہیے تھی' مگر خیر۔۔۔" اس نے ہتھیلی سے آنکھیں رگڑیں۔ "میں نے اس سے وعدہ کیا تھا' کہ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گی اور میں اپنے وعدے پورے کیا کرتی ہوں۔" ساتھ ہی ملامتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم یہ مت سمجھنا کہ تم بچ جاؤ گے' ایک دفعہ میں سعدی کو ڈھونڈ لوں' پھر میں تم سے بھی حساب لوں گی' اس ایک ایک زخم کا جو تم نے میرے خاندان کو دیا ہے۔"

"آپ کو مجھ پہ غصہ ہے اور آپ تکلیف میں ہیں' میں بھی ہوں۔ مگر یہ پہلی دفعہ نہیں ہے' جب مجھے یہ کہا گیا ہے کہ ہسپتال جاؤ' کیوں کہ تمہارے خاندان کا کوئی فرد گولیوں سے بھون دیا گیا ہے۔" وہ اس کو دیکھتے ہوئے تکلیف اور دقت سے بولا تو گلے میں گولہ سا اٹکنے لگا' مگر اس نے نگل لیا۔ "لیکن میں آپ کی طرح رو نہیں سکتا۔ میں رونا نہیں چاہتا۔ میں اس ایک ایک شخص کو' جس نے میرا خاندان تباہ کیا ہے' ڈھونڈ کر اس کی چمڑی ادھیڑنا چاہتا ہوں۔" اب کے اس کی آنکھوں میں درشتی ابھری اور گردن کی رگیں کھنچتی ہوئی دکھائی دیں۔ زمر نے ایک تیز نظر اس پہ ڈالی۔

"مجھے کچھ مت سناؤ۔ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔" اور رخ موڑ لیا۔ گیلی آنکھیں پھر سے رگڑ کر صاف کیں۔

"مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ میری بات سنیں۔ سعدی سے برابر کا رشتہ ہے ہمارا۔ ٹھیک ہے آپ کا کچھ زیادہ ہوگا' مگر اس وقت ہمیں آپس میں لڑنے کے بجائے ایک ساتھ مل کر اس کو ڈھونڈنا ہوگا۔"

"اتنی توانائی مجھ پہ خرچ مت کرو۔ میں اسے ڈھونڈ لوں گی اور میں ہر اس شخص کو ڈھونڈوں گی جو اس میں

انوالوڈ تھا اور پھر دنیا دیکھے گی کہ میں اس کے ساتھ کیا کرتی ہوں۔ مگر یہ تمہاری بھول ہے فارس! کہ میں اس سب میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گی۔" اس کو تیز نظروں سے گھورتی وہ چبا چبا کر بولی۔

"نہ آپ اسے اکیلی ڈھونڈ سکتی ہیں، نہ میں..."

"مجھے تمہاری کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" تلخی سے کہتی وہ اٹھی۔ "میں اکیلی سب کرلوں گی۔ تمہارا کیا بھروسا، کل کو مجھے بھی بیچ آؤ۔"

فارس کے ماتھے پہ بل پڑے۔ دماغ کھول گیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا۔

"ایسا سمجھتی ہیں آپ مجھے۔" غصے سے اس کے مقابل کھڑے پوچھا تو چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"کیوں؟ کیا تم وہی نہیں ہو جس نے مجھ پہ گولی چلائی تھی؟ کیا تم وہی نہیں ہو جس نے مجھے استعمال کرکے جیل توڑنی چاہی؟" وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ کراتنے ہی غصے سے غرائی تھی۔ فارس کے لب بھینچ گئے، چند لمحے ضبط سے گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔

"میں پولیس اسٹیشن جارہا ہوں، کیا آپ چلیں گی؟" بدقت ضبط سے سپاٹ سا پوچھا۔

"ہونہہ..." زمر نے نفی میں سر جھٹکا اور زمین پہ گرا موبائل اٹھایا۔ "یہ ساری پولیس ان ہی لوگوں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ یہ جتنی ناکہ بندیاں کرالیں، اسے نہیں ڈھونڈ پائیں گے۔" ساتھ ہی موبائل پہ مسڈ کالز دیکھ رہی تھی۔ اس کی ناک اور... آنکھیں ہنوز گلابی تھیں اور آنسو پھر سے بہنے لگے تھے۔ فارس کے چہرے کا سپاٹ پن قدرے کم ہوا۔

"مجھے پتا ہے پولیس ملی ہوئی ہے، بے فکر رہیے، ان میں سے ایک ایک آفیسر کا وقت آئے گا۔" اور جانے کے لیے مڑا تب ہی زمر نے فون کان سے لگایا۔

"جی بصیرت صاحب..." وہ چوکھٹ میں ٹھہر گیا۔ مڑا نہیں۔ وہ اب فون پہ کہہ رہی تھی۔ آواز کو نارمل کرتے ہوئے۔

"آپ کا بہت شکریہ... نہیں ابھی تک تو کچھ پتا نہیں چل سکا۔ میں تھوڑی دیر میں گھر سے نکلوں گی، پھر دیکھوں گی... اچھا..." وہ رک کر سننے لگی۔ پھر ہنسی، تلخ سی ہنسی، فارس نے چونک کر گردن موڑی۔

"مجھے اسی قسم کے آرڈر کی توقع تھی، مگر یہ کافی جلدی آگیا۔"

"نہیں... مجھے اب اس سے فرق نہیں پڑتا، آپ کا شکریہ۔" موبائل رکھ کر اس کی نگاہیں اٹھیں تو فارس اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟"

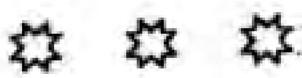
"مجھے ایڈووکیٹ جنرل نے بغیر وجہ بتائے معطل کردیا ہے، اب میں پراسیکیوٹر نہیں رہی۔" اتنی ہی تلخی سے بولی۔

"کیا...؟" فارس کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ "مگر اس طرح کی معطلی غیر قانونی۔"

"اچھا ہی ہوا۔" زمر نے شانے اچکائے اور الماری کی طرف بڑھ گئی۔ "یہ وہ پہلی غلطی ہے جو ہمارے دشمنوں نے کی۔ اس سے انہوں نے مجھے یہ بتادیا ہے، کہ وہ بارسوخ لوگ ہیں۔ یہ ان کی پہلی چال تھی۔ بساط بچھادی گئی ہے اور کھیل شروع ہوچکا ہے۔ اب وہ دیکھیں گے کہ ان کا مقابلہ کس سے ہے۔" تلخی سے بڑبڑاتی وہ الماری میں ہینگر الٹ پلٹ کرنے لگی۔ فارس کا ذہن ایک لفظ اٹک گیا۔

(ہمارے دشمن؟ کیا اس کو خود بھی احساس نہیں کہ اس نے "میرے" یا "سعدی" کے بجائے "ہمارے" کہا؟)

اور اس ساری پریشانی، اذیت اور صدمے کی کیفیت کے باوجود ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ رینگ گئی۔ پھر وہ سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔ ابھی اسے بہت کچھ کرنا تھا۔



گھروں پہ نام تھے، ناموں کے ساتھ عہدے تھے
بہت تلاش کیا، کوئی آدمی نہ ملا

قصر کاردار کے ڈائننگ ہال کی لمبی میز ناشتے، پھلوں

اور مشروبات سے سجی تھی مگر جواہرات سب چھوڑ کر پوری طرح ہاشم کی طرف متوجہ' حق دق سی سنتی جارہی تھی۔ وہ سر جھکائے چائے کے گھونٹ بھرتے بتارہا تھا۔ آفس کے لیے تیار اور ہلکا میک اپ کیے تازہ دم جواہرات کے برعکس وہ قدرے ست تھا۔ سوٹ' ٹائی سب درست تھا' بس آنکھیں ہنوز سوجی ہوئی تھی۔

"سعدی کے ساتھ اتنا کچھ ہوگیا اور مجھے اب معلوم ہورہا ہے۔" بے حد حیرت اور افسوس سے وہ نفی میں سر ہلارہی تھی۔ سامنے ہاتھ باندھے کھڑا خاور اپنے جوتے کو دیکھتا رہا۔ ہاشم کی نظریں بھی چائے پہ جمی تھیں۔

"اس کی فیملی تو بہت ڈسٹرب ہوگی۔" جواہرات کہنی میز پر جمائے' ایئرنگ پہ انگلی پھیرتی' آنکھوں میں تاسف بھرے کہہ رہی تھی۔ "آخر کون کرسکتا ہے یہ؟" پھر چونک کر ہاشم کو دیکھا۔ "تم نے تو۔"

ہاشم نے نیپکن مٹھی میں بھینچا اور خفگی سے نظریں اٹھائیں۔ "میں اس پہ بھی گولی نہیں چلا سکتا' نہ یہ خاور نے کیا ہے۔ ہم اس کے واحد دشمن نہیں ہیں۔"

"اوہ۔" اسے سکون آیا۔ پھر گلاس اٹھا کر جوس کے دو گھونٹ بھرے۔ خاور اور ہاشم نے ایک خاموش نظر کا تبادلہ کیا۔

"مگر۔" یکایک جواہرات کا سانس اٹکا۔ چہرے پر پریشانی آئی۔ "وہ کل ہمارے پاس آیا تھا۔ کوئی ہم پہ شک۔"

"کسی کو نہیں پتا وہ کل ہمارے پاس آیا تھا۔ ہم آفس کے کل کے سی سی ٹی وی ریکارڈ کلیئر کردیں گے۔ زیادہ لوگوں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ اگر پتا چل بھی جاتا ہے تو کیا ہوا؟ کوئی ہم پہ شک نہیں کرسکتا۔"

"ہوں۔" جواہرات نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اسپتال سے اگر وہ غائب ہوا ہے تو ظاہر ہے اتنی زخمی حالت میں۔ اونہوں۔ وہ تو ابھی تک زندہ بھی نہ ہو شاید۔" پھر یکایک ایک خیال کے تحت چونکی۔ "ہاشم۔ سعدی کا یہ حادثہ۔ میرا مطلب ہے' اس کے جانے کے بعد اب کوئی نہیں ہے' جو جانتا ہو کہ ہم نے وہ سب کیا تھا۔"

ہاشم نے ملامتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "کیا آپ کو اس حادثے کا ذرا بھی افسوس نہیں؟"

"اوہ نہیں' آف کورس ہے۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔" وہ فوراً" معذرتی انداز میں کہتی ناشتے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ "آفس جانے سے پہلے ان کے گھر چلیں گے۔ یہ تو ابھی اس کا دماغ الٹا تھا' ورنہ وہ بہت پیارا لڑکا تھا۔ میرا بہت اچھا دوست۔" (ایسے ہی غارت گروالی کہانی یاد آئی جو ایک شام اسے اہتزذہنی حالت میں سنائی تھی۔ چلو اس کہانی کا دوسرا گواہ بھی ختم ہوا۔ اور پہلی۔؟)

"میری کو بھجوادیا تم نے؟" سرسری سا پوچھا۔

"جی' اسے ملک بدر کردیا ہے آج۔" اور جواہرات کا دل مزید ہلکا ہوگیا۔ (شکر!)

"اوکے۔" اس کا دل اچاٹ ہوچکا تھا' بے زاری سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"شیرو پھر ناشتے پہ نہیں آیا۔" وہ ذرا فکر مند ہوئی۔

"وہ رات دبئی چلا گیا تھا۔ آپ جب تک پارٹی سے آئیں' میں سوچکا تھا' بتا نہیں سکا۔" اس نے سیل فون اٹھاتے سرسری سی اطلاع دی۔

جواہرات نے شدید حیرانی سے چہرہ اٹھایا۔ "مگر کیوں؟"

"دوستوں کے ساتھ پروگرام تھا۔ پریشان مت ہوں' اسے کچھ دن ریلیکس کرنے دیں۔ اور ہاں' یہ سعدی والی بات' اسے مت بتایئے گا ابھی۔ ڈسٹرب ہوجائے گا وہ۔ آخر۔ وہ دونوں۔ دوست تھے۔"

آخری فقرہ بدقت ادا کیا۔ پھر جواہرات سے نگاہ ملائے بغیر وہ باہر نکل گیا اور وہ بس سر ہلا کر رہ گئی۔

"مجھے پتا ہے وہ کیوں گیا ہے۔ کیونکہ شہرین نے آج صبح وہاں جانا تھا۔" ناراضی سے بڑبڑاتے گلاس اٹھایا۔

"آپ مسز کاردار سے کیوں چھپا رہے ہیں؟" خاور نے اس کے پیچھے سے آکر پوچھا تھا۔

"معاملہ ٹھنڈا ہونے دو' پھر بتادوں گا۔ ابھی کوئی لاپروائی ہم افورڈ نہیں کرسکتے۔" دبی آواز میں کہتا وہ اس کے ساتھ باہر برآمدے تک آیا تھا۔ سیڑھیوں کے سرے پہ دونوں رکے۔ ہاشم نے چہرہ گھما کر نیچے پھیلے سبزہ زار کو دیکھا۔

"تم نے اس ممکنہ گواہ کو چیک کیا؟" یہ پریشانی ختم ہونے کو نہیں آرہی تھی۔

"جی' مگر ایسا کوئی گواہ پولیس کے پاس پیش نہیں ہوا' نہ ہی سعدی کے گھر والوں سے کسی نے رابطہ کیا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہاں کوئی اور بھی تھا۔ وہ صرف نوشیرواں صاحب کی ڈرگز کے باعث  Hallucination (وہم) ہوسکتی ہے۔"

"مگر میں اس امکان کو رد نہیں کرسکتا۔" ہاشم مطمئن نہیں تھا۔ "تم معلوم کرنے کی کوشش کرو۔" اور زینے اترنے لگا۔ خاور سرہلا کر رہ گیا۔ ایک طویل اور اندھیری رات ختم ہوئی تھی۔

حسب معلوم ہاشم کاردار نے سب سنبھال لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دیکھنے آیا تھا کہ کس حال میں ہیں ہم!

چھوٹا باغیچہ ہنوز جھلس رہا تھا۔ اندر لاؤنج میں حنین خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سامنے صوفے پہ ہاشم اور جواہرات ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ابا اپنی وہیل چیئر پہ نڈھال سے لگ رہے تھے' اور ان کے ساتھ کھڑی زمر ان کو دوا دے رہی تھی۔ ہاشم بار بار نگاہ اٹھا کر اس کو غور سے دیکھتا تھا۔ پژمردہ' اداس حنین کے برعکس وہ تازہ دم لگ رہی تھی۔

اس کے آنے کے بعد ہی وہ اور فارس یکے بعد دیگرے آئے تھے (فارس پھر چلا گیا تھا) وہ بدلے ہوئے لباس میں تھی۔ سامنے کے بال پیچھے کرکے پن لگائے' باقی کھلے چھوڑے' ٹاپس پہنے' ہر روز کی طرح تیار لگ رہی تھی۔ یہ نارمل نہیں تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں زمر؟" ہاشم نے فکرمندی سے اسے مخاطب کیا۔ وہ ابا کو پانی کا گلاس پکڑاتے چونکی۔ چہرہ گھما کر ہاشم کو دیکھا۔ ہلکے سے شانے اچکائے۔

"جی۔ شکریہ۔ ابا آپ کھانا کھا لیجئے گا' مجھے دیر ہوجائے گی۔" ابا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "تم کہاں جارہی ہو؟"

وہ اداسی سے مسکرائی۔ "سعدی کو ڈھونڈنے۔" ہاشم کی گردن کے گرد پھندا سا کسنے لگا۔ فوراً" سے حنین کی طرف متوجہ ہوا۔

"اب تمہاری امی کیسی ہیں؟"

"دوا دے کر سلایا ہے۔ بہت اپ سیٹ ہیں۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ شاکی نظر زمر پہ ڈالی۔ (ان کو تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ ایک آنسو جو بہایا ہو)

زمر ابا کو دوسرے کمرے میں لے گئی' جب واپس آئی تو وہ کہہ رہا تھا۔

"آپ لوگوں نے مجھے کیوں فون نہیں کیا؟ میں ہوتا تو دیکھتا کس طرح کوئی اسے لے کر جاتا ہے۔" وہ خفا ہوا تھا۔ جواہرات نے تاسف سے اس کا ہاتھ دبایا۔ اسے پتا تھا وہ سعدی کے لیے کیا جذبات رکھتا تھا۔

"ہاشم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سعدی اس کا دوست تھا' آپ کو ہاشم کو بلانا چاہیے تھا۔"

"ہاشم کو بلانے سے۔" زمر اور حنین دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کچھ یاد آیا۔

"ہاشم! کیا آپ نے سعدی کو بتائی تھی ایگزام والی بات؟" زمر نے بغور اس کے چہرے کو دیکھتے پوچھا تو ہاشم نے چونک کر حنہ کو دیکھا۔ وہ بھی سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کون سی بات؟"

"جب ایگزام میں حنہ نے۔"

"اوکے میم پراسیکیوٹر۔" ہاشم نے ہاتھ اٹھا کر روکا۔ "میں اس بارے میں بات نہیں کرسکتا۔ اٹارنی کلائنٹ پریویلج کے تحت یہ میرے اور حنین کے درمیان ہے۔ اگر آپ کو کچھ جاننا ہے تو حنین سے پوچھ لیں۔"

"میں سب جانتی ہوں۔ صرف سعدی کو بتانے کے متعلق پوچھا ہے۔"

"میں ایسا کبھی بھی نہیں کرسکتا۔" وہ اتنے اعتماد

زمر پہ "دیکھا؟" والی جتاتی نظر ڈالی۔ جواہرات بھی اسی اعتماد سے گردن اکڑائے بیٹھی رہی۔ زمر البتہ مشکوک نظروں سے ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔

"ہوا کیا تھا؟"

"بھائی کو کل کسی نے بتایا تھا۔ یہ نہیں پتا کہ کس نے۔"

"کیا تم نے اپنی کلاس فیلوز سے پوچھا؟ مجھے وہاں بہت سے لوگوں نے آتے دیکھا تھا۔"

"او ہاں۔" حنین کو یاد آیا۔ "ناعمہ کا بھائی، سعدی بھائی کا دوست ہے۔ شاید اسی نے بتایا ہو۔"

"اور تم نے سب سے پہلا شک مجھ پہ کیا؟" ہاشم مسکرایا۔ حنین کو ڈھیر ساری شرمندگی نے آن گھیرا۔

"اہم۔ یہ کس بارے میں بات ہو رہی ہے۔" جواہرات نے باری باری ان کے چہرے دیکھے۔

ہاشم نے "ایک غیر اہم سی بات تھی۔ جانے دیجیے" کہہ کر موضوع بدل دیا۔

زمر باہر نکلی تو باغیچے کے گیٹ کے ساتھ اسامہ کھڑا اداسی سے دھوپ کو دیکھ رہا تھا۔ صبح اب دوپہر میں تبدیل ہو رہی تھی۔

"مجھے "اس" جگہ جانا ہے۔ کیا تم مجھے پتا سمجھا دو گے، سیم؟" وہ اس کے قریب آ کر بولی تو وہ چونکا، پھر فوراً" سر ہلایا۔

"آپ اکیلی مت جائیں۔ میں ساتھ آؤں گا۔" اس کے کندھے کے برابر آتا سیم ایک دم سنجیدگی سے بولا۔ زمر ہلکا سا مسکرائی، پھر اس کی کہنی تھام لی اور دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"ماموں بھی ادھر گئے ہیں۔" جگہ کا نام لیے بغیر اس نے بتایا تو وہ ہلکا سا چونکی تھی۔

جیسے ہی وہ زیر تعمیر گھر قریب آیا، زمر کے قدم بھاری ہوتے گئے۔ چہرے کی رنگت زرد پڑتی گئی۔ آنکھوں میں نمی ابھری جس کو اس نے اندر اتار لیا۔ (اللہ مجھے صبر دینا! کچھ دیر کے لیے ہی سہی!) گیٹ کے سامنے جب وہ رکی تو آنکھوں میں کرب کی جگہ افسوس نے لے لی۔ اس نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔

"پولیس نے اتنی جلدی کرائم سین دھو دیا؟" غصہ بھی اس نے اندر دبا لیا۔ وہاں چند لوگ اور پولیس اہلکار دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے پورچ میں قدم رکھا تو سیم کی کہنی زیادہ سختی سے بھینچ لی۔ سامنے فرش پہ خاک زدہ خاکہ بنا تھا۔ (جدھر سعدی گرا ملا تھا)۔ اپنی گلابی ہوتی آنکھیں اٹھائیں تو گھر کے اندرونی حصہ میں وہ کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس کی زمر کی جانب پشت تھی اور وہ اینٹوں کی برہنہ سیڑھیوں کے پاس آدھا جھکا کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے آئی۔ فارس سے فاصلہ رکھے، رخ پھیر کر کھڑی، ارد گرد نگاہیں دوڑانے لگی۔

"ادھر کیا ہے ماموں؟" سیم اس کی طرف گیا وہ چونک کر پلٹا، تو دیکھا وہ اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ فارس نے ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی، پھر سیم کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"یہاں دو گولیوں کے نشان ہیں۔ اور ایک گولی اس دیوار میں بھی لگی ہے۔" وہ اتنی آواز میں بولا کہ زمر سن لے اور وہ سن کر چونک کر مڑی تھی۔

"مگر۔ یہاں گولیاں کیوں ہیں؟" سیم نے نا سمجھی سے دونوں کو دیکھا۔

"اس کے اینگل سے لگتا ہے کہ یہ۔" کہتے ہوئے اس نے گردن موڑی، وہ اب ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں ملیں تو وہ سیڑھیوں میں لگے سوراخوں کو دیکھنے لگی۔ "یہ پورچ سے ہی چلائی گئی ہے۔ ظاہر ہے اسی شوٹر نے چلائی ہے۔"

"مگر۔ ادھر کیوں وہ گولی چلائے گا؟ سعدی بھائی تو بالکل دوسری طرف تھے۔"

"شاید اس کا نشانہ برا تھا۔" فارس نے سرسری سا تبصرہ کیا۔

"یا شاید یہاں کوئی اور بھی تھا۔" وہ ہلکا سا بڑبڑائی۔

"آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ کوئی اور بھی تھا؟" وہ چونکا۔ زمر نے جواب نہیں دیا، بس گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ سیم نے بے چینی سے اسے

دیکھا۔

"پھپھو۔ آپ کو کیسے پتا؟"

"میں نے ابھی معلوم کیا تھا کہ پولیس کو کس نے کال کی' کیونکہ سعدی کو بروقت اسپتال پہنچایا گیا تھا' تو۔" وہ سیم کو بتانے لگی۔ آواز بلند رکھی۔ فارس اسے غور سے دیکھتے ہوئے سننے لگا۔ "تو معلوم ہوا کہ ہمسائے میں سے کسی نے کال کی تھی اور پتا سمجھایا تھا' مگر جب پولیس آئی تو یہاں زخمی سعدی کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور ہمسائے میں۔" زمر نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔ "سارے گھر تو ابھی زیر تعمیر ہیں۔"

"یعنی کہ وہ شخص جس نے پولیس کو کال کی' اس واقعے کے وقت یہیں تھا؟"

زمر نے نگاہیں پھیر کر فارس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"تھی۔ کال کرنے والی کوئی لڑکی تھی۔" اور وہ مڑ گئی۔ اسے جاتے دیکھ کر سیم پیچھے لپکا۔

"پھپھو۔ کیا ہمیں یہاں اور نہیں کچھ تلاشنا چاہیے؟ مثلاً" کوئی نشانی' کوئی ثبوت' کوئی فنگر پرنٹ۔"

"سب دھل کر تباہ ہو چکا ہے سیم۔ ہمیں اس کو وہیں ڈھونڈنا ہے جہاں وہ کھویا تھا۔" وہ جیسے صرف یہ جگہ دیکھنے آئی تھی۔ کسی اور چیز کی امید نہ تھی۔

سیم اور وہ ساتھ ساتھ چلتے واپس آئے تھے۔ فارس چند قدم پیچھے تھا۔ سیم اندر چلا گیا اور وہ ابھی باغیچے کے دروازے پر تھی جب اس نے عقب سے پکارا۔

"میں اسپتال جا رہا ہوں۔ اس کی انتظامیہ نے۔"

زمر بات مکمل ہونے سے پہلے ایڑیوں پر گھومی۔

"ان کی انتظامیہ نے پولیس کو نامکمل سی سی ٹی وی فوٹیجز دی ہیں' میں جانتی ہوں' اور یہ بھی جانتی ہوں کہ مکمل فوٹیجز کیسے نکلوانی ہیں اور وہ میں نکلوا لوں گی۔ آپ اپنے کام سے کام رکھیے' میرے راستے میں مت آئیے۔" سرد سپاٹ سا کہتی وہ واپس مڑ گئی تو فارس نے ایک تاسف آمیز سانس لے کر سر جھٹکا' اور گھر کی طرف بڑھ گیا۔ فارس جیسے ہی اندر گیا' ہاشم باہر آتا دکھائی دیا۔

"مجھے بتایئے میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے۔"

وہ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی باغیچے کے جھلسے پھول دیکھ رہی تھی' جب وہ عین سامنے آ کھڑا ہوا۔

"آپ کا شکریہ' ضرورت پڑی تو بتا دوں گی۔" ہاشم نے بس سر کو خم دیا۔ چند لمحے کی خاموشی چھائی رہی۔

"یہ کون کر سکتا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم' مگر ہو جائے گا۔" ہاشم نے تھوک نگلا۔

"جس وقت سعدی کو گولی لگی' اس وقت۔" مڑ کر گھر کو دیکھا جہاں ابھی وہ اندر گیا تھا۔ "فارس کہاں تھا؟"

زمر نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر گھر کو۔ "کیا مطلب؟"

"کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ آپ کے خاندان میں ایک بڑی ٹریجڈی ہوئی تھی' جس کے باعث وہ جیل گیا تھا' اور پھر وہ جیل سے نکلتا ہے تو ایک اور ٹریجڈی ہو جاتی ہے؟" سرسری انداز میں کہتے وہ زمر کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

زمر پلک بھی نہ جھپک سکی۔ "وہ اس کا بھانجا ہے' ہاشم!"

"جیسے وارث اس کا بھائی تھا اور زرتاشہ اس کی بیوی تھی؟"

زمر نے آنکھیں سکیڑ کر قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔ "فارس کا سعدی والے واقعے میں کوئی ہاتھ نہیں ہے' وہ اس وقت کہیں اور تھا۔"

"اوہ کم آن زمر!" ہاشم نے بے زاری سے ہاتھ چہرے کے آگے جھلایا۔ "اس کے پاس ہمیشہ ایلی بائی ہوتا ہے' آپ اس پہ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی کیسے اعتبار کر سکتی ہیں؟ وہ فارس ہے' اس سے کچھ بھی بعید ہے۔ ہم سب جانتے ہیں' آپ نے اس سے کیوں شادی کی۔ اور میرے نزدیک تو اس کے جرائم میں آج ایک جرم کا مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اب وہ وقت ہے جب آپ کو فارس کے خلاف کوئی ٹھوس قدم اٹھانا چاہیے۔"

زمر نے لب بھینچ لیے' تیز نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "آپ پوچھیں گے نہیں کہ اس کا ایلی بائی کون ہے؟"

"اس دفعہ کون ہے؟" اس نے استہزائیہ سر جھٹکا۔

"میں! وہ اس وقت میرے ساتھ تھا۔"

لمحے بھر کو وہ کچھ بول نہیں سکا' پھر وضاحتی انداز میں گویا ہوا۔ "میں فارس پہ اعتبار نہیں کر سکتا' میں اپ سیٹ ہوں' سعدی میرا دوست تھا' اور۔"

"او کے ہاشم! ایک بات۔" وہ ایک ہاتھ اونچا کر کے اسے درمیان سے ٹوکتی' اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اسی سرد مہری سے بولی۔ "آپ فارس کو ناپسند کرتے ہیں' مگر مجھ سے زیادہ نہیں۔ آپ سعدی کو پسند کرتے ہیں' مگر مجھ سے زیادہ نہیں۔ اس لیے میری یہ بات پہلی اور آخری دفعہ دھیان سے سنیے فارس نے یہ... نہیں کیا۔ اپنے پچھلے اعمال کا وہ حساب دے گا' مگر آپ۔ آپ نے اگر اپنے خاندانی تنازعات کے بدلے کے طور پر فارس کے خلاف میرے بھتیجے کی ٹریجڈی کو استعمال کرنا چاہا' تو آپ مجھے اپنا دشمن بنائیں گے۔ دوست' ہم پہلے بھی نہیں تھے۔"

ہاشم نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔"

"یہ موضوع ختم ہوا۔" وہ ایک سلگتی ہوئی نگاہ اس پہ ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ ابھی دروازے کے قریب آئی تھی کہ وہ کھلا اور فارس باہر نکلتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر رکا' اور ہٹ کر راستہ دیا۔ زمر آگے نہیں بڑھی' وہیں کھڑے فارس کو دیکھا' اور کافی صاف آواز میں بولی۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ میری گاڑی میں کچھ مسئلہ ہے۔" کن اکھیوں سے نظر آ رہا تھا کہ باغیچے میں کھڑا ہاشم ہلکا سا چونکا تھا۔

"او کے' میں انتظار کر رہا ہوں۔" فارس ایک سنجیدہ' مگر حیران نظر اس پہ ڈال کر آگے چلا آیا۔

زمر اندر آئی' کمرے سے اپنی ایک دو چیزیں اٹھائیں تو لاؤنج میں بیٹھی جواہرات کی آواز سماعت میں پڑی۔

"اب تم لوگوں کو اس جگہ نہیں رہنا چاہیے۔ یہ علاقہ محفوظ نہیں ہے۔" وہ حنین سے کہہ رہی تھی۔ زمر ٹھہر کر کچھ سوچنے لگی' پھر سر جھٹک کر باہر نکل آئی۔

پرس کہنی پہ لٹکائے اس نے باہر قدم رکھا تو دیکھا فارس گاڑی کی طرف جاتے ہوئے رک کر ہاشم سے کچھ کہہ رہا تھا۔ دونوں کا انداز عام اور سرسری تھا۔ زمر خاموش نظروں سے ان کو دیکھتے ہوئے کار کی طرف چلی آئی۔



نئی منزل کی راہ ڈھونڈو تم!
میرے غم سے پناہ ڈھونڈو تم!

چند منٹ بعد' جب کار سڑک پہ رواں تھی' تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھی زمر نے' موبائل پہ چلتا ہاتھ روک کر' سرسری سا پوچھا۔

"ہاشم تم سے کیا کہہ رہا تھا؟"

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے چونکا' رخ ذرا پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ سر جھکائے' موبائل پہ لگی تھی۔

"پولیس کی کارروائی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"کیا تم نے اسے کسی ممکنہ گواہ کا بتایا؟"

"نہیں تو۔"

"اس کو کچھ مت بتانا۔"

"کیوں؟" فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ زمر نے چہرہ اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں وہی ازلی سرد مہری تھی۔

"یہ مت سمجھنا کہ تمہیں فیور دے رہی ہوں' میں صرف یہ نہیں چاہتی کہ سعدی کے کیس کی تفتیش پہ ہاشم اثر انداز ہو۔" کہتے ہوئے وہ چہرہ موڑ کر کھڑکی کے باہر گزرتا ٹریفک دیکھنے لگی۔ "ہاشم نے مجھے کہا ہے کہ یہ واقعہ میں تمہارے اوپر ڈال دوں۔"

اسٹیئرنگ وہیل پہ اس کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوئی' بے یقینی سے اس نے زمر کو دیکھا۔

"یہ کہا اس نے؟" اس کے کان سرخ ہوئے'

آنکھوں میں طیش ابھرا۔ پھر لب بھینچ لیے اور غصے سے ایکسلیٹر پہ پاؤں کا زور بڑھا دیا۔ اندر ہی اندر لاوا سا ابلنے لگا تھا۔

"مجھے پتا ہے اس میں تمہارا ہاتھ نہیں ہے، لیکن اپنے پچھلے اعمال کا تم حساب دو گے۔ ایک دفعہ یہ معاملہ ختم ہو جانے دو۔" باہر دیکھتی وہ تلخی سے کہہ رہی تھی، جب کہ اس نے زور سے بریک پہ پیر رکھا۔ کار جھٹکے سے رکی، وہ بے اختیار ڈیش بورڈ پہ جھکتی گئی مگر خود کو سنبھال لیا۔ غصے سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ اس سے زیادہ اشتعال سے اسے گھور رہا تھا۔

"بس بہت ہو گیا۔ بہت سن لی میں نے آپ کی بکواس۔" وہ غصے سے غرایا تھا۔ زمر ذرا پیچھے ہوئی۔

"ہاشم کو دیکھ لوں گا میں، مگر آپ کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔ اس لیے آئندہ میرے آگے زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت دیکھ لیا میں نے اپنے گھر والوں کو قتل ہوتے اور خود پہ الزام لگتے۔ آج کے بعد کوئی مجھے نہیں بتائے گا کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ سمجھیں آپ؟" آنکھوں میں تپش لیے اس کو دیکھ کر کہتے وہ کار سے نکلا اور ٹھاہ سے دروازہ بند کیا۔

وہ تنفر اور بے بسی سے اسے گھورتی وہیں بیٹھی رہی۔ کار اسپتال کے سامنے رکی کھڑی تھی اور وہ چابیاں جیب میں ڈالتا اب اس طرف جا رہا تھا۔

چند منٹ بعد وہ اسپتال میں ایک کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ بیگ کہنی پہ ٹکائے، سن گلاسز گھنگھریالے بالوں کے اوپر چڑھائے، وہ آج سیاہ پاجامے پہ ہلکی سبز لمبی قمیص پہنے ہوئے تھی، اور سبز دوپٹہ دائیں کندھے پہ تھا۔ سکون سے کھڑی وہ فارس اور سیکیورٹی آفیسرز کو بحث کرتے دیکھ رہی تھی۔ سیکیورٹی ٹیم کے دو افراد دروازے کے آگے کھڑے تھے۔

"سر، میں آپ کو بتا چکا ہوں، ہم نے پولیس کے حوالے سب کچھ کر دیا ہے، اگر آپ کو مزید کوئی فوٹیج نکلوانی ہے تو کورٹ آرڈر لانا ہو گا۔ ورنہ میں آپ کو اس کمرے میں داخل نہیں ہونے دے سکتا۔"

"اور آپ کا قانون اس وقت کہاں تھا جب میرے بھانجے کو اسپتال سے اغوا کیا گیا؟ ہاں؟ ہاں؟" غصے سے بولتے اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ زمر گھنگھریالی لٹ انگلی پہ لپیٹ رہی تھی۔

"سر! مجھے مجبوراً سیکیورٹی سے آپ کو باہر نکالنے کو کہنا پڑے گا۔" سرد لہجے میں کہتے آفیسر ساتھ میں اسے تیز نظروں سے گھور بھی رہا تھا۔ پیچھے کھڑے دونوں اہلکار آگے ہوئے۔ ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔

"اے۔ ہاتھ نہیں لگانا۔" اس نے سختی سے ہاتھ اٹھا کر ان کو روکا۔

"السلام علیکم۔" وہ نرم سا مسکراتی، کھنکھاری۔ فارس نے بس ایک تیز نظر اس پہ ڈالی۔ مگر وہ سیکیورٹی آفیسر کو دیکھ رہی تھی۔

"میں زمر یوسف ہوں، ڈسٹرکٹ۔"

"میم! مجھے پتا ہے آپ کون ہیں، اور نہیں ہم آپ کو کوئی ٹیپ نہیں دے سکتے۔ اگر آپ کو ٹیپ چاہیے تو وارنٹ لے کر آئیں۔" اس نے سختی سے زمر کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ وہ اسی طرح مسکراتی رہی۔

"او کے۔ کل عدالت کھلے گی تو میں وارنٹ لے آؤں گی، مگر آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کس فوٹیج کا وارنٹ لاؤں گی؟"

"میم! میں آپ کو بہت تحمل سے۔"

"کل جب میں کورٹ جاؤں گی، تو جانتے ہیں کن کے وارنٹ نکلیں گے۔ 16 مارچ کا جب ایک ممبر قومی اسمبلی کی نوکرانی کا ال لیگل ابارشن آپ کے اسپتال میں ہوا تھا، ستائیس جنوری کا جب آپ کے وارڈ سے دو نومولود بچے غائب ہوئے تھے، اور آپ کی فارمیسی کے ریکارڈز کا سرچ وارنٹ بھی جہاں پچھلے تین مہینے سے آپ کے ایک خود ساختہ ملٹی وٹامن نے آدھ درجن عورتوں کے مبینہ طور پر مس کیرج کروائے ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ ملٹی وٹامن ابھی مکمل پور طور اپرووڈ نہیں ہوا۔ سوچا ہے کیا آفیسر، یہ ایک اچھا اور بڑا اسپتال ہے، مگر یہ ایک پرائیویٹ اسپتال ہے، اور سرکار ایک نجی اسپتال کے

ساتھ کیا کر رہی ہے یہ ہم دونوں جانتے ہیں تو آپ آپ مجھ سے پوچھیں کیا چاہیے؟" ایک سانس میں تیز تیز بولنے کے بعد وہ رکی اور مسکرا کر باری باری ان تینوں کے چہروں کو دیکھا۔

آفیسر انچارج غصے بھری بے بسی سے اسے گھورتا رہا "میم!۔"

"مجھ سے پوچھیے آفیسر کہ۔ مجھے۔ کیا۔ چاہیے!"

اس نے ضبط سے گہری سانس لی۔ "آپ کو۔ کیا چاہیے؟"

"جب آپ سامنے سے ہٹ کر مجھے کنٹرول روم میں جانے کا راستہ دیں گے 'تب ہی میں بتا سکوں گی۔"

آفیسر چند لمحے اسے گھورتا رہا 'پھر دوسروں کو اشارہ کرتا ایک طرف ہٹا اور دروازہ کھول دیا۔ زمر نے ایک چبھتی ہوئی (مگر فاتحانہ) نظر فارس پہ ڈالی۔ جس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ چکے تھے 'اور آگے بڑھ گئی۔ پھر بظاہر ان ہی سخت تاثرات کو چہرے پہ طاری کیے 'وہ اس کے عقب میں اندر داخل ہوا۔

چند منٹ بعد ایک کمپیوٹر اسکرین کے سامنے کرسی پہ موجود سی آر انچارج فولڈرز کھول کر ان کو مطلوبہ فوٹیجز دکھا رہا تھا۔ زمر اس کی کرسی کے ساتھ کھڑی 'ذرا جھک کر دیکھ رہی تھی 'اور فارس اس کے کندھے کے پیچھے کھڑا تھا۔

"دو لوگ تھے۔" وہ اسکرین کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی جہاں کاریڈور میں دو ماسک والے وارڈ بوائز اسٹریچر لاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اسٹریچر پہ لیٹے لڑکے کے اوپر چادر ڈالی تھی 'مگر سر سے ذرا سے گھنگھریالے بال نظر آتے تھے۔ زمر کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ پھنسنے لگا مگر اس نے پلکوں کو جھپک کر نمی اندر دبالی۔

"یہ فوٹیج پولیس کے پاس بھی ہے۔ یہ نہیں چاہیے۔" فارس نے بے زاری سے آپریٹر کو دیکھا تھا۔ "لفٹ کی فوٹیج کہاں ہے؟"

آپریٹر نے سر ہلا کر ایک اور فولڈر کھولا۔ تھیٹر میں اسٹریچر لانے سے قبل وہ دونوں لفٹ سے اترے تھے۔

یہ ان کے پیچھے کی فوٹیج تھی۔ لفٹ میں وہ دونوں کھڑے تھے۔ ان کے سروں پہ سبز ٹوپیاں اور چہرے پہ سبز ماسک تھا۔ دفعتاً" ایک وارڈ بوائے جس کا رخ کیمرے کے عین سامنے تھا 'اس نے چھینکنے کے لیے منہ پہ ہاتھ رکھا۔ پھر چھینک مار کر ماسک ہٹایا 'رومال سے منہ صاف کیا اور ماسک درست کر لیا۔

"پیچھے کرو۔" آپریٹر نے پیچھے کر کے روکا 'اور تصویر کو بڑا کیا۔ وارڈ بوائے کا چہرہ کافی واضح تھا۔ وہ ایک پکی عمر کا مرد تھا اور اس کی گھنی مونچھیں تھیں۔

"کیا آپ نے پولیس کو دکھایا؟" اس نے باری باری آپریٹر اور سیکیورٹی آفیسر کو گھورا۔ آفیسر جو سینے پہ بازو لپیٹے کھڑا تھا 'ذرا بے زار ہوا۔

"نہیں 'کیوں کہ انہوں نے یہ فوٹیج نہیں مانگی تھی۔"

فارس نے جیب سے ایک فلیش نکالی اور سسٹم میں داخل کی 'سیکیورٹی آفیسر فوراً" آگے بڑھا۔ "نہیں 'آپ میرا ڈیٹا کاپی نہیں کر سکتے۔"

"نہیں 'تمہارے سامنے کل کی تمام فوٹیجز کاپی کرنے لگا ہوں اور تم مجھے خاموشی سے یہ کام کرتے دیکھو گے۔" پھر آپریٹر کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"جو فولڈرز میں کہہ رہا ہوں 'وہ کاپی کرتے جاؤ۔ شاباش!" آپریٹر نے بے بسی سے انچارج کو دیکھا جو محض خون کے گھونٹ پی کر کھڑا رہا 'دوبارہ کچھ نہیں بولا۔

"یہ بھی کرو۔ اور یہ بھی۔ مجھے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"مگر سر! یہ دوسرے فولڈر کی ویڈیو۔"

"میرا دماغ پہلے ہی بہت گھوما ہوا ہے 'مزید خراب مت کرو۔" وہ جس طرح اس لڑکے کو گھور کر بولا تھا 'زمر نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا اور وہاں سے ہٹ کر دروازے کے پاس آکھڑی ہوئی۔ وہ کرسی کے ساتھ جھکا 'انگلی سے اسکرین کی طرف اشارہ کرتے آپریٹر کو ہدایات دے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ابھی سے برف الجھنے لگی ہے بالوں سے

ابھی تو فرش ماہ و سال بھی اتارا نہیں!

اس اپارٹمنٹ کی دیواریں خوب صورت سجاوٹ سے ڈھکی تھیں اور فرش شیشے سے چمک دار تھے۔ لونگ روم میں ٹی وی بلند آواز سے چل رہا تھا' اور بڑے صوفے پہ نیم دراز نوشیرواں' پاؤں میز پہ رکھے' ناپسندیدگی سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ رف سی شرٹ اور کھلے ٹراؤزر میں ملبوس' اس کا منہ بھی دھلا ہوا نہیں لگتا تھا' پھر اسی بے زاری سے اس نے موبائل اٹھایا اور نمبر ملا کر کان سے لگایا۔

"ہاں شیرو' تم ٹھیک ہو؟" ہاشم مصروف سے انداز میں بولا تھا۔

"خاک ٹھیک ہوں؟ قید پڑا ہوں ادھر۔"

"میں نے کہا تھا' گھر میں بند مت رہو۔ دبئی میں اپنے ایک ایک دوست سے ملو' تاکہ سب کو معلوم ہو کہ تم ادھر ہو اور ادھر ہی تھے۔ جو بھی پوچھے تو کہنا کہ میں اتوار کی رات آیا ہوں۔ سمجھے؟"

"آپ تو ایسے برتاؤ کر رہے ہیں جیسے واقعی مجھے کبھی گرینڈ جیوری کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ خدا کے لیے بھائی۔"

"شکر ادا کرو کہ میں نے تمہیں بچا لیا ہے اور سب سنبھال لیا ہے' لیکن اگر اب تم نے میری بات نہ مانی ناشیرو' تو میں اگلی دفعہ تمہیں نہیں بچاؤں گا۔ اب میرا دماغ مت خراب کرو' اور دوستوں کو جا کر ملو۔" تلخی سے کہہ کر فون رکھ دیا گیا۔ نوشیرواں غصے سے موبائل کو گھور کر رہ گیا۔

پھر اٹھا اور اوپن کچن کی طرف آیا۔ فریج کا دروازہ کھولا' جوس کا ڈبا نکالا اور اوپر لگے اسٹینڈ میں لٹکا شیشے کا گلاس اتار کر کاؤنٹر پہ رکھا۔ پھر انگور کا مشروب اس میں انڈیلا۔ سرخ مائع گلاس میں بھرنے لگا۔ گلاس اٹھا کر وہ ہونٹوں کے قریب لے کر گیا تو۔ مشروب کے سرخ رنگ میں وہی منظر ابھرنے لگا۔

بجری اور سیمنٹ کے ڈھیر کے قریب گرا لڑکا' اس کی اکھڑتی سانسیں۔ کھلتی' بند ہوتی آنکھیں اور۔ خون کا تالاب۔ سرخ تازہ سرخ پانی جو بہتا جا رہا تھا۔

ایک دم اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ بے زاری سے اس نے سرخ مشروب سنک میں انڈیل دیا۔ چہرے پہ شدید جھنجلاہٹ در آئی تھی۔

"کیا مسئلہ ہے۔" اکتا کر وہ چلا آیا اور پھر سے صوفے پر گرا موبائل اٹھا۔ کچھ دیر منہ بگاڑے موبائل دیکھتا رہا' پھر ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ تاثرات بدلے۔ فوراً" سے نمبر ملا کر فون کان سے لگایا۔

"ہیلو۔ شیری۔ کیسی ہیں آپ؟ میں نے ابھی آپ کی اپ ڈیٹ دیکھی۔ آپ دبئی میں ہیں؟ جی میں بھی ادھر ہی ہوں۔ آج صبح ہی پہنچا ہوں۔ کیا ہم مل سکتے ہیں؟ آنکھوں میں امید جاگی اور چہرے پہ جوش سا ابھرا۔



"او کے۔ میں آ جاؤں گا۔" وہ مسکرایا اور موبائل کان سے ہٹایا۔ سرخ دل نے سرخ پانی کو ذہن سے محو کر دیا۔

☼ ☼ ☼

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

چھوٹے باغیچے کے سامنے کار روکتے ہوئے وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "وہ فوٹیج اے ایس پی کے حوالے کر دی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ وہ اس آدمی کو پہچانتا ہے' جلد اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔" زمر نے کوئی تاثر دیے بغیر پرس اٹھایا اور لاک کھولا۔ فارس نے نظریں پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ گھنگھریالے بال کان کے پیچھے اڑستی اپنی طرف کا دروازہ کھول رہی تھی۔

"میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ ان لوگوں کو ادھر نہیں چھوڑ سکتا۔ اب وہ ہماری طرف رہیں گے' اگر آپ کو کوئی اعتراض ہے تو ابھی بتا دیں۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔

"اگر ابا کو تم ہمارے ساتھ رہنے کے لیے راضی کر لو' تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" بظاہر اس نے سپاٹ انداز میں کہا اور آگے بڑھ گئی مگر چہرے پہ واضح اطمینان اتر آیا تھا' گویا کوئی ان کہی خواہش پوری ہوئی

ہو۔

وہ بنا چاپ کے اندر راہداری میں آئی تو لاؤنج سے آوازیں آرہی تھیں۔

"فارس صبح کہہ رہا تھا کہ ہم اب اس کے ساتھ جاکر رہیں۔" ندرت تھکی تھکی سی کہہ رہی تھیں۔ زمر کے قدم راہدری میں سست ہوگئے کیوں کہ حنین آگے سے بہت خفگی سے بولی تھی۔

"ہمارا بھائی کھو گیا ہے تو ہم اتنے بے آسرا ہوگئے ہیں کہ گھر بدر ہوجائیں؟" کہہ کر رونے لگی تھی۔

"تمہیں' اسامہ اور تمہاری امی کو ان کے ساتھ جاکر رہنا چاہیے۔ یہاں اکیلے نہیں رہ سکتے تم لوگ۔" ابا کی آواز میں بھی تکان تھی۔ صبح سے سعدی کو رو رو کر اب سب نڈھال بیٹھے تھے۔

"ماموں یہ بوجھ کیوں بنیں؟ آپ اپنے کرائے داروں کو فارغ کردیں' ہم وہاں چلے جاتے ہیں۔"

"کون سے کرائے دار؟"

"وہ جو آپ کے پلاٹ پہ گھر بنا تھا' اور اس میں نئے کرایے دار آئے تھے۔" وہ ان کو یاد کروا رہی تھی۔ زمر نے دیوار سے لگے' آنکھیں بند کرلیں۔

"گھر؟" ابا حیران ہوئے۔ "تمہیں کس نے کہا؟"

"میری فرینڈ کا گھر بھی ہے اس کالونی میں۔ اس کی طرف گئی تو دیکھا تھا۔"

"وہ پلاٹ تو زمر نے کب کا بیچ دیا۔ حنین۔" ندرت نے بتایا۔

چند لمحے کے لیے لاؤنج سے کوئی آواز نہ آئی۔ راہداری میں کھڑی زمر نے آنکھیں کھولیں۔

"بیچ دیا؟" حنین شاکڈ تھی۔ "مگر کیوں؟"

"اس کو شاید کسی مقدمے کے لیے رقم چاہیے تھی۔" ندرت نے بے پروائی سے بتایا گویا یہ ذکر غیر اہم تھا۔ ابا خاموش رہے۔

"مقدمے کے لیے؟ اف۔ بڑے ابا۔ آپ نے ان کو یوں کرنے کیسے دیا؟ وہ آپ کے لیے ایک سیکیورٹی تھی۔ ایک سہارا تھا۔"

"وہ زمر کا تھا۔"

ہو گئی۔ تھکان سی سے بھری آواز آئی تھی۔

"اور زمر صرف اپنا سوچتی ہیں۔" اور پھر غصے سے بولتی اٹھ کر آئی تو وہ راہدری میں کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دم ٹھہر گئی۔ نظریں اس کے عقب میں گئیں تو زمر نے بھی چونک کر گردن موڑی' فارس بھی پیچھے کھڑا تھا' مگر زمر کے چہرے کے برعکس اس کی آنکھوں میں حنین کے لیے ناراضی تھی۔

"بھائی کا کچھ پتا چلا؟" اس نے بے تابی سے فارس کو مخاطب کیا۔ مگر اس کے نفی میں ہلتے سر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئے۔

بڑے ابا اور ندرت' دونوں نے بے قراری سے ان کو دیکھا' مگر۔ چہروں پہ لکھی تحریر پڑھ لی اور نگاہیں مایوس پلٹ آئیں۔ وہ سامنے صوفے پر جاکر بیٹھا۔ زمر چوکھٹ میں کھڑی رہی۔

"میں جاتے وقت آپا کو بتا کر گیا تھا' کہ اب آپ لوگ ہمارے ساتھ چل کر رہیں گے۔" اس نے بات کا آغاز ابا کو دیکھتے ہوئے کیا۔ انہوں نے "اونہوں" نفی میں گردن ہلائی۔

"میں اسی گھر میں ٹھیک ہوں' صداقت ہے میرے پاس۔ ہاں تم باقی سب کو لے جاؤ۔" ایک ہی دن میں وہ کمزور نظر آنے لگے تھے۔

"ابا! وہ گھر آپ نے مہینے کے آخر میں ویسے بھی خالی کرنا تھا' اور یہ جگہ اب رہنے کے قابل نہیں۔ اس لیے پلیز ضد مت کیجئے اور ہمارے ساتھ چلیں۔"

"زمر ٹھیک کہہ رہی ہیں' اب آپ کا کہیں اور رہنا صحیح نہیں ہے۔" وہ ابا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ابا مسلسل انکاری تھے اور ندرت متامل تھیں۔

"فارس' ہم اتنے سارے لوگ کیسے رہیں گے ادھر؟"

"اتنا چھوٹا نہیں ہے وہ گھر۔۔۔ تین بیڈ روم ہیں۔۔۔ نیچے والا۔۔۔ یوسف صاحب اور سیم لے لیں گے'

صداقت پورچ کے ساتھ سرونٹ روم میں رہ لے گا۔

اور اوپر۔۔۔" وہ رکا' ایک نظر زمر کو دیکھا' وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ "اوپر میرا اور زرتاشہ والا پرانا کمرہ آپ کے اور حنین کے لیے کافی ہے باقی۔۔۔ ہمارا تو ویسے بھی امی والا کمرہ ہے۔" اب کے اس نے زمر کو دیکھے بنا سنجیدگی سے بات مکمل کی۔ دروازے پہ رکھے اس کے ہاتھ کی گرفت سخت ہوئی تھی' ابرو تن گئے' ایک خاموش تیز نظر اس پہ ڈالی' مگر جب بولی تو آواز ہموار تھی۔

"سب آرام سے آجائیں گے۔ آپ بس چلنے کی تیاری کریں۔" اور مڑتے ہوئے کانوں میں ندرت کی آواز پڑی۔

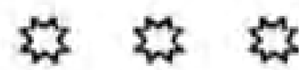
"میرا بیٹا ہوتا تو ہمیں کبھی یوں نہ جانے دیتا۔"

بڑے ابا مسلسل انکار کررہے تھے اور فارس کچھ کہہ رہا تھا' مگر زمر سنے بغیر آگے چلتی آئی۔ سعدی کا کمرہ خالی پڑا تھا۔ وہ دیوار سے لگے اس کے بیڈ پہ بیٹھی جوتے اتار کر پیر اوپر کرلیے اور دیوار سے ٹیک لگالی۔ آنکھوں میں پانی سا ابھر رہا تھا۔ جس کو اندر اتارے بنا دیوار سے سر لگائے' بس چپ چاپ سامنے دیکھے گئی۔ دل خالی تھا' ہاتھ خالی تھے' دنیا خالی تھی۔

اسی دیوار کے دوسری طرف حنین کے کمرے میں بھی ایسے ہی بیڈ لگا تھا اور وہ بھی اسی دیوار سے لگی۔ اکڑوں بیٹھے' سر گھٹنوں پہ رکھے رو رہی تھی۔ دل خالی تھا' ہاتھ خالی تھے' دنیا خالی تھی۔

دونوں ایک ہی بات سوچ رہی تھیں۔

ہمارا سعدی کہاں ہوگا اس وقت؟



بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجب رسم چلی ہے' دعا نہ مانگے کوئی

اس نے بدقت آنکھیں کھولیں تو دھندلی سی چھت نظر آئی۔ پلکیں آہستہ سے جھپکیں تو منظر قدرے صاف ہوا۔ سعدی کے چہرے پہ تکلیف ابھری' حسیات جاگنے کے ساتھ درد شدت سے لوٹ آیا تھا۔ وہ ہلکا سا کراہا پھر گردن موڑی۔

وہ ہسپتال کے بیڈ پہ لیٹا تھا اور اس کے اردگرد ایک کشادہ اور چمکتا ہوا کمرہ تھا۔ اس نے کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کی' مگر جسم جیسے جام ہوچکا تھا۔

"آہ۔۔۔" اذیت کے احساس سے آنکھیں میچ لیں۔

"ریلیکس۔۔۔ آرام سے۔۔۔" ایک عورت تیزی سے اس کے قریب آئی تھی۔ سعدی نے مندی مندی سی آنکھیں کھولیں۔۔۔ یہ چہرہ۔۔۔ وہ اسے پہچانتا تھا' مگر اس وقت ذہن میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کون ہے۔

"امی کہاں ہیں؟" وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

"آپ کو پانی چاہیے؟ یا کچھ اور؟ کہیں تکلیف ہورہی ہے؟" آواز' لہجہ سب شناسا سا تھا' مگر یہ کون؟ اس نے پلکیں جھپکیں۔ خود پہ جھکی اسمارٹ سی عورت کا چہرہ واضح ہوا۔ بھورے سنہرے رنگے بال اور سفید جلد۔۔۔

"میری امی کہاں ہیں؟" اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی' مگر وہ اٹھ نہیں پارہا تھا۔

"آپ کو پانی دوں؟" اب کے سعدی نے الجھن سے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ کیا وہ اس کی بات سن نہیں سکتی تھی؟ اس نے پھر اٹھنے کی سعی کی۔۔۔ مگر کیا شے تھی جو اس کو حرکت نہیں کرنے دے رہی تھی۔ اس کی نگاہیں اپنے بازوؤں تک گئیں۔ دونوں بازو' کہنی سے کلائی تک' بیڈ کے ساتھ اسٹریپس سے بندھے تھے۔

ایک دم سے ذہن پہ دوائیوں سے چھایا نشہ اور غنودگی اترنے لگی۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔

"میں کہاں ہوں؟" بے حد حیرت اور وحشت سے اس نے خود پہ جھکی عورت سے سوال کیا۔

"کیا آپ کو پانی چاہیے؟" اس نے اسی نرمی سے پوچھا۔ ذہن میں بکھرے ٹکڑے جڑنے لگے۔ اس عورت کو دیکھتی اس کی آنکھیں سکڑیں۔

"میری؟ میری اینجو؟" کہنے کے ساتھ اس نے بازو زور سے کھینچے' مگر گرفت مضبوط تھی' وہ کسے

رہے۔

"میں کہاں ہوں؟" وہ سیدھی ہوئی' سینے پہ بازو لپیٹ کر اسے دیکھا۔

"آپ کو پانی چاہیے یا نہیں؟"

سعدی نے سر تکیے پہ گرا دیا۔ میری کو تکتی اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کی حیرت تھی۔

"میں کہاں ہوں؟ میرے گھر والے کہاں ہیں؟" مگر میری کاؤچ کی طرف گئی' شاید فون وغیرہ پہ کسی کو اطلاع دی کہ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"میری امی کہاں ہیں؟" وہ بدقت بول پا رہا تھا۔ تکیے پہ رکھی گردن ذرا موڑی تو دھندلا سا منظر نظر آیا۔ نیلی جینز پہ گھٹنوں تک آتا سفید اوور آل پہنے' ایک لڑکی اس کی جانب آرہی تھی۔ اس کے بال سیدھے اور لمبے تھے۔ کہنی تک آتے اور گردن میں اسٹیتھ اسکوپ پڑا تھا۔ قریب آئی تو چہرہ واضح ہوا۔

گندمی رنگت اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور ان میں ایک معصوم سا تاثر۔ نرمی سے مسکرائی' وہ اس سے انگریزی میں اس کی طبیعت پوچھ رہی تھی۔

"میری۔۔۔ امی کہاں ہیں؟" وہ اس کو اب کوئی انجکشن لگا رہی تھی اور سعدی ایک ہی بات دہرائے جا رہا تھا۔ آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ اندھیرا' پھر روشنی' پھر اندھیرا۔

پھر وہ میری کی طرف گھومی۔ "اس کے ہاتھ کھول دو کم از کم۔۔۔ وہ بیمار ہے اور زخمی بھی۔ اس حالت میں بھاگ کر کہاں جائے گا؟" اس کی آواز میں ترحم تھا۔ مقابل کھڑی میری نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

"تمہیں اس سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے' اپنے کام سے کام رکھو!"

"اپنے باس سے کہو' صرف اس کے ہاتھ کھول دیں۔۔۔ وہ۔۔۔" الفاظ گڈمڈ ہو گئے۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

* * *

سازش تھی رہبروں کی یا قسمت کا پھیر تھا
ہم ہجرتوں کے بعد بھی قاتل کے گھر میں تھے

اس رات قصر کاردار کے عقب میں انیکسی کی ساری بتیاں روشن تھیں۔

صداقت کچن میں کھڑا ندرت کے ساتھ چیزیں سیٹ کروا رہا تھا۔ ندرت پھر اس کے بعد نہیں روئی تھیں۔ دو دن لگے ساری تیاریوں میں اور آج تیسرے دن وہ لوگ بالآخر اس انیکسی میں آچکے تھے۔ لاؤنج بھی صفائی کے بعد چمکنے لگا تھا۔ لاؤنج میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا جس میں بڑے ابا ایک سنگل بیڈ پہ لیٹے تھے۔ فاصلے پہ دوسرے بیڈ پہ سارے دن کا تھکا ہارا اسیم سو رہا تھا۔

اوپر سیڑھیاں چڑھ کر جاؤ تو فارس اور زرتاشہ کے پرانے کمرے کا حلیہ ذرا بدلا ہوا تھا۔ فارس کی کوئی چیز اودھر نہ تھی۔ حنین اور ندرت کے بیگز اور کپڑے وہاں دکھائی دے رہے تھے۔

ساتھ والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر مدھم زرد بتیاں جل رہی تھیں۔ (یہ وہی کمرہ تھا جس میں زمر شادی کے دن سے رہ رہی تھی۔) سعدی کے لائے پھول وہیں رکھے تھے گو کہ وہ اب سوکھ چکے تھے۔

ایک الماری کھلی تھی اور فارس اس کے سامنے کھڑا' اس میں اپنی چیزیں رکھ رہا تھا۔ دفعتاً" اس نے ہاتھ روک کر ایک نظر ان باکسز پہ ڈالی جن میں زمر کے کاغذات تھے اور جو اس نے (بادل نخواستہ) فارس کی چیزوں کے لیے اس الماری سے نکال لیے تھے اور پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا' جو اسٹڈی ٹیبل پہ اس کی طرف پشت کیے' لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھی۔ مدھم زرد بتی میں بھی اس کے گھنگھریالے بال چمک رہے تھے۔

"آپ یہ باکسز نیچے بیسمنٹ (تہ خانے) میں رکھ دیں۔ بیسمنٹ کی چابی آپ کی ڈریسنگ ٹیبل پہ پڑی ہے۔" پچھلے دو دن کی خاموشی کے بعد اس نے پہلی دفعہ اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ جواب دیے بنا کام کیے گئی۔ فارس نے گہری سانس لی۔

"آئی ایم سوری' اس دن آپ پہ غصہ کر گیا۔"

"آپ کی معذرتوں کا وقت گزر چکا ہے۔" وہ مڑے

بنا کندھے اچکا کر بولی۔

"کوشش کروں گا اس کمرے میں کم سے کم آؤں اور آپ کو زیادہ پریشان نہ کروں۔ یہ بھی مجبوری ہے۔"

وہ چپ چاپ اسکرین کو دیکھے گئی اور وہ اس کے بالوں کو۔

"اگر آپ میری وجہ سے بے آرام ہیں تو اس کے لیے بھی معذرت کرتا ہوں۔ یہ آپ کا کمرہ ہے' آپ کا ہی رہے گا۔ میں صوفے پہ سوؤں گا۔ جب تک ہمیں ساتھ رہنا پڑے۔"

زمر کی ٹائپ کرتی انگلیاں تھمیں' گردن موڑ کر جتاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں نے اپنے کمرے میں یہ صوفہ آپ کے لیے ہی ڈلوایا ہے۔" اور واپس گھوم گئی۔ فارس نے ٹھنڈی سانس لی' پھر الماری کا پٹ بند کرتا کھڑکی تک آیا تو دم ٹھہرا۔ پردہ ذرا سرکا کر نیچے دیکھا جہاں برآمدے میں ہاشم کھڑا حنین سے بات کرتا نظر آ رہا تھا۔ فارس کے جبڑے بھنچے۔ وہ تیزی سے باہر نکلا۔

انیکسی کے برآمدے میں وہ کھڑی تھی اور اس کے سامنے ہاشم تھا۔ ہاشم کے عقب میں سبزہ زار اونچا ہوتا دکھائی دیتا اور چوٹی پہ وہ بلند محل تھا۔ مگر جب ہاشم سامنے ہوتا تو دوسری ہر شے اپنا حسن اور عظمت کھو دیتی تھی۔ اب بھی وہ نرمی سے مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔

"اچھا کیا جو تم لوگ یہاں آ گئے۔ سیٹل ہو گئے ہو یا کوئی مدد چاہیے؟"

"نہیں' تھینک یو' سب ہو گیا۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔ بال پونی میں بندھے تھے اور لباس ملگجا تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ رات کو بھی چمک دار سفید شرٹ میں ملبوس کتنا تازہ دم لگ رہا تھا۔ حنہ کو احساس کمتری نے آن گھیرا۔

"وہ بندہ پکڑا گیا یا نہیں؟ جو لفٹ کی فوٹیج میں ملا تھا؟"

"نہیں' پتا نہیں۔" حنہ نے یاسیت سے شانے اچکائے۔ ہاشم نے غور سے اسے دیکھا۔

"تم اس معاملے میں کوئی دلچسپی کیوں نہیں لے رہیں؟"

"پھپھو اور ماموں کر رہے ہیں نا سب۔"

"مگر وہ سعدی کے لیگل وارث نہیں ہیں۔"

"مطلب؟" اس کے چہرے پہ آتی الجھن دیکھ کر وہ قدرے حیران ہوا۔ "کیا تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟ پھپھو اور ماموں قانونی وارث نہیں ہوتے۔ اس کیس میں صرف تمہاری امی یا تم سعدی کے وارث ہو۔"

"اور سیم؟"

"وہ اٹھارہ سال سے چھوٹا ہے' سو وارث نہیں ہو سکتا۔"

"اوہ۔ مگر کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ بے دلی سے سر جھکائے' جوتے سے فرش کھرچنے لگی۔

"تم کتنے سال کی ہو؟" سامنے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہاشم نے پوچھا۔

"بیس۔"

"میں پینتیس سال کا تھا جب میرا باپ مرا۔ میں بیس کا نہیں تھا' پھر بھی لوگوں نے میرا استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے میری نصیحت یاد رکھنا۔ جب آپ کے گھر کا سربراہ نہ رہے تو آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں۔"

حنین چپ چاپ اسے دیکھے گئی' مگر اس کے چہرے پہ الجھن بھری ناپسندیدگی کا تاثر تھا۔ "مگر فارس ماموں اب ہمارے سربراہ ہیں۔۔۔ تو۔۔۔" اسی پل دروازہ کھلا اور فارس باہر آیا۔ حنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ایک دم اپنا آپ چور لگا۔

"ہیلو فارس!" ہاشم نے اسی طرح مسکرا کر سر کو خم دیا۔ حنہ فوراً اس کی طرف مڑی۔

"ماموں۔۔۔ ہاشم بھائی آپ کا پوچھ رہے تھے' میں سمجھی آپ سو چکے ہیں۔"

فارس نے ایک تیز' سپاٹ نظر ہاشم پہ ڈالی' پھر حنہ کو اشارہ کیا۔ "اندر جاؤ۔" آواز میں سختی تھی۔ وہ سر جھکائے "اوکے گڈ نائٹ" کہتی فوراً اندر کھسک لی۔

اب وہ اپنے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے آ

کھڑا ہوا۔ آستین چڑھائے' تنے ابرو اور دبے دبے غصے کے ساتھ ہاشم کو دیکھا۔

"کیا ہوا؟" پرسکون کھڑے ہاشم نے ابرو اٹھائے۔

"وقت نہیں مل سکا' کچھ حساب کتاب کرنا تھا تمہارے ساتھ۔" آنکھوں میں تپش لیے اسے گھورا۔ "کیا کہہ رہے تھے تم اس دن زمر سے؟ کہ سعدی کا حادثہ میرے سر پہ ڈال دو؟"

"اوہ کم آن!" ہاشم نے بے حد حیرت سے سر جھٹکا۔ "کیا اس نے "یہ" بتایا ہے تمہیں؟ اور کیا یہ نہیں بتایا کہ اس نے خود کو کیا کہا؟ ان فیکٹ مسز غازی نے مجھے بہت صاف لفظوں میں بتایا کہ وہ آپ سے' مجھ سے زیادہ نفرت کرتی ہیں اور یہ بھی کہ۔۔۔" طنزیہ لہجے میں وہ گویا ہوا۔

"اور یہ بھی کہ اتفاق سے اس دفعہ بھی آپ کے پاس ایلی بائی ہے۔ تو میں نے پوچھا' فارس اس وقت کہاں تھا۔ بولیں میرے ساتھ تھا' مگر وہ اپنے تمام اعمال کا حساب بھگتے گا۔ میں نے پوچھا آپ یہ فارس پہ ڈالنا چاہتی ہیں؟ تب ہی تم آگئے۔ شاید انہوں نے تمہارے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کے لیے یہ کہا۔ ورنہ۔۔۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو بہت محتاط رہتا۔ کیوں کہ ہم سب کو پتا ہے کہ انہوں نے تم سے شادی کیوں کی ہے۔"

"میری بات کان کھول کر سنو ہاشم!" وہ چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا آگے آیا۔ "یہ میرا گھر ہے اور زمر میری بیوی ہے۔ مجھے تمہارے مقابلے پہ اس کی بات کا زیادہ یقین ہے۔ اس لیے میری بیوی سے۔۔۔ دور رہو۔" چبا چبا کر ایک ایک لفظ ادا کیا۔ "اگر ایک لمحے کے لیے بھی مجھے لگا کہ تم سعدی کے حادثے کو استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو یاد رکھنا میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔" ایک تیز نظر اس پہ ڈال کر وہ مڑنے لگا' پھر رکا۔ "اور ہاں۔۔۔ میرے گھر میری غیر موجودگی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا دوست سعدی تھا۔ اس گھر میں اب تمہارا مزید کوئی دوست نہیں ہے۔" اور اندر جا کر زور سے دروازہ بند کر دیا۔

ہاشم بمشکل ضبط کرتا مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سبزہ زار پہ چلتا گیا۔ اس کے چہرے پہ شدید غصہ تھا۔ اس کے کمرے کی بالکونی سامنے تھی۔ بیرونی زینے سے وہ بالکونی پہ چڑھا اور اندر کمرے میں آکر موبائل پہ نمبر ملایا۔ خاور نے پہلی گھنٹی پہ کال ریسیو کی۔

"جی سر؟"

"خاور۔۔۔ مجھے نہیں پتا تم یہ کیسے کرو گے۔" غصیلی آنکھوں کے ساتھ وہ فون میں غرایا تھا۔ "مگر مجھے فارس غازی جیل کے اندر چاہیے' کبھی بھی باہر نہ نکلنے کے لیے۔"

"اوکے سر۔۔۔ میں کچھ کرتا ہوں۔"

کال بند ہوئی تو ہاشم نے اسی برہمی سے فون صوفے پہ پھینک دیا اور منہ ہی منہ میں چند انگریزی گالیاں اسے دیں۔ غصہ کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

انیکسی کے اندر فارس سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو حنہ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ بجھے چہرے کے ساتھ بیڈ پہ بیٹھی تھی۔ وہ چوکھٹ میں ٹھہرا۔

"آئندہ ہاشم سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔" نہ سختی' نہ نرمی' بس ہموار لہجے میں کہہ کر اس کا "جی اچھا" میں جھکتا سر دیکھ کر وہ اپنے کمرے کی طرف آگیا۔ (اپنا کمرہ؟)

ہلکی دستک دے کر دروازہ کھولا تو کمرے کی بتی بجھی تھی' صرف ڈریسنگ روم کا بلب جل رہا تھا۔ اسٹڈی ٹیبل خالی تھی۔ وہ بیڈ پہ لحاف گردن تک اوڑھے' آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی تھی۔ (کیا یہ میرے جانے کا انتظار کر رہی تھی؟) وہ آہستہ سے دروازہ بند کرتا بیڈ کے قریب آیا۔ دوسرا تکیہ اٹھایا اور صوفے پر رکھا۔ پھر یوں ہی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ آنکھیں بازو سے ڈھکی تھیں۔ مگر ناک کی لونگ دمکتی نظر آرہی تھی۔ فارس کے چہرے پہ چھائے تنے تاثرات ڈھیلے پڑے۔ نظر زمر کی سائیڈ ٹیبل پہ پڑی۔ وہاں دوائیں رکھی تھیں' اور ساتھ میں جگ گلاس۔۔۔ جگ خالی تھا۔ اس نے جگ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو وہ پانی سے بھرا

تھا۔

جگ واپس دھرتے اس نے گردن جھکا کر ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ ایک تلخ مسکراہٹ لبوں پہ ابھر کر معدوم ہوئی۔ پھر صوفے کی طرف آگیا۔

گھر کی بتیاں آہستہ آہستہ بجھنے لگیں۔ خاموشی چھانے لگی۔ کتنے ہی پل ان کے کمرے میں آہستہ سے سرک گئے۔ وہ ہنوز بازو آنکھوں پہ رکھے لیٹی تھی، اور وہ صوفے پہ نیم دراز، سینے پہ لیپ ٹاپ رکھے، اسپتال کی فوٹیج بار بار دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں اسکرین کی روشنی اس کے چہرے کو چمکا رہی تھی۔ ڈریسنگ روم کی بتی اب بند تھی اور باقی کمرہ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔

ایک دم سے وہ اٹھ بیٹھی۔ بالکل سیدھی، فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ پاؤں نیچے اتارے، بالکل ساکت سی بیٹھی تھی۔

"اوہ!" وہ ہلکا سا بڑبڑائی۔

"زمر۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں؟" وہ لیپ ٹاپ میز پہ رکھتا خود بھی اٹھ بیٹھا۔ زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ نیم اندھیرے میں بھی اتنا واضح تھا کہ اس کی آنکھیں خوابیدہ تھیں۔ شاید وہ سو گئی تھی اور کچی نیند سے جاگی تھی۔

"وہ۔۔۔ ویڈیو۔۔۔" وہ بے خودی کے عالم میں بولی۔

"کون سی ویڈیو؟ اسپتال والی؟" وہ ایک طرف ہو کر بیٹھا۔ "آیئے، دیکھ لیجیے۔"

وہ ایک دم اٹھی، اور ننگے پیر تیزی سے اس تک آئی۔

"کیا آپ اس ویڈیو کی بات کر رہی ہیں؟ بیٹھ جایئے۔" وہ جو کافی مضطرب سی لگ رہی تھی۔ صوفے کے کنارے ٹک گئی اور آگے جھک کر اسکرین دیکھی۔ اسپتال کے ایک کوریڈور کی فوٹیج چل رہی تھی۔

"اونہوں۔۔۔ لفٹ والی۔۔۔" وہ پریشانی سے بولی تو فارس نے "اچھا" کہہ کر مطلوبہ ویڈیو لگائی۔ زمر نے چہرہ مزید آگے جھکایا تو کھلی بالوں کی لٹیں کندھوں سے پھسل کر سامنے آگریں۔ فارس نے ذرا کی ذرا نظر اس پہ ڈالی۔ وہ بال کان کے پیچھے اڑستی، آنکھیں سیکڑے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ دیکھو۔" اس نے ایک منظر کو اسٹل کیا تو فارس نے توجہ اور دھیان اسکرین کی طرف لگانا چاہا۔

"مجھے ابھی یاد آیا، یہ آدمی۔۔۔ دیکھو۔۔۔ چھینک مارنے کے لیے ماسک اتارنے سے چھ سیکنڈ پہلے۔۔۔ اس نے نظر اٹھا کر کیمرے کی طرف دیکھا ہے۔"

وہ ایک دم چونکا۔ اسکرین پہ اس شخص کی نگاہ اٹھا کر فوراً" واپس موڑ لینے کو زمر نے اسٹل کر رکھا تھا۔

"یعنی کہ وہ اس بات سے واقف تھا کہ لفٹ کا کیمرہ اس کی تصویر بنا رہا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اور پھر بھی اس نے ماسک اتارا۔" زمر کا اضطراب اب غصے میں بدلنے لگا تھا۔ "تاکہ ہم اس کا چہرہ ٹھیک سے دیکھ لیں۔ اب دیکھنا دو چار دن میں پولیس اس کو پکڑ بھی لے گی اور یہ اعتراف جرم بھی کر لے گا۔"

"کیوں کہ یہ صرف ایک کرائے کا آدمی ہے، جسے اصل مجرم خود کو چھپانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔" وہ اسکرین کو دیکھتے ہوئے سوچتے ہوئے بول رہا تھا۔ پھر کچھ یاد آیا۔ "یہ دیکھیے۔۔۔ میں دوسری فوٹیجز چیک کر رہا تھا۔ یہ اس کوریڈور کو دیکھیے۔" اس نے ایک اور ویڈیو لگا کر دکھائی۔ کوریڈور خالی تھا۔ فارس نے ذرا فارورڈ کیا۔ "اس شیشے کے دروازے کو دیکھیے۔ اس میں مخالف کوریڈور کا عکس جھلک رہا ہے۔" زمر نے گردن مزید آگے کر کے غور سے دیکھا۔

"اس عکس میں ایک نرس جاتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے، اس کی پشت ہے اس طرف، مگر وسط راستے میں وہ ٹرے میں سے کچھ گراتی ہے، پھر اٹھاتی ہے اور چلی جاتی ہے۔"

"او کے پھر؟" نیم اندھیرے کمرے میں وہ دونوں صوفے پہ ساتھ ساتھ بیٹھے بات کر رہے تھے۔

"اس کوریڈور میں اگلے آدھے گھنٹے میں ہر پانچ

منٹ اور سترہ سیکنڈ بعد ایک نرس کا عکس دکھائی دیتا ہے، جو بیچ راستے میں کچھ گرا دیتی ہے یا تو اسپتال کی ساری نرسیں اندھی ہیں، یا پھر یہ ایک ہی پانچ منٹ کا کلپ ہے جسے بار بار دہرایا گیا ہے۔"

"یعنی اصل آدھے گھنٹے کی ٹیپ غائب ہے؟" وہ چونکی۔ "اگر اسپتال والے ان آرگنائزڈ کرمنلز کے ساتھ مل کر یہ ٹیپ ڈاکٹر کر سکتے تھے تو لفٹ والی ٹیپ بھی غائب کر سکتے تھے، مگر نہیں۔۔۔ انہوں نے ہمارے ساتھ کھیل کھیلا۔" اس کی پیشانی پہ بل پڑ رہے تھے، اور وہ غصے سے کہتی جا رہی تھی۔ "ان کو پتا تھا ہم فوٹیجز نکلوائیں گے۔ سو وہ ہر اس راستے پہ بیٹھے ہیں، ہمیں بھٹکانے کے لیے جو سعدی تک جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ ہم سے دو قدم آگے رہیں گے۔" وہ ذہنی طور پہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ فارس نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے صوفے پہ اس کے تکیے کے ساتھ بیٹھی ہے، اسے احساس نہیں ہوا۔

"اگر وہ ہمیشہ ہم سے دو قدم آگے رہیں گے تو ہم سعدی کو کبھی نہیں ڈھونڈ سکتے۔"

"بالکل۔۔۔" وہ اسکرین کو پلکیں سکیڑ کر دیکھنے لگی۔ اندھیرے کمرے میں واحد مدھم سی روشنی عجیب فسوں بکھیر رہی تھی۔ وہ بدقت (زمر سے نظریں ہٹا کر) سامنے دیکھنے لگا۔ لائبریری کے سارے منظر ارد گرد اترنے لگے تھے۔

"بس پھر ہم سعدی کو نہیں ڈھونڈتے۔" وہ قطعیت سے بولی تو وہ چونکا۔

"کیا مطلب؟"

"ہم ان کے قدم پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر وہ ہمیشہ دو قدم آگے رہیں گے۔ سو ہم سعدی کو نہیں ڈھونڈیں گے۔ ہم ان کو ان کی گردن سے پکڑیں گے۔ وہاں سے جہاں سے انہوں نے تصور نہیں کیا ہو گا۔" وہ لیپ ٹاپ کو دیکھتی گویا خود سے بول رہی تھی۔

"مگر ہم نہیں جانتے، وہ کون ہیں۔"

"وہ بھی یہ ہی سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں نہیں جانتے" مگر۔۔۔ یہاں پر انہوں نے ایک غلطی کر دی ہے۔" وہ پہلی دفعہ مسکرائی اور نگاہیں موڑ کر فارس کو دیکھا۔ "کیا تم نے کرمنل لاء میں پڑھا نہیں تھا کہ

its not the crime its the cover-up

فارس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بالکل۔۔۔ مجرم کو اس کا جرم نہیں پکڑواتا بلکہ جرم کو چھپانے کی کوشش پکڑواتی ہے۔"

"سو اپنے جرم کو چھپانے کی کوشش میں، انہوں نے اپنا ایک بندہ ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اب تک وہ ہمارے لیے ایک انجان گروہ تھا مجرموں کا، مگر اب۔۔۔ اب ہم ان کے ایک ساتھی کو جانتے ہیں۔ یہ لفٹ والا آدمی۔" مگر فارس نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ تو صرف ایک ہرکارہ ہے، کرائے کا آدمی۔ جن لوگوں نے سعدی پہ حملہ کیا ہے، یہ آدمی ان کو جانتا تک نہیں ہو گا۔"

"بالکل۔۔۔ وہ بھی یہ ہی سمجھتے ہیں، مگر فارس۔۔۔ وہ کسی کو تو جانتا ہو گا۔ کسی نے تو اس کو پیسے دیے ہوں گے اس کام کے۔ ہم اس آدمی کے ذریعے اس کو ڈھونڈیں گے جس نے اسے پیسے دیے، اور پھر اس سے اوپر والے کو، اور یوں زینہ بہ زینہ چڑھتے ہم ان لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں جنہوں نے سعدی کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ سو اب ہم سعدی کو نہیں ڈھونڈیں گے، ہم ان لوگوں کو ڈھونڈیں گے۔ جس دن ہمیں یہ لوگ مل جائیں گے، اس دن سعدی بھی مل جائے گا۔" اس کے لہجے میں عزم تھا۔

"او کے۔۔۔ ایسے ہی کرتے ہیں، مگر ان تک پہنچنا آسان نہیں ہو گا۔ کیا آپ نے بیلسٹک رپورٹ دیکھی؟ سعدی کو Glock گن سے گولی ماری گئی۔ قوی امکان ہے کہ جی فورٹی ون استعمال کی گئی۔ پاکستان میں جی فورٹی ون منگواؤ تو ڈھائی تین لاکھ سے کم کی نہیں ملتی، اور کون منگوا سکتا ہے، اتنے آرام سے گلاک کی پستول؟ اسلحے کی درآمد ممنوع ہے اور صرف سنگل امپورٹ لائسنس کے ذریعے ہی کوئی ایک وقت میں ایک ہی پستول منگوا سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے یہ

مہنگی ترین گن میں سے ایک ہے۔ کلاس اور ٹیسٹ چیک کریں ذرا ان لوگوں کا۔" وہ اسکرین کو دیکھتے ہوئے تبصرہ کررہا تھا۔ ایک دم رکا۔ اس نے زمر کو چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔ گن کے ذکر پہ جیسے وہ ہوش میں آئی۔ بے اختیار چونک کر آس پاس دیکھا۔ وہ اس کے صوفے پہ... ایک دم وہ کھڑی ہوئی۔ چہرے پہ سپاٹ پن آگیا۔

"ظاہر ہے، قاتل اسلحے کے بارے میں آپ سے بہتر کون جانتا ہوگا۔" تلخی سے کہہ کر وہ تیزی سے بیڈ تک آئی۔ زرد موسموں کا سارا فسوں غائب ہوگیا۔ اندھیرے میں دو سائے رہ گئے۔ ایک صوفے پہ بیٹھا تھا اور دوسری بیڈ کے ساتھ اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔

"گڈ نائٹ۔" فارس کے چہرے پہ سنجیدگی اتر آئی۔ اس کی بات کو نظر انداز کرکے وہ کمپیوٹر آف کرنے لگا۔



جنہیں مانتا ہی نہیں یہ دل، وہی لوگ میرے ہیں ہم سفر
مجھے ہر طرح سے جو راس تھے، وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے

دیوار کے پار حنین اور ندرت کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ ندرت بیڈ پہ بیٹھی نماز پڑھ رہی تھیں اور حنین کروٹ کے بل لیٹی، چادر پہ انگلی سے لکیریں کھینچتی جارہی تھی۔ زمر کے الفاظ ذہن میں گونج رہے تھے۔

"مجھے سعدی کا لیپ ٹاپ کھول دو حنین۔ میں کسی شاپ پہ جاکر بھی کھلوا سکتی ہوں۔ مگر یہ کام تم مجھے خود کرکے دوگی۔ اگر تم کچھ کرسکتی ہو تو۔" وہ جانتی تھی زمر نے صرف اس کو اکسانے کے لیے ایسا کہا تھا، مگر وہ ان باتوں میں اب نہیں آیا کرتی تھی۔ پھر بھی وہ اٹھی اور سلیپرز پہن کر باہر نکل آئی۔ چند لمحے بعد وہ بیسمنٹ کے زینے اتر رہی تھی۔ بتیاں جلائیں تو سارا تہہ خانہ روشن ہوا۔ وہ ایک کھلا سا کمرہ تھا جس میں ستون تھے اور پورے گھر کے رقبے پہ وہ پھیلا ہوا تھا۔ اس کا آدھا حصہ اس سامان اور باکسز سے بھرا ہوا تھا جو گھر خالی کرکے شفٹنگ کے وقت وہ ادھر لائے تھے۔ ایک کونے میں الگ سے چند باکسز رکھے تھے۔ حنین قدم قدم چلتی اس کونے تک آئی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر آنکھیں نم ہوئیں۔ سعدی کی چیزیں۔ اس نے سعدی کے کپڑوں والا باکس کھولا۔ ایک شرٹ نکالی۔ صاف ستھری سفید ٹی شرٹ۔ وہ سوتے وقت عموماً یہ ہی پہنتا تھا۔ ٹی شرٹ دونوں ہاتھوں میں پکڑے، وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ جب ہی اندھیرے تہہ خانے سے آواز آئی۔

"یا صاحبی السجن" (اے میرے قید خانے کے دو ساتھیو!) اس نے چونک کر گردن گھمائی۔ سعدی کی آواز تھی وہ... مگر وہ خود ادھر نہیں تھا... وہ دور کہیں کسی دوسرے زمانے میں اسے پکار رہا تھا۔ ایک منظر سا ذہن میں روشن ہوا۔

ریسٹ ہاؤس کا کمرہ... فاصلے پہ بچھے دو سنگل بیڈ۔ دونوں بیڈز کے پاؤں کی طرف نیچے لگے دو میٹرس (انگریزی حرف T) کی طرح... ندرت کا بیڈ خالی تھا۔ اس کی پائنتی سے نیچے بچھے میٹرس پہ سیم سو رہا تھا۔ دوسرے بیڈ پہ حنین آنکھوں پہ بازو رکھے، چادر گردن تک تانے لیٹی تھی۔ نچلے میٹرس پہ سعدی چت لیٹا تھا۔ اسی سفید ٹی شرٹ میں ملبوس... یکایک اس نے بازو پہ ہاتھ مارا۔

"حنہ! یہاں کتنے مچھر ہیں۔"

وہ آنکھوں سے بازو ہٹائے بغیر نیند میں ڈوبی آواز میں بولی۔

"یہاں ایک بھی مچھر نہیں ہے بھائی۔ آپ صرف مجھے بلوانے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ پلیز سو جائیں، مجھے نیند آرہی ہے۔" سعدی کے چہرے پہ خفگی ابھری۔

"یار حنین! بندہ کوئی بات ہی کرلیتا ہے، ہم کب سے اس قید خانے میں پڑے ہیں۔"

"اس چھوٹے شہر میں صفیہ خالہ لوگوں نے ساری بارات کے لیے اتنا اچھا ریسٹ ہاؤس بک کروایا ہے،

ہمیں پورا ایک کمرہ ملا ہے' اس کو قید تو نہ کہیں اور سو جائیں۔"

چند لمحے کی خاموشی۔ پھر وہ بولا۔ "مجھے نیند نہیں آرہی' امی کہاں رہ گئیں۔"

"وہ فرزانہ خالہ کے کمرے میں ہیں۔ وہاں ساری خالائیں' ممانیاں محفل لگائے بیٹھی غیبتیں کررہی ہوں گی۔ آپ بھی وہیں چلے جائیں۔"

"نہیں یار۔۔۔ اتنی مشکل سے بندہ روز کی پانچ نمازیں پوری کرپاتا ہے' ایویں سارا ثواب ان سب لوگوں کو دے دیں جن کو ہم سخت ناپسند کرتے ہیں؟"

"پھر سو جائیں۔" جمائی روکتے' اس نے کروٹ بدلی۔ نیند سے آنکھیں بند تھیں۔ چند لمحے گزرے' پھر اس نے بڑے پیار سے پکارا۔

"یا صاحبی السجن!" (اے میرے قید خانے کے دونوں ساتھیو!)

حنین کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلے۔ بازو ہٹایا اور کہنی کے بل اٹھ کر چہرہ اونچا کیا' وہ نیچے تھا' تب ہی نظر نہ آیا' تو وہ اٹھی اور تکیہ اٹھا کر پاؤں والی طرف رکھا اور گھوم کر اس طرف سر رکھ دیا۔ پھر گردن اٹھا کر دیکھا تو وہ نیچے لیٹا' مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر دوسرے قیدی پہ ڈالی۔ (سیم) جو کب کا سو چکا تھا۔

"سورۃ یوسف؟" اس نے مسکرا کر آیت کا متن پوچھا۔

"ہوں۔۔۔ میری فیورٹ سورۃ۔"

"بس کردو بھائی' آپ سے تو جس سورۃ کا ذکر کرو' آپ کہتے ہی' یہ میری فیورٹ ہے۔"

"کب کہا میں نے ایسا؟"

"مجھے زیادہ بولنے پہ مجبور نہ کریں اور سو جائیں۔" دوبارہ ماتھے پہ بازو رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

"یا صاحبی السجن!" ذرا دیر گزری تو اس نے پھر نرمی سے حنہ کو پکارا۔ وہ۔۔۔ "ہوں" کر کے رہ گئی۔

"میں ایک بات سوچ رہا تھا۔"

"دل میں سوچیں بھائی۔" مگر وہ بھی ڈھیٹ تھا' بولتا گیا۔

"تمہیں یاد ہے' یوسف علیہ السلام نے جب قید خانے میں اپنے ساتھیوں کو ان کے خواب کی تعبیر بتائی تھی' ایک کو سولی پہ چڑھنا تھا اور دوسرے کو بادشاہ کا ساقی بننا تھا۔ یوسف علیہ السلام نے ساقی سے کہا کہ جب بادشاہ کے پاس جانا تو میرا ذکر کرنا۔ اس سے اگلی آیت یاد ہے تمہیں؟"

رات کے ڈیڑھ بجے وہ کچی نیند میں ڈوبی حنین سے پوچھ رہا تھا۔ حنہ کے چہرے پہ جھنجلاہٹ نمودار ہوئی۔ (ونہوں ایہہ کیہڑی آیت اے؟) (اب یہ کون سی آیت ہے؟) اف بھائی کو کون سمجھائے کہ ہر کوئی آپ کی طرح قرآن کریزی نہیں ہوتا۔

"نہیں۔۔۔ کون سی آیت؟" جمائی روکتے پوچھا۔ آنکھیں بند تھیں۔

"وہ سورۃ یوسف کی سب سے دلچسپ آیت ہے اور تمہیں وہی نہیں یاد؟"

(لو جی۔۔۔ ان سے پوچھو تو ہر دوسری آیت "سب سے دلچسپ" ہوتی ہے۔)

"ابھی نہیں۔" جمائی سے آواز پھر بھاری ہوئی۔ "یاد آرہی۔"

"میں بتاتا ہوں۔" وہ چت لیٹا' ایک دم پرجوش سا بولا۔ اور ساری دنیا کے درخت قلم بن جائیں اور سارے سمندر روشنائی اور ان سے لکھنے بیٹھو تو ختم ہوجائیں درخت اور ختم ہوجائیں سمندر' مگر اللہ کی باتیں کہاں ختم ہوتی ہیں اور قرآن کے اچھے طالب علموں کو بھی بس بولنے کا موقع چاہیے۔

"یوسف علیہ السلام نے اس قیدی سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا۔ اگلی آیت ہے' شیطان نے بھلا دیا اس کو ذکر کرنا اپنے آقا سے تو وہ ٹھہرا رہا قید میں کئی سال۔"

"ہوں۔۔۔" وہ آدھا پونا لفظ سن پائی۔

"اب سنو مزے کی بات' اس آیت میں "اپنے آقا سے ذکر کرنے" کے لیے لفظ آیا ہے "ذکر ربہ" اس کے دو مطلب ہیں۔ آقا سے ذکر کرنا اور آقا کا ذکر کرنا۔ اصل میں اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں۔ پہلا'

شیطان نے اس ساتھی قیدی کو بھلا دیا کہ وہ بادشاہ سے یوسف علیہ السلام کا ذکر کرتا اور دوسرا' شیطان نے یوسف علیہ السلام کو بھلا دیا۔ اپنے رب کا ذکر کرنا' اس لیے وہ ٹھہرے رہے جیل میں اگلے کئی سال' آئی سمجھ؟"

"نہیں؟" وہ بمشکل آنکھیں کھول پائی۔

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میرے بھائی یوسف یہ الفاظ نہ کہتے تو اتنے برس جیل میں نہ ٹھہرے رہتے۔"

"مگر انہوں نے جیل سے نکلنے کی کوشش ہی تو کی تھی' اس میں کیا بری بات ہے؟"

"میرے یا تمہارے جیسے لوگوں کے لیے جیل سے نکلنے کی کوشش کرنا دراصل خود ایک جہاد ہے' ایک اچھا کام ہے' ہم کریں تو ٹھیک ہوگا' مگر مقربین کی حسنات دراصل سیات شمار ہوتی ہیں۔"

"کس کی کیا' کیا شمار ہوتی ہیں؟" اس نے ترجمہ مانگا۔

"مطلب جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہوتے ہیں' ان کی حسنات یعنی چھوٹی نیکیاں' ان کی غلطیاں شمار ہوتی ہیں۔ گناہ نہیں' کہ انبیا کبھی گناہ نہیں کرتے تھے۔"

"نہیں سمجھ میں آئی بھائی۔"

"دیکھو۔ مسجد میں جھاڑو لگانا کتنی اچھی بات ہے' ہے نا؟ جو عورت مسجد میں جھاڑو لگاتی تھی' جب فوت ہوگئی تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے خصوصی دعا کی۔ یہ ایک حسنہ ہے۔ ایک نیکی' لیکن تصور کرو کسی ایسے اسکالر کو جس کا عمل بھی نیک ہو اور علم بھی بہت ہو۔ اللہ نے اسے ریسورسز دیے ہوں' ٹیلنٹ دیا ہو' مواقع دیے ہوں کہ وہ پوری دنیا میں جا کر دین کی تبلیغ کرے' بڑے بڑے فورمز پہ جا کر قرآن کی باتیں لوگوں کو سنائے' اب اگر ایسا بندہ سب چھوڑ چھاڑ کر مسجد میں دن رات صفائی کرنے لگ جائے تو ہوگی یہ بھی ایک نیکی' مگر یہ اس کی برائی شمار ہوگی' کیونکہ جو جتنا نیک اور اچھا ہوگا' اللہ کی اس سے

توقعات اتنی بڑھ جائیں گی۔ کوئی عام بندہ رہائی کا کہے بادشاہ سے تو بہت اچھا' مگر اللہ تعالیٰ کو یوسف علیہ السلام سے اس سے کہیں زیادہ کی توقع تھی۔"

"مطلب انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا؟"

"نہیں استغفراللہ۔۔۔ حنہ! انبیا کبھی بھی اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے کام نہیں کرتے تھے۔ وہ معصوم تھے اور یوسف علیہ السلام کی تو اللہ نے صرف اس ذرا سی کمی کی طرف توجہ دلائی' کیونکہ وہ ایک کامل انسان تھے۔ صبر والے اور علم والے۔ یہ ایک غلطی تھی کہ انسان کو مصیبت میں صرف اللہ کی طرف دیکھنا چاہیے۔ اچھا اب وہ سنو جو میں سوچ رہا تھا۔" وہ چیت لیٹا بولتا جا رہا تھا۔ "تم نے نوٹ کیا' یوسف علیہ السلام کو دنیا کا آدھا حسن دیا گیا تھا اور جن عورتوں کو خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بچہ خوب صورت ہو' وہ روز سورۃ یوسف پڑھتی ہیں' مگر اللہ تعالیٰ نے ایک دفعہ' قطعاً ایک دفعہ بھی سورۃ یوسف میں نہیں کہا کہ یوسف خوب صورت تھے۔ ان کے حسن کا ذکر بھی نہیں کیا۔ کیوں کہ اللہ نے ہمیں "احسن القصص" (سورۃ یوسف) اس لیے دی تھی تاکہ ہم کسی انسان کی ان خوبیوں کو جان پائیں جو اس کو اللہ کی نظر میں خوب صورت بناتی ہیں' مگر حنہ یار! کوئی یہاں قرآن سمجھ کر کیوں نہیں پڑھتا' تم سن رہی ہو نا؟" ہاتھ بڑھا کر حنہ کے بالوں کی لٹ کھینچی۔ "کٹو یار! سنو میں تم سے بات کر رہا ہوں۔"

"سونے دو بھائی۔" وہ نیند میں تھی۔

"ایک وقت آئے گا حنین یوسف! جب تم میری باتوں کو مس کیا کرو گی۔" بڑے ہی خفا انداز میں وہ بولا۔

"ایں؟ کون سا وقت؟" اس کے ذہن میں کوئی فکر جاگی۔

"جب میں شادی کے بعد رخصت ہو کر کسی کا گھر داماد بن جاؤں گا۔"

"توبہ!" وہ نیند میں بھی زور کی ہنسی۔ "آپ کو کوئی گھر داماد نہیں بنائے گا۔"

"کیوں نہیں بنائے گا؟ جیب خالی ہے تو کیا ہوا' بندہ

بہت اچھا ہوں میں۔ ایک تو خوش اخلاق اتنا ہوں' اوپر سے خوب صورت بھی ہوں۔" ذرا رک کر پوچھا۔ "ہوں نا؟"

اس نے بالآخر تکیہ اٹھا کر زور سے نیچے اچھالا۔ "سو جاؤ بھائی۔ میں کبھی نہیں مس کرنے والی آپ کو' جائیں کریں شادی۔"

یاد کا بلبلہ پھٹا اور وہ واپس اس نیم اندھیرے تہہ خانے میں آئی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو سعدی کی شرٹ پہ گر رہے تھے۔ دل جیسے بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ وہ سعدی کے لیپ ٹاپ اور دوسرے gadgets والا باکس چھوئے بغیر واپس ہولی۔ کسی بھی چیز کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ اہل درد بھی کس کی دہائی دیتے ہیں
وہ چپ بھی ہو تو زمانہ ہے ہمنوا اس کا

وہ بار۔۔۔ کاؤنٹر کے اونچے اسٹول پہ بیٹھا تھا۔ پیچھے لوگوں کا شور' موسیقی' جلتی بجھتی روشنیاں تھیں۔ وہ باربار کلائی کی گھڑی دیکھتا۔ چہرے پہ فکرمندی بھی تھی اور امید بھی۔

"ہائے شیرو!" وہ اسی پل اس کے ساتھ والے اسٹول پہ آ بیٹھی۔ کلچ کاؤنٹر پہ دھرا اور چہرہ اس کی طرف موڑا۔ اپنے سنہری بالوں کو اونچی (اور چھوٹی) سی پونی میں کسے اور سرخ لپ اسٹک لگائے' شہرین ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"کیسی ہیں آپ؟" ایک دم سے ساری دنیا رنگین ہو گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے لیے آرڈر کرنے لگا۔

"میں ٹھیک ہوں' مگر تم نے سعدی کے بارے میں سنا؟ اوہ گاڈ! مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا۔" وہ سر شاک کے عالم میں نفی میں ہلاتی موبائل پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ نوشیرواں کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ حلق میں کولہ پھنسا۔

"جی۔۔۔ میں نے سنا۔"

"مطلب کہ لاقانونیت کی حد ہوتی ہے۔ پہلے گولی اور پھر اغوا۔۔۔ یہ پکچر دیکھی تم نے؟" اس نے اسکرین پہ وہی پولیس فوٹو گراف نکال کر اس کے سامنے کی۔ "یہ وائرل ہو رہی ہے۔ اس کے یونی ورسٹی کے دوست اس کے لیے Hash Tag Save Saadi ٹرینڈ کو بہت پروموٹ کر رہے ہیں' مجھے بھی اسی سے پتہ چلا۔ تمہیں پتا ہے انہوں نے لیڈز میں اس کے لیے Vigil بھی کیا ہے۔ دیکھو کتنی بری طرح پیٹا گیا ہے اسے۔" وہ فکرمندی اور تاسف سے بولے جارہی تھی اور وہ صبر سے گھونٹ بھرتا گیا۔ مشروب زہر جیسا تلخ تھا۔

"آپ واپس کب جارہی ہیں؟ سونیا کو مس تو کر رہی ہوں گی۔"

"میں اگلے ہفتے چلی جاؤں گی' مگر یقین کرو جب سے میں نے سعدی والی نیوز دیکھی ہے' بہت اپ سیٹ ہوں۔ شکر ہے تم مجھے مل گئے' کم از کم کسی سے ڈسکس تو کر سکتی ہوں۔ اس دن اتنا کچھ بول گئی میں اس کے بارے میں' جو بھی ہے وہ اچھا لڑکا ہے۔" پھر رک کر پوچھا۔ "یہ کہنا چاہیے تھا؟"

"واپس جا کر کیا پلانز ہیں آپ کے؟"

"ایک سوشلائٹ کے کیا پلان ہو سکتے ہیں؟ وہی روٹین لائف۔ ویسے تمہیں کیا لگتا ہے' سعدی کو ان لوگوں نے مار دیا ہو گا؟"

گلاس پہ نوشیرواں کی انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی اور لب بھینچ گئے۔ آنکھوں میں بے پناہ بے زاری اتری۔ "پتا نہیں۔" اور گھونٹ بھرا۔ شہرین ہنوز تاسف سے بولے جارہی تھی۔

وہ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ گرد باد تمنا میں گھومتے ہوئے دن
کہاں پہ جاکے رکیں گے یہ بھاگتے ہوئے دن

دو ہفتے بعد۔۔۔

وہ گرم صبح قیصر کاردار اور ملحقہ انیکسی پہ چمک دار سی طلوع ہوئی تھی۔ زمر نے آئینے کے سامنے کھڑے بالوں میں برش پھیرتے کھڑکی سے باہر دیکھا' تو سبزہ زار پہ ملازموں کی چہل پہل شروع ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ تب ہی باتھ روم کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آیا۔

زمر نے برش رکھ دیا اور پرس اٹھائے باہر نکل گئی۔ فارس نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا اور دوسری کمرے پہ ڈالی' جس کو وہ ہر صبح کی طرح چند منٹوں میں نفاست سے سمیٹ چکی تھی۔ تکیے بیڈ پہ' بیڈ کور برابر۔ ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سر جھٹکا اور الماری کی طرف آیا۔ آج اسے جاب پہ جاتے پانچواں دن تھا۔

یہ پانچ جون تھی اور اکیس مئی کے اذیت ناک دن کو گزرے قریباً" دو ہفتے بیت چکے تھے۔

زمر باہر نکلی تو نیچے صداقت کے کچن سے خوشبو آرہی تھی۔ وہ حنہ کے دروازے پہ رکی' پھر اسے دھکیلا تو اندر کا منظر نمایاں تھا۔ ندرت کا بیڈ خالی تھا اور حنین اپنے بیڈ پہ اکڑوں بیٹھی تھی۔ بال پونی میں بندھے' وہ ڈل اور کمزور لگتی تھی۔ آہٹ پہ چہرہ اٹھایا' آنکھوں میں امید جاگی۔

"بھائی کا کچھ پتا چلا؟"

"او نہوں۔۔۔ لیکن اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتی ہو۔ ہم مل کر سعدی کو ڈھونڈیں گے۔" حنہ کے چہرے کی جوت ماند پڑ گئی' اس نے ٹھوڑی گرا دی۔

"میں کچھ بھی نہیں کر سکتی' میری وجہ سے۔۔۔ اپنے آخری دن بھائی اتنا ناراض ہوا تھا۔ میں آپ کی طرح نہیں ہوں کہ۔۔۔" نظریں جھکائے خفگی سے بولی۔ "اس سے چار سال بات نہ کروں اور پھر ظاہر کروں کہ مجھے اس کی بہت پروا ہے۔"

چوکھٹ میں کھڑی زمر کی آنکھوں میں نمی ابھری۔

"حنین! مجھ سے ایک غلطی ہوئی تھی اور میں اس کے لیے شرمندہ ہوں۔ تم نے سنا؟ آئی۔۔۔ ایم۔۔۔ سوری فار دیٹ!" وہ بولی تو آنکھوں میں شکوہ اور آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ "میں نے چار سال اس سے تعلق نہیں رکھا' میں نے غلط کیا اور مجھے تب یہ احساس ہو گیا تھا جب ابا نے بتایا کہ مجھے گردہ سعدی نے دیا تھا۔ میں اس دن اس کے پاس چلی گئی تھی اور ہمارے درمیان سب ٹھیک ہو گیا تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ چار سال مٹ گئے۔ مجھے مرتے دم تک ان کا افسوس رہے گا۔" اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ حنین نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی کرچیاں سی بکھری تھیں۔

"اگر تم مجھ سے پوچھو تو میرا دل چاہتا ہے کہ ہر اس شخص کو روکوں جو اپنے کسی خونی رشتے دار سے ناراض ہے اور کہوں کہ اس کو کال کرلو' اس سے تعلق جوڑ لو' چاہے اس نے آپ کا کتنا بھی دل کیوں نہ دکھایا ہو۔ میری طرح اتنے سال ضائع نہ کرو' بے کار کی اناؤں میں۔ اگر تعلق نہیں جوڑو گے تو پتا ہے کیا ہو گا؟ آپ کے بچوں میں ان ہی بہن بھائیوں کی شکلیں اور عادتیں نظر آنے لگیں گی جن سے آپ بہت دکھی دل کے ساتھ علیحدہ ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کیوں بناتا ہے آپ کی اولاد میں آپ کے رشتوں کی مشابہت؟ اس لیے ناکہ ہم ان کو نہ بھول سکیں۔ کیونکہ اگر ہم نے جلد صلح نہ کی تو وہ مر جائیں گے' کھو جائیں گے' یا ہم مر جائیں گے' کھو جائیں گے' میں نے غلطی کی تھی اور مجھے اس کے لیے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ مگر تم میری غلطی کیوں دہرا رہی ہو؟" آخری فقرے پہ حنہ نے منہ موڑ لیا۔

"ایک حادثے کے بعد اپنے واحد پیرنٹ کو مزید بیمار دیکھنا' اور ساری دنیا سے کٹ کر کے کمرے میں پڑ جانا' اور جو اپنے تمہارے پاس ہیں' ان کو ہر وقت الزام دیتے رہنا' تمہیں لگتا ہے یہ تمہاری کہانی ہے حنہ؟ نہیں۔ اگر چار سال پیچھے جاؤ تو یہ میری کہانی ہے۔ جب میں اس غلطی کو نہیں دہرا سکتی تو تم کیوں دہرا رہی ہو؟"

حنین نے جواب نہیں دیا۔ منہ موڑے' گیلی آنکھوں سے کھڑکی کو دیکھے گئی۔

"مجھے نہیں پتا تمہیں کون سا کلٹ روز بروز کمزور کرتا جارہا ہے، لیکن میں جس حنین کو جانتی ہوں، وہ ہمارے خاندان کا سب سے جینئس اور بولڈ بچہ تھا۔ اتنی ڈل اور کم اعتماد نہیں تھی وہ۔ تمہیں سعدی سے محبت ہے تو اٹھو اور اس کمرے سے باہر نکلو، اور اس کے لیے کوشش کرو۔ یا کم از کم میری اس کے لیے محبت کو جج کرنا چھوڑ دو۔" اور وہ مڑ گئی تو پیچھے سے حنہ ہلکا سا بولی۔

"مجھے پتا ہے آپ کو بھائی سے بہت محبت ہے، اور ساری بات یہی ہے کہ آپ کو صرف بھائی سے محبت ہے۔" گیلی آنکھوں سے اس نے زمر کی پشت دیکھی۔ "اگر سعدی کی جگہ حنہ کھوتی تو آپ اتنی بھاگ دوڑ کبھی نہ کرتیں۔ میرے اور آپ کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم ایک ٹیم کبھی نہیں ہوسکتے، اس لیے میرے ساتھ بار بار یہ pep talk کرنا چھوڑ دیں۔"

زمر نے گہری سانس لی اور باہر نکل کر دروازہ بند کردیا۔ پیچھے حنین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"وہ میرا بیسٹ فرینڈ تھا پھپھو، آپ کو اندازہ بھی نہیں کہ میں کتنی اکیلی ہوگئی ہوں؟" سر جھکائے، آنسو صاف کرتے وہ خود سے کہہ رہی تھی۔

زمر نیچے لاؤنج میں آئی تو صداقت چائے لارہا تھا۔

"بھابھی ریسٹورنٹ چلی گئیں؟"

"جی باجی۔ ہر روز جلدی چلی جاتی ہیں اور دیر سے آتی ہیں۔ آنٹی جی کو تو چپ ہی لگ گئی ہے۔" زمر نے جوابی تبصرہ نہ کیا اور ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھی، چائے کا کپ اٹھالیا تب ہی وہ سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا۔

"تھانے سے فون آیا ہے۔ بلارہے ہیں۔ کیا آپ چلیں گی؟" والٹ جیب میں رکھتے اس نے پوچھا۔ زمر نے گھونٹ بھرتے ہوئے شانے اچکائے۔

"میں ایک اٹارنی ہوں، ایک نوٹس پہ ان پولیس والوں کو عدالت بلواسکتی ہوں۔ ان کو کام ہے تو وہ ہمارے پاس آئیں۔"

(جلی رسی کا بل۔ خیر) اس نے کوٹ کا بٹن بند کرتے گہری سانس لی۔

"وہ لفٹ والا آدمی۔ نیاز بیگ۔ اسے کل رات گرفتار کرلیا گیا ہے۔ دوپہر میں آپ کو پک کرلوں گا، آپ اس سے ملنا تو چاہیں گی۔" زمر نے چونک کر کپ نیچے کرکے اسے دیکھا۔ وہ اب ریک سے چابی اٹھا رہا تھا۔ وی گلے کی شرٹ پہ گرے کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ (جاب شروع کرلی، مگر کالر والی ڈریس شرٹ یا ٹائی پہننا تو اس کو پسند ہی نہیں ہے جیسے!) بال ذرا بڑھے تو پھر سے چھوٹے کروالیے۔ اپنی جاب کے لحاظ سے مناسب لگ رہا تھا۔ زمر نے نظریں پھیرلیں اور ہلکا سا اثبات میں سر ہلادیا۔

"اوکے۔"

فارس نے بس رک کر ایک نظر اس پہ ڈالی اور پھر بیرونی دروازے کی طرف چلا گیا۔



چلو یہ سیل بلاخیز ہی بنے اپنا
سفینہ اس کا، خدا اس کا، ناخدا اس کا

اسپتال کا کشادہ اور پرتعیش کمرہ اس صبح بھی دمک رہا تھا۔ کاؤچ پہ میری بیٹھی کتاب چہرے کے سامنے کیے ہوئے تھی۔ بستر پر لیٹے سعدی کے بازو آزاد تھے، مگر پاؤں میں ہتھکڑی لگا کر بیڈ کے ساتھ نتھی کردی گئی تھی۔ سر کی طرف سے بیڈ اونچا کر رکھا تھا اور وہ کھلی آنکھوں سے، پہلے سے خاصا بہتر نظر آتا، ارد گرد دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں کاردار صاحب نے میری نگرانی کے لیے ادھر چھوڑا ہے؟" دفعتا" اس نے پکارا۔ مگر میری کتاب پڑھتی رہی۔

"کیا تمہیں معلوم ہے، مجھے گولی کس نے ماری تھی؟"

میری نے صفحہ پلٹایا۔ نگاہیں صفحے پر جمی تھیں۔ وہ پلکیں سکیڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں سب معلوم ہے۔ تم بھی ان کی شریک جرم ہو۔"

خاموشی نے پھر سے اطراف کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دفعتاً" سعدی نے ٹھنڈی سانس لی۔

"تمہارا بچہ کیسا ہے؟ اس کا علاج کیسا جارہا ہے؟" اب کے اس کا انداز دوستانہ تھا۔

میری نے پلک تک نہیں جھپکی۔ اسی طرح پڑھتی رہی۔ سعدی نے نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔ کمرہ بالکل صاف تھا۔ اس کاؤچ اور بیڈ اور ضروری طبی اشیاء کے علاوہ اس کمرے میں کوئی بھی شے نہ رکھی تھی جو اس کے کسی کام آسکتی۔ کوئی کھڑکی تک نہ تھی۔

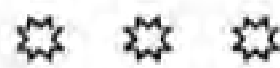
"میرے گھر والے میرے لیے پریشان ہوں گے۔ ان کو صرف اتنا بتادو کہ میں زندہ ہوں۔" بولتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ بہت امید سے میری کو دیکھا۔ مگر اس نے نگاہیں تک نہیں اٹھائیں۔

"مجھے کچھ چاہیے۔" کچھ دیر بعد سعدی نے پکارا۔ میری نے فوراً" چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آدھے آستین کی اسپتال کی شرٹ میں ملبوس، تکیوں کے سہارے نیم دراز" اس کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا؟" اس نے بے تاثر سپاٹ انداز میں دریافت کیا۔

"مجھے قرآن لادو۔ میں اس کو پڑھ لوں گا۔ جیسے تم بور ہو رہی ہو' ویسے ہی میں بھی بور ہو رہا ہوں۔ اتنا تو تم کر سکتی ہو میرے لیے۔"

"اوکے منگوادوں گی۔" اور دوبارہ سے کتاب چہرے کے سامنے کرلی۔ سعدی نے گہرے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔



ہر غلط بات پہ میں آپ کی کہہ دوں لبیک!
اس طرح خون صداقت نہیں کرسکتا میں

تھانے کے اس کمرے میں چوکور میز بچھی تھی۔ فارس اور زمر برابر کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ دائیں ہاتھ اے ایس پی سرمد شاہ تھا۔ سامنے بچھی کرسیوں پہ نیاز بیگ براجمان تھا۔ کندھے کرسی کی ٹیک پہ گرائے، گریبان کے بٹن کھلے تھے' سیاہ مونچھیں اور سیاہ آنکھیں تھیں جن میں زمانے بھر کی بے زاری سموئے وہ زمر کو دیکھ رہا تھا۔

"تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نے سعدی کو گولی ماری ہے۔" زمر نے چبھتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے' ٹھنڈے انداز میں پوچھا تھا۔

منہ میں کچھ چباتے ہوئے اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ہاں۔ اس کا ریسٹورنٹ خریدنے کی بات ہی تو کی تھی۔ آگے سے بولا نہیں بیچنی۔ سارے لوگ شروع میں یہی کہتے ہیں۔ میں نے صرف اصرار کیا۔ دو تین دفعہ جاکر ملا بھی اس سے۔ مگر سالا غصے میں آگیا۔ مجھے گالیاں بکنے لگا۔ سب برداشت ہوتا ہے' بی بی مگر۔" انگلی اٹھا کر سلگتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "گالی برداشت نہیں ہوتی۔ سو وہیں پھڑکا دیا اسے۔ اب جاکر اگلے جہاں میں بیچے اپنی دکان۔" ساتھ ہی استہزائیہ سر جھٹکا۔

"اے۔ زبان سنبھال کر!" وہ ذرا غصے سے آگے کو ہوا تو سرمد شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھمنے کا اشارہ کیا۔ زمر نے محض ایک ناپسندیدہ نظر فارس پہ ڈالی اور دوبارہ نیاز بیگ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اسپتال سے کیوں غائب کیا تم نے اسے؟"

"صاف بات ہے بی بی۔ جب تک لاش نہیں ہوتی' قتل ثابت نہیں ہوتا۔ بس وارڈ بوائے کو ملایا ساتھ' اور لے گئے اسے۔ گاڑی میں ڈالا' اور کوڑے کے ڈھیر پہ پھینک دیا۔ صبح جاکر دیکھا میں نے۔ نام و نشان تک نہ تھا۔ خلاص۔" بے پروائی سے ہاتھ سے اشارہ کرکے بتایا۔ فارس بہت ضبط سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اتنی ہی ٹھنڈی تھی۔

"کون سی گالی دی تھی اس نے؟"

"آہ۔ کیا دہراؤں اب؟" اس نے تلخی سے ہنس کر سر جھٹکا۔ اے ایس پی کے ابرو بھینچے۔

"حد میں رہ کر بات کرو نیاز بیگ۔"

"تو بی بی کو منع کرونا۔ کیوں میرا منہ کھلوانا چاہتی ہے۔"

"میں نے پوچھا۔" زمر اس کی آنکھوں میں دیکھتی آگے ہوئی۔ "کون سی گالی دی تھی اس نے؟"

"دہرا دیتا ہوں، مگر تمہارے بندے کو اچھا نہیں لگے گا۔" استہزائیہ زہریلی مسکراہٹ لبوں پہ بکھیرے اس نے فارس کو دیکھا جو اتنے ہی غصے سے اسے گھور رہا تھا۔ اور پھر اس نے تین چار گالیاں دہرا دیں۔ میز پہ رکھی فارس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"اور کتنی دفعہ دیں اس نے یہ گالیاں؟" زمر کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"چار ایک بار تو دی تھیں۔ تب ہی اسے خلاص کرنا پڑا۔"

"اور یہ سب کہنے کے کتنے پیسے دیے گئے ہیں تمہیں؟" وہ خود کو بولنے سے روک نہیں سکا۔ زمر نے ضبط سے گہری سانس لی۔ (فارس کو برداشت کرنا، نیاز بیگ کو برداشت کرنے سے زیادہ مشکل تھا) نیاز بیگ کے چہرے کے اطمینان اور استہزا میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"نیاز بیگ کسی سے ڈرتا نہیں ہے۔ ڈنکے کی چوٹ پہ بولا ہے سب، کیونکہ ابھی وہ افسر پیدا نہیں ہوا جو چار دن سے زیادہ" انگوٹھا بند کر کے چار انگلیاں دکھائیں۔ "نیاز بیگ کو حوالات میں رکھ سکے۔ اس لیے اپنی وکالت عدالت میں کرو بی بی۔ میرے پہ یہ سکہ نہیں چلنے والا۔" مسلسل منہ میں کچھ چباتے وہ پیچھے ہو کر بیٹھا اور ایک طنزیہ مسکراتی نظر زمر پہ ڈالی۔

"ویسے وہ تمہارا بھتیجا تھا؟ چچ چچ۔ بہت رویا تھا بچہ جب گولی لگی، بالکل لڑکیوں کی طرح۔"

"بس بہت ہو گیا۔" سرمد، فارس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا (اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر نیاز بیگ کا گریبان پکڑ لے) اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ ہتھکڑیاں لگے نیاز بیگ کو اندر لے گئے۔ دروازے میں گم ہونے سے قبل اس نے مسکراتے ہوئے پیچھے زمر کو دیکھتے، منہ سے وہ تنکا تھوک کر پرے پھینکا تھا۔

"اس ساری بکواس کا کیا مطلب تھا؟ یہ شخص۔" اس کے جاتے ہی وہ ایک دم جیسے کھول کر کہنے لگا تھا، مگر اسی پل زمر نے (میز کے نیچے سے) جوتی کی ہیل اس کی پنڈلی پہ زور سے ماری۔ فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سامنے اے ایس پی کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ کے تعاون کا شکریہ۔ اس سے وہ جگہ معلوم کرنے کی کوشش کیجیے جہاں اس نے باڈی پھینکی تھی۔ کوڑا کون اٹھاتا ہے، ٹرک کہاں جاتے ہیں، آپ بس ہمیں باڈی ری کور کر کے دے دیں، اور اس شخص کو اس کی سزا دلوا دیں، اس سے زیادہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔" اس کے انداز پہ وہ خون کے گھونٹ بھر کر خاموش ہو گیا۔ وہ اب پرس اٹھا کر کھڑی ہو رہی تھی۔

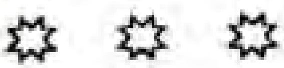
"ہم باڈی ری کور کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ پھر، مجھے بہت افسوس ہے۔" سرمد شاہ سر کو خم دے کر تعزیت کرتے اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی اٹھا۔

"آپ کا بہت شکریہ۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔" وہ مڑی اور ایک تیز نظر فارس پہ ڈالتی باہر نکل آئی۔

گاڑی سامنے ہی کھڑی تھی۔ وہاں جانے تک اس نے بمشکل ضبط کیا تھا، مگر چابی دروازے میں گھساتے ہوئے وہ طیش سے زمر کی طرف گھوما۔

"وہ شخص میرے سامنے۔"

"فارس غازی! وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں، تماشا مت بناؤ۔ گھر جا کر بات کرتے ہیں۔" فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے وہ تلخی سے بولی اور موبائل پہ ایک نمبر ملانے لگی۔ وہ اندر ہی اندر کھولتا، ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا اور زور سے دروازہ بند کیا۔



مجھے لمحہ بھر کی رفاقتوں کے سراب اور ستائیں گے
میری عمر بھر کی جو پیاس تھے، وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے

حنین اور ندرت کے کمرے میں وہی اداسی چھائی ہوئی تھی وہ بیڈ پر گم صم بیٹھی تھی۔ سیم اندر آیا اور دھپ سے بیڈ پر آگرا۔

"حنہ!" بیڈ پر چت لیٹے چھت کو تکتے پکارا۔ حنین گھٹنوں پہ گال رکھے خاموش بیٹھی رہی۔

"یاد ہے حنہ! تھنڈر کیٹس میں بھی ممرا یا اس کا کوئی ساتھی کسی تھنڈر کیٹ کو اغوا کر لیتا یا نقصان پہنچاتا تو آخر میں باقی کیٹس اس کو بچا لیتے تھے اور سب صحیح ہو جاتا تھا۔ کیا ہمارا بھائی بھی واپس آ جائے گا؟"

"ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ ہمارا ممرا کون ہے۔ اور جو اسے ڈھونڈنے کے لیے بظاہر بھاگ دوڑ کر رہے ہیں' ان کو بھی کچھ نہیں پتا۔" وہ خفگی سے بولی۔ "ماموں بھی بدل گئے ہیں۔ پھپھو کی بدل گئی ہیں۔" سیم کہنی کے بل بیٹھا اور چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ "تم بدل گئی ہو!" حنین نے گلہ آمیز نظر اس پہ ڈالی۔
"جاؤ' مجھے پڑھنے دو۔" اور خلاف معمول وہ بنا چوں چرا کیے باہر نکل گیا۔ پھر وہ اٹھی' اور سائیڈ ٹیبل پہ دھری سفید جلد والی کتاب اٹھائی۔ گھٹنوں پہ رکھ کر بے دلی سے صفحے پلٹنے لگی۔

دروازہ کھلا تو تیز روشنی امڈ کر آنکھوں کو چندھیا گئی۔ وہ ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنائے قدم قدم چلتی آگے آئی تو دیکھا' اس کے ارد گرد قدیم دمشق کی ایک روشن دوپہر آباد تھی۔ ہر شے زردی میں لپٹی تھی۔ مگر پہلے کے برعکس' وہ بے دلی سے سر جھکائے' چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کچے راستے پہ آگے بڑھتی گئی۔ دھول جوتوں کو آلودہ کرتی گئی۔ جب چہرہ اٹھایا تو مسجد سے ملحقہ حجرہ سامنے تھا اور ایک طرف درخت تلے وہی ہڈیوں کا سا پنجر آدمی اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی مردنی اور ویرانی ہنوز برقرار تھی۔
آج چھوٹی دیوار کے ساتھ شیخ کھڑے تھے۔ پیروں تک آتا سفید چمک دار لباس پہنے' مسکراتے ہوئے۔ وہ بنا مسکرائے قریب آ رکی۔

"کیا آپ نے اس بیمار کو ابھی تک شفایاب نہیں کیا؟"

"بیمار خود کوشش نہ کرے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ کچے راستے پہ چلنے لگے تو وہ بھی سر جھکائے' بددل سی ساتھ ہولی۔
"تم کیوں اداس ہو؟"

"میرا بھائی کھو گیا ہے' اور میں دن رات اس کے لیے دعا کرتی ہوں۔ مگر میں سوچتی ہوں کہ جو مقدر میں لکھا ہے وہ تو ہو جائے گا' جو نہیں لکھا وہ نہیں ہو گا' پھر بندہ دعا کیوں کرتا ہے؟" دھول سے اٹے راستے پہ وہ دونوں آگے چلتے جا رہے تھے اور وہ سر جھکائے دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔
"وہ بھی ایسا ہی سوچتے ہیں۔" چلتے چلتے شیخ نے ایک طرف اشارہ کیا تو حنہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ سڑک کنارے' بازار میں' ایک قہوہ خانے کے باہر چوکیوں پہ چند لوگ بیٹھے تھے' اور بلند آواز میں بحث کر رہے تھے۔
"جو مقدر میں ہے' وہ ملے گا' جو نہیں مقدر' وہ نہیں ملے گا' سو سوال کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔" ان میں سے ایک کہہ رہا تھا اور باقی سر دھن رہے تھے۔ حنین نے الجھی ہوئی نگاہیں اٹھا کر شیخ کو دیکھا۔ وہ مسکرائے۔
"یہ کہتے ہیں' دعا کرنے یا نہ کرنے کا کیا فائدہ؟ سب کچھ تو لکھا جا چکا۔ مگر یہ ان کی جہالت ہے اور اپنے مسلک میں یہ خود تضاد رکھتے ہیں۔ کیوں کہ اگر ایسا ہے تو پھر ان سے پوچھو' اگر سیرابی تمہارا مقدر ہے' تو پانی پیو یا نہ پیو' پیاس بجھ جائے گی۔ کھیتی مقدر ہے تو دانا ڈالو یا نہ ڈالو' اناج اگ ہی جائے گا۔ تو پھر کھاتے پیتے کیوں ہو؟ دانے بوتے کیوں ہو؟" وہ قدم بڑھاتے گئے اور حنین ان کے ساتھ آگے چلتی گئی۔ قدیم بازار میں لوگوں کی بھیڑ سے شور' آوازیں' قہوے کی مہک' سب خلط ملط ہو رہا تھا۔
"اور ان کو دیکھو۔" ذرا رک کر انہوں نے چتونوں سے ایک کھلے خیمے کی طرف اشارہ کیا جہاں اندر فرشی نشست بچھائے چند لوگ بیٹھے تھے۔ ان کے سروں پہ مخصوص ٹوپیاں تھیں اور وہ آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔

"یہ کہتے ہیں' دعا تو بس عبادت ہے' ثواب کا ذریعہ۔ نیکی اور بدی تو لکھی جا چکی' تو دعا کرنا بس نیکی کی نشانی ہے' اور عذاب پانا' کفر کی علامت ہے۔ نہ نیکی خیر کا سبب ہے۔ نہ عذاب کفر کی وجہ ہے۔ دعا صرف

ثواب کے لیے کرو' ورنہ ہونا وہی ہے، جو تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔ جس نے اس گھڑی مرنا ہے' اب وہ خود کشی کرے' طاعون سے مرے' یا اسے قتل کیا جائے' سب برابر ہے' مگر نہیں۔" شیخ نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ بھی غلط ہیں۔"

"تو پھر صحیح کون ہے؟" وہ پست آواز سے' اور چہرے پہ تکان لیے پوچھنے لگی۔ شیخ دوبارہ چلنے لگے تھے۔ حنہ کے پیر دھول میں اٹے جا رہے تھے۔

"یہ ہیں وہ جو صحیح ہیں۔" انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا تو حنین نے دھوپ کے باعث آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ ایک درخت تلے چادر بچھا کر چند لڑکے قرآن پڑھ رہے تھے۔ ان کا معلم ان کے سامنے چوکی پہ براجمان تھا۔

"یہ کہتے ہیں کہ کوئی کام تب ہوتا ہے' جب اس کے لیے اسباب اختیار کیے جائیں' اور دعا ان اسباب میں سے ایک ہے۔ سیرابی کھانے پینے کے ساتھ ہے' کھیتی' دانہ بونے کے ساتھ ہے' اور جانور کی جان نکلنا ذبح کرنے کے ساتھ ہے۔ اور وہ جو بیمار تم نے دیکھا' وہ یہی بات نہیں سمجھ پا رہا کہ اسباب میں سب سے طاقتور سبب دعا ہے۔"

وہ اب رکے' اور اپنے قدموں پہ واپس جانے لگے۔ تھکی تھکی سی حنہ بھی ساتھ پلٹی۔

"اور جو دعا کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے' وہ؟"

"کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔ فتح کثرت افواج سے نہیں ملتی' آسمانوں سے مدد کی صورت اترا کرتی ہے۔ جو اللہ سے نہیں مانگتا' اللہ اس پہ خفا ہوتا ہے' پس تم دوسروں کے ساتھ جتنی بھلائی کرو گی' اتنا ہی اللہ تمہیں عطا کرے گا۔ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر یونس علیہ السلام' خدا کی تسبیح کرنے والوں میں نہ ہوتے تو اس دن تک کہ جب تک کھڑے کیے جائیں گے' مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتے۔"

"مگر شیخ! جب دعا سب سے طاقتور ہتھیار ہے تو دوسری چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے دعا کی بھائی ٹھیک ہو جائے' وہ ہو گیا۔ میں نے دعا کی' وہ مجھ پہ خفا نہ ہو اور وہ بات بھی سنبھل گئی۔" وہ تپتی دوپہر میں کچے راستے پہ چلتی کہہ رہی تھی۔ "دعا کافی ہے نا پھر تو۔"

"یہ توکل نہیں' کاہلی ہے۔ بے عملی ہے۔ جہالت ہے۔ عقل مند وہ ہے' جو تقدیر کو تقدیر سے توڑے' اور تقدیر کے مقابلے میں تقدیر کو ہی لا کھڑا کرے۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"مطلب یہ ہے لڑکی کہ اسباب بھی قدرت نے دیے ہیں اور پریشانیاں بھی۔ ان کو آپس میں لڑا دو اور آسمانوں سے مدد کی دعا کرو۔ اور سنو۔ قرآن پڑھا کرو۔ اس میں ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔"

مسجد آ گئی تھی اور وہ بیمار ہنوز درخت تلے بیٹھا تھا۔ اکڑوں' سر گھٹنوں پہ رکھے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ لاغر اور مایوس سا وجود۔ اس نے ایک ترحم بھری نگاہ اس پہ ڈالی اور قدم آگے بڑھا دیے۔

"امام کو کیا معلوم میرے مسئلوں کا! ایک سات صدیوں پہلے کے نائیو (سادہ لوح) بوڑھے امام کو کیا معلوم؟"

شیخ وہیں مسجد کے پاس کھڑے رہ گئے۔ اور وہ مدرسۃ الجوزیہ سے' دور' بہت دور' صدیوں کی مسافت طے کرتی چلتی گئی۔



وہ تو زخموں کو نمکدان بنا دیتے ہیں
دل کے زخموں پہ سیاست نہیں کر سکتا میں

دوپہر ہنوز جھلس رہی تھی' جب فارس نے کار انیکسی کے سامنے سبزہ زار پہ روکی اور ایک سلگتی نظر اس پہ ڈالی۔ وہ موبائل کان سے لگائے دوسری طرف جاتی گھنٹی سن رہی تھی۔

"وہ نہیں اٹھائے گا فون۔ چھوڑ دیں اس انوسٹی گیٹو کا پیچھا۔ اب باس نہیں ہیں آپ اس کی۔" زمر نے زور سے فون پرس میں پٹخا۔ پیشانی پہ بل لیے' وہ منہ میں کچھ بڑبڑائی تھی۔

"اس شخص کا منہ توڑنا تھا میں نے' مگر آپ کی وجہ سے چپ رہا اور وہ اے ایس پی۔ وہ سب ایک ساتھ

ملے ہوئے ہیں' کیا ضرورت تھی اس کے سامنے خاموش رہنے کی۔"

"مجھ پہ چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری کوئی ملازمہ نہیں ہوں۔" وہ ناگواری سے اس کی طرف دیکھ کر بولی تھی۔ "میں نے نہیں کہا تھا مجھے تمہاری ضرورت ہے' تم نے کہا تھا کہ ہم ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔ اگر میرے ساتھ کام نہیں کرنا تو جہنم میں جاؤ میری طرف سے۔ میں اپنے بچے کو اکیلے ڈھونڈ لوں گی۔ لیکن اگر میرے ساتھ کام کرنا ہے تو سب میرے طریقے سے ہو گا۔"

"وہ میرے سامنے اتنی بکواس کرتا رہا اور میں سنتا رہا۔ لعنت ہے مجھ پہ۔" اس نے غصے سے اسٹیئرنگ پہ ہاتھ مارا۔ زمر نے بے اختیار کنپٹی کو مسلا۔

"فارس! تم مجھے مزید ٹینشن دینے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔ مجھے بھی پتا ہے کہ کون کس کے ساتھ ملا ہوا ہے' مگر بات یہ اگلے کا گریبان پکڑنے اور دانت توڑنے کے علاوہ بھی بہت طریقے ہوتے ہیں۔ مگر میں بھی کسے بتا رہی ہوں۔" سر جھٹک کر وہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی جہاں سبزہ زار اور ٹیکسی دکھائی دے رہی تھی۔

فارس نے تب کر اسے دیکھا۔ "تو اب کیا ہو گا؟ وہ تو اصل مجرموں کو کور کر گیا ہے۔ کل کلاں ضمانت پہ رہا ہو جائے گا۔ اور وہ اے ایس پی' ایس پی بن جائے گا۔ ایسے ملے گا ہمیں سعدی؟"

"میرا اس اے ایس پی کے ساتھ ایک ورکنگ ریلیشن ہے تم اتنے غصے میں اندھے ہو کر اسے خراب مت کرو' یہ میری درخواست ہے۔"

"مجھے ایک گھنٹہ مل جائے اس نیاز بیگ کے ساتھ' میں دیکھتا ہوں وہ کیسے سب نہیں بکتا۔"

"کیا بتائے وہ؟ اس کو کچھ بھی نہیں پتا۔ اگر پتا ہوتا تو سرمد شاہ اسے ہمارے سامنے نہ لاتا۔ یہ فون کیوں نہیں اٹھا رہا۔" وہ دوبارہ سے موبائل نکال کر نمبر ملانے لگی۔ جھنجلاہٹ اور اکتاہٹ اس کے چہرے پہ بکھری تھی۔ فارس چہرہ اس کی طرف موڑے اسے دیکھنے لگا۔

وہ نمبر ملاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ "مجھے پتا تھا کام بنانے کی بجائے صرف بگاڑو گے۔ تم سے کچھ نہیں ہو گا۔"

وہ تیکھی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ اندر اٹھتا ابال ذرا کم ہوا۔ چہرے کی رنگت نارمل ہونے لگی' پھر اس نے گہری سانس لی۔

"آپ کو کیا چاہیے؟" زمر نے فون کان سے لگاتے ہوئے اکتاہٹ بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"انویسٹی گیٹر کو کیوں کال کر رہی ہیں؟ کیا چاہیے آپ کو؟" اس نے دہرایا۔

"ایسے مت پوچھو' جیسے تم میرا کوئی کام کر سکتے ہو۔" بے زاری سے اس نے فون ہٹایا اور لاک کھولا۔

"ایک آدمی ہراس کر رہا تھا آپ کو' پھر آپ نے مجھے بتایا۔ کیا دوبارہ اس نے کبھی تنگ کیا آپ کو؟" زمر کے دروازہ کھولتے ہاتھ تھمے' چونک کر اس نے فارس کو دیکھا۔

"دو تین دفعہ آپ نے کچھ لوگوں کے بینک اکاؤنٹس اور بیک گراؤنڈ چیک کرنے کے لیے کہا تھا' میں نے وہ کر کے دیا تھا یا نہیں؟" وہ سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے پوچھ رہا تھا۔ زمر کے ابرو مشتبہ انداز میں اکٹھے ہوئے۔

"تب تم قاتل نہیں تھے۔"

"میں نے پوچھا' آپ کو۔ کیا چاہیے؟" ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔ نظریں ابھی تک اس کی آنکھوں پہ تھیں۔

"تم کیا کر سکتے ہو میرے لیے؟ اس نیاز بیگ کا بیک گراؤنڈ چیک کر سکتے ہو؟ اس کا پولیس ریکارڈ' مالی حالات' خاندانی حالات' ڈیلنگز' مجھے ہر چیز چاہیے' وہ بھی جو اس کو خود بھی نہ معلوم ہو۔ اگر میرا انویسٹی گیٹر ہوتا تو کل شام سے پہلے ہر چیز میری ٹیبل پہ ہوتی۔ بولو' تم کر سکتے ہو؟" درشتی سے چبا چبا کر بولتی' ایک ملامتی نظر اس پہ ڈال کر اس نے دروازہ کھولا تو سنا۔

"کل دوپہر سب آپ کی ٹیبل پر ہو گا۔" وہ نکلی تو وہ

زن سے کار آگے لے گیا۔ زمر نے مڑ کر برہمی سے اسے دیکھا۔ "بدتمیز۔" انگلی سے چہرے پہ آئی لٹیں ہٹائیں اور انیکسی کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ تب ہی عقب میں آواز آئی۔

"ہیلو ڈی اے۔" وہ گھومی۔

قدرے جھنجلایا، قدرے جھجکتا سا نوشیرواں وہاں کھڑا تھا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، اسے دیکھا اور پھر مڑ کر ایک خفا نظر عقب میں برآمدے میں کرسی پہ بیٹھی جواہرات پہ ڈالی۔

"اوہ نوشیرواں۔ آپ کو بہت عرصے بعد دیکھا ہے۔" وہ خود کو پرسکون کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں دبئی گیا ہوا تھا۔ کل واپس آیا ہوں۔ ممی نے بولا کہ۔" ایک بےزار نظر پھر دور بیٹھی جواہرات پہ ڈالی جو ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ "آپ سے تعزیت کرلوں۔"

"تعزیت؟" زمر کے دل کو دھکا سا لگا۔ ابرو بھینچ گئے۔

"مطلب وہی۔ سعدی کے لیے۔ مجھے بہت۔ بہت افسوس ہے۔"

"تھینک یو نوشیرواں، مگر وہ زندہ ہے اور ہم اسے ڈھونڈ لیں گے۔" قدرے خشک انداز میں بولی۔ نوشیرواں کی گردن میں کوئی پھندا سا پھنسنے لگا۔

"ہاں شیور کیوں نہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے ویسے۔" جلدی سے بات سنبھالی۔ "مگر یہ کیسے ہوا؟ کس نے کیا؟"

"پولیس ان کو ڈھونڈ رہی ہے، جلد پتا چل جائے گا۔"

"آپ کو کسی پہ شک نہیں؟" اس نے غور سے زمر کا چہرہ دیکھتے پوچھا۔

(ہاشم سامنے ہوتا تو اس سوال پہ اسے ایک تھپڑ تو لگا ہی دیتا۔)

"آپ بتائیں، آپ کو کس پہ شک ہے؟ آپ کا تو وہ فرینڈ تھا۔ اس کے سوشل کانٹیکٹس کو آپ جانتے ہوں گے نا۔"

"نہیں۔ مجھے کیا پتا۔ میں تو کافی دن سے اس سے ملا بھی نہیں تھا۔ ان فیکٹ میں تو اس واقعے سے ایک دن پہلے دبئی چلا گیا تھا۔ مجھے واقعی افسوس ہے کہ میں اس کے پاس اس مشکل وقت میں نہیں تھا۔"

بظاہر لاپروائی سے شانے اچکائے مگر اندر سے اس کا سانس خشک ہو رہا تھا کیونکہ وہ چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"جی مجھے پتا ہے آپ تب دبئی میں تھے، اٹس اوکے۔ ہاشم نے بتایا تھا۔" وہ بات ختم کرکے مڑنے لگی، مگر ایک دم رکی۔ چونک کر اسے دیکھا۔

"سعدی کے واقعے سے ایک دن پہلے، مطلب میری شادی والے دن آپ دبئی گئے ہوئے تھے؟ بیس تاریخ کو؟"

"جی۔ اور سوری بھول گیا۔ شادی کی مبارک ہو آپ کو۔"

زمر نے سر جھٹکا۔ "میں پبلک پراسیکیوٹر نہیں ہوں اب۔" محض اتنا بتا کر وہ پلٹ گئی۔ نوشیرواں نے شانے جھٹکے اور واپس ہولیا۔

لبوں میں سیٹی بجاتا وہ جواہرات کے ساتھ کرسی پہ دھپ سے آگرا تو اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"ڈھنگ سے افسوس کیا یا نہیں؟"

"ہاں، کرلیا۔" اس نے ہاتھ جھلا کر اشارہ کیا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی جواہرات نے رس بھرا گلاس ہونٹوں تک لے جاتے سوچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"شیرو! کیا مسئلہ ہے؟ تم دونوں بھائی مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟"

"اوہ ممی! بس کردیں۔" وہ بےزار ہوا۔ "آپ کو بتائے بغیر کیا چلا گیا، تب سے تفتیش کررہی ہیں۔"

"کوئی تو بات ہے۔ سعدی والے معاملے سے اگر تم لوگوں کا کوئی تعلق ہے تو مجھے ابھی بتادو۔"

"مجھے نہیں پتا یہ سعدی والا معاملہ بھئی! میں تو دبئی

میں تھا، مگر بہت خوشی ہوئی۔ زندگی سے ایک مسئلہ تو کم ہوا۔ اندر جا رہا ہوں، آپ بیٹھیں اتنی گرمی میں باہر۔" منہ کے زاویے بگاڑتا، وہ اٹھا اور بیرونی زینے کی طرف بڑھ گیا۔ (جو اوپر اس کے کمرے کی بالکونی تک جاتا تھا) جواہرات سوچ میں گم اسے جاتے دیکھے گئی۔



تحریر بیچ کر تو کبھی بات بیچ کر
پاتے ہیں رزق صورت حالات بیچ کر

اگلی سہ پہر بھی زیادہ گرم تھی۔ یہ شعبان کے آخری ایام تھے اور شہر بھر میں مصروفیات بڑھ سی گئی تھی۔ ایسے میں اس بلند عمارت کے ٹاپ فلور کے آفسز میں بھی معمول کی چہل پہل جاری تھی۔ ہاشم کاردار کے آفس کے باہر بیٹھی سیکریٹری، لنچ بریک کے دوران، ایک ہاتھ میں سینڈوچ لیے، دوسرے میں میگزین پکڑے، قدرے تعجب سے پڑھتی جا رہی تھی۔ تب ہی انٹرکام بجا تو وہ میگزین پہ سینڈوچ بیگ رکھ کر، فوراً متوجہ ہوئی۔

"جی سر؟ اوکے!" ریسیور رکھ کر اٹھ گئی۔ اس کے سینڈوچ بیگ تلے میگزین کا آدھا صفحہ دکھائی دے رہا تھا۔ شہ سرخی واضح تھی۔

"تہکبس کام کے نوجوان سائنس دان اور تھرکول کے سینئر انجینئر کو لاپتہ ہوئے پندرہواں روز ہو گیا۔" ساتھ میں آدھی ڈھکی تصویر بھی جھلک رہی تھی۔ گھنگھریالے بالوں والا لڑکا مسکراتا ہوا۔ حلیمہ نے آفس کا دروازہ دھکیلا تو منظر سا کھلتا گیا۔ چوڑی میز کے پیچھے ہاشم، بغیر کوٹ کے بیٹھا، فون پہ بات کر رہا تھا، اور سامنے کرسی پہ خاور بیٹھا ایک فائل کے صفحے پلٹ رہا تھا۔

ہاشم نے انگلی سے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا، پھر فون پہ ہنس کر کسی کو الوداعی کلمات کہے، پھر اسے دیکھتا اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "حلیمہ، وہ لیٹرز مجھے ابھی لا دو، میں سائن کر دیتا ہوں۔ پھر مجھے نکلنا ہو گا۔"

"اوکے سر!" وہ چپ ہوئی۔ قدرے تذبذب سے رکی۔ "سر میں نے ابھی میگزین میں دیکھا، آپ کا وہ فرینڈ، سعدی یوسف... وہ مسنگ ہے۔" صفحے پلٹتے خاور نے ایک دم مڑ کر اسے دیکھا اور دوبارہ فون اٹھاتے ہاشم نے بالکل ٹھہر کر پھر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ہاں... وہ تو کافی دن سے مسنگ ہے، ہم سب اس کے دوست اور خاندان والے بہت اپ سیٹ ہیں اس کے لیے۔" ہاشم بولا تو لہجے سے فکرمندی جھلکتی تھی۔

"اوہ آئی ایم سوری سر! ایس می کو وہ آیا ادھر اور کسے پتا تھا کہ اسی رات..." وہ تاسف سے بول رہی تھی اور ہاشم کی گردن میں ڈوب کر ابھرتی گلٹی واضح دکھائی دی۔

(کسے پتا تھا!) خاور چوکنے انداز میں ہاشم کو دیکھ رہا تھا۔ ہاشم ذرا کھنکھارا۔

"حلیمہ! تم نے اس ہفتے بہت دفعہ کال کی تھی اسے، کیا پولیس نے تم سے کچھ پوچھا اس بارے میں؟"

وہ ٹھٹک کر رکی، آنکھیں اچنبھے سے سکڑیں۔

"نہیں سر!"

"دراصل پولیس اس کی گرل فرینڈ کو ڈھونڈ رہی تھی، وہ بھی مسنگ ہے اور تمہاری کالز کی وجہ سے انہوں نے مجھ سے تفتیش کی تھی، مگر میں نے انہیں تسلی کروا دی کہ تمہارا اس سے ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایسا ہی ہے نا؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔ (خاور نے مسکراہٹ چھپانے کو چہرہ نیچے کر لیا۔)

"نہیں سر! میں تو اسے جانتی بھی نہیں۔" وہ ایک دم حیران پریشان نظر آنے لگی۔

"ہاں میں نے بھی انہیں یہ ہی کہا کہ تمہاری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور کالز بھی تم نے نہیں، میں نے کی تھیں آفس سے، وہ مشکوک تھے، ان کو بس کسی لڑکی کا چہرہ چاہیے اس مسنگ گرل فرینڈ کے ساتھ فٹ کرنے کے لیے، مگر تم فکر مت کرو، ہاشم

کاردار کی سیکریٹری کو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ میں سنبھال لوں گا۔" رسان سے اس کی تسلی کرائی۔

"تھینک یو سر!" وہ ذرا پریشان، ذرا ممنون سی واپس پلٹی۔ (اپنے ڈیسک پہ آ کر اس نے کسی کراہیت بھری شے کی طرح وہ میگزین موڑ کر ڈسٹ بن میں پھینکا اور سینڈوچ لے کر واپس کمپیوٹر پہ بیٹھ گئی۔ (اف ساتھ ہی جھرجھری لی۔)

اندر خاور نے ستائشی مسکراہٹ سے سامنے بیٹھے ہاشم کو دیکھا۔

"اب یہ قیامت تک سعدی کا ذکر نہیں کرے گی۔"

اس نے ہلکے سے کندھے اُچکائے۔ "ہاشم سب سنبھال سکتا ہے۔" پھر ذرا آگے کو ہوا۔ "اس شخص کا کچھ پتا چلا جو موقع پہ موجود تھا؟"

"مجھے یہ ایک واہمے سے زیادہ کچھ نہیں لگتا۔ اگر وہاں کوئی انجان شخص ہوتا تو گواہی کے لیے آگے آتا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ بالفرض اگر وہ سعدی کا کوئی جاننے والا تھا تو اس سنسان گلی میں کیا کر رہا تھا؟ یقیناً سعدی نے ہی اسے بلایا ہو گا۔ میں نے اس کا سارا کال ریکارڈ چیک کیا ہے، اس نے ہمارے آفس سے جانے کے بعد کوئی کال نہیں کی۔ سو یہ ممکن نہیں کہ وہاں کوئی ہو۔" مگر ہاشم کی آنکھوں میں تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔

"پولیس کو کس نے بلایا؟"

"ہمسائیوں میں سے کسی نے فون کیا تھا، انہوں نے اس کی چیخیں سنی تھیں۔ پولیس کو معلوم نہیں تھا، مگر میں نے زمر صاحبہ سے پوچھا تھا، وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ سعدی کے محلے کی کوئی خاتون ہیں اور زمر کی ان سے بات ہوئی ہے، انہوں نے بھی کچھ نہیں دیکھا۔"

ہاشم نے گہری سانس لی، پیچھے کو ٹیک لگائی اور سوچتی نظروں سے سامنے دیوار کو دیکھنے لگا۔

"اس کے کال ریکارڈز وہ لوگ بھی نکلوائیں گے۔"

"حلیمہ نے اپنے نمبر سے کوئی کال نہیں کی، آپ کے ڈیسک فون سے کی تھی اور وہ آپ کا دوست تھا، کوئی شک نہیں کرے گا۔"

"اس کے فون سے کچھ نہیں ملا؟"

"انہوں... صفاچٹ... اسے شاید ڈر تھا کہ ہم اس کا فون بگ نہ کر رہے ہوں، اس لیے وہ اس میں کوئی پُرخطر شے نہیں رکھتا تھا۔ بہرحال وہ مکمل طور پہ تباہ کر کے ڈسپوز آف کر دیا ہے۔ کسی کو نہیں ملے گا۔ جیسے وہ خود کسی کو نہیں ملے گا۔"

ہاشم کے چہرے پہ ایک عجیب سا احساس ابھرا۔ اس نے خاور کی طرف دیکھا اور جب بولا تو آواز ہلکی تھی۔

"کیسا ہے وہ؟"

"ری کور کر رہا ہے۔ جلد شفٹ کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ اور..." وہ رکا۔ "وہ پڑھنے کے لیے قرآن مانگ رہا تھا۔"

"دے دو۔" ہاشم نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے قدرے تکان سے کہا۔ خاور کو بے چینی ہوئی۔

"ہمیں اس کو اسپتال میں ہی ختم کر دینا چاہیے تھا۔ اس کو زندہ چھوڑ کر آپ غلطی کر رہے ہیں۔"

"خاور! ہم یہ موضوع ختم کر چکے ہیں۔" خاور سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے ہمیشہ سوچا سر... کہ جب نجومی کہہ دے کہ اس سال میں پیدا ہونے والے لڑکے کو مار دینا بہتر ہے، تو نیل میں تیرتے صندوق کو ڈبو دینے کے بجائے اسے پہلے پہلو اور دل میں جگہ دینے کا غلط فیصلہ انسان سے کون کرواتا ہے؟ مگر کچھ دن سے مجھے لگنے لگا ہے کہ واقعی محبت پہ انسان کا اختیار نہیں ہوتا... خیر..." اس نے گہری سانس لی۔ "مسز کاردار مجھ سے بار بار اشاروں کنایوں میں وہ پوچھ رہی ہیں جو آپ انہیں نہیں بتانا چاہ رہے۔ اس بارے میں غور کیجیے گا۔"

وہ چلا گیا اور ہاشم قلم انگلیوں میں گھماتا، سوچ میں ڈوبا بیٹھا رہا۔



کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں

لیوے نہ کوئی نام، ستم گر کے بغیر!

"فوڈلی ایور آفٹر۔" ریسٹورنٹ کے اندر اس سہ پہر اکا دکا لوگ ہی موجود تھے۔ کونے کی ایک میز پہ زمر کاغذات پھیلائے بیٹھی تھی۔ اس نے زرد پھول دار جوڑا پہن رکھا تھا اور بال آدھے کیچر میں باندھے، سر جھکائے، صفحے الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر کاؤنٹر کے ساتھ کھڑی ندرت کو بھی دیکھ لیتی، جو رجسٹر چیک کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں تلے گہرے حلقے تھے اور چہرہ زرد تھا۔

"بھابھی! ہم اسے بہت جلد ڈھونڈ لیں گے۔" ہلکا سا مسکرا کر زمر نے ان کو پکارا۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھے بنا سر ہلایا۔ زمر کی مسکراہٹ مدھم ہو گئی۔ ندرت اب زیادہ بات نہیں کیا کرتی تھیں۔ زمر روز ادھر ہی ہوتی، مگر آج خلاف معمول حنین بھی ساتھ آئی تھی۔ البتہ اس کے قریب نہیں بیٹھی۔ کچن میں کھڑی رہتی یا کبھی باہر آجاتی۔

"حنہ! کیا تم مجھے سعدی کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ کھول کر دے سکتی ہو؟" زمر نے نرمی سے اسے پکارا۔ وہ کچن کے دروازے پہ کھڑی تھی، اس کی بات پر مڑ کر اسے دیکھا۔

"مجھے نہیں آتے یہ کام۔" اور رخ پھیر لیا۔

"ہم دونوں جانتے ہیں کہ یہ سچ نہیں ہے۔"

"لیپ ٹاپ سے کیا ملے گا؟ کال ریکارڈ سے بھی تو کچھ نہیں ملا۔" وہ خفگی سے اس کی طرف پشت کیے بولی تھی۔ زمر نے گہری سانس لی۔

"کیا تم نے اپنی دوستوں سے پتا کیا؟ کس کے بھائی نے بتائی تھی سعدی کو وہ بات؟"

"ناعمہ کے بھائی نے بتایا ہو گا۔ اب وہ کوئی مانے گی تھوڑی؟"

"اور میں نے تمہیں کہا تھا کہ ڈاکٹر سارہ سے پوچھو، نیکس کام میں حلیمہ نامی سیکریٹری کس کی ہے؟"

زمر کے پاس ان کاموں کی ایک لمبی فہرست تھی جو اس نے حنین کو دی تھی اور جو حنین کر کے نہیں دے رہی تھی، اس بات پر تنگ کر رہی تھی۔

"سارا خالہ ابھی تک گھر میں ہی ہیں؟ واپس آکر پتا کریں گی اس سیکریٹری کا۔ وہ خود اتنی پریشان اور شاکڈ ہیں بھائی کے لیے۔ کہہ رہی تھیں، فیلڈ پہ بھی سب بہت اپ سیٹ ہیں بھائی کی وجہ سے۔ اب بار بار کیا تنگ کروں ان کو؟"

زمر نے نفی میں سر ہلاتے گہری سانس خارج کی اور واپس کاغذات کی طرف متوجہ ہوئی۔ تب ہی سامنے دروازہ کھلا اور کوئی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی میز کے قریب آکھڑا ہوا۔

زمر نے سر اٹھایا۔ احمر سامنے کھڑا تھا۔ تذبذب اور فکر مندی سے اسے دیکھا۔

"میم... السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! بیٹھیے۔" وہ بے نیازی سے کہہ کر کچھ صفحے نکال کر دوسری فائل میں لگانے لگی۔

"آ... وہ... میں نے آپ کو ابھی کال کیا تھا، آپ نے بتایا آپ ادھر ہیں۔" کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھتے اس نے یاد دلایا۔ (چڑیل کا کیا بھروسا۔)

"ہوں... کافی جلدی مل گیا آپ کو ایڈریس۔"

"نو پرابلم... میں پہلے بہت آچکا ہوں ادھر... سعدی کے ساتھ... اوہ... مجھے بہت افسوس ہے اس کے لیے۔" جلدی سے آگے ہو کر وہ تاسف سے کہنے لگا۔ "میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایسا ہو گا۔ اگر میں کچھ کر سکوں اس کے لیے تو پلیز بتایے۔"

"آپ کے خیال میں اس کے ساتھ یہ کس نے کیا ہو گا؟" وہ کاغذات سمیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ..." وہ رکا، ہچکچاہٹ سے کنپٹی کھجائی۔ "کورٹ میں ایک جج ہے، سعدی نے اس جج کو..."

"اسٹاپ!" زمر نے ایک دم ہاتھ اٹھا کر اور آنکھیں نکال کر اسے روکا۔ وہ ٹھہرا اور رنا الجھن سے اسے دیکھا۔

"ہم اس بارے میں بات نہیں کر رہے او کے!" اسے گھور کر بظاہر ٹھنڈے انداز میں کہا۔ وہ ذرا الجھا۔

"مگر آپ میری بات تو سن لیں۔"

"احمر! اگر مجھ سے کورٹ میں پوچھا گیا کہ ہم نے

ایسی کوئی بات کی ہے یا نہیں... تو میں اسٹینڈ پہ جھوٹ نہیں بول سکتی' اس لیے ہم ایسی کوئی بات نہیں کر سکتے... اوکے..." ابرو اٹھا کر سختی سے جتایا۔ احمر کا منہ کھل گیا۔

"آپ جانتی ہیں کہ غازی کیسے رہا ہوا تھا۔"

"اسے جج نے رہا کیا تھا... میں یہ ہی جانتی ہوں۔" کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتے احتیاط سے الفاظ کا چناؤ کیا۔

"جی... بالکل... آف کورس..." احمر نے دم بخود اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر... جسٹس سکندر نے کبھی کوئی... ذکر کیا؟"

"احمر! جسٹس صاحب میرے پاس آئے تھے اور میں نے وہی کہا جو میں نے کہنا تھا۔" ٹھہر ٹھہر کر وہ بولی۔ احمر نے سمجھنے والے انداز میں گردن ہلائی۔ زمر کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر پھر سے تازہ ہو گیا۔ وہ اپنے آفس میں کھڑی تھی اور جسٹس سکندر بدلتے رنگوں والا چہرہ لیے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"یہ پیکٹ مجھے آپ کے بھتیجے نے بھجوایا ہے' اس کو ایک نظر دیکھیے اور بتائیے کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔"

زمر نے سینے پہ بازو لپیٹے اور چبھتی ہوئی آنکھوں سے ان کو دیکھا۔ "یور آنر' میں اس کو نہیں کھولوں گی' مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کیا ہے' اس میں ثبوت اور شواہد ہو سکتے ہیں' جو اس نے اپنے ماموں کے حق میں جمع کر کے بھیجے ہوں آپ کو' اور اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اس لیے آپ اس پیکٹ کو لے جائیے اور بطور جج وہی کیجیے' جو آپ کو بہتر لگتا ہے' کیوں کہ میں یہ کیس آپ سے ڈسکس نہیں کر سکتی' یہ غلط ہے... سو..." ساتھ ہی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ "مجھے چلنا ہو گا۔" اور پرس وغیرہ سمیٹنے لگی۔

"آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ اس میں کیا ہے۔"

"یور آنر' میں نے اس کو نہیں کھولا' اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے اجازت دیجیے۔" اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ ہلکا سا سر جھٹکا تو یاد کا بلبلہ ہوا میں تحلیل ہوا اور وہ واپس ریسٹورنٹ میں آئی۔

"کوئی اور کام جس میں آپ سعدی کے شریک رہے ہوں؟" سنجیدگی سے احمر کو دیکھ کر وہ پوچھنے لگی۔

"مسز شہرین کاردار کا ایک کام تھا۔" وہ تفصیل سے بتانے لگا۔ زمر غور سے سنتی رہی۔ آخر میں بس اتنا بولی۔ "مجھے شہرین کی وہ ویڈیو چاہیے۔ آپ کے پاس ہو گی یقیناً؟"

احمر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "سوری! مگر میں نے ابھی آپ کو بتایا ہے کہ وہ میں ہر جگہ سے مٹا چکا ہوں' میرے پاس وہ نہیں ہے۔"

"مجھے... وہ... ویڈیو چاہیے احمر!" توڑ توڑ کر اس نے الفاظ ادا کیے۔ احمر کے چہرے پہ بے پناہ افسوس بھرا۔

"مطلب آپ مجھے اتنا کوئی گرا ہوا انسان سمجھتی ہیں کہ میں کلب کے ریکارڈ سے مٹا کر اس کو اپنے پاس رکھ لوں گا؟ مجھے آپ کی سوچ پہ افسوس ہے اور..." جذباتی انداز میں وہ بولے جا رہا تھا کہ زمر نے زور سے میز پہ ہاتھ مارا۔ "احمر شفیع!" اور اس کو گھورا۔

"اوکے سوری... میرے کمپیوٹر میں پڑی ہے' کل لا دوں گا۔" اس نے فوراً" ہاتھ اٹھا دیے۔ پھر بے چارگی سے ادھر ادھر دیکھا' ذرا دیر کو ٹھٹکا۔

"ایکسکیوزمی... یہ لڑکی کون ہے؟" زمر نے اس کی نظروں کے تعاقب میں کچن کی سمت دیکھا' جہاں حنین قدرے رخ موڑے کھڑی تھی۔ زمر نے واپس ایک تیز نظر احمر پہ ڈالی۔

"یہ سعدی کی بہن ہے' یعنی کہ فارس کی بھانجی اور اگر فارس یہاں ہوتا تو آپ کی آنکھیں نکال چکا ہوتا اب تک۔" نرمی سے گویا ہوئی تو وہ جو دیکھے جا رہا تھا، ہڑبڑا کر سیدھا ہوا۔

"نہیں... نہیں... سوری... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" کرسی پہ رخ بھی موڑ لیا۔ پھر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں چلتا ہوں... کل ویڈیو لا دوں گا۔" عجلت میں کہتا' شرمندہ سا فوراً" باہر نکل گیا۔ زمر نے دیکھا۔ باہر شیشے کے دروازے کے پار فارس آتا دکھائی دے رہا

تھا۔

احمر نے بھی اسے دیکھ لیا۔ اس کے پاس لمحے بھر کو رکا۔

"تم ادھر؟" فارس نے دھوپ کے باعث آنکھیں چندھیا کر اسے دیکھا۔ آج اس نے بھورا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اندر گول گلے کی سیاہ شرٹ۔ (پھر ویسی ہی شرٹ!) ہاتھ میں کچھ کاغذ پکڑ رکھے تھے۔

"سعدی کا افسوس کرنے آیا تھا' مگر اب سوچ رہا ہوں کہ جو اس دن فیصلہ کیا تھا' چڑیل کو چڑیل نہ کہنے کا وہ واپس لے لوں۔" نہایت جل کر بولا۔

"مطلب؟" اس نے تعجب سے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

"دفع کرو۔" احمر نے سر جھلایا۔ پھر جلدی سے قریب ہوا۔ "پتا ہے کیا' زمر میڈم سب جانتی ہیں کہ کیسے تم باہر آئے' کیسے سعدی نے جج کو بلیک میل کیا اور وہ جج سب سے پہلے ان ہی کے پاس گیا تھا' مگر۔۔۔"

وہ تیز تیز بولے جا رہا تھا۔ فارس نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔

"ایک منٹ' ایک منٹ!" حیرت اور شاک سے اس نے بات کاٹی۔ "اس کو چھوڑو' تم کیسے جانتے ہو یہ سب؟"

جذباتی انداز میں بولتے احمر کو بریک لگی۔ منہ کھل گیا۔ (oops) بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹا۔

"میری امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی' میں چلتا ہوں۔"

"تمہاری امی کے انتقال کو سات سال گزر چکے ہیں۔ سیدھی طرح مجھے پوری بات بتاؤ!"

"وہ۔۔۔ دیکھو۔۔۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔۔۔ آخر لوگ میرے پاس مشورے لینے آتے ہی کیوں ہیں؟" وہ واقعی روہانسا ہوا۔ "میں نے تو صرف ایک مشورہ۔۔۔"

"تم۔۔۔!" وہ انتہائی غصے سے آگے بڑھا۔ "تم نے میرے بھانجے کو بلیک میلر بنا دیا۔" دبی دبی آواز میں غرایا تھا۔

"تو اور کیا کرتا؟ کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ دیکھو مجھے جلدی ہے' ابھی میں جا رہا ہوں' بعد میں بات کرتے ہیں' ہاں۔۔۔" تیز تیز بولتا' پیچھے ہٹتے وہ مڑا اور اپنی کار کی طرف لپکا۔ فارس بمشکل ضبط کر کے اسے جاتے دیکھتا رہا' پھر واپس مڑا تو شیشے کی دیوار کے پار' ریسٹورنٹ کے اندر وہ بیٹھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے پہ سر جھکا کر کاغذ الٹ پلٹ کرنے لگی۔

"اس کو تو بعد میں پوچھوں گا۔" ایک خشمگیں نگاہ دور جاتے اسٹیپنی پہ ڈال کر وہ (گہری سانس لے کر) اندر آیا۔ زمر سر جھکائے کاغذ دیکھ رہی تھی' جب ان کاغذوں پہ اس نے ایک فولڈر رکھا۔ زمر نے سر اٹھایا۔ وہ سنجیدہ سا سامنے کھڑا تھا۔

"آپ کے انویسٹی گیٹر نے جواب نہیں دیا؟" زمر نے اس کا طنز نظر انداز کر کے فولڈر کھولا۔ آہستہ آہستہ کاغذات پہ نظر دوڑاتی گئی۔ ابرو اٹھے' لب سکڑے۔

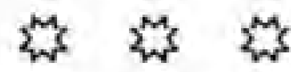
"نیاز بیگ دو دفعہ جیل جا چکا ہے' صرف ایک بار تین سال کی سزا کاٹی تھی۔ مبینہ طور پہ دو قتل کر چکا ہے' اور دونوں دفعہ الزام سے بچ گیا تھا۔ چار بچے ہیں' ایک بیوی' جو سیٹلائٹ ٹاؤن میں اس کے گھر میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک۔۔۔" وہ رکا۔ "ایک عورت سے اس کا تعلق ہے امینہ امتیاز نام ہے اس کا' اس کو فلیٹ لے کر دیا ہوا ہے اور ایک این جی او میں اچھی نوکری دلوا رکھی ہے۔ باقی سب اس فولڈر میں ہے۔"

زمر صفحے پلٹتی گئی۔ (اور چہرے پہ متاثر کن تاثرات نہ آنے دینے کی کوشش کرتے خود کو سپاٹ رکھا) پھر نگاہیں اٹھائیں۔

"مجھے اس امینہ امتیاز کی ایک ایک تفصیل چاہیے۔ یہ کہاں رہتی ہے' کیا روٹین ہے اس کی۔۔۔ کب۔۔۔" الفاظ لبوں میں رہ گئے۔ فارس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے چند تہہ شدہ کاغذ نکال کر اس کے سامنے رکھے۔

"اور کچھ؟" وہ سنجیدہ تھا۔ سپاٹ سا۔

"نہیں....." وہ بے نیازی سے کاغذوں کی تہیں کھولتی قدرے رخ موڑ گئی۔ وہ بھی نہیں رکا۔ ندرت کو بس سلام کیا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی زمر کے چہرے کی لاتعلقی ہوا ہونے لگی اور وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ تیز تیز ان کاغذات کو پڑھنے لگی۔



ہم سے نہ پوچھو ہجر کے قصے

اسپتال کا وہ کمرہ ساری دنیا سے الگ تھلگ اور کٹا ہوا لگتا تھا۔ سعدی بیڈ سے ٹیک لگائے پاؤں لمبے کیے بیٹھا تھا اور دو تین افراد اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک جھک کر اس کی ٹانگ کے زخم کی ڈریسنگ تبدیل کر رہا تھا۔ خود وہ بس سینے پہ بازو لپیٹے' خاموشی سے ان کو یہ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ شروع میں اس نے ان میل نرسز سے ہم کلام ہونے کی بہتیری کوشش کی تھی' مگر وہ نہ سنتے تھے' نہ جواب دیتے تھے' سو اب توانائی ضائع کرنا بے کار تھا۔ سوائے اس ڈاکٹر کے۔ آج وہ بال پونی میں باندھے' اس کے سر پہ کھڑی گردن جھکا کر پٹی بدلنے کے عمل کو دیکھ رہی تھی۔ کام مکمل کر کے وہ لوگ اسی خاموشی سے چلے گئے جس سے آئے تھے۔ البتہ وہ چند لمحے کے لیے کھڑی رہی۔

"کیا تمہیں اس پیر کی ہتھکڑی سے تکلیف تو نہیں ہو رہی؟" ڈرتے ڈرتے میری کو نظرانداز کرتے اس نے پوچھا۔ میری ایک دم ناگواری سے اٹھی۔

"نہیں۔" سعدی نے رخ پھیر لیا۔ لڑکی نے بے بسی بھری ہمدردی سے اسے دیکھا۔

"تمہارا کام ختم ہو گیا ہے مایا' اب تم جاؤ۔" میری نے اس کو گھورا۔ مایا سر جھکائے "اوکے" کہتی دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولتے ہوئے مڑ کر ایک بے بس' دکھی نظر اس پہ ڈالی اور پھر باہر نکل گئی۔ میری صوفے پہ بیٹھ گئی۔ سعدی اب اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ ڈھیلا پڑ چکا تھا یا شاید اس قید سے نکلنے کا راستہ کوئی نہ تھا۔

اس نے سائیڈ ٹیبل سے اپنا قرآن اٹھا لیا اور خاموشی سے صفحے پلٹنے لگا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کل تلاوت کہاں سے چھوڑی تھی۔ پھر یاد کرنے کی کوشش کیے بغیر اس نے اپنی پسندیدہ سورت کھولی۔ چیونٹیوں کی سورۃ۔ پیامبروں کی سورت۔

"مجھے اپنا قرآن پین بھی چاہیے۔" صفحے سے نگاہ اٹھائے بغیر اطلاع دی۔ جواب بھی اسی سرد انداز میں میری کی طرف سے آیا تھا۔

"تمہیں کسی بھی قسم کا gadget نہیں مل سکتا' سوری۔"

سعدی نے مزید کچھ نہیں کہا۔ اعوذ باللہ پڑھا اور صفحے پہ دھیان دیا' جہاں سفید کاغذ کے اوپر سیاہ الفاظ جگمگا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ان الفاظ پہ جم گئیں۔ کمرے میں چھایا ڈپریشن' تناؤ اور افسردگی ہر شے اس جگمگاہٹ کے پس منظر میں جانے لگی۔ آیت اس سے کہہ رہی تھی۔

"مگر جس کسی نے بھی ظلم کیا' پھر برائی کے بعد اسے نیکی سے بدل دیا ہو تو بے شک میں (اللہ) غفور اور رحیم ہوں۔"

چند لمحے کے لیے اس کا رابطہ کمرے کے دوسرے حصوں سے کٹ گیا۔ بیڈ کے گرد سیاہ جگمگاہٹ کا ایک ہالہ سا کھنچ گیا جس میں وہ سر جھکائے بیٹھا' ہاتھ میں پکڑی کتاب پڑھ رہا تھا۔

"اللہ تعالیٰ!" وہ مدھم آواز میں بڑبڑایا تو سیاہ ہیروں سی جگمگاہٹ دل کے اندر اترتی ہر آگ کو ٹھنڈا کرنے لگی۔ "مجھے یہ آیت یاد ہے۔ جہاں بچپن میں' میں قرآن پڑھنے جاتا تھا' وہاں میری ٹیچر نے یہ آیات بہت اچھے سے پڑھائی تھیں۔ وہ کہتی تھیں' عربی بہت گاڑھی زبان ہے' اس میں ہر لفظ کا بہت وسیع مطلب ہوتا ہے۔ قرآن تب سمجھ آئے گا جب اس کے ہر لفظ کے مطلب کو سمجھو گے۔ جیسے اللہ دیکھیں نا' آپ نے کہا' جو کوئی ظلم کرے' تو ظلم کا مطلب کیا ہے؟ اس سارے ذہنی تناؤ میں بھی مجھے یاد ہے۔ ظلم کا مطلب ہے' کسی کے حق میں کمی کرنا۔ تو آپ مجھے یہ سمجھا رہے ہیں اللہ کہ ہم زندگی میں جب بھی کسی کے حق

میں کمی کریں تو احساس ہوتے یہ صرف سوری کر دینے کی بجائے برائی کو اس دکھ اور تکلیف کو ہمیں اچھائی اور محبت سے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان سارے دنوں میں مجھے لگنے لگا تھا کہ میں اس قید میں اس لیے پڑا ہوں کیوں کہ میں نے زمر کا دل دکھایا تھا' وہ بیمار تھیں' انہوں نے کیا نہیں کیا میرے لیے' کیا تھا اگر میں فارس ماموں کی مسلسل حمایت کرنے کے بجائے دکھاوے کو ہی سہی ان کی بات پہ یقین کر لینے کی اداکاری کر لیتا' مگر میں نے ان کا حق ادا نہیں کیا۔ اگر چار سال انہوں نے تعلق نہیں رکھا تو میں بھی ان کی موجودگی میں ان کے گھر نہیں جاتا تھا' میں نے بھی کال کرنی چھوڑ دی۔ آخر میں پہل تو پھر بھی انہوں نے کی۔ وہ سونیا کی سالگرہ کا کارڈ لے کر آئیں۔ میں تو نہیں گیا نا' مگر اب آپ مجھے بتا رہے ہیں کہ اگر میں نے اس ظلم کو اچھائی سے بدلنے کی کوشش کی ہے تو پھر آپ غفور بھی ہیں اور رحیم بھی۔ اتنا تو مجھے پتا ہے کہ پیچھے گھر میں مجھے کوئی بھی برا نہیں سمجھتا ہوگا۔ میری مداوے کی کوششوں نے میری سب کمی کوتاہی ڈھانپ لی ہوگی۔"

وہ سر جھکائے بڑبڑاتے ہوئے چونکا۔

"اوہ!" جیسے کچھ سمجھ آیا۔ "اسی لیے آپ نے کہا کہ آپ غفور اور رحیم ہیں۔ غفور کہتے ہیں ڈھانپنے والے کو' جو گناہوں کو ڈھانپ کر ان کو مٹا دے' معاف کر دے اور رحیم۔۔۔" اس نے آنکھیں میچ کر یاد کرنا چاہا۔ کندھا پھر سے درد کرنے لگا تھا۔ "بار بار رحم کرنے والا' لوگوں کی غلطیاں' گناہ سب بار بار معاف کر کے پھر سے ان کو موقع دینے والا۔"

سیاہ حروف کی جگمگاہٹ اس کے گرد کسی اونچے دائرے کی طرح رقصاں تھی۔ باقی سب کچھ چھپ گیا تھا۔ بدقت اس نے اگلے الفاظ پڑھنے چاہے۔

"اور اپنا ہاتھ ڈال لیجیے اپنے گریبان میں (اے موسیٰ) وہ نکلے گا سفید چمکدار' بغیر کسی عیب کے (یعنی کسی بیماری کی وجہ سے نہیں' معجزاتی طور پہ) یہ نو نشانیاں ہیں' ان کو لے جایے فرعون اور اس کی قوم کی طرف۔ بے شک وہ لوگ ہیں جو حد سے بڑھ جانے والے ہیں۔"

"آہ اللہ!" سر جھکائے بیٹھے لڑکے نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ "میں نے بھی یہ ہی کرنا چاہا تھا' مگر مجھے بھول گیا تھا کہ موسیٰ تنہا نہیں گئے تھے۔ وہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر گئے تھے۔ میں نے زندگی کی دوسری بڑی غلطی کی زمر اور حنین سے جھوٹ بول کر کہ میں نیس کام جا رہا ہوں۔ اب ان کو کون بتائے گا کہ میں کہاں ہوں اور پہلی غلطی۔" اس کی بند آنکھوں کے آگے ایک منظر لہرایا۔ "گولی لگنے سے چند منٹ پہلے۔۔۔ میں نے وہ پین کیمرہ ایک غلط شخص کے ہاتھ میں دے دیا۔۔۔ اوہ اللہ!"

پھر اس نے ذہن سے ساری یادوں کو جھٹک کر آنکھیں کھولیں اور اگلی آیت پہ انگلی رکھی۔

"پھر جب ان کے پاس آنکھیں کھول دینے والی ہماری نشانیاں آگئیں تو وہ کہنے لگے' یہ تو کھلم کھلا جادو ہے۔" ایک ایک لفظ اس نے ٹھہر کر اندر اتارا۔ دل و دماغ میں عجیب قنوطیت اور اذیت بھر گئی۔

"اللہ! آپ کو تو پتا تھا کہ وہ اس کو نہیں مانیں گے' ہدایت کی کوئی بات ان کے دل کو موم نہیں کر سکے گی۔ پھر آدمی کیوں جا کر کسی منکر' ظالم کو للکارے؟ وہ اپنا عمل کریں اور ہم چپ چاپ اپنی نماز' روزہ کرتے رہیں۔ میں بھی کوئی ان کا دل موم کرنے نہیں گیا تھا' مگر یوں ہی ایک انہونی سی آرزو تھی کہ شاید وہ مداوے کے لیے کچھ کریں۔ کچھ کرنا چاہیں' مگر فائدہ کیا ہوا؟" سیاہ جگمگاہٹ کو مایوسی کا اندھیرا نگلنے لگا اور جیسے۔۔۔ جیسے آس پاس سیاہ دھوئیں کے مرغولے اٹھنے لگے۔۔۔ اس کا دل پھر سے زخم زخم ہونے لگا۔

"اور انہوں نے ان کا انکار کیا' ظلم اور تکبر کے ساتھ' حالانکہ ان کے دل یقین کر چکے تھے۔"

وہ پڑھتے پڑھتے چونکا۔ سیاہ دھواں پھیلنا ٹھہر گیا۔ ساری فضا ساکن ہو گئی۔

"حالانکہ ان کے دل یقین کر چکے تھے۔"

"پھر دیکھو!

کیا انجام ہو فساد برپا کرنے والوں کا!"
دھواں چھٹ گیا۔ سیاہ حروف کی جگہ گاہٹ پھرسے اردگرد پھیل گئی۔ اداس بیٹھے سر جھکائے لڑکے کے چہرے پہ تکان بھری مسکراہٹ آٹھہری۔ اس نے گہری سانس خارج کی۔ ہونٹوں سے اسی کتاب کی ایک اور آیت ادا ہوئی۔
"اور جو اللہ پہ بھروسا کرتے ہیں' اللہ ان کے لیے ضرور راستہ نکالتا ہے۔"
مقدس کتاب بند کی' ادب سے چوما اور سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دی۔ پھر اداسی سے مسکراتے واپس ٹیک لگالی۔
میری ہنوز بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ سعدی خاموشی سے مسکراتا' چھت کو تکتا رہا۔
"اور تم ہاشم کاردار' دیکھنا ہمیں کہ ہم کیسے بحراحمر کو دو حصوں میں کاٹتے ہیں اور پھر تمہیں اسی میں ڈبوتے ہیں' تم دیکھنا۔"



غم کی حدت سے کوہسار پگھلتے دیکھے
انسان تو پھر انسان ہوا کرتے ہیں

قصر کاردار سے بڑے انیکسی میں ان دنوں سمجھوتے کی سی فضا چھائی تھی۔ رمضان شروع ہوچکا تھا اور پہلے چند روزے کب گزرے' پتا ہی نہیں چلا۔ عجیب سی روٹین بنی ہوئی تھی۔ افطاری کے بعد سحری تک کوئی نہ سوتا۔ پھر سحری کرکے سیم اور حنین دوپہر تک سوتے۔ ندرت کا وہی طریقہ تھا۔ رمضان کے باوجود جلدی ریسٹورنٹ چلی جاتیں۔ زمر بھی گھر پہ ٹکتی اور فارس جاب پہ ہوتا۔ بڑے ابا خالی بڑے لاؤنج میں سارا دن صداقت کے ساتھ بے مقصد بیٹھے رہتے۔
صداقت بولتا رہتا' یا سیم اٹھ جاتا تو وہی بولتا یا وہ دونوں ٹی وی دیکھتے رہتے اور دونوں کو لگتا کہ وہ موسیقی سے بھرپور دکان رمضان ٹرانسمیشن میں لوگوں کی طرف بھکاریوں کی طرح تحفے اچھالتے دیکھ کر ثواب کما رہے ہیں۔ ابا سیم سے اتنا بھی نہ کہتے کہ رمضان عبادت کا مہینہ ہے' ٹی وی کے سامنے بیٹھنے سے اسے ضائع نہ کرو کہ انہیں ڈر تھا' اگر وہ بھی لاؤنج میں آکر نہ بیٹھے گا تو یہ تنہائی شاید مار ہی دے۔ حنین پہلے بھی سست تھی' اب تو ہر کام سے گئی۔ کمرے میں بند رہتی یا باہر لان میں بیٹھی گردن اٹھائے قصر کو دیکھتی رہتی۔
ایسی ہی ایک رات زمر اور فارس کے کمرے میں مدھم زرد بتی جل رہی تھی۔ بجلی گئی تھی۔ یو پی ایس پہ پنکھا چل رہا تھا' کمرا ے سی کی ٹھنڈ باقی تھی۔ فارس صوفے پہ پاؤں لمبے کیے لیٹا' سینے پہ لیپ ٹاپ رکھے کچھ کام کررہا تھا۔ (وہ ایک کارپوریٹ فرم میں بطور چیف سیکورٹی آفیسر تعینات تھا۔) سامنے جائے نماز پہ زمر التحیات میں بیٹھی تھی۔ سر پہ دوپٹا اچھے سے لپیٹے اس کا چہرہ جھکا تھا۔ فارس کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ تراویح ختم کرکے اب وتر کا سلام پھیر رہی تھی۔ پھر جائے نماز سمیٹتی اٹھ گئی۔
"آپ کی نماز کافی خوب صورت ہے۔ سلو اور آرام سے... میں بھی پڑھتا تھا جیل میں... مطلب اتنی اچھی نہیں۔ آس پاس کی ساری آوازیں سنائی دیتیں اور سارے دن کے کام یاد آتے۔" اسکرین کو دیکھتا وہ بولا تو وہ جو پشت کیے کھڑی جائے نماز تہ کررہی تھی' رک گئی' مگر مڑی نہیں۔ "اور آپ کی طرح پانچ وقت کی نہیں پڑھتا تھا۔ کچھ دن پڑھی' پھر چھوڑ دی... اور... ایک بات' دعا نہیں مانگا کرتا تھا' مگر سچ تو یہ ہے دعا کے بغیر نماز ادھوری ہے۔"
وہ ہلکا سا مڑی' چبھتی نظر اس پہ ڈالی۔ "میں دعا مانگوں یا نہیں' یہ میرا اور میرے اللہ کا معاملہ ہے۔"
"میں نے تو کچھ نہیں کہا۔" وہ شانے اچکا کر اسکرین کی طرف متوجہ ٹائپ کرتا رہا۔
زمر جائے نماز رکھ کر اسٹڈی ٹیبل پہ آبیٹھی۔ (اس کی طرف اب بھی پشت تھی) انگلی سے چہرے کے گرد اڑسا دوپٹا کھولا۔ فائل سامنے کی۔ قلم اٹھایا۔ الفاظ پہ نگاہ پڑی تو ہر چیز مدھم ہونے لگی۔ اپنی زندگی کسی فلم کی طرح نظروں کے سامنے گھوم گئی۔
"اللہ تعالیٰ۔" اس نے بنا آواز لب ہلائے۔

آنکھوں میں اضطراب در آیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ میں پہلے جیسی دعا نہیں کرتی۔ آپ سے بات بھی نہیں کرتی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی کہ آپ سے ناراض ہوں' نعوذ باللہ! بس میرا دل سخت ہو گیا ہے۔ مجھے لگتا تھا میرے پاس اب کھونے کو کچھ نہیں بچا' مگر میں غلط تھی۔ جب تک انسان کی سانس ہے' اس کے پاس کھونے کو کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ میرے پاس بھی تھا۔ سعدی۔۔۔ اور اب وہ نہیں ہے۔۔۔ ابا اور باقی سب ہیں' میں ان کو کھونا نہیں چاہتی۔ آپ اس کا خیال رکھیے گا۔ آپ اس کو اکیلا نہ چھوڑیے گا۔" اس نے آنکھیں بند کیں تو دو آنسو ٹوٹ کر چہرے پہ گرے۔ پھر بھیگی پلکیں کھولیں۔

"فارس!" اس کی آواز بھی رندھی ہوئی تھی۔ اس نے چونک کر سر گھمایا۔ پھر لیپ ٹاپ ہٹا کر اٹھا اور قدرے تشویش سے اس کی پشت کو دیکھا۔

"کیا ہوا؟"

"وہ آج نیاز بیگ کی ضمانت ہو گئی۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ ہلکا سا بولا' نگاہیں اس کے سر کی پشت پہ تھیں' جس سے دوپٹا پھسل گیا تھا اور بھورے گھنگھریالے بال جھلک رہے تھے۔

"اس نے جج کے سامنے کہا کہ اس نے یہ قتل سیلف ڈیفنس میں کیا تھا۔ اس نے کہا کہ سعدی اس کو مارنے لگا تھا۔ اس نے۔۔۔" ایک اور آنسو آنکھ کے کنارے سے ہٹا۔ "اس نے ہمارے فجر پہ اٹھ کر مسجد کی امامت کروانے والے سعدی کے بارے میں کہا وہ اس سے ڈرگز خریدتا تھا اور یہ جھگڑا ڈرگز پہ ہوا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اس کے چہرے پہ ایک زخمی تاثر آٹھہرا۔ "قتل سے نکلنے کا سب سے اچھا طریقہ مقتول کی اتنی کردار کشی کرنا ہے کہ جج کو لگے' اسے مار کر قاتل نے دنیا پہ احسان کیا ہے۔ آپ نے ہی بتایا تھا کرمنل لاء کی کلاس میں۔"

زمر نے آنکھ انگلی کی نوک سے پونچھی اور پلٹی تو اس کی آنکھیں اور ناک گلابی ہو رہی تھیں۔ (اور ناک کی لونگ۔۔۔ اس نے نگاہ چرائی)

"تم نے کہا تم میرا ساتھ دینا چاہتے ہو۔ میں کیسے یقین کروں کہ تم میرے ساتھ پھر سے کوئی دھوکا نہیں کرو گے۔"

"زمر!" اس نے گہری سانس لی اور اسی سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ "میں وہ نہیں ہوں جس کو اس نے اپنا گردہ دیا تھا' نہ میں وہ ہوں جو اس کی یونیورسٹی کی فیس دیتا تھا' مجھے پتا ہے اس بارے میں' مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اس سے آپ سے کم محبت تھی۔"

وہ چونکی تھی' آنکھوں میں شاک ابھرا۔

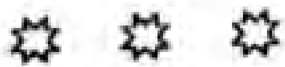
"مجھے پتا ہے اور یہ نہیں بتاؤں گا کہ کیسے پتا ہے' مگر یہ یاد رکھیے کہ وہ میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح تھا۔ اس نے میرے لیے بہت کچھ کیا اور میں اسے کبھی نہیں بتا سکا کہ اس سے کتنی محبت تھی مجھے۔ آپ کو میں اپنے ساتھ مخلص نہیں لگتا' خیر ہے' مگر اس کے ساتھ کتنا مخلص ہوں' یہ آپ کو پتا ہے۔"

زمر نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا۔ لب کھولے' پھر بند کر دیے۔ (وہ نہیں بتائے گا' تو وہ کیوں منت کرے؟ ضرور ابا نے بتایا ہوگا)

"پھر۔۔۔ کیا چاہتی ہیں آپ؟ میں کیا کروں؟" اب کے ذرا نرمی سے پوچھا۔

زمر نے گہری سانس لی۔ (یا اللہ مجھے اتنا صبر دینا کہ میں اپنا ضبط کھوئے بغیر اس شخص کے ساتھ کام کر سکوں' جس سے مجھے شدید نفرت ہے)

"کیا تم نے شہزاد ملک کے بارے میں سنا ہے؟" اس نے فارس کو مخاطب کیا تو آواز متوازن تھی اور بے تاثر۔



اور جب وہ دونوں آئندہ کا لائحہ عمل طے کر رہے تھے تو ساتھ والے کمرے میں ندرت بیڈ پہ تھکی ہاری سو رہی تھیں اور حنین لیٹی ہوئی ان کے فون پہ سعدی کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پہ کٹے بال اب آنکھوں تک آتے تھے۔ باقی تکیے پہ کھلے پڑے

تھے۔ وہ پہلے سے پژمردہ اور کمزور لگتی تھی۔

اسکرین پہ انگلیاں پھیرتے یک دم غلطی سے وائی فائی کو چھو لیا۔ شاید سیم نے اس فون سے زمر کے کمرے میں رکھا وائی فائی پہلے استعمال کیا تھا کہ پاس ورڈ پوچھے بنا وہ آن ہو گیا۔ امی نے یہ اسمارٹ فون چھ ماہ پہلے لیا تھا وائبر کے لیے۔ حنہ تو اسے ہاتھ بھی نہ لگاتی، مگر اب لگا رہی تھی۔ وائبر پہ امریکا سے کسی کزن کا میسج آیا ہوا تھا۔ اس نے کھولا اور پھر وائی فائی بند کرنے لگی، یکایک ٹھہر گئی۔

"امی نے واٹس ایپ نہیں ڈاؤن لوڈ کیا۔" اندھیرے کمرے میں ایک نظر کروٹ لیے سوئی ندرت پہ ڈال کر سوچا۔ "ڈاؤن لوڈ کرنے میں کیا حرج ہے؟ بھائی کی ڈی پی دیکھ لوں گی۔" اس نے پلے اسٹور آن کیا۔ واٹس ایپ ڈاؤن لوڈ کیا اور پھر فہرست دیکھی۔ اس کے اسٹیٹس میں لکھا تھا۔ Everafter Ants وہ اداسی سے مسکرائی۔ بھائی کا کی چین بھی بھائی کے ساتھ کھو گیا تھا۔ اس نے سعدی کا چوکھٹا کھولا۔

Last Seen 22 May

حنہ چونکی... بھائی کا حادثہ اکیس مئی کو ہوا۔ مگر اگلے دن بھی کسی کے پاس اس کا فون تھا؟ وہ سوچنے لگی۔ پھر ایک خیال نے ذہن کی رو بھٹکائی۔ اس نے سیاہ سنہرے جگمگاتے ہندسے یاد کیے اور موبائل میں لکھے اور ہاشم کاردار کے نام سے محفوظ کیے، پھر کانٹیکٹس کی فہرست دیکھی۔ (پتا نہیں ہاشم بھائی واٹس ایپ پہ ہیں یا نہیں؟)

دفعتاً "فہرست اوپر کرتا انگوٹھا رکا" آنکھوں میں کچھ چمکا۔ ہاشم کردار، ساتھ میں اپنی اور سونی کی سیلفی۔ وہ ہلکا مسکرائی۔ کھڑکی کو دیکھا جس کے پار اور قصر تھا۔ اس نے انگوٹھے سے ہاشم کا نام دبایا۔ پیغام بھیجنے کا صفحہ کھلا۔ اوپر "آن لائن" جگمگا رہا تھا۔

"مجھے موبائل رکھ دینا چاہیے، یہ چیزیں میرے لیے نہیں ہیں، ان کے نتائج برے نکلتے ہیں" اس نے خود کو کہا، مگر سنا ہی نہیں اور بائیں ہاتھ میں موبائل پکڑے کروٹ کے بل لیٹے دائیں ہاتھ کی انگلی سے ٹائپ کرنے لگی۔

"ہاشم بھائی؟"

"کون؟" چند لمحے بعد جواب چمکا۔ ہلکی سی تھرتھراہٹ ہوئی۔ حنہ نے فوراً "امی کو دیکھا۔ وہ سو رہی تھیں اور موبائل سائلنٹ کر دیا۔

"حنہ... یہ امی کا فون ہے۔"

"حنین! ہماری پڑوسن حنین!" وہ اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھا، لیپ ٹاپ اور فائلز کھولے ہوئے کام کر رہا تھا۔ جب موبائل بجا، سو وہ اس طرف متوجہ ہوا۔ پیغام بھیج کر موبائل رکھا اور پھر سے ٹائپ کرنے لگا۔

"شکر ہے آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ کون حنین؟"

"کیسی ہو تم؟ تم لوگ آتے ہی نہیں ہو اس طرف۔"

"رمضان کی وجہ سے روٹین بدل گئی ہے۔ افطاری سے پہلے شدید پیاس سے نڈھال، افطاری کے بعد بہت کھا کر نڈھال۔" اتنے عرصے بعد ٹائپ کرنے کے باعث حنین کی رفتار سست تھی۔

"یہ تو ہے اور سعدی کا کچھ پتا چلا؟"

تنہائی میں ڈوبا کمرہ اداس ہو گیا۔ موبائل کی روشنی سے چمکتا حنہ کا چہرہ بجھ گیا۔

"نہیں۔" ذرا ٹھہر کر میسج کیا۔ "او کے۔ آپ سو جائیں۔ میں نے یوں ہی آپ کو آن لائن دیکھ کر ٹیکسٹ کر دیا تھا۔" وہ برے دل کے ساتھ فون رکھنے لگی۔

"نہیں... میں جاگا ہوا ہوں۔ کل کورٹ جانا ہے۔ اسی کی تیاری کر رہا تھا۔ میں بات کر سکتا ہوں۔ نو پرابلم، تم بتاؤ، کیا کرتی رہتی ہو سارا دن؟" وہ پیغام بھیج کر فون رکھ دیتا اور پھر سے کام کرنے لگ جاتا۔ مکمل توجہ اور دھیان سے اسکرین پہ نظریں جمائے۔

"میں... کچھ بھی نہیں... بس بھائی یاد آتا ہے... اور..." وہ لکھتی گئی۔ باہر رات پگھلتی گئی۔ قطرہ قطرہ... تاریکی بڑھتی گئی اور وہ ٹیکسٹ پہ ٹیکسٹ کرتی گئی۔

وقت اور جگہ کا سارا احساس ختم ہوگیا۔ ہر اگلے پیغام کے انتظار کی بے قراری اور ہر پیغام پڑھتے وقت لبوں پہ مسکراہٹ۔ کیونکہ ابھی دنیا میں وہ خمر کشیدہ ہی نہیں کی گئی جس کا نشہ آدھی رات کو کسی نامحرم سے موبائل پہ بات کرنے سے زیادہ ہو۔

سحری کے قریب اس نے لکھا۔ "اب سو جاؤ بچے' مجھے صبح کورٹ جانا ہے۔"

"اوکے گڈ نائٹ!" مسکرا کر اس نے لکھا' پھر ساری گفتگو کو مٹانے کا بٹن دبایا۔ پھر ہلکا سا چونکی۔ (مٹانے کی کیا ضرورت؟ ہاشم بھائی ہی ہیں۔ ان سے بات کرنے میں غلط کیا ہے؟) مگر جب واٹس ایپ نے پوچھا کہ واقعی سب مٹانا ہے تو اس نے یس کا بٹن دبا دیا۔ پھر فون رکھا اور آنکھیں بند کیں تو سعدی ایک دفعہ پھر سے یاد آگیا۔ کرب بڑھ گیا اور اس میں اب ایک اور کرب بھی شامل ہوگیا۔



اس کے نزدیک غمِ ترکِ وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں

شام بارش کے باعث پہلے سے ٹھنڈی اور خوش گوار سی اتر رہی تھی۔ ہاشم نے قصر کا داخلی دروازہ کھولا تو اندر کا منظر نمایاں ہوا۔ اونچے اور وسیع لاؤنج میں بڑے صوفے پہ جواہرات تمکنت سے بیٹھی تھی۔ کہنی صوفے کے ہتھے پہ جمائے وہ چائے کی نازک پیالی سے گھونٹ بھرتی' مسکراتی نظروں سے سامنے بیٹھی شہرین کو دیکھ رہی تھی' جو اس سے قطعا" بے نیاز سونیا کے بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔ ساتھ میں چیونگم بھی چبا رہی تھی۔

آفس سے تھکے ہارے ہاشم نے ایک مشترکہ سلام کیا اور زینے کی طرف بڑھ گیا۔

"سونا! اپنے بابا کو بتادو کہ آج سونی ماما کے ساتھ جارہی ہے اور دو دن بعد آئے گی اور یہ بھی بتاؤ کہ سونی کتنی خوش ہے ان سارے پلانز پہ۔ جو ماما نے سونی کے لیے بنائے ہیں۔" آخری پن لگا کر اس نے سونی کے نرم بالوں میں برش پھیرتے اونچا سا کہا تو سونی خوش خوش سی اٹھی اور بھاگتی ہوئی ہاشم کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"بابا۔ سونی ماما کے ساتھ جارہی ہے۔ اور پتا ہے' ماما نے۔" آگے اس نے جوش میں وہ چند فقرے دہرائے جو شہرین کی ڈھائی گھنٹے کی محنت کا نتیجہ تھے۔

ہاشم نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا' اور پھر ایک تیز سنجیدہ نظر اس پہ ڈالی' جواب ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھی' جتاتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہاشم سونیا کو انکار نہیں کرسکتا' اسے معلوم تھا۔

"شیور۔ انجوائے کرو۔" جھک کر اس کا گال چوما اور سیدھے ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا اور پھر ایک قہر آلود نظر شہری پہ ڈال کر اوپر کی جانب قدم اٹھا دیے۔ شہری نے فاتحانہ مسکراہٹ جواہرات کی طرف اچھالی جو عادتا" مسکراتے ہوئے چائے پی رہی تھی۔

"پتا نہیں کیوں لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ شہری کو ہرا سکتے ہیں۔" انگلی سے سنہری بال نزاکت سے پیچھے کرتے وہ بولی۔ ساتھ ہی دور کھڑی فیونا کو اشارہ کیا۔ وہ آئی اور سونی کو تیار کرنے ساتھ لے گئی۔ "صرف وہی ایسا سمجھتے ہیں' جو شہری کو کئی دفعہ ہرا چکے ہوں۔" جواہرات نے شانے اچکائے۔

تب ہی دروازہ پھر سے کھلا اور موبائل کے بٹن دباتا الجھا ہوا نوشیرواں اندر داخل ہوا۔ وہ ویسٹ اور ٹائی میں ملبوس تھا' اور پیچھے ملازم اس کا بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا۔ یقینا" وہ ہاشم کے ساتھ آفس سے آرہا تھا۔

ماں کو سلام کرتے ذرا کی نگاہ اٹھائی تو ٹھہرا۔ شہری سامنے بیٹھی تھی' ابرو بھینچ کر جواہرات کو دیکھتی' کسی تابڑ توڑ حملے کے لیے تیار۔

"اوہ ہائے!" نوشیرواں ہلکا سا مسکرایا۔ جواہرات نے پوری گردن گھما کر اس کی مسکراہٹ دیکھی۔

"ہیلو!" شہری کا فقرہ منہ میں ہی رہ گیا۔ بدمزہ سی اٹھی اور سونی کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

"آپ کہاں جارہی ہیں؟" وہ حیران ہوا۔ وہ مڑی'

تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔ "اپنی بیٹی کے لیے آئی تھی' اس کو لینے جارہی ہوں' ورنہ مجھے قطعاً" کوئی خواہش نہیں اس گھر میں بار بار آنے کی۔" تنے ابرو کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ وہ ہونقوں کی طرح اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔ ہاتھ میں موبائل جوں کا توں اٹھا رکھا تھا۔ جواہرات کی مسکراہٹ' شدید ناپسندیدگی میں بدلتی گئی۔ اور شیرو کو گھورتے اس نے تاسف سے سر جھٹکا۔

"وہ صحیح کہہ رہی ہے' اس گھر میں ذرا دیر بیٹھی ہے' ورنہ آتے ساتھ ہی سوئی کو لے کر زمر کے پاس چلی گئی' سعدی کا افسوس کرنے! جاؤ' تم فریش ہولو۔"

نوشیرواں کا دل جیسے اچاٹ ہوگیا۔ وہ برہمی سے زینے چڑھنے لگا۔



دنیا تو ایک برف کی سل سے سوا نہ تھی
پہنچی ذرا جو آنچ تو دنیا تمام شد!

اس شام' جب دفاتر میں لوگ اپنے کام جلد از جلد نبٹاتے' گھر جانے کی تیاری میں تھے کہ پانچ بجنے میں ذرا سی دیر ہی باقی تھی' ایسے میں اس عمارت کے اندر ایک چھوٹے آفس کے سامنے لاؤنج نما کمرے میں فارس کھڑا تھا۔ اس نے نیلی کف والی شرٹ اور سر پہ پی کیپ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پہ گلاسز تھے اور کیپ کو چہرے پہ خاصا جھکا رکھا تھا۔ ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا گلدستہ لیے۔ (جو اوپر سے شفاف پلاسٹک میں پیک تھے) وہ پیون کو رسید نکال کردے رہا تھا۔

"امینہ صاحبہ کے لیے ہیں' ان سے دستخط لائیے۔" آفس کے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا تو پیون سرہلا کر گلدستہ احتیاط سے پکڑے اندر چلا گیا۔ دروازہ ذرا سا کھلا رہ گیا۔ فارس نے کن اکھیوں سے جھری سے دیکھا۔ اندر آفس میں میز کے پیچھے ایک نارنجی ڈائی بالوں والی لڑکی نما عورت بیٹھی تھی اور پیون اس کی میز پہ گلدستہ رکھ رہا تھا۔

"کس نے بھیجے ہیں؟"

"نام نہیں بتایا۔ بس اتنا بولا کہ نیاز بیگ کے کسی پولیس والے دوست نے بھیجے ہیں اپنی ترقی کی خوشی میں جو آپ کی وجہ سے ہورہی ہے۔" وہ رخ موڑے کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ پیون نکل آیا۔ رسید اسے لاکر دی' جسے اس نے رجسٹر میں لگایا' تب ہی رجسٹر ہاتھ سے پھسلا اور سارے کاغذ بکھر گئے۔ رسیدیں' پرچیاں۔ فوٹو اسٹیٹ کاغذ۔

"معاف کرنا!" وہ پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھا کاغذ سمیٹنے لگا۔ آہستہ آہستہ۔ کیپ والا سر جھکائے۔ بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتا۔ پیون کبھی اندر آرہا تھا' کبھی باہر جارہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے پرچیاں اٹھاتا اور رجسٹر میں لگاتا رہا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ اور کن اکھیوں سے پیون کو دیکھا۔ وہ اب ٹرے لے کر راہداری کی طرف جارہا تھا۔ ادھر وہ نکلا' ادھر فارس تیزی سے اٹھا اور آفس کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔

میز پہ سر ٹکائے' ڈائی بالوں والی عورت آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ ساتھ ہی گلدستہ کھلا ہوا پڑا تھا اور اس سے عجیب مہک اٹھ رہی تھی۔ ناک بند کرکے وہ تیزی سے قریب آیا' گلوز والے ہاتھوں سے اسے واپس ریپ کیا۔ پھر لینڈ لائن فون کا تار کاٹا۔ انٹرکام کا تار کاٹا۔ کمپیوٹر کی تار کو منقطع کیا۔ امینہ کا پرس کھنگالا۔ اندر سے چابیاں نکالیں۔ پھر میز پہ رکھا موبائل جیب میں ڈالا' اور دروازے تک آیا۔ جھری سے باہر دیکھا' پیون ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ اس نے جلدی سے بتی' پنکھا سب بند کیے۔ باہر نکلا۔ دروازہ لاک کیا۔ باہر لگا "اوپن" کارڈ پلٹ کر "کلوزڈ" سامنے لایا۔ اور پھر جیبوں میں ہاتھ ڈالے' سر جھکائے' وہ آگے چلا گیا۔

پھر شام گہری ہوگئی' افطار کے قریب لوگ سمٹ کر گھروں کے اندر چلے گئے تو شہر قدرے سنسان لگنے لگا۔ مغرب باسی ہوئی اور رات اترنے لگی۔

ایسے میں ایک بڑے اور مہنگے پرائیویٹ اسپتال کے باہر کھلے پارکنگ ایریا کے ایک کونے میں ایک کار کھڑی دکھائی دیتی تھی اور ڈرائیونگ سیٹ پر فارس' پی

کیپ پہنے بیٹھا نظر آتا تھا۔ چیونگم چباتے ہوئے وہ آنکھیں سیکڑ کر اسپتال کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں بیرونی استقبالیے سے ہٹ کر' باہر ایک اندھیرے کونے میں اسے زمر دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں سے وہ مبہم سی دکھائی دیتی تھی۔ اگر قریب جاکر دیکھو تو وہ اس ویران کونے میں ایک نرس کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نرس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتے' ایک پیکٹ زمر کی طرف بڑھایا۔

"سب کچھ پورا ہے؟" زمر نے سرگوشی میں پوچھا۔ نرس نے جھٹ سر اثبات میں ہلایا۔

"اوکے۔ وہ ابھی آئے گا' آگے تم جانتی ہو' تمہیں کیا کرنا ہے۔" کہنے کے ساتھ پرس سے ایک بند خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ نرس نے فوراً" ہاتھ اٹھائے۔

"نہیں' نہیں' اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کے مجھ پہ احسان ہیں۔"

"رکھ لو۔ میں خوشی سے دے رہی ہوں۔" اس نے مسکرا کر زبردستی پیکٹ تھمادیا۔ نرس نے شرمندہ ہوتے ہوئے اسے رکھ لیا۔

تب ہی فارس کو وہ واپس آتی دکھائی دی۔ اس نے نیلی قمیص پہن رکھی تھی اور سیاہ دوپٹہ سر پہ تھا۔ وہ سر جھکائے متناسب چال چلتی اس طرف آرہی تھی۔ فارس نے ہاتھ بڑھا کر فرنٹ سیٹ کالاک کھولا۔

"آدھا کام ہوگیا۔" اندر بیٹھتے ہوئے زمر نے عام سے انداز میں اطلاع دی اور پیکٹ ڈیش بورڈ پہ رکھا۔ فارس نے ایک نظر اس پہ ڈالی۔ وہ سر سے دوپٹا اتار کر' اب گھنگریالے بالوں کو گول مول لپیٹ کر جوڑا بنا رہی تھی۔ وہ سامنے دیکھنے لگا۔

"اب؟"

"وہ آجائے' پھر فون کرتے ہیں۔" اس نے متلاشی نظروں سے دور اسپتال کے بیرونی دروازوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ آچکا ہے۔ جب آپ گئیں تب ہی آگیا تھا۔" کہنے کے ساتھ اس نے امینہ کا موبائل زمر کی طرف بڑھایا۔ جسے اس نے رومال میں لپیٹ کر پکڑا۔ کال وہ ملا چکا تھا کیونکہ اس کے ہاتھوں پہ گلوز چڑھے تھے۔ پلاسٹک کے شفاف پتلے گلوز۔ زمر نے کان سے موبائل لگایا۔ ایک رومال منہ کے قریب فون پہ رکھا۔ گھنٹی کے بعد مردانہ آواز ابھری۔

"ہاں امینہ!"

"میں اسپتال سے بات کررہی ہوں' یہاں ایک بی بی کو لایا گیا ہے' نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی ہے اس نے۔ امینہ نام ہے اس کا۔" وہ پختون لہجے میں روانی سے بول رہی تھی۔(اور وہ ہلکا سا مسکرایا۔ واہ۔ چڑیل اداکاری بھی کرتی ہے۔) "اس کے فون پہ آپ کا آخری نمبر ڈائل کیا گیا تھا۔"

"کیا؟ کون سے اسپتال سے؟" دوسری طرف الجھن اور پریشانی در آئی۔ زمر نے جلدی جلدی نام اور پتا بتایا۔ "پندرہ بیس منٹ بعد پولیس آجائے گا' اگر تم نے آنا ہے صاحب تو جلدی آؤ۔"

"پولیس سے کچھ نہیں کہنا' میں آرہا ہوں بس اور۔" مگر زمر نے سنے بغیر کال کاٹ دی۔

"یہ لہجہ کہاں سے سیکھا آپ نے؟" مسکراہٹ چھپائے اس کو دیکھ کر پوچھا تو زمر فون ڈیش بورڈ پہ دھرتے ہوئے اسی بے تاثر انداز میں بولی۔

"آریو شیور' وہ امینہ سے یہاں آنے سے پہلے رابطہ نہیں کرسکے گا۔"

فارس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ "جی۔"

زمر نے ایک اچٹتی سی نظر اس پہ ڈالی۔

"کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟" اس نے چہرہ موڑ کر زمر کو دیکھا۔ "گلا گھونٹ کر پنکھے سے لٹکادیا ہے اور کہا ہے کہ یہ خودکشی ہے۔"

وہ اکتا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

رات باہر قطرہ قطرہ بہتی رہی۔ کار کے اندر خاموشی چھائی رہی۔ دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ دفعتاً" وہ سیدھا ہوا۔

"وہ نیاز بیگ!" زمر نے بھی اسی طرف دیکھا۔ شلوار سوٹ میں ملبوس نیاز بیگ اسپتال کے اندر داخل

ہو رہا تھا۔ فارس نے گردن گھمائی۔ "اس کی کار قریب میں ہی کہیں ہوگی' جلدی میں لگ رہا ہے۔" لاک کھولتے ہوئے اس نے ڈیش بورڈ سے پیکٹ اٹھایا اور دروازہ کھولا۔ زمر نے قدرے بے چینی سے اسے دیکھا۔

"دھیان سے!" ہلکا سا بولی۔ وہ چونکا' اس کی آنکھوں کو دیکھا اور ہلکا سا مسکرایا۔

"میں نہیں چاہتی تمہاری لاپروائی سے کوئی گڑبڑ ہو۔" وہ وضاحت دے کر رخ موڑ گئی۔ اس کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔

اندر استقبالیہ تک نیاز بیگ تیز قدم اٹھاتے پہنچا۔ وہی نرس کاؤنٹر کے پیچھے دو تین افراد کے ہمراہ کھڑی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر فوراً" اس طرف متوجہ ہوئی۔

"جی؟" وہ اس کے مخاطب کرنے پہ وہیں رکا۔

"ہاں وہ۔ امینہ نامی خاتون کو لایا گیا ہے' مجھے فون آیا تھا اور۔"

"پرائیویٹ روم' چھ نمبر میں ہے وہ۔ آپ یہاں سے سیدھا جاکر دائیں مڑ کر۔" وہ عجلت میں رستہ سمجھاتی گئی۔ وہ سنجیدگی اور قدرے اضطراب سے سرہلاتے' آگے بڑھ گیا۔

چند راہداریاں عبور کرکے' کمروں کے نمبر پڑھتا' وہ مطلوبہ کمرے کے قریب آیا۔ باہر دو پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ نیاز بیگ کی تیوری چڑھی۔ وہ دروازے کے نزدیک جانے لگا تو ایک سپاہی نے راستہ روکا۔

"کیا کام ہے؟"

"اندر میرا مریض ہے۔ اسے دیکھ لوں' پھر تم سے بات کرتا ہوں۔" وہ قدرے اکھڑے لہجے میں کہہ کر آگے بڑھنے لگا' مگر سپاہیوں نے پھر سے روک دیا۔

"اجازت نہیں ہے۔ مریض سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟"

اس سے پہلے کہ وہ غصے سے کچھ جواب دیتا' دروازہ کھلا۔ نیاز بیگ کے الفاظ منہ میں رہ گئے۔ اے ایس پی سرمد شاہ' عام پینٹ شرٹ میں ملبوس' باہر نکل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر چونکا۔

"نیاز بیگ۔ تم ادھر کیسے؟" تعجب سے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتے' اپنے پیچھے دروازہ بند کیا۔

"یہ تمہارے تھانے کی حدود تو نہیں ہے اے ایس پی۔" وہ بھی ذرا حیران ہوا۔ "خیر میری پہچان کی ایک عورت۔ (آنکھ سے اشارہ کیا) ادھر ایڈمٹ ہے۔"

سرمد شاہ کا ابرو بے اختیار اٹھا۔ "ادھر؟ اس کمرے میں؟"

"ہاں۔ دیکھو اسے پولیس کیس مت بناؤ' یہ اتنا کوئی بڑا معاملہ۔"

"تم شہزا کو کیسے جانتے ہو؟" سرمد شاہ نے تیزی سے بات کاٹی۔ اس کی متعجب نگاہیں نیاز بیگ پہ جمی تھیں۔

"کون شہزا؟" وہ ٹھہرا۔

"آئی جی صاحب کی بیٹی اور میری کزن شہزا ملک' جو ریپ اور ٹارچر کے بعد پچھلے ڈیڑھ ماہ سے کوما میں ہے۔ بتاؤ کیسے جانتے ہو اسے؟" سرمد شاہ کی نگاہوں کا تعجب اب کھوجتے تاثر میں بدل رہا تھا۔

ایک دم نیاز بیگ کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"نہیں' شہزا کون؟ میں تو نہیں جانتا کسی شہزا کو۔ میں تو ادھر امینہ کے لیے آیا تھا۔ وہ میری ایک عزیزہ ہے۔" پھر کمرہ نمبر دیکھا۔ "شاید غلط کمرہ نمبر بتادیا انہوں نے۔ میں پوچھتا ہوں دوبارہ۔ اور۔ افسوس ہوا تمہاری کزن کا سن کر۔" غلط وقت پہ غلط جگہ پہ ہونے کا احساس ہوتے ہی وہ عجلت میں کہتا' اس کا کندھا تھپتھپاتا' جیب سے موبائل نکال کر مڑا۔

سرمد شاہ آنکھیں سکیڑ کر اسے جاتے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک نظر اپنے ایس آئی پہ ڈالی' وہ بھی ان ہی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک دم سرمد شاہ اس کے پیچھے لپکا۔ پیچھے کمرے کے دروازے کی ہلکی سی درز کھلی تھی جس سے بیڈ پہ لیٹی لڑکی نظر آرہی تھی۔ ہوش و خرد سے بیگانہ۔ آکسیجن ماسک لگا تھا۔ بہت سی دوسری نالیاں بھی۔ اس کے بال بھورے سنہرے سے تھے اور کان کے قریب ان میں تتلی کی شکل کا نگوں والا کلپ لگا تھا۔

"کیا نام بتایا تم نے اپنی عزیزہ کا؟" راہداری کے آخر میں اس نے نیاز بیگ کو جالیا۔ جو موبائل پر نمبر ملا کر کان سے لگائے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پہ الجھن تھی۔ سرمد شاہ کے پکارنے پہ چونک کر گردن گھمائی۔

"ہاں وہ امینہ ہے' میری جاننے والی۔ اسپتال والوں نے ابھی فون کر کے بتایا۔ میں پوچھتا ہوں ابھی۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو اے ایس پی؟" وہ ذرا اکتایا۔ "بھئی میں نہیں جانتا تمہاری کزن کو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی تمہاری عزیزہ کی عیادت کرلوں۔" اس نے ابرو سے اسے چلتے رہنے کا اشارہ کیا۔ تیز' جانچتی نگاہیں بار بار نیاز بیگ پہ ڈالتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کوفت کا شکار ہونے لگا' مگر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ واپس استقبالیہ کاؤنٹر تک آپہنچے۔

"او بی بی' کس کمرے میں بھیج دیا تم نے مجھے؟" وہ بگڑ کر کہتا اسی نرس سے مخاطب ہوا۔ "وہ تو کسی شہزا بی بی کا کمرہ ہے۔" "سر آپ نے شہزا ملک کے کمرے کا ہی پوچھا تھا' تب ہی میں نے روم نمبر سکس بولا۔" وہ سادگی سے گویا ہوئی۔ سرمد شاہ نے پوری گردن گھما کر اسے دیکھا۔ وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ میں نے امینہ امتیاز کا پوچھا تھا۔ تم لوگوں نے مجھے کال کر کے بلایا ہے۔" ساتھ ہی حیران پریشان نگاہ اے ایس پی پہ ڈالی۔ جو بس چپ چاپ اسے گھور رہا تھا۔

"سوری سر' مجھے شہزا ملک سنائی دیا تھا۔"

"امینہ امتیاز۔" وہ جھک کر چیک کرنے لگی۔

"یہاں تو کوئی امینہ امتیاز نہیں لائی گئی۔ نہ ہم نے اس سلسلے میں کسی کو کال کی ہے۔"

"کیا بکواس ہے۔ تم لوگوں نے مجھے ابھی کال کی' خود مجھے بلایا' خودکشی کا کیس تھا۔" غصے سے لال پیلے ہوتے اس کے ماتھے پہ پسینہ آرہا تھا۔

"سر' یہ سارے فونز آپ کے سامنے رکھے ہیں' آپ کال ریکارڈز چیک کریں۔ ہمارے پاس کوئی امینہ امتیاز نہیں لائی گئی۔ آپ نے خود ابھی شہزا ملک کا پوچھا تھا مجھ سے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"تمہیں کس نمبر سے فون آیا؟" وہ جو چپ کھڑا تھا' ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ نیاز بیگ نے جھنجلا کر اسے دیکھا۔

"امینہ کے موبائل سے فون آیا تھا۔" وہ واپس اسے کال بیک کرنے لگا۔

"گھنٹی جا رہی ہے' کوئی اٹھا نہیں رہا۔ میں اس کے گھر دیکھتا ہوں۔ اچھا خدا حافظ!" ماتھے کو چھو کر عجلت میں اسے سلام کیا اور باہر کی طرف بڑھا۔ ایس آئی نے بے اختیار سرمد کو دیکھا۔ وہ سوچتی نظروں سے نیاز بیگ کو باہر نکلتے دیکھ رہا تھا۔

"نیاز بیگ کی کار کون سی ہے امجد حسین؟" اس نے سوچ میں ڈوبے پکارا۔

"سر' ہمیشہ نیلے رنگ کی نسان میں دیکھا ہے اسے۔"

"اور اس دن ہمیں جو گمنام ٹپ موصول ہوئی تھی' یاد ہے؟ فون کرنے والی عینی شاہد نے کہا تھا کہ اس نے ایک آدمی کو شہزا کو کار کی ڈگی سے نکال کر سڑک پہ پھینکتے دیکھا تھا۔ کون سی کار بولی تھی اس نے؟"

"نیلی نسان۔ مگر سر' ٹپ تو جھوٹی بھی ہو سکتی ہے۔" وہ خود متذبذب تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" سرمد شاہ کے چہرے پہ بے پناہ سختی در آئی۔ وہ باہر نکلا۔ ایس آئی فوراً پیچھے لپکا۔

دو گاڑیوں کی قطار کی طرف نیاز بیگ تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی موبائل پہ مسلسل نمبر ملا رہا تھا۔ جب تک' وہ دونوں اس تک پہنچے' وہ نیلی نسان سے چند قدم دور تھے۔

"تمہاری امینہ نے فون نہیں اٹھایا؟" خشک انداز میں اس نے پوچھا تو وہ چونک کر گھوما۔ چہرے پہ دبا دبا غصہ در آیا۔

"اے ایس پی میں پریشان ہوں اس ٹائم! امینہ گھر بھی نہیں پہنچی' اور فون بھی نہیں اٹھا رہی' کوئی مسئلہ ہے اس کے ساتھ۔" وہ ذرا جھنجلایا ہوا' ذرا متفکر کہہ رہا تھا جب ایس آئی نے آواز دی۔ "سر!"

سرمد شاہ نے اس طرف دیکھا۔ وہ چند قدم دور ریپی نسان کے ساتھ کھڑا ان کو بلا رہا تھا۔ نیاز بیگ فون کان سے لگائے جھنجلا کر بولے جا رہا تھا' مگر سرمد شاہ نے بغیر آگے آیا۔

نیاز بیگ کی کار کے ڈیش بورڈ پہ ایک موبائل تھر تھراتا ہوا جل بجھ رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی روشنی ونڈ اسکرین پہ عکس بنا رہی تھی۔ عکس پہ نیاز بیگ کا نام اور نمبر لکھا آرہا تھا۔ سرمد شاہ نے تیز نظروں سے اسے گھورا جو روشنی دیکھ کر اس طرف آیا تھا۔

"تمہاری امینہ شاید اپنا فون تمہاری کار میں بھول گئی۔"

وہ حیران پریشان سا قریب آیا۔ موبائل دیکھ کر اس کے چہرے پہ شاک در آیا۔ تیزی سے کار کھولی اور موبائل نکال کر چہرے کے سامنے کیا۔ وہ امینہ کا ہی موبائل تھا۔ اس نے الجھن بھری نگاہیں اٹھائیں تو اے ایس پی تیکھی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"یہ ادھر کیسے؟" وہ کبھی ڈیش بورڈ کو دیکھتا' کبھی موبائل کو۔

"امجد حسین' ذرا گاڑی کی تلاشی لو۔ شاید امینہ بی بی بھی مل جائے۔" اے ایس پی نے تحکم سے ایس آئی کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا تو نیاز بیگ کی پریشانی پس منظر میں چلی گئی' اور ابرو تن گئے۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کے گھر جاتا ہوں۔" ہاتھ جھلا کر قدرے کھردرے انداز میں کہتے ایس آئی کو روکا۔ ایس آئی نے اے ایس پی کو دیکھا۔ وہ آگے ہوا' اور نیاز بیگ کی آنکھوں میں دیکھتے تحمل سے بولا۔ "نیاز بیگ' اس وقت مجھے غصہ دلا کر مجھے اپنا دشمن مت بناؤ۔ میں نے بڑے موقعوں پہ تمہارا ساتھ دیا ہے' اس لیے چپ چاپ یہاں کھڑے رہو۔" پھر امجد حسین کو اشارہ کیا۔ "گاڑی کھولو۔"

چند لمحوں بعد تین چار مزید اہلکار وہاں کھڑے تھے' ایس آئی ٹارچ سے اندر روشنی مارتا کار کی سیٹیں' خانے' گلوز کمپارٹمنٹ چیک کر رہا تھا۔ اے ایس پی سرمد شاہ کمر پہ ہاتھ باندھے' پتھریلے تاثرات کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور نیاز بیگ جھلا تا ہوا سا کھڑا تھا۔

"یہ تم اچھا نہیں کر رہے۔" ایک سلگتی نظر سرمد شاہ پہ ڈال کر ہلکا سا بولا۔ سرمد شاہ خاموش رہا۔ ایس آئی اب ڈگی کھول رہا تھا۔

"میں پہلے مصیبت میں ہوں' اوپر سے تم کسی مشتبہ کی طرح میرے ساتھ برتاؤ کر رہے ہو۔ میں یہ بے عزتی بھولوں گا نہیں۔"

"سر!" ایک دم ایس آئی سیدھا ہوا' اس کے چہرے پہ کوئی ایسا ہکا بکا تاثر تھا کہ سرمد شاہ فوراً ڈگی کی طرف آیا۔

"یہ دیکھیے۔" اس نے ٹارچ کی روشنی ڈگی کے ایک کونے میں ماری۔ سرمد شاہ نے آنکھیں سیکڑ کر دیکھا اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ وہاں ایک جگمگاتا ہوا تتلی کی صورت کا' تین انچ چوڑا' ہیئر کلپ گرا تھا۔ اس سے ہی چند ہلکے بھورے بال بھی اڑے تھے۔ (اور چند بال فاصلے فاصلے پہ ڈگی میں بکھرے بھی تھے جو ابھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔) تتلی کے چند نگ جگمگا رہے تھے' اور باقی نگوں کو سوکھے خون کے دھبوں نے ماند کر رکھا تھا۔ شنزا کا خون۔ سرمد شاہ کی آنکھوں میں سرخی ابھری۔ وہ طیش میں اس کی طرف گھوما۔

"نیاز بیگ! اپنے ہاتھ پیچھے باندھ لو۔ رفیع محمد' اسے ہتھکڑی لگاؤ۔" وہ غرایا تھا۔

"کیا بکواس" نیاز بیگ کی ساری جھلاہٹ ہوا ہوئی' وہ حیران پریشان سا آگے ہوا مگر ایس آئی کو تتلی نما کلب اٹھا کر پلاسٹک بیگ میں ڈالتے دیکھ کر اس کا چہرہ فق ہوا۔

"اوہ یہ میرا نہیں ہے۔ یہ میری گاڑی میں کہاں سے۔ اوہ میری بات سنو۔"

سرمد شاہ نے پوری قوت سے اس کے منہ پہ گھونسا مارا۔ وہ ایک دم تیورا کر پیچھے کو گرا' مگر گرنے سے پہلے سرمد شاہ نے گریبان سے کھینچ کر اسے اٹھایا' اور اس کا خون زدہ سا چہرہ قریب کیا۔

"میں نے تمہیں کتنے کیسز سے نکالا' کیا اس لیے

کہ تم میرے خاندان کی لڑکی کے ساتھ ایسا کرو گے؟ تم (گالی) گھٹیا انسان! وہ میری بہنوں جیسی تھی۔" شاکنڈ سے نیاز بیگ کو جھٹکے سے چھوڑا۔ ایک اہلکار نے اس کے ہاتھ موڑ کر پیچھے باندھے۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

"نہیں نہیں، یہ کوئی گڑبڑ ہے، مجھے اس میں پھنسایا جارہا ہے، میں نہیں جانتا تمہاری بہن کو۔ میری بات سنو!" وہ دو اہلکاروں کی آہنی گرفت میں پھڑپھڑاتا چلا رہا تھا۔

"آئی جی صاحب کو فون لگاؤ، اور بولو۔ تھانے آجائیں۔" سرمد شاہ سرخ چہرے کے ساتھ ایس آئی کو کہہ رہا تھا۔

اور دور سڑک کے اس پار، گرین بیلٹ کے ساتھ پارکنڈ کار کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی زمر گھنگھریالی لٹ انگلی پہ لپیٹتی وہ منظر دیکھ رہی تھی۔ آواز سنائی نہ دیتی مگر وہ ایک منظر سو آوازوں پہ بھاری تھا۔ اس کے چہرے پہ اطمینان تھا، مگر آنکھوں میں سرد سی تپش بھی تھی۔

فارس نے گہری سانس لی، اور کافی مطمئن سے انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"آر یو شیور۔ اے ایس پی کو اصل معاملہ سمجھ نہیں آئے گا؟"

"میں اسے جانتی ہوں، کام کیا ہے اس کے ساتھ۔ اگر اس میں اتنی عقل ہوتی تو چار سال سے اے ایس پی نہ ہوتا، سال ڈیڑھ پہلے ایس پی بن چکا ہوتا۔ یہ اس کے گھر کا معاملہ ہے۔ اس کی جج منٹ کو غیرت ڈھانپ دے گی۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی کہہ رہی تھی۔

"مگر اس کی جلد ہی ترقی ہونے والی ہے۔"

"اس کی ترقی کا انحصار اس کیس پہ ہے۔ اس کو شہرا کا مجرم مل گیا، یعنی اس کو ترقی مل گئی۔" زمر نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔ دور نیاز بیگ سپاہیوں کی گرفت میں پھڑپھڑاتا، مسلسل چلا رہا تھا۔

"اب دیکھو، کون لڑکیوں کی طرح چیخ رہا ہے۔" وہ اسی منظر کو دیکھتے بولی تو لہجے میں نمی بھی تھی اور آنچ بھی۔ فارس نے ٹیک لگائے، گردن اس کی طرف موڑی۔

"کل جب امونا اس سے لاک اپ میں ملے گی تو اس کی بات سن کر نیاز بیگ کو یہی لگے گا کہ اسے پولیس نے پھنسایا ہے اس کیس میں۔ ہمارے دشمن ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہوں گے، اس دفعہ ہم ان کا تماشا دیکھیں گے۔" وہ رکا۔ "مگر شہرا۔؟"

زمر نے گہری سانس لی۔ "اس کے مجرم یقیناً چالاک لوگ ہیں، ان کو کبھی نہیں ملیں گے۔ وہ بے چاری بچی شاید چند دن زندہ رہ پائے۔ مگر وہ نہ کبھی ہوش میں آئے گی، نہ کسی کو کچھ بتا پائے گی۔" وہ ابھی تک پولیس موبائل کو دیکھ رہی تھی جس میں اب وہ چیختے چلاتے نیاز بیگ کو لا رہے تھے۔

"وہ کلپ جو میں نے اس کی ڈگی میں رکھا ہے، کیا اس کے خاندان والے پہچانیں گے نہیں؟ گو کہ وہ شہرا کے کلپ کے جیسا ہی ہے۔ مگر اس کا نہیں ہے۔ کیا معلوم شہرا کے پاس صرف ایک ہی کلپ ہو۔"

"اونہوں۔ وہ ڈیزائنر کلپ ہے، اور اس کے جیسا کلپ جو میں نے خریدا تھا، وہ اس وقت شہرا کے بالوں میں لگا ہے۔ جس کلپ پہ اس کا بلڈ اور بال لگا کر سسٹر نے مجھے دیے تھے، وہ شہرا کا اصلی کلپ ہے۔ وہ اسے فارنزک بھیجیں گے، ہر طرح سے چیک کریں گے۔ مگر شہرا کے بالوں میں لگا کلپ کوئی نہیں چیک کرے گا۔" سرسری سا بتا رہی تھی۔

"اوہ۔" وہ چپ ہو گیا۔ پولیس موبائل اب دور جارہی تھی۔

زمر نے گردن موڑ کر اسے دیکھا، پھر کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ پھر سامنے دیکھنے لگی۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ پھر ہلکا سا بولی۔ "گڈ جاب، فارس!" اس کے لہجے میں نرمی تھی، مگر وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ وہ ذرا سا مسکراتے ہوئے کار اسٹارٹ کرنے لگا۔

"پلان آپ کا تھا۔ گڈ جاب ٹو یو! سو۔ اب کس کی باری ہے؟" کار ریورس کرتے اس نے پوچھا۔ سیڑھی کا پہلا زینہ ان کے قدموں تلے تھا، اور اس کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے ہر زینے کو اسی طرح روندنا تھا۔ یہ سعدی یوسف کو بچانے کا واحد طریقہ تھا۔

"بتاؤں گی۔ جب ضرورت پڑی تو!" وہ پھر سے ویسی ہی روکھی ہو گئی۔ مگر ایک تبدیلی آئی تھی۔
کم از کم وہ بات کرنے لگے تھے۔
ابھی وہ رستے میں تھے کہ زمر کا موبائل بجا۔ ڈاکٹر سارہ غازی۔
"جی ڈاکٹر سارہ۔" اس نے مصروف سے انداز میں فون کان سے لگایا۔
"کچھ پتا چلا سعدی کا زمر؟" وہ فکر مندی سے بولی۔
"کہاں سارہ؟ آپ بس دعا کریں۔ اچھا میرا کام ہوا؟"
"جی میں نے پتا کیا تھا۔ نیس کام میں کوئی حلیمہ کام نہیں کرتی۔ ایک علیمہ سرفراز ہے مگر وہ انجینئر ہے سیکریٹری نہیں۔" زمر نے تکان سے آنکھیں میچ لیں۔
"نہیں' وہ حلیمہ ہی تھی۔ خیر تھینک یو۔ واپس آکر چکر لگائیے گا۔ بچے آپ کو مس کرتے ہیں۔"
"جی' میں بس گھر میں پھنسی ہوں اتنے دن سے۔ سعدی کی پریشانی الگ' جیسے ہی آئی' چکر لگاؤں گی۔"
زمر نے فون رکھ دیا اور دوسری طرف۔
دوسری طرف اپنے بیڈ روم میں کھڑی' سارہ نے بھی موبائل رکھ دیا۔ اور جیسے ہی وہ پلٹی' ذکیہ بیگم پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک تاسف بھری نظر سارہ پہ ڈالی جو سادہ شلوار قمیص میں ملبوس' بالوں کا جوڑا بنائے ہوئے تھی۔ ان کو دیکھ کر چونکی۔
"کیوں ان کو اوائڈ کر رہی ہو؟ تم پچھلے ایک مہینے سے' جب سے سعدی کھویا ہے' یہیں اس گھر میں قید ہو۔ پھر بار بار جھوٹ کیوں؟"
سارہ کی سبز نیلی آنکھوں میں نمی در آئی۔ "میں ان لوگوں سے نہیں ملنا چاہتی۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں ملی تو وہ جان لیں گے۔"
"کیا جان لیں گے؟" وہ ذرا حیران ہوئیں۔ سارہ کے آنسو بہنے لگے۔
"امی! اس رات سعدی کے ساتھ اس گھر میں میں تھی۔ امی میں نے اپنے سامنے اسے گولیاں لگتے دیکھا ہے۔ امی میں ہوں وہ گواہ جسے وہ لوگ ڈھونڈ رہے ہیں۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سمیرا فضل

افطاری کی خوشی

"کل میرا پہلا روزہ تھا اور ممی نے افطاری میں بہت کچھ بنایا تھا' فروٹ چاٹ' دہی بھلے' چکن پکوڑے' سموسے' رول اور جو کچھ میں نے کہا' مجھے منگوا کے دیا۔ مجھے بہت مزہ آیا۔" شاہ زیب نے خوشی اور فخر کے ساتھ اپنے چچازاد حسن کو بتایا۔

حسن کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور غائب ہوگئی جو پاس بیٹھی فاطمہ پھوپھو کو چونکا گئی۔ فاطمہ پھوپھو کے دل کو دکھ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا وہ کچن میں آگئیں جہاں کنزہ ان کی لاڈلی بیٹی افطاری کی تیاری کررہی تھی اور ان کے دونوں بھتیجے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے جو کنزہ سے میتھس پڑھنے آئے تھے۔

فاطمہ اور ان کے تینوں بھائیوں کے گھریلو حالات بہت اچھے تھے وہ چاروں بہن بھائی ایک ہی محلے میں رہائش پذیر تھے اور ان کی اماں چاروں بچوں کو اپنے گھروں میں خوش حال دیکھ کر بہت خوش تھیں' مگر فاطمہ کے چھوٹے بھائی اسد کی ایک حادثے میں ٹانگ ٹوٹنے سے اس کے مالی حالات خراب ہونا شروع ہوگئے تھے اسد کی عزت نفس بہن' بھائیوں سے مزید مالی امداد لینا گوارہ نہ کرتی تھی۔ گو بڑے تینوں بہن بھائی اسد کی مدد کرنے میں پیش پیش تھے۔ اور فاطمہ جانتی تھیں کہ ان کا بھائی کبھی بھی اپنے بچوں میں احساس کمتری پیدا ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"امی! ہم سب مل کر افطاری کیا کریں گے۔ ہفتے میں دو دن۔ سب اپنی اپنی استطاعت کے مطابق افطار کے لیے کچھ نہ کچھ لائے گا تاکہ کسی کی جیب پر بوجھ نہ پڑے۔ اس طرح ہم کو مزہ بھی آئے گا اور مل بیٹھ کر کھانے سے پیار بڑھے گا۔" فاطمہ نے ستائشی نظروں سے اپنی لاڈلی کی طرف دیکھا جو بہت سمجھ دار تھی اور اس کا دل محبت کے جذبات سے لبریز تھا۔

"فاطمہ! تم سمجھتی ہو کہ اسد مان جائے گا۔" اختر میاں نے فاطمہ کی طرف دیکھا جو اپنے چھوٹے بھائی کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے کہ اس کی عزت نفس مزید مالی مدد لینا گوارا نہیں کرے گی۔

"ہاں کیوں نہیں مانے گا' اس میں کیا مضائقہ ہے؟" کنزہ کا مشورہ سن کر اماں بہت خوش تھیں انہیں یہ تجویز پسند آئی تھی۔ فاطمہ پھوپھو اپنے چھوٹے بھائی کے دونوں بچوں میں کسی طرح کا احساس کمتری پیدا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھیں اس لیے انہوں نے اسد سے بات کی تھی۔ اسد نے اپنے دونوں بچوں حسن اور ردا کی معصوم شکلوں کو دیکھا جو کارٹونز دیکھنے میں مگن تھے اور سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے تائیدی انداز میں سرہلادیا۔

روڈ ایکسیڈنٹ حادثے نے اسد کے مالی حالات کافی خراب کردیے تھے اگرچہ اب وہ ٹھیک تھے آفس بھی جانے لگے تھے' سعدیہ بھی اسکول میں پڑھاتی تھی' مگر ابھی ان دونوں کو بہت محنت کرنا تھی ان خوابوں کے لیے' جو انہوں نے اپنے بچوں کے لیے دیکھے تھے۔

"روزے کا اصل مقصد بھوکا پیاسا رہ کر اپنے نفس کو مارنا ہے اور ان لوگوں کی تکلیف کا احساس کرنا جن کو سارا سال بھوکا پیاسا رہنا پڑتا ہے اس کا مقصد صرف نت نئے کھانوں سے دسترخوان بھرنا نہیں بلکہ



ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے۔"

سب نے کنزہ کی طرف توصیفی نظروں سے دیکھا۔ وہ سب آج بڑے بھائی کی طرف افطاری کر رہے تھے اور چاروں بہن بھائی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق افطاری کا سامان لائے تھے جو کنزہ کے مشورہ کے مطابق صرف کھانے کی ایک ڈش پر مشتمل تھا جس میں نہ دکھاوا تھا' نہ نمود و نمائش' بلکہ کنزہ نے کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہونے دیا کہ کون کیا لایا؟ سب نے خاموشی سے افطاری کی اور اس کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کیں رات کو تمام افراد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے' کیونکہ اگلے جمعے کے دن ان کو دوسرے بھائی کے گھر روزہ افطار کرنا تھا اور اپنی استطاعت کے مطابق ایک ایک کھانے کی ڈش لانا تھی یہ جانے بغیر کہ کون کیا لایا؟ اور کسی دکھاوے کے بغیر کسی بھائی یا بہن کی عزت نفس مجروح کیے' کیونکہ ان کے دل پیار کی ڈوری سے بندھے تھے نہ وہ اپنے بچوں میں احساس برتری یا احساس کمتری پیدا ہوتے دیکھ سکتے تھے اور نہ اپنے چھوٹے بھائی کی عزت نفس کو مجروح کرنا چاہتے تھے۔

☼

فریدہ فرید

محبت یار دی کام آئے

''وفا تو کرو گی ناں؟''
سوال تھا کہ التجا تھی' شوق کا اظہار تھا کہ حسرت کی انتہا تھی' آنکھوں میں امید کے دیے جلائے' سفر کی تھکان چہرے پر سجائے کوئی سراپا انتظار تھا۔ وہ مانند بت اس کے سامنے ایستادہ تھی۔ نگاہ اٹھائے نہیں اٹھ رہی تھی اور جھکائے جھکتی نہیں تھی' کیا غضب تھا؟ ایک تہی دست دوسرے تہی دامان سے بھیک چاہتا تھا اس کی ویران آنکھوں سے چند آنسوؤں سے زیادہ کوئی پیمان نہ ہوسکا۔ اس کی زیست کی ساری کہانی اسی پانی میں نہاں تھی' جنہیں مجتبیٰ احمد نے زمین پر بکھرنے سے قبل اپنی کپکپاتی پوروں پر سمیٹ لیا۔ وفا کا مان چاہنے سے قبل' وہ مان بھرے انداز میں اس کی حاصل متاع اپنے لبوں پر سمیٹ گیا۔



قندیل ایاز نے دس روپے اس کے سر سے وار کے ویٹر کے ہاتھ میں تھما دیے جہاں مجتبیٰ احمد نے اس کی حرکت حیرت سے دیکھی' وہیں ویٹر بھی دس روپے کے نوٹ کو چٹکیوں سے پکڑ کر ناک چڑھاتا واپس لوٹ گیا تھا۔ دونوں بغیر دیکھے جان سکتے تھے کہ ویٹر نے دس

روپے کسی بھکاری کو نہ دے دی ہوگی۔

"قندی! یہ کیا حرکت تھی؟"

مجتبیٰ کو ایک تو انوکھی حرکت 'اوپر سے دس روپے کی حقیر حیثیت دونوں پر ہی اعتراض تھا سو سوال کافی تیکھے انداز میں وارد ہوا۔

"کیسی حرکت' صدقہ اتارا ہے تمہارا' آخر کو تم اتنے خوش تھے اور میں تمہاری خوشی کو دیکھ کر خوش 'نظر اتارنا ضروری تھا۔"

قندیل نے اس کی تھوڑی انگلیوں کی پوروں میں لے کر بچوں کی طرح اسے بہلایا' یہ الگ بات کہ بڑھی شیو سے سجی تھوڑی کسی بچے کی نہیں تھی۔

اٹھائیس سالہ مضبوط' صحت مند' گھنے بالوں' سرخ وسفید چہرے والا مجتبیٰ احمد خیر سے تعلیمی مراحل سر کیے اب تو چیف ایگزیکٹو کے عہدے پر بھی فائز ہو چکا تھا مگر اسے بڑا سمجھنے کو قندیل ہنوز تیار نہ تھی 'کیونکہ اس سے پانچ منٹ بڑا ہونے کا اعزاز بہرحال اسے حاصل تھا۔ ایک ہی دن ایک ہی وقت 'ایک ہی اسپتال میں دنیا میں وارد ہونے والے یہ دونوں نفوس تمام تر خصوصیات کے باوجود جڑواں نہیں تھے اب کیوں کا سوال اٹھنا لازمی ہے تو مختصر ترین جواب ہے کہ دونوں کی مائیں الگ الگ تھیں۔

زیبا اور دیبا دونوں بہنوں کی ایک ساتھ شادی اور اللہ کے کرم سے ایک ساتھ بہرہ ور ہونے کی تک تو سمجھ آتی ہے 'مگر ایک ہی دن ڈلیوری میں اللہ کی تدبیر کے ساتھ ذرا سا ہاتھ زیبا کا بھی تھا' زیبا کو چند پیچیدگیوں کے باعث آپریشن بتایا گیا تو اس نے دیبا کی نارمل ڈلیوری کے ساتھ آپریشن کی تاریخ کو سیٹ کروادیا اس میں شک نہیں کہ ایسا کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں 'یقیناً" اللہ کی تدبیر میں ہی دیبا کو یہ راہ فراہم کرنا پوشیدہ تھا۔

قصہ مختصر دونوں خالہ زاد قندیل اور مجتبیٰ مانند جڑواں دنیا میں تشریف لائے اور زندگی کے تمام مراحل ایک ساتھ طے کرتے آج اس مقام پر تھے کہ مقامی کیفے ٹیریا میں مجتبیٰ نے قندیل کو نئی نئی حاصل ہونے والی خوشی سے آگاہ کیا۔

"قندی تو تصور کر ہی نہیں سکتی کہ جب میں نے

ناولٹ



سندس سے حکایت دل بیان کی تو اس نازک لب نے کیا افشاں کیا۔ میں کچھ سن نہ پایا دیکھا تو صرف اس کے شفق نمار خسار کو رسیلی مسکراہٹ تکلم کر رہی تھی تو شعلہ گوں عارض بے دم کر رہے تھے 'نہیں جانتا کہ ان قدموں کے ساتھ تیرے پاس کیسے آپایا ہوں۔"

"میرے خیال میں تو' تم آئے ہی نہیں ہو' ابھی تک وہیں ہو۔"

جذب نہاں سے گھائل مجتبیٰ کو قطع کلامی کیے بغیر قندیل واپس لا بھی نہیں سکتی تھی گرچہ بات درست تھی مجتبیٰ قندیل کے سامنے ضرور تھا' مگر تھا سندس کے پاس ۔ دونوں کی مشترکہ یونیورسٹی فیلو سندس ریحان کی کون سی ادا مجتبیٰ کے اندر گھر کر گئی' وہ نہیں جانتا تھا وہ کب اپنے شب و روز اس کے نام کر گیا' کب وہ اتنا اندر اتر گئی۔ کہ بات ہو تو اس کی ذات ہو تو اس کی مانند وہ عشق کے آب و رنگ میں نہا گیا اس کی دیوانگی سے کرن ۔ واقف نہ تھا اور قندیل تو ویسے ہی ہر لمحے کی ساتھی تھی' ساتھ بیٹھے مجتبیٰ کا دیوانوں کی مانند سامنے بنچ پر براجمان سندس کو تکتے جانا اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھا۔ پروفیسر کی آمد پر سخت ہاتھوں کی چٹکی لے کر وہ اسے کلاس روم میں حاضر کیا کرتی تھی' سندس کو گھر تک چھوڑ کے آنا اور اس کے گھر کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہنے کی ذمہ داری مجتبیٰ نے اپنے سر کیا لی کہ اس کے تمام نوٹس مکمل کرنا اور تھیسس تیار کرنے کی ذمہ داریاں قندیل نے بخوشی اٹھالیں۔ وہ عشق کے داؤ پیچ میں الجھا رہا اور وہ اس کے لیے گھر کے اندر اور باہر آسانیاں مہیا کرتی رہی بالآخر وہ دن آن پہنچا جب ایک ہی ہوٹل میں مجتبیٰ نے اسے چیف ایگزیکٹو بننے کی ٹریٹ دی تو قندیل نے اشعر سے شادی طے پا جانے کی مٹھائی کھلائی۔ رنگ زندگی پیہم رقصاں تھے۔



"آج مطلع انتہائی ابر آلود ہے' ذرا سنبھل کے۔"

حسنہ کی اطلاع نئی تھی نہ وہ خود کوئی فرد واحد تھی' بلکہ وہ ساتواں نمبر آف کزن تھی جس نے قندیل کو گھر میں داخل ہوتے ہی خبر بہم پہنچائی تھی اور ہر ایک کو جواب میں اس کی کھنکتی ہنسی نے مطمئن کرایا تھا۔

قندیل اشعر کی کھل کھل کتنی اثر انگیز تھی' اس خوبی سے وہ بخوبی واقف تھی۔ مجتبیٰ احمد کا غصہ پانی کے بلبلے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا وہ اپنی نازک لانبی انگلیوں سے یہ جھاگ پھوڑ دیا کرتی تھی' جیسا کہ اب ہوا تھا وہ جو ہفتہ بھر سے کھولتا رہا تھا کہ محترمہ میکے آویں اور وہ حال دل سناوے' سارا غصہ بھلائے جلدی جلدی اس کے ہاتھ کے ابلے چاول پر رائتہ ڈال کر کھاتے ہوئے محو گفتگو تھا۔

"یا تو کھانا کھالو یا بات کرلو۔" قندیل اس کے تہذیب سے عاری طریقہ تناول کی گرچہ عادی تھی' مگر نصیحت کرنا کبھی بھولتی نہیں تھی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی' تمہاری زبان ایک ہی وقت میں چکھنے اور بولنے کا کام کرکیسے لیتی ہے؟" اسے قطعاً" یاد نہیں تھا کہ وہ اب تک کتنی بار اس سے یہ سوال پوچھ چکی تھی اس کا جواب ہمیشہ ایک ہی ہوتا تھا۔

"قندی! ندیدوں کی طرح مجھے دیکھنے کے بجائے خود ٹھونس لیا کرتو ذرا سی صحت بن جائے تیری بھی اور میری بھی۔" اور وہ اس کی نہ بنتی صحت کی بابت سوچ کر کڑھتی رہتی۔

"سندس کے ساتھ سمندر کی لہریں دیکھنے کا مزا ہی اور ہے' اس کی سنگت بے رنگ پانی کو بھی رنگ دیتی ہے قندی! قوس قزح اس کے وجود سے تخلیق پاتی ہے' وہ سامنے ہوتی ہے اور میں اسے سوچ رہا ہوتا ہوں جیسے کہ وہ میلوں کے فاصلے پر ہو اسے پانا سراب کیوں معلوم ہوتا ہے۔" مجتبیٰ کی ہر بات سندس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی' کچھ قدرت نے اسے حسین تخلیق کیا تھا اور کچھ مجتبیٰ کی چاہت نے اسے حسن کا شاہکار بنا دیا تھا۔

"مجتبیٰ، کچھ عرصے میں ایک ہو جاؤ گے تم دونوں تو سارے واہمے دم توڑ دیں گے تب تک کے لیے میرا مشورہ ہے کہ کم ملا کرو۔" قندی بہترین سامع تھی وہ پچھلے کئی سالوں سے اس کی حکایت عشق سن رہی تھی حسب ضرورت مشوروں سے نوازتی رہتی، مگر ایسا مشورہ مجتبیٰ کو حیرت میں ڈال گیا۔

"کیوں؟ اس میں کم یا زیادہ ملنے کا کیا تعلق؟ تم جانتی ہو کہ میں اس طرح کی پابند۔۔۔"

"ارے نہیں! میں اس حوالے سے نہیں کہہ رہی ہوں۔" مجتبیٰ کو بات غلط سمت لے جاتے دیکھ کر وہ فوراً" تصحیح کرنے لگی۔

"میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم محبت میں گوڈے گوڈے تک دھنسے ہوئے ہو اور شادی محبت کا اینڈ ہے' کہیں ایسا نہ ہو یہ رنگ وفا شادی کے بعد محض ایک رنگین کہانی ثابت ہو' اس لیے خود کو جانچنے کے لیے تھوڑا سا اسپیس (Space) دو۔" مگر مجتبیٰ کو لگا کہ قندیل کی ازدواجی زندگی کا اس کی بدلتی سوچ کے ساتھ ربط ضرور تھا سو پہلی بار وہ اپنی کہنے کے بجائے اس سے دریافت کرنے لگا۔

"کیا ہوا قندی! کیا تم اس رنگ الفت کے کچے پن کا شکار تو نہیں ہوگئی ہو۔" اشعر قندیل اور مجتبیٰ کا کزن تھا طوفانی عشق کی داستان اگرچہ نہ تھی' مگر اشعر اور قندیل کی شادی ان دونوں کی باہمی رضامندی اور ذہنی ہم آہنگی کے بعد ہی ہوئی تھی ڈیڑھ برس گزرا تھا ان کی شادی کو اور قندیل کی کِھل کِھل اور دمکتی رنگت کچھ بھی تو اس طرف اشارہ نہ کرتے تھے' اس لیے مجتبیٰ کو اپنے سوال کے بودے پن کا خود بھی اندازہ تھا۔

"رہنے دو یہ کچا' پکا عشق اور دور جدید کی اصطلاحات سے مجھے تو معاف ہی رکھو' اشعر ان خرافات میں پاؤں کیا ہی دھرے گا میں اس کی لائف سے نو دو گیارہ ہو جاؤں گی۔" قندیل صاف گوئی سے کہہ گئی۔

☆ ☆ ☆

مجتبیٰ کا عشق وصال کے مرحلے میں داخل ہونے کو تھا۔ وہ سندس سے روبرو ہونے کے قریب تھا کیا کیا مدوجزر نہیں اٹھتے تھے اس کی سوچوں میں جنہیں بیان کرنے کے لیے بہترین سامع کی کمپنی میسر نہیں آتی تھی' قندیل اس کی شادی کی تیاریوں میں بھرپور طریقے سے مگن تھی' ویسے بھی وہ خاندان کے تمام غم و خوشی کے معاملات کی ہمیشہ سے انچارج رہی تھی۔ مجتبیٰ اینڈ کمپنی نے تو اسے "فیملی بھوت" کا خطاب دے رکھا تھا۔ کیوں کہ وہ بھوت کی مانند ہر جگہ موجود ہوتی تھی۔

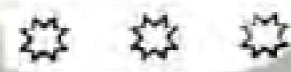
"قندی سندس کی مایوں کے جوڑے کی تصویر ضرور لے کر آنا جسے دیکھنا ضروری ہو اسی سے چھپاتے ہیں ظالم لوگ بھلا دیکھو پابندی بھی کیسی ہے لال جوڑے میں تمہاری' پیلے میں ہماری! حد ہو گئی۔"

وہ آنکھوں کو لائٹ شیڈز دیتی قندیل کے سر پر سوار اپنی کہے جارہا تھا جو اپنے کام میں اتنی مگن تھی' گویا اس سے ضروری اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ قندیل کو میک اپ کا کریز تھا وہ ہمیشہ ڈارک کلرز پہنتی اور ڈارک ہی شیڈز استعمال کرتی تھی' مگر آج نہ تو وہ بہت شوخ رنگ پہنے تھی نہ ہی میک اپ میں گہرے پن کا احساس تھا۔ اوپر سے کِھل کِھل کی کمی الگ جان لیوا تھی مجتبیٰ جو وصال یار کے لیے بے چین تھا اس کے رویے کی تبدیلی نوٹ کرکے بھی انجان ہی رہا اور وہ اپنی سنانے کے لیے اس کے سوال کی منتظر ہی رہی۔

"اف سندس کہاں سے اتنا روپ چرا کے لائی ہو کند چھری سے ذبح ہو رہا ہوں میں۔" قندی کے موبائل پر سندس سے حال زار کہتا وہ دنیا مافیہا سے بے نیاز نظر آتا تھا۔ سندس کی رسیلی ہنسی اور اپنے اظہار شوق میں الجھے وہ قندیل کی خاموشی مکمل فراموش کرچکا تھا سو وہ دھیرے دھیرے قدموں سے چلتی وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ مجتبیٰ کی شادی کے لیے اس سے زیادہ پرجوش کوئی نہیں تھا' کیوں کہ دونوں دوست اکلوتے تھے' نہ مجتبیٰ کو ویر کہنے والی کوئی تھی نہ قندیل کا کوئی ۔۔۔ ویر تھا' سو وہ ایک دوسرے کی کمی پوری کردیا کرتے تھے۔

مجتبیٰ کی شادی کے تمام نیگ وصول کرتے اور رسومات انجوائے کرتے وہ سوچوں کے ڈستے ناگ سے دامن بچاتی رہی۔ انس عارف کی آمد نے شادی کی رونقیں مزید بالا کردی تھیں۔ مجتبیٰ کے چچا زاد انس کا اس کی شادی پر آنا گھر بھر کے لیے سرپرائز سے کم نہیں تھا۔

سرخ جوڑے میں اس کے من آنگن کو مہکاتی سندس کو دیکھ دیکھ کر وہ نہال ہوا جاتا تھا۔ انس کے شرارتی کیمرے سے اس نے خوب رومانٹک پوز بنوائے تھے اس سارے ہنگامے میں مجتبیٰ سمیت سارے کزن قندیل کی غیر موجودگی کو نظر انداز کرچکے تھے جو بھیگے گالوں کو بے دردی سے رگڑتی کونے کھدروں میں گھسی جاتی تھی خود پر قابو رکھنے میں جب کامیاب نہ ہو پائی تو اشعر کے ساتھ گھر لوٹ گئی۔



"مجتبیٰ جاگ رہے ہو یا نیند میں چل کر آئے ہو۔" شادی کے دو دن بعد علی الصبح مجتبیٰ کی آمد اسے حیرت زدہ کر گئی' وہ دیر تک سونے کا عادی تھا

"جاگ رہا ہوں بلکہ کافی دیر گزر گئی جاگتے ہوئے' سونا چاہتا تھا اسی لیے یہاں آیا ہوں۔" مجتبیٰ کے لہجے میں خفیف سی افسردگی تھی۔

"یہاں سونے کے لیے' سندس کو لوری نہیں آتی!" وہ شرارت برساتی آنکھوں سے پہلے تعجب اور پھر استہزائیہ گویا ہوئی۔

"حال دل کہنے آیا ہوں جب تک کہوں گا نہیں سو نہیں پاؤں گا۔" وہ قدرے جھنجلا کر چبا چبا کر بولا تھا اور یہ بات سچ بھی تھی وہ جب تک "عظیم سامع" کو سزائے سماعت نہ دیتا سکون سے رہ نہیں پاتا تھا۔

"اچھا تو کہو سندس نے جب پہلی صبح بیڈ روم میں آنکھ کھولی تو گویا کلیاں مسکرا اٹھیں' رات بھر کی پتوں پر گری شبنم کسمسا اٹھی' سورج کی کرنیں شرما گئیں اور۔۔۔ اور اور۔"

وہ ہنوز شرارتی انداز میں اس کے شاعرانہ تخیل کی نقل کرتے ہوئے الفاظ کی کمی پر اور اور کرنے لگی وہ جانتی تھی کہ مجتبیٰ کو سندس کی شان میں قصیدہ گوئی کے سوا کوئی کام نہ تھا' مگر اسے حیرت کا جھٹکا لگا جب مجتبیٰ نے اس کے قصیدے کو مکمل کرنے کے بجائے خاموشی کا سہارا لیا تو وہ بھی سنجیدگی کے دائرے میں آنے لگی۔

"وہ سب میرا تصور ہے' مگر سندس اپنے انداز سے سوچنے کی عادی ہے۔" مجتبیٰ نروٹھے انداز میں کہنے لگا قندیل دوران گفتگو معمول کے کام بھی نپٹا رہی تھی ہاتھ میں گلاس لیے اب وہ فریزر کی طرف بڑھی تھی اس کی مصروفیت اس جانب اشارہ تھا کہ وہ مجتبیٰ سے کسی خاص بات کی توقع نہیں رکھتی تھی' اس کے نزدیک مجتبیٰ نے خود کو محبت کے شیرے میں اس طرح ڈبو دیا تھا کہ اب اس کے لیے ذرا سی بے نیازی بھی ناقابل قبول تھی سندس کی زندگی کی کٹھنائیوں کا اسے اندازہ تھا۔

"قندی! اس کا اندر بھی اس کے ظاہر کی طرح جان لیوا ہے' اسے دیکھ دیکھ کر تڑپتا ہوں تو اس کی بات سن کر بھی بے سکون ہوں یہ محبت مجھے مار دے گی۔" قندیل بچوں کی طرح بلبلاتے مجتبیٰ کے پاس چلی آئی اور اپنے مخصوص شفیق انداز میں اس کے بکھرے بال سمیٹنے لگی۔

"تو پوچھے گی نہیں کہ ہوا کیا ہے؟" مجتبیٰ اپنی بات کی طوالت اور قندیل کے کچھ بھی دریافت نہ کرنے سے خود بھی بے زار ہو گیا تھا' سو اپنے سر پر دھرا اس کا ہاتھ تھام کر سختی سے بولا۔

"اچھا بتاؤ محب سے محبوب فریفتہ کی شان میں کیا گستاخی ہو گئی ہے او نہیں' کچھ الٹا ہو گیا میرا مطلب۔۔۔" قندیل اس کے انداز کی نقالی میں ہمیشہ ناکام رہتی تھی' مگر باز پھر بھی نہیں آتی تھی۔ مجتبیٰ کے ہلکے سے قہقہے نے اسے راحت فراہم کی۔

"رہنے دو کوئی گستاخی نہیں ہوئی بس ایک ذرا سی بات مجھے جذباتی کر گئی قندی! سندس دماغ سے سوچنے کی عادی ہے۔" قندیل نے مجتبیٰ کی بات سختی سے کاٹی

تمہید بوریت کے مراحل میں داخل ہو گئی تھی۔

"قندی! سندس کہتی ہے اسے کچھ سالوں تک بچے کا جھنجھٹ نہیں پالنا' کتنی اسٹوپڈ سوچ ہے اس کی یار بچہ تو پیار کی نشانی' انسانی شناخت ہوتا ہے' مگر وہ اسے غیر ضروری ذمہ داری قرار دیتی ہے۔" وہ بات کرتے کرتے قندیل کو دیکھ کر چونک گیا قندیل کا انداز اس کی توقع سے ہٹ کر تھا۔ وہ شدید کرب میں دکھائی دیتی تھی' اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے دبائے آنکھیں پھاڑے دیوانوں کی مانند اسے تک رہی تھی' ایک لمحے کو اسے لگا قندیل کی روح بدن سے الگ ہو گئی ہے ایسا شدید ردّعمل مجتبیٰ کے لیے حیران کن تھا۔

"قندی ٹھیک تو ہو؟" ہوا کیا ہے' مجتبیٰ نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر تقریباً" جھنجھوڑ ڈالا تھا' تب وہ حواسوں میں لوٹی تھی' اپنی عجیب کیفیت پر وہ خود بھی نادم دکھائی دیتی تھی' خود کو کنٹرول کرتے کرتے بھی اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"قندی۔"

"میں ٹھیک ہوں مجتبیٰ! بس تمہاری طرح میں بھی جذباتی ہو گئی تھی۔" مجتبیٰ کو حد سے زیادہ فکر مند دیکھ کر وہ اسے مطمئن کرتے ہوئے بولی۔

"بس قدرت کے کھیل پر حیران تھی' کہیں کوئی اس تحفہ کو بوجھ سمجھتا ہے تو کہیں کوئی یہ بوجھ اٹھانے کو تڑپتا ہے۔" قندیل دلگرفتہ ضرور تھی' مگر قدرے سنبھل گئی تھی۔

"قندی اب اصل بات بھی بتا دو۔" مجتبیٰ کے ڈپٹنے پر وہ استہزائیہ ہنسی تھی' کیوں کہ دیر اس نے بتانے میں نہیں مجتبیٰ نے دریافت کرنے میں لگائی تھی۔

"سندس کو بچہ نہیں چاہیے اور قندیل کو بچہ دینے پر قدرت راضی نہیں۔" وہ دو ٹوک لفظوں میں کہہ اٹھی۔ مجتبیٰ چونک گیا ایسی کسی بات کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا' یہ قندیل کیا کہہ رہی تھی' اس کی مسلسل خاموشی اور موجودہ کیفیت کی وجہ ہو گی یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

"دو سال سے مسلسل ٹیسٹ کروا رہی ہوں' اب فائنل رپورٹس یہ ہی آئی ہے کہ میں بنجر زمین ہوں وائے عجب کوئی لینے سے انکاری ہے اور کسی کو قدرت دینے سے انکار کر دیتی ہے۔" قندیل نہ چاہتے ہوئے بھی ساون بھادوں برسا رہی تھی۔ کتنے تکلیف دہ آنسو ہوتے ہیں جو باہر کے ساتھ ساتھ اندر بھی گھائل کر دیتے ہیں' بلعض درد ایسے ہوتے ہیں جن کا درماں کوئی نہیں ہوتا' کوئی حرف تسلی نہیں ہوتا' کوئی مداوائے غم نہیں ہوتا۔ مجتبیٰ کو رتی برابر بھی اس کے اندر کے اس زخم کا اندازہ ہوتا تو وہ اس کے سامنے کبھی یہ موضوع نہ چھیڑتا۔

"تم اتنا بڑا درد تنہا سہہ رہی تھیں' مجھے بتایا تک نہیں۔" مجتبیٰ چاہتے ہوئے بھی اس کے آنسو نہ پونچھ پایا' ہاتھوں میں دم نہیں تھا یا اس درد میں بہتے آنسوؤں میں شدت ہی بہت ہوتی ہے۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ سندس کے ایک بچکانہ فیصلے پر جسے وہ سختی سے رد بھی کر چکا تھا' وہ کتنا دلبرداشتہ تھا تو جس سے یہ امید ہمیشہ کے لیے چھن جائے' اس کی تڑپ' اس کے کرب کا شاید ہی کوئی اندازہ کیا جا سکے۔

"یہ تمہاری شادی کے دنوں کی بات ہے میں خوشی کے شادیانوں میں اپنی کم بختی کا ماتم نہیں کرنا چاہتی تھی۔" قندیل کی بات سے اختلاف کے باوجود اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔



"سندس! تھوڑا سا لے لو یار! ٹھنڈا ہو گیا تو پینے کے قابل نہیں رہے گا۔" مجتبیٰ کی پکارتی آواز اور سندس کے نخریلے اوں ہوں نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ سجا دی' گھر میں قدم رکھتے ہی اس حسین ہلچل نے خوش گواریت کا احساس بخشا تھا' وہ سیدھی صوفے پر دراز سندس اور سوپ کا پیالہ ہاتھ میں لیے التجا کرتے اس کے پہلو میں بیٹھے مجتبیٰ کے پاس چلی آئی۔

"پی لو سندس! سوپ ہو یا پیار ٹھنڈا بہت جلدی ہو جاتا ہے۔" وہ مجتبیٰ کی حمایت کرتی سندس سے شرارتی پن سے بولی۔

"قندی! تم ہی اسے سمجھاؤ نہیں دل چاہ رہا کچھ بھی کھانے کو متلی ہو جائے گی ایک تو زبردستی اس مصیبت میں الجھا دیا اوپر سے کھلانے پلانے اٹھانے بٹھانے میں بھی زبردستی، تھوڑا وقت اور سکون سے گزار لیتے۔" سندس پیا من چاہی اور اللہ کی نعمت سے نوازی گئی ہستی تھی نخریلی ادائیں کیسے نہ بجتیں اس پر، مگر قندیل کے پھیکے پڑتے چہرے کو دیکھتے ہی مجتبیٰ موضوع بدلنے لگا۔

"او قندی! اب تو حویلی اپنے بھوت کو ترسنے لگی ہے کہاں رہتی ہو اتنے اتنے دنوں تک صورت نہیں دکھاتیں۔" مجتبیٰ سندس سے توجہ ہٹائے اس کے پاس آن بیٹھا تھا جو اپنے درد کو اپنی ـــــ کھکھلاہٹ میں چھپائے پھر سے ہشاش بشاش دکھائی دیتی تھی۔

"بس وہ چچی جان تنہا ہوتی ہیں گھر میں اشعر تو پوسٹنگ کے بعد مہینوں گھر کا چکر نہیں لگاتا ہے اور تینوں نندیں بھی کم کم ہی آتی ہیں اب ایسے میں چچی جان کو چھوڑ کے آنا اچھا نہیں لگتا۔" قندی تفصیل سے بتانے لگی اشعر تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ والد حیات نہیں تھے اور والدہ معذور تھیں قندیل نے اشعر کے ساتھ جانے کے بجائے ساس کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی اب وہ کیسے بتاتی کہ اشعر نے ساتھ لے جانے کی ضد ہی کب کی تھی

"ہیلو فرینڈز اور مائی ڈیئر سندس! کیا حال چال ہیں؟" انس کی اچانک پرجوش آمد اور زور دار حال احوال نے ماحول کو اچھا رخ دیا تھا سندس کو الگ سے پکارنا قندیل کو عجیب لگا تھا مگر مجتبیٰ کو مطمئن دیکھ کر وہ بھی نظر انداز کر گئی باقی تمام وقت مجتبیٰ، سندس کے صدقے واری جاتا رہا انس سندس کو دیکھتے ہوئے قندیل سے محو گفتگو رہا اور وہ محض لایعنی سوچوں کو جھٹکتی مسکراتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"دماغ تو نہیں خراب ہو گیا تمہارا کیوں ایثار بننے پر تلی ہوئی ہو یہ افسانوی باتیں کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں یا فلموں میں، حقیقت میں زندگی ایسی فضول قربانیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔" مجتبیٰ کی چیخ و پکار اس کے لیے نئی نہیں تھی اب تک جس نے بھی اس کے فیصلے کے بابت سنا تھا یوں ہی اسے سمجھایا اور دھمکایا تھا کچھ دیر پہلے دیبا بھی اپنی اکلوتی صابر بیٹی کو سمجھانے کا فریضہ ادا کر کے گئی تھیں۔ مجتبیٰ کو اس بات سے آگاہ بھی انہوں نے ہی کیا تھا اور وہ حسب توقع اس کے روبرو تھا۔

"قندی! میں دیوار سے بات نہیں کر رہا تم سے مخاطب ہوں۔" وہ قندیل کی مسلسل خاموشی پر ضرورت سے زیادہ چڑ چکا تھا۔

"دیوار ہی تو ہوں میں، مٹی گارے سے بنی صرف ایک دیوار جس کی مٹی کبھی زرخیز ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی بیل پروان چڑھ سکتی ہے بے ثمر درخت....." قندیل یاسیت کی انتہا پر تھی مگر حقیقت یہ تھی کہ اس کا ہر لفظ اس کے ذہنی کرب کا آئینہ دار تھا۔

"اسٹاپ اٹ قندیل! زندگی بے شمار خواہشات کا نام ہے اسے صرف ایک خواہش اور حسرت کی نذر کر دینا عقل مندی نہیں اولاد زندگی کے لیے ضروری ضرور ہے مگر زندگی نہیں ہے سات رنگوں سے بنی ہوئی ایک حساس نازک عورت ہو تم، تمہارے اندر زندگی ہے، حرارت ہے، خوشی ہے، صرف ایک کمی تمہارے وجود کو مائنس نہیں کر سکتی۔" مجتبیٰ کبھی بلند کبھی دھیمے، کبھی نرمی سے بہلاتے کبھی سختی سے دھمکاتے۔ ہر ممکن طریقے سے اسے سمجھانے کا فریضہ ادا کرتا رہا۔

"مگر یہ خوبیاں کسی کو نظر نہیں آتیں مجتبیٰ! تمہارے کہہ دینے سے اور میرے مان لینے سے کیا فرق پڑتا ہے اشعر اور اس کی بہنوں کو مجھ سے وفا نہیں اولاد چاہیے اپنی ریاضت سے اپنے اللہ کو راضی نہ کر سکی تو ان سب کو کیسے مناؤں؟ اشعر کو دوسری شادی کی اجازت دے کر اپنی خدمت، وفا ایثار سب کچھ

اپنے ساتھ لیے زندگی گزار لوں گی وقت ہی ہے بیت جائے گا۔" قندیل نے نہ صرف عزم سے فیصلہ کیا بلکہ ہمت اور حوصلے کے ساتھ اشعر کی دوسری شادی کروادی اس شرط پر کہ وہ اسے بھی خود سے جدا نہیں کرے گا۔ مجتبیٰ سمیت گھر والوں کے پاس سوائے کڑھنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہ بچا تھا۔



کبھی کبھی زبان سے نکلے الفاظ کا بوجھ اٹھانا کتنا مشکل ہو جاتا ہے اس کا اندازہ اسے اب ہوا تھا اولاد کی بابت قندیل کو دیتی اس کی طفل تسلیاں خود اسی پر لوٹ آئیں گی اس نے کب سوچا تھا؟ سندس کی بے احتیاطی تھی یا قدرت کو امتحان مقصود تھا' سندس کے بچہ ضائع ہونے نے اسے انتہائی رنجیدہ خاطر کر دیا اوپر سے قندیل کا اس سے فاصلہ بڑھا لینا کہ اس کی نحوست کا سایہ مجتبیٰ کی زندگی پر پڑ گیا ہے اسے اور بھی تاؤ دلا گیا' نتیجتاً وہ "عظیم سامع" کے کانوں میں لاوے کی طرح پھٹ پڑا۔

"قندی! میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری سب ڈگریاں سو روپے میں بیچ کر نان چھولے کھا لوں کیسی پڑھی لکھی جاہل ہو' تعلیم نے تمہیں جہالت سے نکالا نہیں' لگتا ہے اور بھی اندر دھنسا دیا ہے۔"

"جذباتی مت بنو مجتبیٰ! آنکھوں دیکھی حقیقت کو جھٹلاؤ مت' نہ میں تمہاری زندگی میں ہوتی نہ تمہاری اتنی قیمتی خواہش رائیگاں جاتی۔" قندیل خود کو مورد الزام ٹھہرائے جاتی اور اسے اور بھی رنجیدہ کرتی تھی۔

"قندی خود کو اتنا بے مول کیوں سمجھ لیا ہے تم نے' میری خواہش سے زیادہ قیمتی میرے لیے تم ہو۔ مخلص دوست سے بڑھ کر کوئی نعمت ہے دنیا میں' اور ویسے بھی یہ صرف ایک آزمائش تھی میرے پیار کی' اللہ چاہے گا تو میرے صبر کے بدلے مزید نوازے گا میں مایوس نہیں۔"

"ان شاء اللہ۔"

قندیل نے اس پر عزم چہرے کو دیکھتے پر خلوص لہجے میں کہا اور دل سے اس کی خوشیوں کے لیے دعا کی۔

وقت کی رفتار گھڑی کی سوئیوں کی مانند ہے تو زندگی بدلتے موسموں کی طرح ہر قدم پر نیا سپنا دکھاتی ہے کبھی غم کو خوشی کے رنگ میں ڈھال دے تو کبھی ہنستے ہنستے رلا دے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ لب بلاوجہ مسکراتے تھے۔ لایعنی باتوں میں کئی گھنٹے بیت جاتے تھے اور اب یہ عالم تھا کہ زندگی گزر رہی تھی اور وہ اس کا دامن تھامے ساتھ چلنے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جاتے تھے۔ حد سے زیادہ خاموشی اس کے لیے ناقابل برداشت ہونے لگی تو بلاوجہ چائے ساسر میں انڈیل کر زوردار سڑکیاں لینے لگی' سڑسڑ کی آواز پر وہ خود ہی ہنس دی کافی دیر تک خواہ مخواہ ہنس ہنس کے وہ گہرا سانس لے کر اٹھ گئی۔

قندیل نے اشعر کو اپنی ایک صفت کی کمی پر خود سے دور کیا کیا' اس نے تو اس کی ذات ہی کی نفی کر دی' اس کے ایثار کے عوض دو لفظ پیار کے بولنے کا بھی روادار نہ رہا تھا۔ کئی کئی ماہ اس کی طرف نگاہ نہ کرنے والا یہ فراموش کر گیا کہ وہ صرف اولاد پیدا کرنے سے محروم تھی ورنہ سانس لیتی' جیتی جاگتی انسان تو تھی' مگر ہمارے معاشرے میں ساری صلاحیتیں ایک طرف اور محض بچہ پیدا کرنا ایک طرف۔

"قندی' ایک کپ چائے مجھے بھی دو۔" وہ اپنی سوچوں میں اتنی محو تھی کہ مجتبیٰ اس کے سامنے ڈائننگ ٹیبل پر آن بیٹھا اسے خبر نہ ہوئی اور شاید مجتبیٰ بھی تھکا ہوا تھا وہ اس کی غائب دماغی اور پھر چونکنا کچھ بھی محسوس نہ کر سکا۔

"کیا ہوا؟ سندس کے بغیر ناشتہ کرو گے تو ہضم کیسے ہو گا۔" وہ دونوں ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے تھے اس لیے قندیل مسکرا کے بولی۔

"اب وہ گھر پر نہ ہو تو کیا بھوکا رہوں۔" سندس میکے میں تھی اور وہ اداس' صورت حال تو بالکل واضح تھی وہ اس کے کپ میں چائے ڈال کر اپنی پلیٹ سے دو پاپے اٹھا کر اس کے سامنے رکھنے لگی' سراسر شرارت کا موڈ

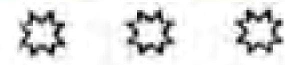
تھا کیوں کہ مجتبیٰ کو رسک سے کتنی چڑ تھی وہ جانتی تھی' مگر حیرت کا مقام تھا کہ مجتبیٰ نے رسک چائے میں ڈبو کر منہ میں رکھ لیا غائب دماغی یہیں نہیں وہاں بھی تھی۔ وہ ایک بار پھر بلاوجہ کھلکھلا اٹھی۔

"مجتبیٰ! بہت بدل گئے ہو۔" وہ اس کی ناک کھینچ کر بولی۔

"ہاں' پیار ہر رنگ میں ڈھل جانا سکھاتا ہے' میں نے اپنی سوچ' پسند ناپسند' ترجیحات سب کو پیار کا جامہ پہنا کر سندس کا اوڑھنا بنالیا ہے' وہ تکلفات سے کتراتی ہے اس نے ناشتے میں رسک رکھنا شروع کیا میں نے کھانا شروع کردیا بس سو سمپل زیادہ لمبی چوڑی کہانی نہیں ہے میری۔" مجتبیٰ کو عشق کا عجب بخار چڑھا تھا اپنی ذات کو کسی اور کے سانچے میں ڈھالنا کتنا مشکل امر ہے۔ قندیل کو سندس کی قسمت پر رشک آیا' سونے کے قلم سے نصیب لکھا گیا تھا سندس کا وہ سوچے بنا نہ رہ سکی۔

"ویسے ان عاداتِ شریفہ کے لیے ہمارے معاشرے میں ایک خاص اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔" وہ شرارت سے لب دانتوں میں دبائے بولی۔

"ارے میں مستند "زن مرید" ہوں مجھے بے شک گولڈ میڈل پہنا دو۔" مجتبیٰ اس کا اشارہ سمجھ کر کمال ڈھٹائی سے بولا۔ قندیل کی بے ساختہ ہنسی نے بوجھل صبح کو خوش گوار کردیا تھا۔



"مجتبیٰ!"

تیسری بار پکارنے پر مجتبیٰ نے سر اٹھایا تھا قندیل کو اس کی ذہنی پراگندگی کا اندازہ ہوا۔

سندس میکے سے اس کے لیے دکھ لے کر آئی تھی ایک بار پھر تین ماہ کا حمل گر گیا تھا مجتبیٰ کے لیے انہونی انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوتی تھی۔ اب کی بار وہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ سندس کے متکبرانہ بول پکڑ میں آچکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پیار کی پھوار میں لڑائی کا چھینٹا پڑ چکا تھا۔ حسب معمول خالہ کے بلاوے پر قندیل دوڑی چلی آئی تھی قندیل کے والد کے انتقال کے بعد مجتبیٰ خالہ اور قندیل کو اپنے گھر لے آیا تھا' سو قندیل کا میکہ مجتبیٰ کا ہی گھر تھا اشعر کی دوسری شادی کے بعد وہ زیادہ تر وقت میکے میں ہی رہتی تھی' چچی جان سمیت' مگر دو دن قبل اشعر کی آمد پر وہ گھر لوٹ گئی تھی' مگر آج پھر اس کے روبرو تھی۔

"قندی اسے سمجھاؤ یہ اس معاملے کو لے کر اتنا پوزیسو کیوں ہے؟" سندس دھیمے قدموں سے چلتی ان کے پاس آ بیٹھی تھی' نقاہت اس کے چہرے سے عیاں تھی پے در پے بچے ضائع ہونے نے اس کی شادابی نچوڑلی تھی' مجتبیٰ کی سندس اب پہلے جیسی نہ رہی تھی تب ہی تو مجتبیٰ کی چاہت کا اول روز کی طرح جنونی پن اسے اور بھی حیران کردیتا تھا۔

"قندی اسے بتاؤ کہ میں ہر بات سے بڑھ کر صرف اس کی ذات کے لیے فکر مند ہوں اب بھی میری تکلیف کا سبب اس کی یہ حالت ہے اگر یہ ذرا سی احتیاط کرے تو اسے اتنی بڑی اذیت نہ سہنا پڑے۔"

مجتبیٰ نے بھی قندیل کے ذریعے بات پہنچائی جو کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی' سندس نے جہاں لفظوں کی ادائیگی میں لاپروائی کی تھی' وہیں ضروری تدابیر کو بھی — فضول سمجھا تھا' مگر قندیل کے لیے دونوں کو سمجھانا مشکل امر تھا' وہ سامع اچھی ضرور تھی' مگر ناصح بالکل نہیں تھی۔

"او کے لیواٹ یہ وقت تم دونوں کا ایک ساتھ بیٹھ کر دکھ سکھ بانٹنے کا ہے' گلے شکوے کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔" وہ اپنی دانست میں دونوں کو پچکارتے ہوئے بولی۔

"میرے خیال میں ایک کپ چائے تو بنتی ہے۔" انس کی اچانک انٹری اور بے محل فرمائش قطعاً دھیان دینے لائق نہیں تھی' مگر قندیل کے لیے مقام تعجب تھا کہ سندس نقاہت سے اٹھتی کچن کی طرف بڑھ گئی تھی مجتبیٰ کا چونکنا اور اس کے پیچھے نظر دوڑانا

قندیل سے چھپا نہ رہ سکا۔ مجتبیٰ کی نگاہوں کا نیا انداز اسے فکر مند کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وقت کی گھٹن روز بروز بڑھتی چلی جارہی تھی مجتبیٰ کی شوخیوں کو نظر لگ گئی تھی تو سندس کی لاپروائیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اس کی گھر میں آمدورفت ضرورت سے زائد ہوتی جارہی تھی تو مجتبیٰ کے ماتھے کے بل بھی بڑھتے جارہے تھے۔ قندیل کی سات سالہ ازدواجی زندگی جمود کا شکار تھی۔ بھاگتی دوڑتی وقت کی گاڑی کا ساتھ دینے کے چکر میں وہ ہلکان ہوگئی تھی اس کی ذات سے مکمل بے نیاز اشعر کو نہ وہ خوشیوں کے لمحات میں یاد رہتی تھی اور نہ وہ اس کے دکھ درد میں ساتھ دینے کو تیار تھا مگر وہ اپنی تمام تر وفاؤں کے ساتھ محض نام کے رشتے کو نبھائے جارہی تھی، مگر ذرا سی بات پر اتنا کچھ ہوجائے گا' زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی در آئے گی اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔ علی الصبح ناشتے کی میز پر اسے سر جھکائے بیٹھا دیکھ کر مجتبیٰ فکر مندی سے قریب چلا آیا تھا۔

"کیا ہوا قندی! تم اتنی صبح کیسے آئیں اور سر کیوں پکڑا ہوا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔" مجتبیٰ نے اسے یوں دیکھ کر پوچھا' اس کے اندر چاہے کتنے ہی طوفان ہوں وہ بظاہر ہشاش بشاش دکھائی دیتی تھی اس کے اندر کا دکھ اس کے چہرے سے عیاں نہ ہوتا تھا اس لیے اس کی غیر معمولی خاموشی زیادہ محسوس ہورہی تھی۔

"میں رات میں ہی آگئی تھی تم اپنے کمرے میں جاچکے تھے۔" وہ پژمردگی سے گویا تھی اس نے کہا نہیں تھا مگر صاف ظاہر تھا کہ قندیل نے تمام رات اسی میز پر گزاری تھی۔

"قندی! اچھی کو کس کے پاس چھوڑ کے آئی ہو؟"

"ان کا بیٹا آگیا ہے ان سے ملنے۔" بظاہر مجتبیٰ نے لایعنی سوال کیا تھا' مگر قندیل کا استہزائیہ جواب سن کر چونک گیا۔

"اشعر آیا ہے تو تم یہاں چلی آئیں کیوں؟" وہ کم ہی اس کے معاملات میں دخل اندازی کرتا تھا' مگر آج قندیل کی حالت زار اسے سوالات پر مجبور کررہی تھی اور قندیل بھی شاید عاجز آچکی تھی خود کو خود میں مزید چھپانا اس کی برداشت سے باہر ہوگیا تھا تب ہی ابل پڑی۔

"تو کیا کرتی؟ بانہیں پھیلا کر استقبال کرتی اس کا' ڈیڑھ سال بعد ماں سے ملنے کے لیے بیوی بچوں سے جدا ہوکر آیا ہے' جب ماں سے مل لیتا ہے تو جاتے جاتے بیوی کا خیال آجاتا ہے' چند لمحے خیرات کی طرح جھولی میں ڈالنے والے کے لیے' پلکیں راہ میں بچھا دوں۔" مجتبیٰ محض اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اسے لگا وہ بات کرنے سے اتنا عاجز پہلے کبھی نہ ہوا تھا ہر دم اس کے دکھ سکھ بانٹتی قندیل کی آنکھوں سے درد کی برسات رواں تھی اور وہ بس یک ٹک اسے تکے جارہا تھا۔

"رات کو آیا تھا اپنا حق وصول کرنے' مزید مہان نہیں بن سکی' نہیں کرسکی خود پر جبر' بیوی ہوکر یہ سب سہنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے' میں لہو لہو ہوگئی ہوں مجتبیٰ۔" وہ سسک رہی تھی اور مجتبیٰ سلگ رہا تھا۔ قدرت کو کچھ اور کھیل دکھانا تھا کہ اشعر کی غیر متوقع آمد پر وہ چونک اٹھے۔

"مجتبیٰ! اسے بتاؤ شوہر کے کیا حقوق ہیں اسلام میں' ساری رات شوہر ناراض رہے تو فرشتے کتنی لعنت بھیجتے ہیں اسے بتاؤ۔" اشعر تن فن کرتا سیدھا مجتبیٰ سے مخاطب ہوا۔

"تمہیں معلوم ہے بیوی کے کیا حقوق ہیں اسلام میں' تم نے سارے فرائض پورے کرلیے ہیں!" مجتبیٰ پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا ایک دم سے چلا اٹھا۔ اس کی چنگھاڑتی آواز پر سب گھر والے کمروں سے نکل آئے۔

"کیا کمی کی ہے میں نے' ہر مہینے خرچا بھیجتا ہوں اور......"

"اور خرچا بھیج کر تم احسان عظیم کردیتے ہو اس پر۔" اشعر کی بات کو کاٹ کر وہ اتنی تیزی سے کرسی

سے اٹھا کہ گویا تو نہیں یا میں نہیں کا ارادہ ہو' قندیل ہونق ہو کر دونوں کے مابین تلخی کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہارے ساتھ زندگی بھر کا بندھن باندھنے والی' تمہارے گھر اور عزت کی رکھوالی کرنے والی' تمہاری ماں کی خدمت گزار' تمہاری بلا معاوضہ نوکرانی' تمہیں اپنی مرضی سے تمہاری خواہش کی خاطر پانٹ دینے والی کے لیے تمہارے نوٹوں کے چند کاغذ کتنی بڑی نوازش ہے۔"

www.paksociety.com

"ہاں تو اور کیا کروں میں' گلے پڑے ڈھول کو بجاتا رہوں۔" اشعر کی بات تھی کہ کند چھری کا زخم۔ اسے لگا وہ زمین میں دھنس گئی ہو' زندگی بھر کی ریاضت' ایثار' خدمت دو کوڑی کی ہو گئی تھی اور وہ خود شاید دو پیسے کی بھی نہ رہی تھی' اتنی اذیت شاید ہی کسی تیز دھار آلے کے لگے زخم سے ہو پائے۔

"تو کیوں باندھ کے رکھا ہوا ہے اسے اپنے ساتھ' لے جا اپنی ماں کو اپنی لاڈلی بیوی کے پاس' آزاد کر دے نا اس کو۔" مجتبیٰ کو قندیل کی تکلیف نے اتنا جذباتی کیا کہ وہ اشعر کا گریبان پکڑے جانے کیا بول پڑا' کس کس نے اس کے منہ پر ہاتھ نہ رکھا' کون کون ان دونوں کو دست و گریبان ہونے سے نہیں روک رہا تھا' اگر کوئی بے جان بت تھا تو وہ قندیل کا وجود تھا۔ دھندلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی اور آوازیں دور سے دور ہوتی جا رہی تھیں' شاید اس نے کچھ تھامنے کی کوشش بھی کی تھی' مگر لاحاصل زندگی کی طرح یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔



وہ حواسوں میں آنا نہیں چاہتی تھی' مگر اپنوں کی دعائیں زیادہ پُراثر تھیں۔ دیبا کی آنکھ سے بہتے آنسوؤں نے اسے باور کرایا کہ سب سے مہلک درد وہ نہیں جو دوسرے ہمیں دیتے ہیں' جان لیوا تکلیف وہ ہے جو ہماری ذات سے اپنوں کو پہنچے اور وہ اس گناہ عظیم کی مرتکب نہیں ہونا چاہتی تھی' ماں سے لپٹ کر حسب عادت اپنے آنسو اپنے اندر گرانے لگی۔

مجتبیٰ کے اشتعال دلانے کے باوجود اشعر "عظیم خدمت گار" سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا' جبکہ مجتبیٰ کے اندر کیا غبار اٹھا تھا کہ وہ اب اور رعایت دینے کو تیار نہ تھا' گھر بھر کی حمایت بھی اس کے چند لفظوں نے حاصل کر لی تھی۔

"آج قندی کی اس حالت کے ذمہ دار صرف اشعر نہیں ہم سب بھی ہیں۔ اگر وہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک جیتی جاگتی انسان ہے تو فراموش تو ہم نے بھی کر دیا تھا کہ صرف موت زندگی اور اس کی خواہشات کی تابع ہے کوئی کمی یا عیب زندگی ختم نہیں کر سکتا۔

وہ صرف بچہ پیدا نہیں کر سکتی تھی' مگر اس کے اندر دل تو دھڑکتا تھا' چاہے جانے کی کشش اسے بھی تو کھینچتی تھی۔ بے اثر دن' بے کیف راتیں وہ کیسے گزارتی تھی؟ اس کی زندہ تمنائیں' آرزوئیں اس جرم کی پاداش میں مردہ ہو گئیں' جو اس نے کیا ہی نہیں تھا وہ خود کو خاک کرتی گئی اور ہم اسے داد دیتے رہے' اسے اپنے بارے میں سوچنا ہو گا' خود غرض' مفاد پرست انسان کے لیے قندیل کی انمول وفا اللہ کی دی ہوئی نعمت کا زیاں ہے' اللہ کے کارخانے میں سب کھلونے ایک ہیئت کے نہیں تو ایک فطرت کے بھی نہیں ہوتے' ایک بد فطرت سے کنارہ کشی کرو' اللہ تمہیں تمہاری وفا کا طلب گار کوئی مخلص انسان نواز دے گا' بنا دھاگے کے سوئی سے جتنی مہارت بھی ہو کشیدہ کاری بھی نہیں ہو سکتی۔"

اور قندیل نے مخلص انسان کے لیے نہیں اپنی عزت نفس کے لیے اشعر سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ کیوں کہ وہ مزید اس کے گلے کا ڈھول نہیں بننا چاہتی تھی۔ ایثار و وفا کی کہانی بے حسی و تنگ نظری کی نذر ہو گئی۔



قندیل کی روٹین میں سوائے اس کے کہ اس کے نام کے ساتھ اشعر کا نام نہ رہا تھا' کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی' اس گھر میں بھی وہ اور دن بھر کے معمولات ہوتے تھے اور یہاں بھی وہی صبح ہوتی تھی'

شام ہوتی تھی فرق تھا تو صرف یہ کہ اب وہ پل پل اپنی ناقدری پر مرتی نہیں تھی اپنوں کی شفقت تلے زندگی جینا قدرے آسان ہو گیا تھا۔

لیکن پُرسکون وہ اب بھی نہیں تھی۔ مجتبیٰ کی شادی شدہ زندگی ڈولتی سنبھلتی ناؤ اسے بے چین کر دیتی تھی۔ مجتبیٰ کی عشقی دیوانگیوں سے کاش وہ واقف نہ ہوتی تو یقیناً "اسے سمجھوتہ کی زندگی گزارنے کی تلقین ضرور کرتی۔

سندس کے لیے اپنی چاہت، سوچ، سرمایہ سب کچھ وقف کر دینے والے مجتبیٰ سے سندس کے معمولات روز مرہ محض ہیچ ہوتے تھے ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا تو خواب و خیال کی بھی بات لگتی تھی قندیل کے صبر کی تو ہر کوئی داد دیتا تھا، مگر قندیل کے نزدیک آفرین تھی مجتبیٰ کے کردار کو کہ وہ سندس کے بارے میں حرف شکایت تو کیا ہی زبان پر لاتا اس کے لیے ناروا سوچنا بھی محال سمجھتا تھا ہاں تقاضائے فطرت کے تحت طلب عشق کی تشنگی اس کے شکستہ وجود سے عیاں رہتی تھی۔ اب اس سے بڑھ کر وہ اپنے ضبط و تحمل کی کیا مثال دیتا کہ قریبی ذرائع سے ملنے والی خبر کے تحت سندس نے تین ماہ کے حمل کو خود گرا دیا تھا وہ کمال ضبط سے برداشت کر گیا تھا اور سندس کی ایک نرم مسکراہٹ سے کی گئی سوری پر اپنی وفا کو آزما گیا تھا۔

تقدیر لکھنا اپنے اختیار میں ہوتا تو وہ دکھ سکھ کی پگڈنڈیوں پر زندگی کی گاڑی گھسیٹ ہی لیتے۔ مگر کاتب تقدیر کی منشا کچھ اور ہی تھی پل پل محبوب کی قصیدہ گوئی کرتی زبان سے ایسے کلمات ادا ہوں گے یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

مضمحل قدموں کی چال تو مجتبیٰ کی کئی ماہ سے تھی مگر اس قدر شکستگی گویا کندھوں پر کئی من بوجھ لادے ہو وہ نڈھال سا "عظیم سامع" کے سامنے آن گرا تھا۔

"مجتبیٰ! سندس کو میکے بھیجتے ہی کیوں ہو؟ جو تمہاری ایسی حالت ہو جاتی ہے بالکل غافل ہو جاتے ہو خود سے۔"

قندیل وجہ افسردگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے جھڑک کر بولی تھی۔

"میکے اس لیے بھیجا تھا تاکہ وہ میری چاہت سے اکتا نہ جائے، میری محبت اس کے لیے بوجھ نہ بن جائے مگر میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ آیا وہ میری وفا کے لائق ہے بھی یا نہیں۔" مجتبیٰ کی اگر حالت مختلف تھی تو یہ الفاظ بھی اس کے منہ نہ لگتے تھے قندیل حق دق رہ گئی۔

"مجتبیٰ ذرا سی بات پر اتنا غصہ۔"

"قندی! چپ ہو جاؤ اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی مت کہنا جس نے میرے اعتماد کی دھجیاں اڑا دیں۔"

مجتبیٰ کیا کہہ رہا تھا وہ کچھ بھی اخذ کرنے سے قاصر تھی، اس کی چھٹی حس اشارہ ضرور کر رہی تھی کہ بات کچھ ایسی تھی جو مجتبیٰ کی برداشت سے باہر تھی۔

"مجتبیٰ ہوا کیا ہے کچھ بتاؤ تو سہی؟"

اس کی زبان سے تو سوال بھی انتہائی دقت سے ادا ہوا تھا، دو روز قبل سندس کو میکے چھوڑنے کے لیے مجتبیٰ خود گیا تھا اور سندس کی پیکنگ تو خود قندیل نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ وہ کچھ دن رہنے کے ارادے سے گئی تھی اور آج صبح ہی مجتبیٰ نے اسے واپس لانے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ جس کا زیبا سمیت سب نے خیر مقدم کیا تھا، مگر شام کو مجتبیٰ کا یہ رویہ بے حد پریشان کن تھا۔

"اس نے کہا تھا کہ اس کے والد کی ناسازی طبع کے باعث وہ کچھ دن میکے میں رہے گی میں نے اسے گھر کے دروازے پر ڈراپ کیا تھا اس نے اندر آنے کی آفر نہیں کی، وقت میرے پاس بھی نہیں تھا اس لیے آفس چلا گیا، دو دن سے اس سے فون پر مستقل رابطہ رہا ہے، کل رات کو ہم نے کافی دیر بات کی تھی اور آج میں اسے کال کر کے واپسی کا پروگرام طے کرنا چاہتا تھا میری کال کرنے سے قبل اس کے والد کی کال آ گئی میں سمجھا سندس نے ان کے سیل سے کال کی ہے مگر اس

کے والد نے فون پر جو کہا اس نے میرے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی ہے۔"

مجتبیٰ یہ سب بتاتے ہوئے قدرے بہتر حالت میں تھا مگر آگے کی بات کہنے کے لیے اسے خود پر کئی گنا جبر کرنا پڑا تھا قندیل کو لگا کہ شاید وہ آج کے بعد کبھی بول بھی نہیں پائے گا اور جو اس نے کہا اس نے قندیل پر بھی آسمان گرا دیا تھا۔

"قندی! تین دن سے سندس میرے گھر سے دور اپنے میکے میں ہے مگر آج اس کے والد نے فون کر کے کہا کہ سندس کو ان سے ملوانے لے آؤں' کئی دنوں سے اس کی صورت نہیں دیکھی۔"

قندیل ہی نہیں مجتبیٰ کے الفاظ سماعت کرتے اس والدین اور دیبا کی بھی حالت مجتبیٰ سے یکسر مختلف نہ تھی اور سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ سندس میکے نہیں گئی تھی تو تین دن سے کہاں تھی؟



کسی کی چاہت کا مان لیے دل لبھاتی نرم مسکراہٹ چہرے پر سجائے' آنکھوں میں فتح کا خمار لیے سندس لوٹ آئی تھی' مگر اس کی انتہاپسندی کو طفلانہ سوچ قرار دے کر اگنور کرنے والے اس پر اپنی جنونی چاہت لٹانے والے کی ضبط کی صراحی چھلک چکی تھی' ظرف کا ظروف مزید ناقدری سہنے کو تیار نہ تھا۔ مجتبیٰ کی نگاہیں جن قدموں پر صدقے واری جاتی تھیں ان کی بے راہ روی پر شعلے برسانے لگیں نہ سندس کی تاویلات وضاحتیں اسے مطمئن کر سکیں' نہ دونوں کے والدین کی کوششیں بار آور ہوئیں دل کا شیشہ بال آنے سے زنگ آلود ہو گیا' عشق کا مجنوں' فیصلہ کرنے میں بھی جنونی ثابت ہوا۔ اور چاہت کے دھاگوں میں پرو کے انتہائے شوق سے استوار ہوا بندھن' بے وفائی کے چھینٹوں سے داغ دار ہو گیا۔

"ایک موقع اور۔"

مجتبیٰ کے استفہام پر قندیل اسے دیکھ کر رہ گئی اپنے تئیں وہ اسے سمجھانے کے لیے آئی تھی مگر مجتبیٰ نے اس کے محض ایک جملے پر کہ سندس کو ایک موقع اور دو' جس کرب سے دو لفظ ادا کیے تھے وہ دل چیرنے کو کافی تھے۔

"قندی اب بھی تم کہتی ہو اسے ایک موقع اور دوں' وہ میرے اخلاص کو پاؤں تلے روندے' کسی اور پر چاہت لٹاتی رہی' میرے بچوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتی رہی اور میں ایک سوری سے بہلتا رہا اور تم کہتی ہو ایک موقع اور دوں' سب سہ تو رہا تھا اول دن سے اس کی بے پروائیاں' بدتمیزیاں' منافقت سب کو اگنور کر تو رہا تھا' مگر وہ میری وفا کو بیوفائی کے دلکش کاغذ میں لپیٹ کر کسی اور کی دہلیز پر چھوڑ آئی اور میں آنکھوں پر غفلت کی پٹی چڑھائے عشق کی پتنگ اڑاتا رہا۔ ڈور کی طرح اس کے ہاتھوں میں الجھتا رہا وہ بوجھ کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ منتقل کرتی رہی' سینے پر گولی مار دیتی تو معاف کر دیتا مگر پیٹھ پر بےوفائی کا تیر پیوست ہو تو معاف کرنا روح قبض ہونے سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔"



سلگتی تلخ باتوں سے
بڑے بے درد ہاتھوں سے
لو دیکھو! ہار دی تم نے
محبت
مار دی تم نے

اس نے محبت کیا ہاری تھی؟ لگتا تھا زندگی ہار دی تھی' حسرتوں کے سائے تلے زندگی رواں تھی۔ جمود غم سے نجات کے لیے اور والدین کی بوڑھی امید بھری نگاہوں کی خاطر اس نے ایک نئے بندھن کی ہامی بھر لی تھی ویسے بھی جب اپنے لیے جینا دشوار ہو جائے تو اپنوں کے لیے جینا سہل ہو جاتا ہے۔

اک نئی مہم کا آغاز ہو گیا تھا' دن بھر تصویروں کا تبادلہ ہوتا تو کہیں فون پر معاملات طے کیے جاتے' کبھی

کوئی رشتہ جڑوانے والی خالہ تشریف فرما ہوتیں تو بھی نین نقوش پر سیر حاصل تبصرے ہوتے' پہلی بار میں مجتبیٰ نے رشتہ کروانے کی درد سری سے والدین کو نجات دے دی تھی مگر اس بار اس کی لاپروائی اور خاموش تماشائی جیسی صورت نے اپنوں کو جو کھم میں ڈال دیا تھا قندیل کی بھرپور حمایت ومدد کے زیر اثر یہ مہم جاری تھی۔

تقریباً" سال بھر کی محنت کے بعد جب سب معاملات طے ہونے کے قریب تھے' والدین نے اپنی دانست میں اولاد کے لیے ہیرا تلاش کرلیا تھا بندھن جڑ جانے کے قریب تھا کہ مجتبیٰ کے فیصلے نے جامد زندگی میں ارتعاش پیدا کردیا' ہر ایک کو اپنے فیصلے سے مطمئن کراتا بالآخر وہ لمحہ آن پہنچا جس کا اسے انتظار تھا۔

قندیل اس کے روبرو تھی' آنکھوں میں حیرت کا رنگ لیے وہ پے در پے انہونی کا ایک عرصے سے سامنا کرتی آئی تھی مگر یہ غیر متوقع امر کی حد تھی یا اس کے تصور سے کہیں بڑھ کر بات تھی جو وہ یقین کی دنیا میں لوٹنے کو تیار نہ تھی۔ اس سے تصدیق کرانے آئی تھی مگر خاموش نگاہوں سے تکتی رہی' زبان تو کچھ بھی نہ کہنے کی قسم کھا بیٹھی تھی۔

"قندی ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ اتنی بے یقین کیوں ہو" مجتبیٰ نے بنا اس کے پوچھے جواب دینا شروع کیا۔

وہ جانتا تھا مدتوں سے امید سے ناتا توڑنے والی کو یقین آتے بھی مدتیں ہی لگنا تھیں۔

"مجتبیٰ ایک بار پھر غلط فیصلہ کر رہے ہو خوش نصیب ہو' زندگی تمہیں جینے کا ایک موقع اور دے رہی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ گھاٹے کا سودا نہ کرو۔" قندیل کے لفظوں میں اس کی بیتی زندگی کا عکس تھا۔

"قندی! دل کی ماننے والا ہوں دل ہی سے سوچوں گا۔ خواہ ہر بار دل دھوکا ہی کیوں نہ دے' پہلے اسے اپنایا تھا جس کے لیے دل دھڑکتا تھا اب اس کا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں جس کے سینے میں دل دھڑکتا ہے احساس کا' وفا کا' اعتبار کا۔"

مجتبیٰ کی نگاہوں میں کیا تھا وہ کیا مانگ رہا تھا؟ اس سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ وفا کی بے قدری اس نے بھی سہی تھی اور انمول وفا کو مٹی ہوتا مجتبیٰ بھی دیکھ چکا تھا واقف غم تھے قدرت غمگسار بنانا چاہتی تھی۔

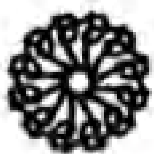
"جذباتی ہو کر فیصلہ مت کرو' میں بے ثمر ٹہنی تمہیں کیا دے پاؤں گی؟"

"وفا تو دو گی ناں۔"

قندیل کی جانب ہاتھ بڑھائے وہ کیا طلب کر رہا تھا اولاد سے بڑھ کر وفا قرار پائی تھی' یہ کون سے دیس کی بولی تھی دادی نانی کی کہانیوں میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا' یہ الف لیلیٰ کس نے کہی تھی۔

"ایک کھوکھلے بندھن اور بے حس شخص کے لیے اپنی وفا لٹا سکتی ہو ایک کمزور رشتے کے کچے دھاگے میں انتظار کے موتی پرو سکتی ہو تو یہ دولت میرے کاسے میں کیوں نہیں ڈال سکتیں۔ میں مجبور نہیں بنوں گا' وفا میں چور بھی نہیں ہوں گا' محبت ہار چکا ہوں' چاہت ہار چکا ہوں مگر قدر وفا زندہ ہے طلب ستائش بھرپور ہے۔ آغوش الفت چاہیے' ساری دنیا چھان لی صرف تمہارے وجود کی سیپ میں وفا کا موتی پایا ہے' بے ثمر تم نہیں ہو' محروم وہ ہیں جو تمہارے فیض نہاں کو نہ پاسکے' تم برستان الفت کی ایک رنگین ٹہنی ہو۔ میں کارگاہ عشق کا خاک نشین ہوں وفا کے دریا میں اتر جائیں گے رنگ زندگی کلا جائیں گے تیار ہو!"

وہ لفظ لفظ بولتا تھا' تخیل کے تاج محل بناتا تھا قندیل ایثار کا سنگھار تھی مانگنے والے نے مانگا تو صرف اعتبار وفا اور عطا کرنے والے نے صرف ایک نعمت نہ دی تھی باقی تو نعمتوں کی انتہا کی تھی وہ کس کی ناشکری کرتی' دینے والے کی یا مانگنے والے کی۔



عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ' الھڑسی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں' مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی' نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتا" صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کردیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کردیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ' امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھادیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کرلیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کرلیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آجاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کردیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فورا" آجاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد' ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کردیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی





دوستی ہے۔ جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے، مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔
معیز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد 'ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں 'مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب 'ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے 'ان سے پیسے بٹور کر بلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگیٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب 'معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔
ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کرپاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں' زور زبردستی کرکے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سرپٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے 'مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ 'گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار کر جاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید تپ پا ہوتی ہیں۔ معیز 'ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے 'مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔
عون 'معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی 'ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس سے محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کردیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔
میم 'ابیہا کو سیفی کے حوالے کردیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کردی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے' جہاں معیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کرلیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلاوجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً" سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہو کر اس سے رابطہ کرتی ہے' مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد 'ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا پرانا راز کھولنا پڑتا ہے۔
وہ بتا دیتا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے' مگر وہ نہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معیز احمد سے طے کردیتی ہے' مگر معیز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہوپاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ابیہا 'ثانیہ کو فون کردیتی ہے۔ ثانیہ بیوٹی پارلر پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم 'حنا کو بیوٹی پارلر بھیج دیتی ہے' مگر ثانیہ 'ابیہا کو وہاں سے

نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیز اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں، مگر معیز سمیت زارا اور ایزد انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیز احمد اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ابیہا کو گھر لے تو آتا ہے، مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کر کے شرمندہ کرتی ہے۔ عون نادم ہو کر کچھ اشیائے خورد نوش لے آتا ہے۔ معیز احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

سفینہ بیگم اب تک یہ ہی سمجھ رہی ہیں کہ ابیہا مرحوم امتیاز احمد کے نکاح میں تھی مگر جب انہیں پتا چلتا ہے کہ وہ معیز کی منکوحہ ہے تو ان کے غصے اور نفرت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اٹھتے بیٹھتے بری طرح ٹارچر کرتی ہیں اور اسے بے عزت کرنے کے لیے اسے نذیراں کے ساتھ گھر کے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا ناچار گھر کے کام کرنے لگتی ہے۔ معیز کو برا لگتا ہے، مگر وہ اس کی حمایت میں کچھ نہیں بولتا۔ یہ بات ابیہا کو مزید تکلیف میں مبتلا کرتی ہے۔ وہ اس پر تشدد بھی کرتی ہیں۔

پرانے شکوے شکایتیں دور کرنے کی خاطر عون کے ابا عون اور ثانیہ کو اسلام آباد نازیہ کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ جہاں ارم ان دونوں کے درمیان آنے کی کوششیں کرتی ہے اور ثانیہ اپنی بے وقوفی کے باعث عون سے شکوے اور ناراضیاں رکھ کر ارم کو موقع دیتی ہے۔ عون صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر ثانیہ اس کے ساتھ بھی زیادتی کر جاتی ہے۔ ارم کی بہن نیلم ایک اچھی لڑکی ہے، وہ ثانیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر عون نے پہلے شادی سے انکار کر کے اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی تو اب اپنی عزت نفس اور انا کو چھوڑ کر آپ کو منانے کے لیے جتن بھی کر رہا ہے۔ عزت کریں عون کی، اور دوسروں کو اپنے درمیان آنے کا موقع نہ دیں۔ ثانیہ کچھ کچھ مان لیتی ہے۔ تاہم مہندی میں کی گئی ثانیہ کی بدتمیزی پر عون دل میں اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

رباب، سفینہ بیگم کے گھر آتی ہے تو ابیہا کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ پھر سفینہ بیگم کی زبانی ساری تفصیل سن کر اس کی تضحیک کرتی ہے۔ ابیہا بہت برداشت کرتی ہے مگر دوسرے دن کام کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ سفینہ بیگم کو شدید غصہ آتا ہے۔ وہ انیکسی جا کر اس سے لڑتی ہیں۔ اسے تھپڑ مارتی ہیں، جس سے وہ گر جاتی ہے۔ اس کا سر پھٹ جاتا ہے اور جب وہ اسے حرام خون کی گالی دیتی ہیں تو ابیہا پھٹ پڑتی ہے۔ معیز آ کر سفینہ کو لے جاتا ہے اور واپس آ کر اس کی بینڈیج کرتا ہے۔ ابیہا کہتی ہے کہ وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ معیز کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ سفینہ بیگم ایک بار پھر معیز سے ابیہا کو طلاق دینے کا پوچھتی ہیں تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔

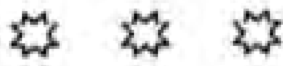
اکیسویں قسط

بیٹھے بیٹھے دعائیں کرتے جانے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ دعا کرتی زارا کے آنسو تھمنے میں نہیں آتے تھے۔

ابیہا کی اس سے جھجک فطری تھی۔ جو رشتہ اور جو حالات ان کے درمیان تھے، وہ اسے آگے بڑھنے سے روکتے تھے، مگر پھر ایک مماثلت ان کے مابین پل بنی۔۔۔ ماں۔ ابیہا اپنی ماں کا دکھ جھیل چکی تھی، جبکہ زارا اس تکلیف سے گزر رہی تھی۔ وہ زارا کا ہاتھ تھام کر پیار سے سہلاتی اسے دوسراہٹ کا احساس دلا رہی تھی۔ ایسے میں معیز کی کال آنا اور اس کی بات سن کر ابیہا کا رنگ اڑنا۔۔۔ زارا کے دل کو جیسے کسی نے شکنجے میں کس لیا ہو۔ اسے اگلے ہی لمحے سانس لینے میں دشواری ہوئی۔

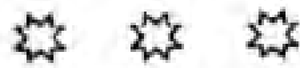
"ماما۔۔۔ کیا ہوا؟ ماما کو۔۔۔ کس کا فون ہے؟" وہ متوحش سی سرسراتی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ معیز لائن کاٹ چکا تھا مگر ابیہا کے کندھوں پر ایک بھاری ذمہ داری کا بوجھ رکھ کر۔

"زارا کو مت بتانا" اس کے کانوں میں معیز کی تھکی صدمے سے بوجھل آواز ابھی تازہ تھی۔
ایبہا نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور زارا کی طرف اعتماد سے دیکھنے کی کوشش کی۔
"وہ... آئی سی یو میں ہیں' چیک اپ ہو رہا ہے۔ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔" زارا نے بے اعتباری سے اسے دیکھا۔ جس کی رنگت ابھی بھی اپنا اصل رنگ کھوئے ہوئے تھی۔
"آمین..." زارا نے شدت جذبات سے بھرپور انداز میں کہا۔ وہ ایبہا کی بات پہ دل سے یقین کرنا چاہتی تھی۔ چاہے یہ سچ تھا یا جھوٹ۔ مگر وہ اسی پہ اعتبار کر کے جینا چاہتی تھی کہ سفینہ زندہ ہیں۔ ڈاکٹرز کی ٹیم ان کا تفصیلی چیک اپ کر رہی ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ خاموشی ان دونوں کے درمیان ہکل مار کے بیٹھ گئی۔ زارا مسلسل زیر لب ورد کرتی دونوں بھائیوں میں سے کسی کو بھی فون نہ کر رہی تھی۔
جانے کس فریب کے حصار میں گھری رہنا چاہتی تھی؟



عون بھاگم بھاگ اسپتال پہنچا تو عمر اور ایراز سمیت معیز کا حال بھی دگرگوں تھا۔ سفینہ بیگم ابھی تک آئی سی یو میں تھیں۔ اور ڈاکٹرز کوئی بھی تسلی بخش جواب نہیں دے رہے تھے۔ معیز نے ایبہا کو فون کر کے سفینہ بیگم کی خرابی طبع... اور دعا کرنے کا کہہ دیا اور ساتھ ہی تاکید بھی کی کہ زارا کو "سب ٹھیک ہے" کی رپورٹ ہی دے۔
"یہ سب ہوا کیسے..." عون دکھ کی کیفیت میں تھا۔
"بس ایک دم سے بی پی شوٹ کر گیا... وہ تو زارا نے دیکھ لیا ورنہ تو اسپتال بھی ٹائم پہ نہ پہنچ پاتے۔"
معیز خود کو بہت ضبط سے سنبھال رہا تھا۔ وگرنہ ایراز تو باقاعدہ عمر کے گلے لگ کے رو چکا تھا۔
اگلے چار گھنٹے اسی ٹینشن اور شدید پریشانی میں گزرے ڈاکٹرز اور اسٹاف پوچھنے پر بھی فی الحال مریض کی حالت نہیں بتا رہے تھے۔
اور پھر سینئر ڈاکٹر فاروق جلال نے بالآخر معیز کو اپنے کمرے میں بلایا تو وہ افتاں و خیزاں ان کے کمرے میں پہنچے تو ان کے فق چہروں کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر فاروق نے تمہید باندھی۔
"دیکھیں ہر کام میں اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ زندگی دینے والا وہ ہے تو موت پر بھی اسی کو قدرت حاصل ہے۔ ہم لوگ تو بس اپنی سی کوشش کر سکتے ہیں۔ کسی کی سانسوں کو بحال کرنے کی۔ اصل ڈاکٹر جو زندگی اور موت کا فیصلہ کرتا ہے وہ اوپر بیٹھا ہے۔"
انہوں نے انگشت شہادت سے آسمان کی جانب اشارہ کیا تو معیز نے متوحش انداز میں پوچھا۔
"ڈاکٹر صاحب کیا بات ہے... ماما ٹھیک تو ہیں نا!" ڈاکٹر فاروق نے تھکے ہوئے انداز میں اپنی کرسی سے پشت لگائی۔
"وہ اللہ ہے ہر شے پر قادر۔ چاہے تو زندگی دے اور چاہے تو موت... مگر ایک تیسری کنڈیشن بھی ہے۔" وہ کہتے ہوئے لمحہ بھر کو تھمے۔ چار فق چہروں کو دیکھا پھر بولے۔
"چاہے تو زندگی اور موت کے درمیان معلق کر دے۔"
"یو مین... کوما...؟"
عمر نے بے یقینی سے ایک دم پوچھا تو معیز اور ایراز وحشت زدہ سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگے۔ پھر ڈاکٹر کا اثبات میں ہلتا سر دیکھ کر دکھ سے اپنی جگہ گڑ گئے۔

"یہ کیفیت دو دن کی بھی ہو سکتی ہے' دو سال کی بھی یا پھر سالوں تک کی بھی۔۔۔"
ڈاکٹر فاروق انہیں تفصیلی بریفنگ دے رہے تھے' جو ان کی سائیں سائیں کرتی سماعتوں سے ٹکرا تو رہی تھی' مگر دکھ اور غم کی شدت فی الحال اور کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھوئے ہوئے تھی۔



دکھ اور تکلیف کی ایک شدید لہر تھی' جو اس گھرانے سے پوری طاقت کے ساتھ ٹکرا گئی۔
اور اُن کا ردعمل بھی وہی تھا جو کسی بھی تکلیف کے آنے پہ ہوتا ہے۔ پوری طاقت سے خوف زدہ سا ہو کر چیخنا چلانا اور آہستہ آہستہ اس تکلیف کی حقیقت کو قبول کرتے ہوئے اس کے ساتھ زندگی گزارنے پر خود کو مجبور پانا۔ مگر اس تکلیف کا احساس کبھی ساتھ نہ چھوڑتا تھا۔ بالکل ایڑی کے کانٹے کی طرح ہر قدم پہ تکلیف۔
آج ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ اور سفینہ بیگم ہاسپٹل میں کومے کی کیفیت میں تھیں۔ زارا کی آہ و بکا اور رونا کرلانا بھی ان کی بند پلکوں میں جنبش نہ لا پایا تھا اور نہ ہی جوان بیٹوں کے ہاتھوں کا بے بسی بھرا لمس اور دبی سسکیاں۔ مگر وہ مرد تھے جیسے تیسے خود کو سنبھال کر بظاہر پھر مضبوطی سے کھڑے ہو گئے مگر زارا۔۔۔ ماں کی لاڈلی ان کے بغیر ایک پل نہ رہنے والی۔ سارا دن ماں کا ہاتھ تھامے بیٹھی رہتی۔
سفیر احسن اور ان کی پوری فیملی فوری طور پر ہاسپٹل پہنچی۔ زارا کی حالت دگرگوں تھی۔ معیز اور عمر کے لاکھ... سمجھانے پر بھی وہ گھر جانے کو تیار نہیں تھی۔ اسے دیکھ کر سفیر کا دل دکھ سے بھر گیا۔
ایسی ملاقات کا خواب تو ان دونوں میں سے بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سفیر نے زارا کے سر پہ ہاتھ رکھا تو اس میں ہمدردی' محبت اور دوسراہٹ کا احساس تھا۔ زارا' سفیر کی امی کے گلے لگ کے بلک اٹھی۔
سب ہی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
یا خدا۔۔۔ یہ کیسی زندگی تھی' موت نہ ہوتے ہوئے بھی موت جیسی۔
سفیر کی امی کے سمجھانے پر وہ بمشکل گھر آنے پر راضی ہوئی۔ واپسی پہ رباب اس کے ساتھ گھر آئی۔
عمر اور ایراز نے معیز کو بھی تھوڑی دیر آرام کے لیے ان کے ساتھ ہی بھجوا دیا۔ ایک ہفتے سے وہ مسلسل سفینہ بیگم کے سرہانے بیٹھا تھا۔
"نارمل ہو جاؤ معیز! اللہ سے احتجاج باندھ کے مت بیٹھو۔ تم جانتے ہو کہ تمہارے یوں ڈاکٹرز کے پیچھے بھاگنے اور راتوں کو مسلسل جاگتے رہنے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ بلکہ تم اپنی بھی صحت خراب کر رہے ہو۔ مریض کی دیکھ بھال ایک مریض نہیں' بلکہ ایک صحت مند انسان ہی کر سکتا ہے۔"
اس کے احتجاج پر عمر نے اس کے شانوں پہ دونوں ہاتھ جماتے ہوئے تادیبی انداز میں سمجھایا تو وہ چپ سا ہو گیا۔

عمر اور ایراز باری باری آرام کر لیا کرتے تھے' لیکن معیز نے تو گویا قسم ہی کھالی تھی کہ جب تک سفینہ بیگم آنکھ نہ کھولیں گی' وہ ان کے سرہانے سے نہیں اٹھے گا۔
اندرونی دروازہ ابیہا نے کھولا تو رباب کے اندر سے ناگواری کی ایک لہر اٹھی۔ اور بے یقینی کا احساس۔
معیز نے زارا کے شانے پر بازو پھیلائے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ اسے اندر لے آیا۔ لاؤنج میں صوفے پہ اسے بٹھایا تو وہ نڈھال سی تھی۔
"تم کیا کھڑی تماشا دیکھ رہی ہو۔ جا کے ٹھنڈے پانی کی بوتل لاؤ۔۔۔ نان سینس۔"

رباب نے مضطربانہ ہاتھوں کی انگلیاں مسلتی ایبہا کو اس قدر اچانک اور بگڑے ہوئے انداز میں مخاطب کیا تھا کہ وہ سن سی رہ گئی۔ معیز نے چونک کر ایبہا کو دیکھا۔ وہ بہ سرعت کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ معیز کو رباب کا انداز اچھا نہیں لگا تھا۔

"اٹس اوکے رباب۔" معیز نے ہلکے سے اسے ٹوکا۔

"کیا اوکے ہے؟ دیکھ نہیں رہی۔ اتنی گرمی میں باہر سے آئے ہیں۔ سر پہ چڑھ کے تماشا دیکھ رہی ہے۔ بس۔ آنے والوں کو پانی ہی پوچھ لیتے ہیں۔ زارا کو دیکھو' کیسے نڈھال ہو رہی ہے۔" رباب نے تیز لہجے میں کہا۔ جو ایبہا نے بخوبی سنا۔

اس نے بوتل سے گلاس میں پانی انڈیلا اور صوفے پہ ٹکتے ہوئے زارا کو تھمایا۔ جو وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

"کھانا تیار ہے۔ آپ لوگ فریش ہو جائیں تو میں لگا دیتی ہوں۔"

ایبہا نے صاف آواز میں زارا سے کہا۔ تو وہ گلاس ایبہا کے ہاتھ میں تھامی پلیٹ میں رکھتے ہوئے اپنی کنپٹیاں دبانے لگی۔

"مجھے بالکل بھوک نہیں۔۔۔ میں بس تھوڑی دیر کے لیے گھر آئی ہوں۔ پھر ہاسپٹل چلی جاؤں گی ماما کے پاس۔"

"تھوڑا سا ریسٹ کر لو۔ کھانا کھاؤ گی تو طاقت آئے گی نا' تبھی ماما کی دیکھ بھال کر سکو گی۔"

ایبہا نے اسی پیار سے کہا جس کا برتاؤ وہ زارا کے ساتھ پچھلے ایک ہفتے سے کر رہی تھی۔ عمر یا ایراز میں سے جو بھی رات کو گھر آتا وہ زارا کو زبردستی ساتھ لے آتا۔ تب ایبہا ہی تھی جو اس کے آنسو پونچھتی' تسلیاں اور دلاسے دیتی اور اس کے ساتھ سوتی۔

"تم جاؤ۔ جا کے کھانا وانا گرم کرو۔ میں دیکھتی ہوں زارا کو۔" رباب کا وہی تحکمانہ انداز تھا۔ گویا ایبہا نوکرانی ہو۔ وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔

معیز نے رباب کی سرد مہری کو اچھی طرح محسوس کیا اور اس سرد مہری کا محرک بھی اسے اچھی طرح سمجھ میں آرہا تھا۔

"جب سے ماما کی طبیعت خراب ہوئی ہے ایبہا ہی گھر کے معاملات دیکھ رہی ہے۔" معیز نے دبے لفظوں جیسے رباب کو "باز" رہنے کی تنبیہہ کی۔

"سو واٹ۔۔۔ نوکروں کا اور کام ہی کیا ہوتا ہے۔۔۔" رباب نے تنفر سے شانے جھٹکے۔

کچن سے سالن کا ڈونگا لے جاتی ایبہا کے قدم من من کے ہوئے۔

"وہ نوکر نہیں ہے اس گھر کی رباب۔"

معیز نے اس بار قدرے سخت لہجے میں تصحیح کی تھی۔ رباب نے اسے ہلکا سا گھورا اور جتاتے ہوئے انداز میں بولی۔

"فرد بھی نہیں ہے معیز احمد۔"

"ایبہا اس گھر کا فرد ہی ہے رباب۔۔۔" زارا نے کھڑے ہوتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور معیز پر ایک غلط نگاہ ڈالی جو ساکت سا کھڑا رہ گیا تھا۔

"میں نے شاید اس کا پورا تعارف نہیں کرایا تم سے۔ ایبہا ابو کی کزن کی بیٹی ہے۔ اصل میں ہمارے تعلقات اس کی فیملی سے اچھے نہیں تھے اس لیے۔۔۔ آئم سوری' مگر اب اس نے اپنے اچھے اخلاق سے میرا اس مشکل وقت میں اتنا ساتھ دیا ہے کہ میں اعتراف کیے بنا رہ نہیں سکتی۔"

"تم نے تو کہا تھا کہ وہ... نوکروں کو سپروائز کرتی ہے..." رباب نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا مگر زارا کے سکون میں کمی نہیں آئی تھی۔

"اسی کے لیے سوری کہہ رہی ہوں۔ دراصل ہم لوگ ابیہا کو اس کی اصل جگہ دینے کو تیار نہیں تھے... مگر اب خیال آیا کہ جن کے رشتہ داری کے تنازعات تھے وہ تو مر گئے... پھر ہم کون سی دشمنی نبھا رہے ہیں...."

زارا کے لب و لہجے سے دکھ جھلک رہا تھا اور معیز گنگ کھڑا تھا۔ منٹوں میں زارا نے لفظوں کے شیشوں سے سالوں کی دشمنی کی فصیلیں گرادی تھیں۔

وہ فریش ہو کے کھانے کی میز پہ آیا بھی تو فریش نہ تھا۔ طبیعت مضمحل سی تھی۔ ایک عجیب سا بوجھل پن۔

رباب تو بس زارا کی طبیعت اور موقع کی نزاکت دیکھ کے چپ رہ گئی تھی' ورنہ تو زارا کو خوب سناتی۔ اس "کہانی" نے اسے تو قطعاً "مطمئن نہ کیا تھا۔ مزید تب تلملائی جب زارا نے کھانا لگا کے جاتی ابیہا کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم بھی بیٹھ کے کھانا کھالو۔ صبح سے کچن میں لگی ہوگی۔" وہ ہلکا سا مسکرادی۔

"آپ لوگ شروع کریں۔ میں ہسپتال کے لیے ٹفن بنا رہی ہوں۔ ابھی ڈرائیور کے ہاتھ کھانا بھیجنا ہے۔" نرمی سے کہا اور ہاتھ چھڑا کے کچن میں چلی گئی۔

زارا کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ تو وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھ گئی۔

یونہی... خیال سا آیا۔ کس کی آہ... کس کا صبر ان کے لیے آزمائش بن گیا تھا؟

ساتھ بیٹھے معیز نے تشویش سے اس کے شانے کو چھوا۔ تو وہ چونکی۔

"شروع کرو..." معیز نے کھانے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

رباب کا تو دل گھبرا گیا اتنی دکھی صورت حال دیکھ کر اسے زارا اور معیز کے ساتھ گھر آنے کے فیصلے پر افسوس ہونے لگا۔

(اس سے تو اچھا تھا کوئی مووی دیکھ لیتی گھر پہ)

وہ کڑھتے ہوئے اپنی پلیٹ میں سالن نکال رہی تھی۔ ڈرائیور کے ہاتھ اسپتال' عمر اور ارزا کے لیے کھانا بھجوانے کے بعد ابیہا نے کچن ہی میں بیٹھ کے تھوڑا سا کھانا کھالیا۔ اس کا رباب جیسی کم ظرف کے سامنے جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ کھانے کے بعد معیز نے زارا کو تھوڑی دیر آرام کرنے کا مشورہ دیا تو رباب کا دل گھبرانے لگا۔

وہ اس "دکھی چہرہ" زارا کے ساتھ جا کے آرام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ فوراً" ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم آرام کرو۔ میری وجہ سے ڈسٹرب ہوگی۔ میں پھر آؤں گی۔"

بڑے پیار سے زارا کو لپٹاتے ہوئے وہ چھوٹے بھائی کو کال ملا رہی تھی۔ جو بائیک پہ آکے اسے ساتھ لے جاتا۔

"تم رکو نا زارا کے پاس۔ شام کو میں ہاسپٹل جاتے ہوئے تمہیں ڈراپ کردوں گا۔"

اس کے ساتھ باہر تک آتے معیز نے آفر بھی کی۔

"نہیں معیز۔ زارا کو آرام کی ضرورت ہے' میری وجہ سے وہ ڈسٹرب ہوگی۔"

اس نے طریقے سے انکار کردیا۔ رباب کو رخصت کر کے وہ چائے کی طلب لیے کچن میں آیا تو ابیہا کو دل جمعی اور پھرتی کے ساتھ برتنوں کی دھلائی میں مگن پایا۔ وہ چونکہ چائے بنانے کا سوچ کر ہی کچن میں آیا تھا' سو ابیہا کو متوجہ کیے بغیر ساس پین چولہے پر رکھا۔ کھٹکے کی آواز پر ابیہا نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ فریج میں سے دودھ کا پیکٹ نکال رہا تھا۔

ایبہا نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور اس کی طرف پلٹی۔
"چائے چاہیے۔۔۔؟ میں بنا دیتی ہوں۔"
اس کے اندر کی پیدائشی عورت نے گوارا نہ کیا تھا کہ ایک مرد کو اپنی موجودگی میں چائے بنانے دیتی۔
معیز نے خاموشی سے دودھ کا پیک کاؤنٹر پہ رکھا اور کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔
چولہا جلا کر قہوہ بناتے اور پھر دودھ ڈال کے دم پہ رکھتے معیز نے بے دھیانی میں اسے دیکھا۔ ایک ہفتہ پہلے معیز نے اسے کال کر کے بلایا تھا اور پچھلے ایک ہفتے ہی سے وہ سارے گھر کا نظام ایسے سنبھالے ہوئے تھی جیسے برسوں سے سنبھال رہی ہو۔
وہ تینوں اسپتال میں کھانا، ناشتہ کھاتے یا نہیں، مگر وہ ڈرائیور کے ہاتھ تینوں کے لیے باقاعدگی سے کھانا بھجواتی تھی۔
اس نے ریک میں سے مگ لیا اور اس میں چائے چھان کے ڈالنے لگی۔
اس نے مگ معیز کے سامنے رکھا۔
"تھینکس۔۔۔"
"اب آنٹی کی طبیعت کیسی ہے؟"
ایبہا نے بار بار لبوں تک آتا سوال پوچھ ہی لیا۔ تو ایک تکلیف کا احساس معیز کے اندر پھر سے جاگنے لگا۔
"ویسی ہی۔۔۔ جیسی اول روز سے ہے۔" وہ پھیکے لہجے میں بولا۔ ایبہا اس کے سامنے والی کرسی پہ ٹک گئی۔
"وہ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔" اس نے پورے خلوص سے کہا۔ تو ایک دم سے معیز کی زبان تلخی سے پھسلی۔
"ہاں۔ اگر تم انہیں بددعائیں دینا ختم کر دو گی تو۔" ایبہا کے سر پہ جیسے کسی نے ہتھوڑا دے مارا ہو۔ معیز وہ آخری شخص تھا جس سے وہ اس الزام کی توقع رکھتی تھی، مگر وہ "پہلا" بن گیا۔
بعض اوقات ہم توقعات کے کارپٹ پہ بہت بری طرح پھسلتے ہیں۔
ایبہا کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔ اس نے بے یقینی سے معیز کو دیکھا وہ بات کرتے ہوئے اسی کی طرف متوجہ تھا۔ ایبہا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔
"مطلب۔۔۔ آپ میرے بارے میں۔۔۔ اتنا برا سوچتے ہیں؟" اس سے بولنا مشکل ہوا۔
"دیکھو۔۔۔ ڈراما مت کرنا یہاں۔ اس دنیا میں تمہارے سوا ہمارا کسی سے کوئی اختلاف نہیں ہے، سو صاف اور سیدھی بات ہے جو میں نے کہہ دی۔"
وہ بڑی رکھائی سے اس کے آنسوؤں کو ڈراما کہہ گیا تھا۔ ایبہا کے آنسو تو کیا حواس بھی ٹھٹھر گئے۔
اتنے دنوں سے وہ کتنی ایمان داری سے ان لوگوں کے ساتھ چل رہی تھی۔ سفینہ بیگم کا نام اس کی نمازوں کی دعاؤں کا باقاعدہ حصہ بن گیا تھا۔
ایسا نہیں تھا کہ اسے سفینہ بیگم سے بہت محبت تھی، بلکہ اس لیے کہ۔۔۔ معیز کو ان سے شدید محبت تھی۔
وہ مزید کوئی بات کیے بنا وہی بدگمانی لیے مگ اٹھائے چلا گیا تو وہ یونہی ساکت بیٹھی اسے جاتا دیکھتی رہی۔
رباب کی باتوں پہ ایبہا کا دل دکھتا تھا۔۔۔ تو معیز کی باتوں کا وہ کیا کرتی؟ وہ تو دکھتے دل کو چیر ہی گیا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔۔۔ اس کا تو دکھ بھی ڈراما بن گیا تھا۔



ان دنوں زارا باقاعدگی سے پانچوں نمازیں پڑھ رہی تھی۔ معیز اور ایراز تو خیر شروع ہی سے پابند نماز تھے۔
معیز فجر پڑھنے گیا تو لاؤنج میں صوفے پہ لیٹی ایبہا کی آنکھ کھل گئی۔۔۔ فجر پڑھنے کے بعد مسنون دعائیں پڑھ کے پوری نیک نیتی سے سفینہ بیگم کے لیے دعائے صحت کرنے کے بعد وہ زارا کے کمرے کی طرف آئی۔
اس نے ہلکا سا کھٹکھٹانے کے بعد دروازہ کھول کے دیکھا تو زارا جاگ رہی تھی۔
"میں آجاؤں۔۔۔؟" ایبہا نے اجازت طلب کی تو وہ جو تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی اٹھ بیٹھی۔ دوپٹہ ابھی تک نماز کے اسٹائل میں لپیٹا ہوا تھا۔ اثبات میں سر ہلایا۔
"آجاؤ۔۔۔" ایبہا جھجکتی ہوئی اندر آگئی۔
"بیٹھو۔۔۔" زارا نے اپنے بیڈ پہ اشارہ کیا تو وہ کنارے پہ ٹک گئی۔ ایبہا نے چند لمحے جیسے لفظوں کا جوڑ توڑ کیا ہو۔ پھر سر اٹھا کر زارا کو دیکھا۔
"اللہ جانتا ہے زارا۔ میں نے کبھی بھی آنٹی کے لیے کچھ برا نہیں سوچا اور نہ ہی انہیں بددعا دی ہے۔" اس کی آواز بھر آگئی تھی۔ زارا نے ہاتھ بڑھا کر بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھپکا۔
"وہ آپ لوگوں کی ماں ہیں اور میں جانتی ہوں کہ ماں جیسی دولت کا کھونا کیسا ہے۔۔۔ آپ پوری دنیا کھو بیٹھتے ہیں۔"
ایبہا کے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے اور ساتھ ہی زارا کے بھی۔
"دے لیتیں بددعا ایبہا۔۔۔ تمہارا صبر ہی پڑ گیا ہے شاید۔" زارا روتے ہوئے دکھ سے بوجھل لہجے میں بولی۔ تو کچھ بولنے کی کوشش میں ناکام ہو کر ایبہا نے نفی میں سر ہلایا تھا۔
"ہم میں سے کسی نے بھی تمہیں انصاف نہیں دلایا اور تم پھر بھی صبر کرتی رہیں۔۔۔"
زارا پہ گزرے دنوں میں بہت کچھ وارد ہوا تھا۔ ٹھوکر لگنے پر تو آنکھیں کھل ہی جایا کرتی ہیں۔ پھر آگے پیچھے بہت کچھ دکھائی دیتا ہے۔
"ہم سب حالات کا شکار ہیں زارا۔ آنٹی کا کیا قصور۔۔۔ میں ان چاہا فیصلہ ہوں جو ان پر تھوپا گیا تھا۔ اور مسلط کر دیے جانے والے فیصلوں پر کوئی بھی خوش نہیں ہوا کرتا۔" ایبہا نے پل بھر میں سب کو بری کر دیا تھا۔
"میری طرف سے دل میں میل مت لاؤ زارا۔ میں تو اس گھر کے ہر فرد کے لیے دل سے دعا کرتی ہوں۔ تو اس ماں کے لیے کیوں نہ کروں گی جس کے بیٹے نے ایک لڑکی کو بازار میں بکنے سے بچایا تھا۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں زارا۔"
وہ بری طرح رو رہی تھی۔
اور زارا نے جیسے اتنے عرصے میں پہلی بار اس کے دکھ کی شدت کو محسوس کیا اور اسے خود سے لپٹا لیا۔
یہ اس کے یقین کا اظہار تھا۔ ایبہا کے دل میں ٹھنڈک سی اترنے لگی۔



بے کیف سے دن بوجھل راتیں۔ ہر کوئی اپنی جگہ بے سکونی کی کیفیت میں تھا۔
عون اسپتال سے گھر آیا تو امی بھابی نے سفینہ بیگم کی بابت پوچھا۔ وہ انہیں تفصیل بتا کے کمرے میں آیا تو طبیعت مضمحل سی تھی۔ معیز سے ظاہری نہیں دلی دوستی تھی۔ اس کا دکھ عون کو بھی دکھی کرتا تھا۔
ثانیہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔ عون کو اندر آتا دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔
وہ اسے نظرانداز کرتا اپنے رات کے کپڑے لیے واش روم میں چلا گیا باہر نکلا تو وہ ابھی بھی یونہی منتظر سی بیٹھی

تھی۔ عون نے حسب عادت تکیہ اٹھا کر اپنی جگہ کو جھاڑا۔

"کیسی طبیعت ہے اب آنٹی کی۔؟"

وہ اسے سونے پہ "تلا" دیکھ کر نرمی سے بولی۔

"ہوں۔ ویسی ہی ہے۔"

سرہلا کر مختصراً" جواب دیا اور بتی بجھا کر اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ ثانیہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہونے لگی۔

جن دنوں وہ متوجہ رہتا تھا' تب بھی وہ جھنجلائی ہوئی رہتی تھی اور اب اس کا "غیر متوجہ" انداز بھی دل پر آرے چلا رہا تھا۔ وہ اب کڑھنے لگی۔

اس کی تو شاید نزدیک کی نظر بھی کمزور ہے۔ اتنی خوب صورت بیوی بھی دکھائی نہیں دیتی۔۔۔ چلو قبول صورت ہی سہی۔

"عون۔۔۔ تمہیں نہیں لگتا کہ ہم کچھ عجیب سے ہو گئے ہیں۔" وہ بلا ارادہ بے اختیار ہی کہہ گئی۔ پھر دانتوں تلے زبان دبا کر اسے سزا بھی دی۔ دم سادھ کے پڑ گئی۔ جانے وہ کیا سمجھے عون کی آواز لمحہ بھر کے وقفے سے اندھیرے میں ابھری۔

"تم شاید غیر فطری کہنا چاہ رہی ہو۔"

ثانیہ پر تو گھڑوں پانی پھرا۔۔۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنی سانس بند ہوتی محسوس کی۔ وہ کروٹ بدل کے ثانیہ کے بالکل پاس آگیا تھا۔

"میں تو فطرت سے پیار کرنے والوں میں سے ہوں۔" دھیما جذب سے بھرپور لہجہ۔ ثانی کے بالکل کان میں گنگنایا تھا۔ اور وہ حواس باختہ سی اسے اجنبیت کی تمام دیواریں توڑتے دیکھتی رہ گئی۔



وہ آئینے کے سامنے کھڑی کان میں بندہ پہن رہی تھی' جب وہ مکمل تیار شدہ حالت میں بڑا مصروف سا اس طرف آیا اور پرفیوم اٹھانے کے لیے جھکا۔

نگاہ آئینے میں۔۔۔ ثانیہ کی نظر سے ٹکرائی تو ہونٹوں پر شرارتی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس مسکراہٹ نے ثانیہ کے چہرے پر جیسے شعلوں کی لپٹیں دوڑا دیں۔ وہ محجوب سی ہاتھوں سے پھسلتا بندا سنبھالنے لگی۔

"اوفوہ۔۔۔ میری پرنسز کس الجھن میں پڑ گئی ہے۔" وہ پرفیوم واپس رکھتا سیدھا ہوا اور مسکرا کر کہتے ہوئے بندا اس کے ہاتھ سے لے کر خود پہنانے لگا۔ پھر ہلکا سا کھنکھارا۔

"تمہیں پتا ہے میاں بیوی کے رشتے میں جب محبت ہو تو وہاں انا نہیں ہوا کرتی۔۔۔ صرف مان ہوتا ہے۔" بے حد نرمی سے کہا اور وہ جو بندا پہناتے اس کے ہاتھوں کے لمس ہی سے مسمرائز تھی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

دفعتاً" وہ گھٹنے کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا اور دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر ذرا سا سر جھکایا اور گویا اعتراف کرنے لگا۔

"مجھے تم سے محبت ہے ثانیہ عون عباس۔ تم دس ہزار بار مجھ سے روٹھو گی تو ہر بار میں ہی تمہیں مناؤں گا' کیونکہ میری محبت میں انا نام کا کوئی دشمن نہیں ہے۔" ثانیہ لمحہ بھر میں ہلکی پھلکی ہو گئی۔

سارے خود ساختہ خوف اور فضول سوچیں۔۔۔ وہ کہے گا۔۔۔ طعنے دے گا۔ سب اڑنچھو ہو گئے۔ میاں بیوی میں محبت ہو تو "انا" نہیں ہوا کرتی۔ محبت کرنے والے خود ہی دوسرے کی عزت نفس کا خیال کرتے ہیں ثانیہ کو یہ

سبق بڑے اچھے سے سمجھ میں آیا تھا۔
وہ پلٹی اور ڈریسنگ ٹیبل پر سے عون کا پرفیوم اٹھایا۔ پہلے ہلکا سا فضا میں اسپرے کیا اور لمبی سی سانس اندر کھینچ کر خوشبو کو محسوس کیا۔
عون دراز قد اس کے سامنے کھڑا ہوا ثانیہ نے دل کی پوری رضا کے ساتھ اس کے پاس آتے ہوئے اس کے ملبوس پر اسپرے کیا پھر بڑے اطمینان کے ساتھ بولی۔
"یہ خوش فہمی تم بھول جاؤ کہ میں دس ہزار بار تم سے روٹھوں گی... ہاں مگر..." اس نے تنبیہی انداز میں انگلی اٹھا کر گویا وارننگ دی۔
"تمہارے خراٹوں کی وجہ سے ہر بار لڑائی ہوا کرے گی۔"
"تو تم میرے منہ پہ تکیہ رکھ دینا۔"
عون نے معصوم سا منہ بنایا۔ ثانی نے منہ لٹکا لیا۔
"یہی تو نہیں کر سکتی... پانے کے بعد کھونا بہت مشکل ہے۔" اف... اعتراف محبت۔
عون کا دل بہت ترنگ میں دھڑکا۔ کھینچ کر اسے اپنی گرفت میں لیا۔
"بہت گندی جان ہو... اتنے دن تنگ کیا مجھے۔" ثانیہ ہنسی۔
"آئی لو یو..." کان میں گنگناتا عون کا دھیما سا لہجہ اور ثانیہ کا مدھم سا اعتراف۔
"می ٹو..."
"دو بے وقوفوں کی کہانی کی بنیاد "محبت" تھی۔ سو محبت بھرے انداز میں محبت کے اعتراف پہ ہی ختم ہوئی۔ ہر اختلاف ہر لڑائی۔



ڈراما... ؟ ڈرائیونگ کرتے معیز کا ذہن وہیں اٹکا ہوا تھا۔
سفینہ بیگم کا ایبہا سے رویہ سب کے سامنے تھا اور ایسے میں ایبہا کا اس قدر مثبت رویہ...
معیز نے سر جھٹکتے ہوئے موبائل سے رباب کو کال ملائی۔
"ریڈی ہو تو راستے میں سے تمہیں پک کرلوں... ؟"
"اوہو... کہاں کا پروگرام ہے ؟"
رباب نے کھنکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"شکر ہے اس سڑے بھسے فیز سے نکلے سب۔"
معیز نے احتیاط سے موڑ کاٹا۔ اس کا دھیان رباب کے انداز کی طرف نہیں تھا۔
"اسپتال جارہا ہوں۔ سوچا تمہیں بھی لے چلوں۔" وہ بولا۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔
"رباب... کہاں ہو یار... ؟" معیز کو شک ہوا۔ شاید لائن ڈراپ ہو گئی تھی۔
"زارا بھی ساتھ ہے ؟" رباب نے پوچھا تو معیز نے اس کی بھی تفصیل بتا ڈالی۔ رباب کا تو سر کے بال نوچنے کو جی چاہا۔
دونوں بہن بھائی ہی مجذوب بنے بیٹھے تھے۔ بھئی۔ کیا دنیا بیمار نہیں پڑتی...

"آئم سوری معیز... میں کچھ بہتر محسوس نہیں کر رہی ایکچوئیلی مجھے اسپتال کے ماحول سے وحشت ہوتی

ہے۔ یونو دوائیوں کی بو وغیرہ۔"

وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی تو معیز کی پیشانی پر ہلکی سی شکن پڑی۔

"اوکے۔۔۔ اللہ حافظ۔"

اس نے مختصراً" کہہ کر لائن ڈراپ کرتے ہوئے موبائل ڈیش بورڈ پہ ڈال دیا۔

ذہن ایک بار پھر ابیہا مراد کی طرف پلٹنے لگا۔

وہ کس نیت سے یہ سب کر رہی تھی؟ گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ اسپتال میں داخل ہوا تب اس کے موبائل پر ایراز کی کال آنے لگی تھی۔

اس نے صرف "ایراز کالنگ" جگمگاتے ہوئے دیکھا تو دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ وہ یونہی موبائل مضبوطی سے تھامے اندر کی جانب دوڑا۔ وہ یہ کال نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دبا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ وہ پھولی سانسوں کے ساتھ سفینہ بیگم کے کمرے تک پہنچا۔ اس نے اندر سے دو ڈاکٹرز اور نرسوں کو نکلتے دیکھا اور ساتھ ایراز۔۔۔ معیز کی ٹانگوں کی جان گویا نکلنے لگی۔

تب ہی ایراز کی نظر اس پر پڑ گئی تو وہ بھاگنے کے سے انداز میں معیز کی طرف آیا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

وہ پاس آ کے جوشیلے انداز میں بولا۔

"ماما کو ہوش آ گیا ہے بھائی۔۔۔ ابھی ڈاکٹرز چیک کر کے گئے ہیں۔ وہ بول نہیں رہیں، مگر وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

اور معیز۔۔۔ پھر سے جی اٹھا۔

وہ تیزی سے کمرے میں بھاگا تھا۔

سفینہ بیگم چت لیٹی تھیں، مگر اتنے دنوں سے بند آنکھیں اب مسلسل کھلی تھیں اور چھت کو دیکھ رہی تھیں۔

"ماما۔۔۔ ماما۔۔۔" فرط جذبات سے وہ انہیں پکارتا ان کے قریب چلا آیا۔ تو انہوں نے چہرہ گھما کر دیکھا۔

ایراز اس کے پیچھے تھا۔ سفینہ بیگم کا کمزور سا لہجہ ابھرا۔

"تم لوگ کون ہو۔۔۔؟"

ان کے انداز میں اس قدر اجنبیت تھی کہ دونوں بھائی اپنی جگہ گڑے رہ گئے۔ انجکشنز لے کے آتا عمر بھی ساکت سا تھا۔



دعائیں رنگ لائی تھیں سفینہ بیگم کومے سے باہر آ گئیں، مگر شدید نروس بریک ڈاؤن کی وجہ سے ان کی دماغی کیفیت متاثر ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے فی الحال وہ کسی کو پہچان نہیں پا رہی تھی، مگر ان کے لیے یہی خوشی بہت تھی کہ ماں زندہ، جیتی جاگتی حالت میں سامنے تھی۔

وہ زارا کو لینے آیا۔ تو خوشی کی خبر سن کر وہ رونے لگی۔

"رو مت زارا۔ پہلے اللہ کا شکر ادا کرو۔" ابیہا نے نرمی سے ٹوکا تو معیز نے بے اختیار اسے دیکھا۔

"مبارک ہو۔" وہ کچھ جتانے والے انداز میں بولی تو معیز عجیب سی کیفیت کا شکار ہوا۔

"میں بس شکرانے کے دو نفل پڑھ لوں۔ پھر ہاسپٹل چلتی ہوں۔" زارا ہنستی روتی کیفیت میں تھی، مگر پہلے وہ اس اللہ کا سجدہ شکر ادا کرنا چاہتی تھی، جس نے ہاتھ اٹھاتے ہی اسے نواز دیا تھا۔

زارا کے جانے کے بعد معیز نے دیکھا ابیہا لاؤنج میں صوفے پر جا بیٹھی تھی اور اپنی مسنون دعاؤں والی

کتاب بند کر کے دعا مانگ رہی تھی۔
وہ کچھ سوچ کر اس کی طرف آیا۔ اس نے ایہا کی دعا مکمل ہونے اور آمین کہہ کر چہرے پر ہاتھ پھیرنے کا انتظار کیا وہ اٹھنے لگی تو' معیز کو کھڑے پاکر چونک گئی۔
"آئم سوری!" وہ راستے میں کھڑا تھا۔ ایہا وہاں سے جانے لگی تھی جب وہ صاف آواز میں بولا۔
وہ ٹھٹک گئی۔ بے حد حیرت سے معیز کو دیکھا۔
"میں نے ٹینشن میں آکر وہ فضول بکواس کردی تھی۔ اس کے لیے سوری۔"
"میں ہر شخص کو معاف کرنے میں جلدی کرتی ہوں۔ آپ کو بھی اسی وقت کردیا تھا۔ اس سے دل صاف رہتا ہے۔"
وہ پرسکون انداز میں کہتی معیز کو بے سکون کر گئی۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ وہاں سے جا چکی تھی۔
زارا اچھی طرح دوپٹہ لپیٹتی کھلے چہرے کے ساتھ آئی تو وہ چونکا۔
"ایہا سے پوچھ لو۔ وہ جائے گی؟"
وہ کہنا کچھ چاہتا تھا اور منہ سے کچھ اور ہی نکل گیا۔ زارا کو بھلا کیا اعتراض تھا۔ فوراً" اسے لے آئی۔ ان دونوں کے ساتھ باہر نکلتے معیز کو احساس ہوا کہ زارا نے بالکل ایہا کے طریقے سے دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔
"تو کیا زارا... ایہا کو فالو کرنے لگی ہے؟"
معیز کے ذہن میں پھانس سی اٹکنے لگی تھی۔



سفینہ بیگم کے سنبھلنے تک زارا کی شادی آگے کردی گئی تھی۔ وہ تیزی سے روبصحت تھیں اور ہاسپٹل سے گھر شفٹ کردی گئی تھیں۔ ہاں مگر ذہنی کیفیت کسی وقت بالکل غائب دماغ سی ہو جاتی تو وہ عجیب بہکی بہکی سی باتیں کرتیں۔ کسی کو بھی نہ پہچانتیں' یا پھر اگر اپنی کسی بات پہ اڑ جاتیں' خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ تو وہ بحث سننا پسند نہ کرتی تھیں۔ زور زور سے چیختی چلاتیں اور ڈاکٹر نے انہیں سختی سے ٹینشن فری رکھنے اور پیار اور عقل مندی سے کنٹرول کرنے کی ہدایت کی تھی۔ زارا کے ذمہ ان کی مستقل دیکھ بھال آگئی تو وہیں سارے گھر کا نظام ایہا کا محتاج ہو گیا' نذیراں واپس آچکی تھی۔ اس کے ساتھ مل کے ایہا گھر کے ہر کونے کو سنوارتی۔
"مجھے اس لڑکی کی شکل سے ہی چڑ ہے' ورنہ میں اسے مستقل نوکرانی بنانا پسند کرتی۔"
رباب نے ایک بار با آواز بلند ایہا کو سناتے ہوئے مذاقاً" معیز سے کہا تو وہ سناٹے میں آگیا۔
"شٹ اپ رباب۔" وہ ناگواری سے بولا تو رباب نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔
"تمہارا بہت دل دکھتا ہے اس کے خلاف سن کر۔"
"وہ تمہارے خلاف یہ سب کہتی تو میں یونہی اعتراض کرتا۔" معیز نے کہا تو وہ تلملا اٹھی۔
"یعنی تمہارے نزدیک مجھ میں اور اس تھرڈ کلاس میں کوئی فرق ہی نہیں ہے؟"
"وہی تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ تم اپنے اور اس کے درمیان موجود فرق باقی رہنے دو۔ جو رباب ہے وہ ایہا کبھی نہیں ہو سکتی۔" معیز نے ٹھنڈے لہجے میں کہا تھا۔
اور یہ سب اپنے کانوں سے سنتی ایہا مراد کے ہونٹوں پہ چپ کا تالا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ معیز کے سامنے اپنے حق کی آواز اٹھا کر شاید خود کو بے مول کر بیٹھی ہے' اب وہ دوبارہ کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ اسے خدا کے فیصلے کا انتظار تھا۔

☆ ☆ ☆

سفینہ بیگم کے سامنے جانا ایبہا کے لیے کڑا امتحان ثابت ہوا۔ مگر یہاں زارا کی فراست کام آئی۔

"آپ چاہتی تھیں نا یہ اس گھر کے کام کرے تو جب سے آپ بیمار ہوئی ہیں نذیراں کے ساتھ مل کر یہ سارا گھر سنبھال رہی ہے۔۔۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔"

اور سفینہ بیگم اچھی طرح سمجھ گئیں۔ البتہ شدید بیماری نے بھی ایبہا سے ان کی نفرت اور بدگمانی کو ختم نہیں کیا تھا۔ وہ ایبہا کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتیں جیسا کسی نوکرانی کے ساتھ۔ اور دوپہر کے کھانے پہ تو حد ہی ہو گئی۔ شدید گرمی سے پریشان زارا شاور لے کر فریش ہونے گئی تب سفینہ بیگم کے کھانے کا ٹائم ہو گیا تو ایبہا بڑی نفاست سے سلاد اور رائتے کی باؤلز سمیت کھانا ٹرے میں سجائے ان کے کمرے میں آ گئی۔ انہوں نے اسے دیکھ کر منہ بنایا۔

"تم پھر آ گئیں۔ نذیراں کہاں مر گئی ہے؟"

ایبہا نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔ ایک برتن میں ان کے ہاتھ دھلوائے۔

"بہت ڈھیٹ ہو۔ بالکل اپنی ماں کی طرح۔" وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

"نذیراں سارا کام ختم کر کے گئی ہے۔ یہ ذمہ داری تو میری ہے نا۔" وہ نرمی سے بولی اور ہاتھ خشک کرنے کے لیے نیپکن انہیں تھمایا۔

"تم کون ہوتی ہو میرے گھر کی ذمہ داری اٹھانے والی۔ ہنہ۔۔۔" انہوں نے نیپکن بیڈ پر پھینکا۔

"میری بیماری کا بہانہ بنا کر قبضہ کرنا چاہتی ہو تم۔" وہ تلملائیں۔ ایبہا نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ ٹھیک ہو جائیں تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔"

"اور اس گھر کا حصہ بھی چھوڑ دو گی؟"

وہ تنفر سے بولیں تو انداز جارحانہ تھا۔ ذہنی دورے کے تحت وہ ایسے ہی ایک بات پہ اڑ جاتی تھیں۔ ایبہا سے تو خیر ویسے بھی انہیں پرخاش تھی۔

"جی۔۔۔ چھوڑ دوں گی۔"

معیز کے قدم کمرے کے دروازے ہی میں ٹھٹک گئے۔ وہ کھانے کی ٹرے سفینہ بیگم کے سامنے رکھ رہی تھی۔

"اور میرے معیز کو بھی۔۔۔"

انہوں نے اسی حقارت بھرے انداز میں گویا کانٹوں بھرا کوڑا اسے رسید کیا تھا۔ وہ بلبلائی روح تک تڑپی مگر منہ سے ایک لفظ نہیں بولا تھا۔

"کھانا کھالیں آپ۔۔۔"

"نہیں۔ پہلے تم کہو کہ تم میرے بیٹے کا پیچھا چھوڑ دو گی۔" وہ بضد ہوئیں اور اب یقیناً کتنی ہی دیر وہ اسی بات پہ اڑی رہنے والی تھیں۔

"میرا ان سے کیا تعلق۔۔۔ جب میں چلی جاؤں گی تو سب کچھ خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

وہ بڑی برداشت سے کام لیتے ہوئے بولی تو نا چاہتے ہوئے بھی آواز بھر آ گئی۔

"ہوں۔۔۔ چلی جانا۔ اچھا۔۔۔ ورنہ میں نوکروں سے کہہ کر تمہیں خود باہر پھنکوا دوں گی۔" وہ سر ہلاتے ہوئے تسلی سے بولیں اور کھانا کھانے لگیں۔

"نذیراں کھانا اچھا بنانے لگی ہے..... میرے پاس کھڑے کھڑے سیکھ گئی ہوگی۔"

وہ یونہی بولتی رہتی تھیں۔ اور ابیہا ان کے کھانا کھانے کے دوران ایک طرف کرسی پہ بیٹھی سنتی رہتی۔ اب بھی ان کی بات پر تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ بنا تصحیح کیے کہ یہ کھانا ابیہا نے بنایا تھا، بلکہ اب تو کھانا پکتا ہی ابیہا کی مہربانی سے تھا۔ زارا تو ان کاموں میں نکمی تھی۔

معیز گہری سانس بھرتا اندر آیا۔ ابیہا کی قوت برداشت واقعی کمال کی تھی، صحیح معنوں میں وہ ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کر رہی تھی۔

"آؤ معیز... کھانا کھاؤ۔"

وہ معیز کو دیکھ کر خوش ہوئیں۔ وہ لنچ کرنے آفس سے گھر آیا تھا۔

"جی ماما آپ کھائیں۔ میں ابھی فریش ہوں گا۔ آپ کو دیکھنے آگیا۔" وہ مسکراتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

وہ بھی مسکرائیں۔ تو واقعی بالکل ٹھیک ہی لگیں۔

"اب میں نے سوچ لیا ہے کہ زارا کی شادی میں ہی تمہارے فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں۔ بھولے آؤں گی میں، تو میری فکر کم ہوگی۔ بستر پہ پڑی ہوں سارا گھر اوندھا سیدھا ہو گیا ہوگا۔"

وہ مگن انداز میں مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ معیز کی نگاہ بے اختیار ہی ابیہا کے سفید پڑتے چہرے کی طرف اٹھ گئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ابیہا کے سامنے کوئی ایسی بات کرے۔

خود چاہے وہ کوئی بھی فیصلہ کرنا چاہتا تھا، مگر یہ وہ جان گیا تھا کہ وہ ایک بے ضرر اچھی لڑکی ہے۔

سفینہ بیگم کی بات کا جواب اچانک دروازہ کھول کے ابراز کے ساتھ اندر داخل ہوتے عمر نے دیا۔

"غلط فہمی ہے آپ کی پھپھو جان سارا گھر اپنے قدموں پہ کھڑا ہے اور وہ بھی بڑی شان و شوکت کے ساتھ۔"

"اچھا... تمہیں بڑی خبر ہے۔" وہ ہنسیں ابیہا کو اپنا آپ وہاں مس فٹ لگا تو وہ اٹھنے کو پر تولنے لگی۔

"پھر بھی اگر آپ اپنے کسی بیٹے کی شادی کرانے پہ تلی ہی ہوئی ہیں تو میری کرا دیں۔"

ابراز نے مسکین سا منہ بنایا۔

"بلکہ مجھے گود لے کے بھی یہ فریضہ ادا کر سکتی ہیں۔" عمر کے جملے کمال کے ہوتے تھے ابیہا کو ہنسی آنے لگی۔ مگر عمر کے اگلے فقرے نے اسے ٹھہرا دیا۔

"رہ گیا آپ کا گھر تو وہ آپ کی بڑی بہو نے چمکا کے رکھا ہوا ہے۔"

کمرے میں ایک دم خاموشی سی چھائی۔ ابیہا حواس باختہ سی کرسی سے اٹھی۔

"کیا بکواس ہے یہ عمر...؟" وہ غصیلے لہجے میں بولیں۔ ساتھ ہی ابیہا کو گھور کے دیکھا۔

"یہ کوڑے کے ڈھیر سے اٹھ کے آئی لڑکی... اسے تم میری بہو کہہ رہے ہو..."

نفرت، حقارت، تنفر... خوف خدا ختم تھا یہاں جو عورت اپنے ٹھنڈے مزاج کے مثالی شوہر کے ساتھ ساری زندگی طبل جنگ بجائے رہی تھی وہ کسی اور کو کیوں کر بخشتی ابیہا کا چہرہ اہانت کے مارے سرخ ہو گیا۔

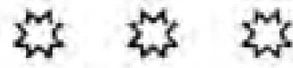
"ہیرا کوڑے کے ڈھیر پہ پڑا ہو تب بھی ہیرا ہی ہوتا ہے پھپھو! اس کی قیمت اور قدر میں فرق نہیں آتا۔"

عمر سنجیدہ تھا، مگر اسے احساس نہیں تھا وہ کیا کر بیٹھا ہے۔ اگلے ہی پل سفینہ بیگم نے جیسے غصے سے بے قابو ہو کر ہاتھ مار کے کھانے کی ٹرے پرے گرائی اور ایک پلیٹ اٹھا کے ابیہا کو دے ماری جو پوری قوت سے اس کے بازو سے ٹکرائی اور نیچے گر گئی۔ واہی تباہی بکتی سفینہ بیگم نے گلاس اٹھایا تو ابراز ان کے اور ابیہا کے درمیان آ

گیا۔
"کیا ہو گیا ہے۔ ماما۔ ریلیکس۔۔۔"
اس نے نرمی سے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ سے گلاس لیا۔ اور ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ایبہا فی الفور کمرے سے باہر نکل گئی۔ عمر اور ایراز سفینہ بیگم کو ٹھنڈا کر رہے تھے۔ معیز اٹھ کر تیزی سے ایبہا کے پیچھے نکلا۔
ان دنوں اس کے پاس جائے پناہ صرف ایک ہی تھی کچن۔ وہ دروازے پر ہی ٹھٹک گیا۔
کچن میں کرسی پر بیٹھی میز پہ بازو کے گھیرے میں سر ٹکائے وہ یقیناً" رو رہی تھی۔
تاسف اور دکھ کا احساس۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر شرمندگی۔ معیز کے قدم من بھر کے ہو گئے۔
آج تک وہ یہی سوچتا اور کڑھتا آیا تھا کہ زندگی نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔۔۔ مگر آج پتا چلا کہ اس سے بھی زیادہ برا تو ایبہا کے ساتھ ہوا تھا۔ اور یہ ہونا ابھی جاری و ساری تھا۔
آگے آکے اس نے کرسی گھسیٹی اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ فورا" الرٹ ہوئی۔ جلدی سے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں پونچھ کے چہرہ اوپر اٹھایا تو سامنے معیز کو پا کر اہانت کے احساس سے پھر آنکھیں نم ہو گئیں۔
معیز کو "سوری" جیسا لفظ بھی بے معنی لگنے لگا۔
بعض رویوں کا مداوا "رویہ" ہی ہوا کرتا ہے الفاظ نہیں۔ معیز بھی اسی پوزیشن پر تھا' مگر مشکل تو یہ تھی کہ رویے کے اظہار کے لیے رشتے کا تعین ضروری تھا۔
"ماما کی طرف سے میں معذرت چاہتا ہوں۔" وہ درحقیقت شرمندہ تھا۔
لعنتیں' ملامتیں کھاتی یہ لڑکی مشکل وقت میں اس گھر کی صحیح معنوں میں مددگار اور مخلص ثابت ہوئی تھی۔
"ان کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں پتا نہیں ہے۔۔۔۔"
معیز کو کہتے شرم آئی۔
(بھلا جب ذہنی کیفیت ٹھیک تھی تب کون سا وہ اسے پھولوں میں تول رہی تھیں)
"مجھے تو پتا ہے نا۔۔۔ میں ان کی وجہ سے نہیں رو رہی۔" ایبہا نے انہیں بری الذمہ قرار دیا۔
"تو پھر کیوں رو رہی ہو۔۔۔؟"
رو کے گلابی ہوتی آنکھوں کے گرد سیاہ پلکوں کی گھنی باڑ تھی۔ معیز نے اپنے سوال کے جواب میں آنکھوں کے گلابی تہہ والے کٹوروں کو پھر سے بھرتے دیکھا تو وہ مسمریز سا ہو گیا۔ کیا کسی کا رونا۔۔۔؟ رونا بھی جادو اثر ہو سکتا ہے؟ پھر وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔
"ایسے ہی۔۔۔ اپنی بدقسمتی پر یقین آگیا آج۔ میں جتنی بھی صاف دلی سے کوشش کرلوں عزت اور محبت میرے نصیب میں نہیں ہیں۔ میں کبھی بھی کسی کو اپنا نہیں بنا سکتی۔ میرے باپ نے مجھے بیچ دیا' میری ماں مر گئی اور اس گھر نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔۔۔ آپ بس ایک مہربانی کیجیے گا۔ مجھے کسی قابل اعتبار دارالامان میں چھوڑ دیجیے گا۔"
وہ دکھ اور درد کی انتہا پر تھی۔ ایک آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کے رخسار پر لڑھک آیا۔ شدت ضبط سے سرخ پڑتی آنکھوں نے معیز کو بیٹھے بٹھائے مار ہی توڑالا۔ وہ لمحوں میں خالی سینہ بیٹھا رہ گیا۔
کاگا' سب تن کھائیو
چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو
انہیں

پیا ملن کی آس
وہ ایبھا مراد تھی۔ عزت اور محبت کے لیے روتی کرلاتی۔ اپنی بد قسمتی پہ آنسو بہاتی۔ جانتی نہیں تھی آج اس کی قسمت اوج پر ہے اور اس کے بخت کا ستارہ معیز احمد کی پیشانی پر چمکنے والا ہے۔
وہ دوپٹے سے بے دردی سے چہرہ رگڑ رہی تھی۔
سرخ پڑتا چہرہ گھور سیاہ آنکھیں۔
معیز کو جیسے آج پتا چلا کہ وہ کس قدر خوب صورت تھی، اور یہ بھی کہ پاس بیٹھی لڑکی اس کی کیا لگتی تھی۔ وہ معیز کے ساکت وجامد انداز پر گھبرا کر پریشانی سے بولی۔
"قسم سے میں آنٹی سے خفا نہیں ہوں اور کبھی بددعا نہیں کرتی۔ میں نے تو آج تک کبھی اپنے آپ کے لیے بھی برا لفظ نہیں کہا۔"
معیز نے بے اختیار اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ تو وہ گنگ سی ہو گئی۔
"میں جانتا ہوں۔ تم کسی کا برا چاہ ہی نہیں سکتیں۔" ایک تند و تیز جھکڑ سا چلا۔ ایبھا نے حد درجہ بے یقینی سے معیز کا چہرہ دیکھا۔
نرم سے تاثرات اور اس سے بھی بڑھ کے نرمی اس کے لب و لہجے سے چھلک رہی تھی۔
ایبھا نے جیسے کرنٹ کھا کر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچا۔
معیز کا انداز اپنی گرفت میں جکڑنے والا تھا۔ اس وقت وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھ لیتی تو کہیں اور دیکھ ہی نہ پاتی مگر اس نے مفر کی راہ اختیار کی کرسی گھسیٹ کر فوراً اٹھ گئی۔
مگر معیز موقع جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ بالکل تازہ تازہ دل پہ بیتنے والی واردات نے پل بھر میں ایک نیا معیز احمد تعمیر کر ڈالا تھا۔
تو یہ "آسمانی چیز" اس پر نازل ہو ہی گئی تھی۔ جسے عرف عام میں محبت کہا جاتا ہے؟ کیا یہ واقعی تھی؟ اس نے ایبھا کا ہاتھ دوبارہ سے تھاما اسے جانے سے روکا اور خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ایبھا۔۔۔"
بدلی نگاہ، بدلا لب و لہجہ۔۔۔ وہ وحشت زدہ سی ہرنی کی مانند معیز کو دیکھنے لگی۔
اور ان غزالی آنکھوں پر وہ فریفتہ ہی تو ہو گیا۔ دل تو چلا ہی گیا اب بس ایک جان ہی باقی رہ گئی تھی وارنے کو۔ (مگر جو فیصلہ میں نے کیا ہے اس کا کیا؟)
ایبھا نے خود کو یاد دلایا۔
اسی وقت زارا اسے پکارتے ہوئے ادھر ہی چلی آئی تو معیز اس کا ہاتھ چھوڑ کر پلٹ گیا۔
تمتماتے چہرے کے ساتھ وہ اللہ کا شکر ادا کرتی زارا کو دیکھنے لگی۔
"کیا ہوا۔۔۔ لگی تو نہیں تمہیں؟" زارا کی پریشانی محبت بھری تھی۔ معیز نے شدت سے محسوس کیا اور زارا کو خوش قسمت بھی گردانا جو اس محبت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔
وہ ایبھا کی آستین اوپر چڑھائے لال نشان دیکھ رہی تھی۔
"کریم مل دیتی ہوں۔ نیل پڑ جائے گا یہاں۔"
جب طعنے تشنے تھے تب بھی زندگی مشکل تھی۔ اب ایک دم سے یوں توجہ ملی تو ایبھا کا پھوٹ پھوٹ کے رونے کو جی چاہا۔
اور دل چاہا اپنی پشت پہ کھڑے اس خوب صورت شخص کی بدلتی آنکھوں میں غور سے اپنا عکس دیکھے۔۔۔ اور پھر

بار بار دیکھے.... آج تو معجزہ ہو گیا تھا۔
معیز کا دیکھنا... عام دیکھنے جیسا نہیں تھا' مگر وہ اسے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے دل کو کچلنا تھا۔ جو فیصلہ اس نے کیا تھا اس پر عمل کرنے کے لیے اس کا اس گھر اور اس کے لوگوں سے دور ہو جانا ہی بہتر تھا۔
بس کچھ ہی گھنٹے تھے ایبہا کے ان سب کے ساتھ' اس کا ایک بار پلٹ کر معیز احمد کو دیکھنے کو جی چاہا' مگر وہ دل پہ پاؤں رکھے زارا کے ساتھ نکل گئی۔



وہ مرد تھا۔ اور اسے کوئی شرمندگی نہ تھی کہ ایبہا مراد آج اسے اچھی لگی۔ بلکہ اس وقت کے بعد تو وہ بار بار اسے دیکھنا اور سننا چاہ رہا تھا۔
اس کے پاس اپنی اس وارفتہ اور بے اختیارانہ کیفیت کا تجزیہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ بس ایبہا کے سامنے جاتا اور سب حقیقت سامنے آجاتی۔ کیا یہ وارفتگی تب بھی باقی رہتی۔ یا محض ان چند لمحوں کا جادو تھا؟
وہ ایبہا سے ملنے کو بے قرار تھا۔ مگر وہ تو جیسے اس سے چھپ ہی گئی تھی۔
تو یہ کیسے پتا چلے کہ ایبہا مراد اس کے لیے کیا بن گئی تھی۔ بنا اس کے سامنے پھر سے جائے؟
وہ پورے گھر میں اسے ڈھونڈ چکا تھا۔ آخر میں لان میں' مگر وہ ندارد' اسے لگا شاید وہ زارا کے کمرے میں ہو۔ تب ہی سر اٹھا کے آسمان پہ چھائی سرمئی بدلیوں کو دیکھتے اس کی نگاہ میں ٹیرس پر لہراتا سرخ و سفید دوپٹا آگیا۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔
کیا قرار آیا تھا دل کو۔ جو مقصود تھا وہ پالیا ہو جیسے۔ وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھا۔ سب اپنے کمروں میں تھے۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ٹیرس پہ آیا تو اسے اوپری سیڑھیوں پہ سر جھکائے بیٹھا پایا۔
سکون کی ایک گہری سانس اس کے حلق سے آزاد ہوئی تھی۔ جوتوں میں مقید پاؤں اس کی نگاہوں کے سامنے آکے ٹھہرے تو ایبہا نے ہڑبڑا کر چہرہ اٹھایا۔
سامنے ہی وہ دشمن جان کھڑا تھا۔ جو کبھی زیست کا حاصل "تھا"
یا شاید "لگا کرتا تھا"
"کس سے چھپ رہی ہو....؟" معیز دفعتاً" برا مان گیا۔ ہلکے سے چبھن آمیز انداز میں کہا۔
"میں کسی سے کیوں چھپوں گی۔ میں نے کسی کا کیا چرایا ہے۔" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہہ کر ٹھوڑی دوبارہ گھٹنوں پر رکھ لی۔
کیا پتا کچھ چرا ہی لیا ہو۔" وہ بے ساختہ بولا' پھر اپنے لفظوں پر مسکرا دیا۔ اسے یہ سب کہنا اچھا لگ رہا تھا۔ کوئی جبر کوئی زبردستی نہ تھی۔"
"تھوڑا ہی وقت ہے سب لوٹانے میں۔" وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔
"ہوں۔ کیا کہا۔؟"
وہ واقعی اسے سننا چاہتا تھا' مگر وہ گہری سانس بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ سرخ و سفید پرنٹ کے لباس میں ان ہی دو رنگوں کا دوپٹہ شانوں پہ ڈالے وہ معیز احمد کو ایک نیا جہاں' ایک نئی دنیا لگ رہی تھی جو اس نے آج ہی دریافت کی ہو۔
"میں تو بس یونہی۔ اچھا موسم دیکھ کے آگئی تھی۔" اس نے نیچے جانے کا ارادہ باندھتے ہوئے سادگی سے کہا۔
معیز کے بدلتے انداز پر اس کا دل دھڑک کے جا رہا تھا۔

"اور میں نہیں۔" کتنا سادہ طرز بے ساختہ مدعا تھا۔
ایہا کو زوروں کا رونا آیا۔
وہ کیا کرتی۔ اب اس کی سوچ اس کی منزل بدل چکی تھی۔ اسے ان نگاہوں اور اس لہجے کے جال میں نہیں آنا تھا۔
ایہا نا سمجھی کا تاثر دیتے ہوئے اس کے پاس سے گزری تو معیز کی پر سکون سی آواز نے اس کے جسم و جاں میں ہلچل سی مچادی۔
"کیا مجھے اپنے اب تک کے رویے کی معافی مل سکتی ہے؟"
جال کاٹ کاٹ کے سفر کے راستے ڈھونڈنے والا پرندہ خود بخود دل کی ڈال پر آکے بیٹھ گیا تھا۔ اس کی جان لرزنے لگی۔ وہ چاہ کے بھی اس سے دوری اختیار کرنے والا ایک قدم بھی نہیں اٹھاپائی تھی۔ شدت سے رو دی۔
دنیا کی بھیڑ میں کھوئے ہوئے کو اچانک کوئی اپنا مل جائے۔ کچھ ایسی ہی حالت ایہا کی بھی ہوئی تھی۔
معیز نے اس کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے نرمی سے اسے تھام کر گلے سے لگالیا تھا۔ جیسے اسے سہارا دیا ہو۔ اور بس۔ ایہا کو اپنے اللہ کے جبر و قہر۔ اس کی رحمانیت حاوی ہونے کے دعوے پہ پختہ یقین ہوگیا۔ آج اس کا صبر اس کا شکر اس کی تمام دعائیں اور بے بسی رنگ لے آئی تھی۔
پھر جانے کیا ہوا۔ وہ اس کے حصار کو ایک جھٹکے سے توڑ کر اس سے نظر ملائے بغیر سرپٹ سیڑھیوں کی طرف بھاگ لی۔
"ایہا۔ ایہا۔!" وہ سیڑھیوں کے کنارے تک اسے بے تابی سے پکارتا آیا تھا۔
مگر اس کے پیچھے تو جیسے جن بھوت لگ گئے تھے۔ معیز کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔
وہ اپنی شکست تسلیم کر رہا تھا۔ اور وہ تو پہلے ہی اس کی زندگی سے نہ جانے کا مصمم ارادہ ظاہر کرچکی تھی پھر یہ کیا ہوا کہ۔ شاید مجھے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف ٹھیک سے کرنا نہیں آیا۔
(مجھے تو ہاتھ جوڑ کے معافی ملے گی۔ یا شاید اٹھک بیٹھک کرنی پڑے)
سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچتا وہ ایک ہلکے سے سرور آمیز حصار میں گھرا ہوا تھا۔



وہ پچھلے کئی دنوں سے اس گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔ جہاں سے اس نے ایہا مراد کو نکلتے اور پھر وہیں واپس آتے دیکھا تھا۔ وہ معیز احمد اور ایک دوسری لڑکی کے ساتھ گاڑی میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک جاگی۔
یہ لڑکی۔ جادو کا چراغ تھی اس کے لیے۔ تحویل میں آجاتی دوبارہ تو وہ بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا۔ تب ہی وہ اس گھر کے باہر تاک میں بیٹھ گیا۔ صرف کھانا کھانے جاتا اور پھر وہیں سڑک پر آکر جم جاتا۔ وہ ایہا مراد کے گھر سے اکیلے نکلنے کی امید میں تھا۔
اور قسمت اس کا ساتھ دینے کی مکمل تیاری کرچکی تھی۔



روتے ہوئے اس نے اپنے کپڑوں کا بیگ پیک کیا۔ جو وہ انیکسی سے یہیں لے آئی تھی۔
بس۔ اس گھر اور گھر والوں کے ساتھ اس کا اتنا ہی ساتھ تھا۔ معیز احمد کا لمس یاد آتا۔ اس کا ہارا ہوا مگر پیارا انداز تو جان ٹوٹنے لگتی۔
سب جائیں بھاڑ میں، مگر پھر خیال آتا اس عہد کا جو اس نے خود سے کیا تھا۔

وہ دنگ تھی قسمت کے اس موڑ پر۔ جب اس نے اپنا دل بدلا تو معیز احمد کا دل بھی بدل دیا گیا۔
اگر وہ تھوڑی سی خود غرضی دکھاتی تو اس کی زندگی پر بہار ہو سکتی تھی مگر۔
اس نے موبائل اٹھا کر ٹائم دیکھا۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ سب یقیناً" سو رہے تھے۔
چھوٹا گیٹ تو کھلا ہی ہوتا ہے۔ صرف ہینڈ لاک ہے، جو گھمانے پہ کھل جائے گا۔ اور مین روڈ پہ نکلتے ہی کنوینس بھی مل جاتی ہے۔
وہ سب حساب کتاب لگا چکی تھی۔
رونا' رونا۔ شدت کا رونا۔ مگر وہ جانتی تھی اس کا اس گھر سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔
وہ زارا کے کمرے میں تھی۔ اور زارا' سفینہ بیگم کے پاس تھی۔ وہ اپنا بیگ اٹھائے خاموشی سے باہر نکلی تو دل و دماغ عجیب سن حالت میں تھے۔ وہ اب مزید کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔
یہاں سے سیدھی ثانیہ کے پاس جاؤں گی اور پھر اس سے کہوں گی مجھے کسی بہتر مشورے سے نوازے۔
اس نے اندھیری سڑک پر چلتے ہوئے اپنے دل کو قابو کرنا چاہا جو خوف کے مارے بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا۔ تب ہی اس کے پیچھے چلتے سائے نے ایک دم سامنے آکر اس کا راستہ روکا تو بے ساختہ اس کی چیخ نکل گئی۔
"ایبہا۔!" سفاک' سرد مہر سا لہجہ اور سب کچھ پالینے والی فاتحانہ مسکراہٹ۔
یہ چہرہ۔ یہ مکروہ چہرہ اور اس کے گندے عزائم ایبہا کیسے بھول سکتی تھی۔ اس کی ٹانگوں کی جان نکلنے لگی۔ کندھے پہ لٹکا چار جوڑوں والا بیگ منوں برابر لگنے لگا۔
"کب سے ڈھونڈ رہا تھا تمہیں۔ میری سونے کی چڑیا۔"
اسے مارے خوف اور دہشت کے غش آگیا۔ زبان اکڑ کے چڑا بنی تالو کے ساتھ چپک گئی تھی۔ بنا آواز نکالے وہ تیورا کے گری تو اس شخص نے اسے سنبھالتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور حواس کھوتی ایبہا کو بوری کی طرح کندھے پر لاد کر سڑک کنارے قریبی درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھا۔ جہاں کتنے ہی دنوں سے وہ اپنی گاڑی اسی نیت پر کھڑی کرتا تھا۔ آج اس سنسان سڑک پر وہ بیش قیمتی موقع اس کے ہاتھ لگ ہی گیا تھا۔ چند لمحوں میں اندھیری سڑک پر محض گاڑی کی پچھلی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔



"یہ کیا بے وقوفی ہے۔؟"
موبائل پہ کوئی میسیج پڑھتے ہوئے ثانیہ نے خود کلامی کی۔ عون رات گئے ریسٹورنٹ سے لوٹا تھا۔ ابھی فریش ہو کے آیا تھا۔ تولیے سے بال رگڑتے اس کے ہاتھ ٹھٹکے۔
"کیوں۔ سب ہی لوگ تولیے ہی سے بال خشک کرتے ہیں۔"
ثانیہ کو ہنسی آئی۔
"تمہیں نہیں کہہ رہی۔"
پھر الجھن آمیز لہجے میں بولی۔
"تم کہہ رہے تھے ایبہا ان دنوں معیز بھائی کے گھر ہے۔ ابھی مجھے اس کا میسیج آیا ہے کہ وہ ہمارے گھر آرہی ہے۔" عون چونکا۔

"معیز کے ساتھ۔ یا اکیلے؟"

"مذاق کر رہی ہوگی۔ اتنی رات کو۔ کوئی بات نہ ہو گئی ہو۔"

ثانیہ نے کئی قیافے لگائے۔ اسی اثناء میں ثانیہ اس کا نمبر ملا چکی تھی۔

ایک بار' دوبار' سہ بار۔ مگر کال اٹینڈ نہیں کی گئی۔

"تم ذرا معیز بھائی سے پوچھو۔ ایبہا کال اٹینڈ نہیں کر رہی۔"

عون نے سرہلاتے ہوئے اپنا موبائل اٹھا کر معیز کو کال کی تو کسی کے گمان میں بھی وہ قیامت نہ تھی جو گزر چکی تھی۔



عون کی کال بند ہوتے ہی معیز تیزی سے زارا کے کمرے کی طرف بڑھا تو اسے اندھیرا اور خالی پایا۔ اس کے بعد سارے گھر کی لائٹس آن کر کے دیکھ لیا۔ ماما کے کمرے میں جھانک آیا جہاں ماما اور زارا بے خبر سو رہی تھیں۔

وہ خدشات سے بوجھل دل لیے باہر کی طرف بھاگا۔ لاؤنج کا انٹرنس ڈور (داخلی دروازہ) کھلا تھا۔

گیٹ پہ آ کے اس کے بدترین خدشات کی تصحیح ہو گئی۔ بڑا گیٹ بدستور تالے سے بند تھا۔ مگر چھوٹے گیٹ کی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ البتہ آٹومیٹک لاک کسی کے باہر جا کے دروازہ بند کرنے پر اندر سے خود بخود لگ جاتا تھا۔

معیز نے دروازہ کھول کے سڑک پہ ادھر ادھر نگاہ ڈالی دور دور تک کوئی نہیں تھا۔

وہ بے بسی سے مٹھیاں بھینچے لٹی پٹی کیفیت میں کھڑا تھا۔

(اختتام کی طرف گامزن باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حنا یاسمین

من چاہا بول دے تو

ناولٹ

گرمی سے یا غصے سے کوئی عکس واضح نہیں ہو پا رہا تھا۔ بس ایک تمتماتا چہرہ کمرے میں داخل ہوا۔ آنکھوں میں نظر آتی درشتی اور ایک تفاخر سے یا غصے سے آنچل کو کندھے پر یوں ڈالا جیسے کوئی پرانا قرض چکانا تھا۔ پھر دھپ کرکے خود کو صوفے پر گرا لیا گیا مدمقابل بے شک اجنبی نہ تھا پر نظر انداز کرنے کا اسٹائل مکمل اجنبیت کو ظاہر کر رہا تھا۔ فریدہ نے خائف نظروں سے بیٹی کے چہرے کو گھورا، مگر وہاں کوئی پروا نہیں تھی۔ سینٹرل ٹیبل سے گلاس اٹھایا، چھوٹے کولر کے پاس جاکر پانی بھرا اور جلدی جلدی چڑھا کر وہ کمرے کی طرف مڑی۔

"مہک۔۔۔ مہک۔۔۔!" فریدہ پیچھے سے بولتی ہی رہ گئیں۔

"بس بیٹا! وہ زمانے گئے جب بیٹیوں میں تمیز، اخلاق اور سلیقے والی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ مائیں صرف ابرو کا اشارہ کرتیں اور بیٹی فوراً" سے پیشتر ماں کی نظروں کا مفہوم جان جاتی۔ ادب و آداب تو اس دور کی فضاؤں تک میں رچا بسا تھا، مگر اللہ سمجھے اس انگریزی تعلیم کو جس نے لڑکیوں میں لڑکوں جیسی فضول اکڑ ڈال دی۔ تہذیب، سلیقہ چھو کر نہ گزرا۔۔۔"

دادی کو موقع مل گیا۔

"اماں! کالج سے ابھی تھکی ہوئی آئی ہے۔ آج گرمی بھی تو بہت ہے۔" فریدہ نے ماں ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے نادیدہ پسینہ ماتھے سے صاف کیا۔

"ہاں، بس ایسی ہی مائیں ہوتی ہیں، جو پردے ڈال ڈال کے بیٹیوں کی عادتوں کو مزید پکا رنگ چڑھاتی ہیں۔ پھر جب یہی بیٹیاں اگلے گھروں میں جاکر بدتمیزی کرتی ہیں تو ساس اور نندوں سے منہ کی کھاتی ہیں۔ پھر ایسی ہی مائیں، بیٹیوں کے پیچھے ریں ریں کرتی پھرتی ہیں۔ پہلے چوٹی سے پکڑ کر ٹھیک کرنا نہ آیا تو بعد میں رونے کا فائدہ؟؟"

دادی کے ہاتھوں اماں کی درگت بنتے دیکھ کر کچن سے چکن منچورین کا ڈونگا اٹھائے باہر آتی عائزہ نے ترچھی نظروں سے ملک جلال کو دیکھا جو کبھی ہونٹ





سکوڑ رہا تھا۔ کبھی کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔

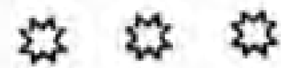
"اماں! اب ایسی بھی بات نہیں۔۔۔ مائیں بیٹیوں کو اچھی ہی تربیت دیتی ہیں۔ اچھی ہی بات سکھاتی ہیں اور اگر بیٹیاں کبھی بدتہذیبی کا مظاہرہ کریں تو ماؤں کو پتا ہوتا ہے۔ بس وہ دوسروں کے سامنے بیٹیوں کی عزت افزائی کرنے سے پرہیز کرتی ہیں۔" ملک جلال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا گیا۔

"بس اس پڑھی لکھی پوت کے پاس دلائل کے انبار ہوتے ہیں۔ مجھ بڑھیا کو ان سے مقابلہ کرنا کہاں آئے گا۔ پچھلے دور میں تو ہم لوگ بڑوں کی باتوں کے سامنے بحث کرنا گناہ سمجھتے تھے۔" دادی کی "پچھلے دور" کی کہانی پھر شروع ہو گئی تھی۔

عائزہ کو غصہ سا آنے لگا۔ "دادی! اگر پچھلے دور میں اصغری تھی تو اس کی بڑی بہن اکبری بھی پچھلے دور کی ہی لڑکی تھی اور ہم نے "پچھلے دور" کو اچھی طرح سے پڑھا ہوا ہے، ہر دور میں ہر ورائٹی موجود ہوتی ہے۔" وہ "پچھلے دور" پر زور دیتے ہوئے بولی۔

فریدہ نے عائزہ کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ دادی کی بات کی مسلسل نفی ایک نئی جنگ چھیڑ سکتی تھی اور وہ ساری عمر مصلحتوں پر چلنے والی خاتون اب جوان بیٹیوں کی وجہ سے ایسے خطرات مول نہیں لے سکتی تھیں۔

"عائزہ! کچن میں قیمے کو دیکھ لو۔۔۔ اب وہ تھوڑا بوائل ہو چکا ہو گا۔" انہوں نے اسے سامنے سے ہٹانا چاہا۔ دادی کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ ملک جلال بھی صورت حال کی نزاکت کو سمجھ کر اب جانے کے لیے پر تول رہا تھا، جبکہ خود وہ جلتی بھنتی کچن کی طرف مڑ گئی۔



"انسان جس چیز سے ڈرتا ہے وہی اس کے سامنے آتی ہے۔"

"غلط ڈیر! انسان کے لیے اللہ۔۔۔ جو بہتر سمجھتا ہے۔۔۔ وہی اس کے سامنے لاتا ہے۔" وہ کینو چھیل کر مہک کو پکڑاتے ہوئے بولی۔ دونوں بہنیں مالٹوں کی دیوانی تھیں۔ اس لیے سینٹرل ٹیبل کے گرد کرسیوں پر بیٹھ کر پورے اہتمام سے کھا رہی تھیں۔

"تم اتنا مثبت کیسے سوچ لیتی ہو؟" مہک کبھی کبھی اتنی معصومیت سے بعض سوالات پوچھتی کہ عائزہ کو بہن پر پیار آ جاتا۔

"کیوں کہ مجھے مثبت سوچنے سے سکون ملتا ہے اور زندگی میں واحد "سکون" ایک ایسی عیاشی ہے۔ جس پر انسان کا اپنا اختیار ہوتا ہے۔"

"مگر میرا دل بعض چیزوں پر راضی نہیں ہوتا۔" وہ مالٹوں کی پھانکیں علیحدہ علیحدہ کرکے ان پر نمک چھڑکتے ہوئے بولی۔

"مجھے پتا ہے تمہارا اشارہ کس طرف ہے۔ تم ملک دلاور کے رشتے پر راضی نہیں ہو۔"

"راضی! کیا سچ میں مجھے تو ان کے نام تک نہیں پسند۔۔۔ ملک دلاور۔۔۔ ملک جلال۔۔۔ اونہوں پرانے زمانے کے ناولوں کے ہیرو۔ سچ میں پرانے زمانے کی تان دادی نے اتنی دفعہ لگائی ہے، مجھے ہر پرانی چیز سے نفرت سی ہونے لگی ہے۔ پرانا دور۔۔۔ پرانی روایات۔۔۔ پرانی تہذیب۔۔۔ ہمارا کیا قصور جو ہم نئے ہو گئے۔"

مہک کے تبصرے پر عائزہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"بہن۔۔۔ میری پیاری بہن۔۔۔ ہر بندے کو پرانی چیزوں کا حصہ بننا ہے۔ ہر دور مستقبل کی طرف بڑھتے ہوئے۔ ضرور ماضی میں جا گرتا ہے۔ ہم سب بھی ماضی ہو جائیں گے تو پچھلے دور، پچھلی روایات سے انسانی محبت ایک قدرتی عمل ہے جس دور میں آپ جی رہے ہوتے ہو، اس دور میں آپ جو پہناوے پہنتے ہیں جو چیزیں کھاتے ہیں جن روایات کی پاس داری کرتے ہیں ان سے محبت ہو جاتی ہے۔ دادی بھی اسی محبت کی وجہ سے اپنا دور یاد کیا کرتی ہیں۔ وہ اس دور کو اپنا نہیں سمجھتیں، پرایا جان رہی ہیں اسی لیے تنقید کر جاتی ہیں۔ کل کو ہم مستقبل میں جا کر اپنا ماضی اور اپنے دور کی روایات کی یادیں اسی طرح سینے میں بسا کر یونہی کہا کریں گے۔ یہ دور نہیں اچھا، پچھلا اچھا تھا۔"

"ہوں۔۔۔ ٹھیک کہتی ہو شاید تم۔" وہ قدرے

مطمئن ہوگئی عائزہ فی الحال اسے پر سکون ہی کرنا چاہ رہی تھی، پچھلے کچھ دنوں سے وہ کافی اپ سیٹ تھی۔

"مریم آپی کی کال آئی؟"

"نہیں، آج صبح سے میری ان سے بات نہیں ہوئی۔"

"یار، یہاں اسکائپ ٹھیک سے نہیں چلتا۔ تم "imo" کی ایپلی کیشن انسٹال کروالو۔" مہک نے اسے مشورہ دیا۔

"ہوں... چلو تم میرے موبائل پر کردینا۔ جب فری ہو۔ اچھا اب میں کھانا بنالوں۔ ویسے بائی دا وے تمہیں پتا ہونا چاہیے آج ابو نے تایا ابو اور دونوں ملکوں کو بلایا ہے۔" وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے شرارت سے بولی۔

"پیئر آف ملک (ملکوں کا جوڑا)" اس نے غصے سے ملک دلاور اور ملک جلال کو "پیئر آف ملک" کا نام دیا۔



کھیتوں میں دھان کی فصل کی بوائی کا کام جاری تھا۔ اب بیلوں کی گردن میں ڈالی جانے والی گھنٹیوں کی جگہ ٹریکٹروں کی آوازوں نے لے لی تھی۔ نرم و راحت والی فضاؤں نے ناگواری سے ٹریکٹروں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھا۔ کائنات کی ساری نزاکتیں ماحولیاتی آلودگی نے ختم کردی تھیں۔

سنہری پھول... سورج سے ناراض ہوئے چلے جارہے تھے۔ فضا میں ناراضی کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ وہ سورج سے رخ پھیرے بیٹھے تھے۔ کئی پھولوں کی کلیاں بن کھلے ہی مرجھا رہی تھیں۔ چڑیا چونچ میں دانہ ڈال کر اپنے بچوں کے سامنے قدرے برہمی سے پھینکنے لگی۔ کتنی ہی دفعہ وہ چونچ میں پانی بھر کر چھوٹے بچے کے منہ میں ڈالتی پر نجانے کون سی ایسی پیاس تھی، جو بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

سرنگاں گاؤں پنجاب کے جنوبی حصے میں پڑتا تھا۔ سرنگاں... سرنگ سے ماخوذ تھا یا پھر اسی کو بگاڑ کر رکھا گیا تھا اس چھوٹے سے گاؤں میں ذات کے ملک کمین تھے۔ جن کی چودھراہٹ ماضی کا حصہ بن گئی۔ اب سب پڑھ لکھ گئے تھے۔ تعلیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے یہ غلامانہ ذہنیت اور غلامی کے درمیان باریک سے فرق کو بھی پہچان لیتی ہے۔ تعلیم نے اس گاؤں کے لوگوں میں عزت نفس اور خودداری کی فصل بوئی تھی، جو کہ آنے والی نسلوں کے لیے خوش آئند بات تھی۔ اب ملکوں کو لوگ اپنی بیٹھکوں میں دوستوں کی طرح شادی بیاہ پر دعوت دیتے۔ جو ذرا ناک ابھی تک اونچی رکھے ہوئے تھے۔ وہ کمی کمین جان کر ناک بھوں چڑھا کر گھروں میں ہی بیٹھے رہتے۔ لوگ پروا بھی نہ کرتے۔

ہر زمانے میں کچھ اچھی باتیں بھی پنپتی ہیں۔ لوگوں نے احساس کمتری کو ختم کرلیا تھا۔ بدلی بدلی ہواؤں... رویوں... کو ملکوں نے کیسے قبول کیا یہ ایک الگ داستان امیر حمزہ تھی۔ پر اب وہ شادیوں میں جانے لگے تھے۔ درختوں کے نیچے عام طبقے کے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر دکھ سکھ میں شریک بھی ہونے لگے تھے۔ جتنے اونچے اور پکے مکان ان کے تھے۔ اب باقی لوگوں نے بھی بنالیے کسی کا بیٹا کویت میں انجینئر تھا تو کسی کا کراچی میں کسٹم میں بھرتی ہوگیا تھا۔ تعلیم نے شخصیت نکھار دی رویوں میں خلوص اترنے لگا، پر ایک اچھی چیز اتر رہی تھی اور ایک بری چیز بھی بڑھتی جارہی تھی۔ دکھاوا... نمود و نمائش بڑھ گیا۔ فطرت میں "دکھاوے" کا عنصر زیادہ ہوگیا تھا۔

ملک دلاور اور ملک جلال نے بھی ایم اے کرلیا۔ وہ شہر کی طرف بھاگے، جہاں ملک صفدر نے اپنی دونوں بھتیجیوں کے لیے رشتہ ڈال دیا۔ مہک کے لیے چھوٹے دلاور کا اور عائزہ کے لیے جلال کا... ملک ایاز کے لیے صورت حال پریشان کن تھی۔ ان کی بیٹیاں کانونٹ کی پڑھی ہوئی تھیں۔ سوچوں اور نظریات میں اختلاف تھا۔ پھر ماحول یکسر مختلف... فریدہ نے یہ رشتہ نہ کرنے کی درخواست کردی۔ دادی نے تو گھر میں کہرام برپا کردیا۔ ملک ایاز ماں اور بھائی کو زیادہ دیر تک

ناراض نہ رکھ سکے اور رشتہ طے کردیا۔ ایک چھوٹی سی تقریب میں روتی ہوئی مہک اور قدرے سنجیدہ سی عائزہ نے انگوٹھیاں پہن لیں۔

فریدہ اس رات بیٹیوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر دادی سے چھپ کر کتنی ہی دیر روتی رہیں۔ شکر ہے مریم کا جوڑ ہی نہ تھا۔ وہ تو ایان خرم سے شادی کرکے کینیڈا میں بیٹھی تھی۔ وہ اور اس کا شوہر دونوں کینیڈا میں ڈاکٹرز تھے اور بڑی اچھی فیملی لائف گزار رہے تھے۔ فریدہ کا اپنا خاندان پڑھا لکھا، سلجھا ہوا تھا۔ انہوں نے کبھی زندگی میں بھی نہ سوچا تھا کہ بیٹیوں کو اس خاندان میں بیاہیں گی۔ پر ملک ایاز اور سسرال کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھیں۔

اس نے سفید کرتا پہنا ہوا تھا جس کے اوپر میرون بٹن لگے ہوئے تھے۔ کھلے بالوں کو شانوں کے پیچھے لہراتے میرون پٹی والے سفید دوپٹے کو جھلاتے وہ کاریڈور سے باہر لان کی طرف آگئی۔

مما معمول سے کچھ زیادہ ہی چپ رہنے لگی تھیں۔ گھر کی فضا میں عجیب سی اداسی نے ڈیرہ جما لیا تھا۔ لان کے دائیں طرف کناروں پر لگی بیل کی کٹنگ کا جائزہ لیتے ہوئے وہ سیدھی مما کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"میں نے پاستا بنالیا ہے۔ آج خالہ آرہی ہیں۔" عائزہ نے ماں کی توجہ ہٹانا چاہی۔

"آں۔۔۔ہاں!" وہ خیالوں سے چونکیں۔ "مجھے لگتا ہے۔۔۔ ہم لوگوں سے تم دونوں بہنوں کے معاملے میں زیادتی ہو گئی ہے۔ میں نے اپنی بیٹیوں کے لیے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔"

"افوہ مما! میں جانتی ہوں آپ اور بابا جان کبھی ہمارے لیے برا نہیں سوچ سکتے اور مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔۔۔ میں خوش ہوں۔"

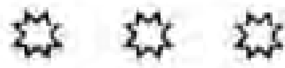
عائزہ نے مطمئن نظر آنے کی پوری کوشش کی۔ فریدہ بیگم بس اس کو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ بلاشبہ وہ بے حد سعادت مند بیٹی تھی۔

"پر مہک۔۔۔ مہک تو بہت پریشان سی ہو گئی ہے۔ مجھ سے بھی خفا۔ پھر کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھا رہی ہے۔" فریدہ بیگم کی پریشانی بجا تھی۔

"مما! اسے وقت چاہیے اس ساری صورت حال کو سمجھنے کے لیے۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ انسان کی خواہشات کے برعکس کوئی کام ہو تو وہ یونہی پریشان سا ہو جاتا ہے۔"

"چلیں اٹھیں۔۔۔ کچن میں چلتے ہیں۔"

وہ ان کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔



اسے اپنے گھر کا یہ کونا بے حد پسند تھا جہاں پرانے زمانے کی طرح دیواروں میں جھروکے سے بنے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بک شیلف کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایرانی لوک کہانیوں کا مجموعہ تھا۔ گزرے وقتوں کی داستانیں پڑھ کر اسے خوب مزا آتا۔ پرانے لوگوں کے مزاج۔۔۔ لباس۔۔۔ انداز و اطوار۔۔۔ رہن سہن۔ خواہشات۔۔۔ سب کو پڑھ کر اسے ایک اندازہ ضرور ہوا تھا کہ پرانے وقتوں اور نئے ادوار میں موجود ہر چیز ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ صرف "خواہش" وہ واحد چیز تھی جو دونوں ادوار میں مشترک تھی۔ انسانی خواہشات۔۔۔ خیالات۔۔۔ تفکرات کا ہجوم لگ بھگ ایک جیسا ہی تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ تاریخ کے اوراق کھنگالا کرتی اور خود بھی ماضی کا حصہ بنتی جارہی تھی۔

"تم ادھر بیٹھی ہو۔۔۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے سیدھا ادھر ہی آگئی ہوں۔" مہک نے پھولی سانسوں کے ساتھ کہا۔ "یہ لو" اس نے پن ڈرائیو اس کی طرف بڑھائی۔ "اس میں faerwell Baghdad والی مووی محفوظ کروا آئی ہوں۔"

"او، بہت شکریہ۔۔۔ میری پیاری بہن۔۔۔" عائزہ خوش ہو کر بولی۔

"ہاں جی۔۔۔ مجھ سے تو کام نکلوالیا، مگر میرا کام ہوتا نہیں۔۔۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"مہک! مما بہت پریشان ہیں۔ تم پلیز تھوڑا انتظار

کرو۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ کتنے لوگ اس پر ناراض ہوں گے۔ بابا' دادی۔۔۔ تایا ابو۔۔۔ پھر خاص طور پر میرا رشتہ بھی شامل ہو گیا ہے۔"

"تو تم اس پر راضی ہو؟" مہک نے حیرت سے آنکھیں نکالیں۔

"ہاں' مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔"

"اف مائی گاڈ! اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی کنویں میں چھلانگ لگواؤ گی۔" مہک سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

عائزہ کو اس کی بات پر افسوس ہوا تھا۔

"تمہیں مسئلہ کیا ہے آخر؟" وہ تھک کر بولی۔

"ملک دلاور۔۔۔ زمانہ قدیم کا نام' بندہ کوئی ماڈرن نام رکھے اب گاؤں بھی شہر بن گئے ہیں۔ شلوار قمیص کی جان ہی نہیں چھوڑتا۔ پینٹ شرٹ نہیں پہن سکتا کیا؟ پورا منہ کھول کر ہنستا ہے حلق کا کوا بھی اس کے ہاتھوں تنگ ہے۔ میں جو بات کہوں چاہے وہ گھر کے پکے سالن کے متعلق ہی کیوں نہ ہو اتنی دلچسپی سے سنتا ہے کہ جیسے پتا نہیں کون سی دیومالائی داستان سنانے بیٹھ گئی ہوں۔ میں اگر کہوں کہ میں نے دریا میں کودنے جانا ہے تو بخوشی تیار ہو جائے گا۔ میں نے کہا مجھے چکن ود چیز والے برگر پسند ہیں تو فورا" سے ہی کہہ دیا کہ مجھے بھی پسند ہیں۔ آئی ڈونٹ نو (میں نہیں جانتی) کہ وہ کیا چیز ہے؟" اپنے کٹے بالوں میں انگلیاں پھیرتے اس نے خاصے مضحکہ خیز انداز سے ملک دلاور کا نقشہ کھینچا۔

"چچ چچ۔۔۔ کتنے افسوس کی بات ہے! بہت ہی بری بات ہے' مہک! ایسے نہیں کہتے کسی کے بارے میں اتنا مذاق اڑانے والا لہجہ۔" ابھی وہ کچھ اور کہتی' مگر اس نے اسے وہیں روک دیا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑے۔ "یہ پینڈو پروڈکشن" تمہیں ہی سوٹ کرتی ہے۔ برائے مہربانی مما سے بات کرکے میری اس مصیبت سے جان چھڑواؤ۔"

عائزہ نے افسوس بھری نظروں سے مہک کو دیکھا۔

"کیا تمہیں اس میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی؟ زندگی گزارنے کے لیے جو معیار تمہارے ذہن میں ہے' کیا تمہیں یقین ہے کہ وہی سب کچھ ہے۔" وہ حیرت سے اس کی سوچ پر تبصرہ کرتے ہوئے بولی۔

"عائزہ! میری فرینڈ کے فیانسی کوئی لمز سے پڑھا ہے۔ کوئی فاسٹ سے انجینئرنگ کر رہا ہے۔ کوئی کیمرج یونیورسٹی سے۔۔۔ کیا ان کی ڈریسنگ ہے' بالکل ہیرو والی پرسنالٹی۔ وہ جب ان کی باتیں کر رہی ہوتی ہیں تو ان کا لہجہ فخریہ ہوتا ہے۔ اصل چیز ذہنی ہم آہنگی ہے۔ وہ ماڈرن دور کے مطابق تو ہیں نا۔ ذہنی طور پر ایک دوسرے کو سمجھنے والے' یہ تو نہیں کہ ایک مرسیڈیز کی بات کر رہا ہو' دوسرا بھینسوں کے لیے کون سا چارہ بہتر رہے گا۔ ایک نئے پلاٹس اور پلازہ کی بات کر رہا ہو' جبکہ دوسرا کھیتوں میں کون سی فصل بوئی جائے اس پر تبصرہ کرنے بیٹھ گیا۔ نہ۔ جی نہ۔۔۔ زندگی ایک دفعہ ملتی ہے اور وہ بھی من چاہی۔۔۔ میں ان لڑکیوں میں سے بھی نہیں جو کمپرومائز پر زندگیاں گزار دیں۔ ایسا ہوتا ہو گا' لیکن پچھلے زمانے میں۔۔۔" دادی کا پچھلا زمانہ اس کے لہجے میں بھی آگیا تھا۔

"مہک! تم۔۔۔!"

"عائزہ! پلیز نو لیکچر۔" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔

"میں اس کو نہیں سمجھا سکتی۔" عائزہ نے بے بسی سے جھروکوں میں آکر بیٹھ جانے والی چڑیوں کی چوں چوں میں پریشان ذہن کو الجھاتے ہوئے سوچا۔

"عائزہ! میں سوچ رہی ہوں کہ صوفے کے کور بدل دیں۔۔۔ تم میرے ساتھ مارکیٹ چلنا۔"

وہ ریک میں اپنی کتابوں کی سیٹنگ میں مصروف تھی جب مما نے آکر اس سے کہا۔

تب ہی ٹی وی لاؤنج کے سینٹرل ٹیبل پر پڑا فون زور زور سے بجنے لگا۔

"عائزہ! بیل تو اچھی لگالیا کرو۔" تازہ تازہ فیشل کروائے مہک بھی وہیں آگئی۔ جاتی سردیوں کی مدھم مدھم سی دھوپ تھوڑی تھوڑی لاؤنج کے کارپٹ پر بھی اپنی جھپ دکھا رہی تھی۔ سرخ کارپٹ پر سنہری

پھول دھوپ کے ساتھ چمک کر مزید ابھر رہے تھے۔

"اللہ یہ نمبر مجھے کتنے دنوں سے تنگ کر رہا ہے۔" عائزہ نے سیل ہاتھ میں پکڑے تفکر سے کہا۔ "لاؤ' مجھے دکھاؤ۔" مہک نے سیل اپنے ہاتھوں میں لیتے کہا۔ اتنے میں پھر بیل ہونے لگی۔

"ہیلو! آپ کی آواز بہت پیاری ہے۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" رانگ نمبر شروع ہو گیا۔

"تو سی کون۔۔۔" وہ ٹھیٹ پنجابی میں بولی۔ مما اور عائزہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پنک کیوٹکس لگے نیلز کو بالوں میں چلاتے وہ صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گئی۔

"میں۔۔۔ میں تاں عذرا دی بہن صغریٰ بولنی پئی آں جندے کار پچھلے ہفتے ڈاکہ پیا سی (میں عذرا کی بہن صغریٰ بول رہی ہوں جس کے گھر پچھلے ہفتے ڈاکہ پڑا تھا)"

مہک نے اتنے مزے دار لہجے میں کہا۔ عائزہ اور مما کے لیے ہنسی کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا۔ "لو۔۔۔ فون ہی بند کر دیا۔۔۔"

اندر آتے ملک دلاور نے پنجابی لب و لہجے میں ایسا مزے دار جملہ سنا تو اس کی طبیعت صاف ہو گئی۔ عائزہ اور مما مسلسل ہنس رہی تھیں' جبکہ مہک جو خود ہنستے ہنستے دہری ہو رہی تھی ملک دلاور کو دیکھتے ہی ہونق سی بن گئی۔ اسے لگا کہ شدید ٹھنڈ میں کسی نے اس پر ٹھنڈا گھڑے کا پانی ڈال دیا ہو۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ہمیشہ مسکرانے والی عائزہ قہقہے پر قہقہہ لگا رہی تھی۔ خود وہ اندر کی طرف بھاگی۔

ملک دلاور کی گھنی مونچھوں کے نیچے مسکراتے لب اس نے چڑ کر مونچھوں کو دیکھا۔

"فضول۔" دل میں اسے مخاطب کر کے وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر بیٹھا اور کب گیا۔ وہ سو گئی تھی۔

شام میں عائزہ نے آکر اسے اٹھایا آنکھیں مسلتے اس نے ٹائم دیکھا۔ مغرب کا وقت گزر چکا تھا۔

"لو۔۔۔ میری نماز رہ گئی۔" وہ فکر مندی سے بولی۔ مما نے دونوں کو نماز کا پابند بنایا ہوا تھا۔

"تمہیں اس وقت سونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ دادی کہتی ہیں عصر اور مغرب کے درمیان نہیں سوتے۔"

وہ مہک کے کپڑوں کو تہہ کرنے لگی جو فضول بکھرے ہوئے تھے' حالانکہ وہ صبح میں تہہ کر کے گئی تھی' مگر مہک کی عادت تھی ایک دوپٹا بھی نکالتی تو سارے کپڑے پھر سے پھیلا دیتی۔ وہ کتنے ہی سالوں سے بہت تحمل سے ہر دفعہ اس کا پھیلاوا سمیٹتی۔ عائزہ میں عجیب سی برداشت اور صبر تھا۔ مہک کو اپنی اس بہن پر بڑا رشک آتا۔ نہ کوئی خواہش۔۔۔ نہ خواب۔۔۔ ہر بات جلدی مان جاتی۔۔۔ ہر بات پر جلدی راضی ہو جاتی۔ وہ مسلسل عائزہ کو گھورتے سوچے گئی۔

"ویسے آج دوپہر میں بڑا مزہ آیا' مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی پیاری پنجابی بھی بول لیتی ہو۔" وہ جو بات بھولے ہوئے تھی ایک دم شرمندہ سی ہو گئی۔

"ملک دلاور نے بھی بڑا انجوائے کیا' اپنی ہونے والی منکوحہ کے منہ سے ایسے الفاظ سن کر۔۔۔"

"جی نہیں' وہ رانگ نمبر والے کے لیے ایسا بولا تھا۔ ان سے سریلی آواز اور تمیزدار لہجے میں بات کرو تو مزید پیچھے پڑ جاتے ہیں۔" وہ وضاحتی لہجے میں بولی۔

"ویسے اس کے بعد اس کی کال نہیں آئی۔ اسے پتا تھا کہ صغریٰ اس کے پیچھے پڑ جائے گی۔"

عائزہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

"تمہیں ملک دلاور کا نام نہیں پسند تو تم مہک سے صغریٰ نام رکھ لو۔ پھر ٹھیک رہے گا۔ دونوں کے اولڈ نیم۔۔۔ پھر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔"

"میں تو ملک دلاور سے دس قدم دور ہی ٹھیک ہوں۔ آئی ڈونٹ لائیک ہم۔" (میں اسے پسند نہیں کرتی) ایک بے زاری اور متکبرانہ سی ٹون تھی اس کی۔

"منگیتر نہیں تسلیم کرتیں تو۔۔۔ تو تایا زاد تو ہے ہی نا۔۔۔ تھوڑی شرم کر لو۔" عائزہ نے افسوس سے سر ہلاتے کہا۔

"جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔"

ڈائیلاگ مارتے ہوئے، پھر پیٹ پوجا کرنے کے لیے کچن کی طرف بڑھی۔ جبکہ عائزہ کتنی ہی دیر فکر مندی سے وہیں پر کھڑی بت بنی سوچتی رہی۔ خاندان کا رویہ ایسا تھا کہ اس بات کو بہت بڑا بنا دیا جاتا اور دلوں میں دراڑیں پڑنے کا اندیشہ گہرا ہو جاتا۔ اس نے رات میں مما کے ساتھ ڈسکس کیا۔

"میں نے کبھی تم تینوں بہنوں کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کیا۔ نہ تم لوگوں کی تربیت میں کوئی کمی چھوڑی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا مہک کیوں اس رشتے کو قبول نہیں کر پا رہی۔ میں اپنی بچی کے ساتھ زبردستی کے حق میں بھی نہیں ہوں۔ میں اسٹینڈ لے سکتی ہوں۔ ہاں تمہارے ملک جلال سے جڑے رشتے نے میرے ہاتھ باندھ دیے ہیں۔"

"مما! کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ میرا رشتہ بھی توڑ دیں۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا ہو گیا ہے تم دونوں بہنوں کو؟ کیا تمہیں بھی ملک جلال نہیں پسند۔"

"مما! بات پسند کی نہیں۔ میری وجہ سے مہک کی زندگی کیوں خراب ہو۔ ویسے مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، ملک جلال سلجھا ہوا انسان لگتا ہے۔" تصور میں اس کی مسکراتی روشن آنکھیں آئی تھیں۔ جن میں احترام کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا۔

"پھر تم ایسا مت کہو... ہمارے معاشرے میں بیٹیوں کے رشتے جڑ کر ٹوٹ جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میں اپنی پھول سی بچیوں پر کیوں کوئی حرف آنے دوں۔ مہک ایک فینٹسی کی دنیا کو اردگرد بسائے ہوئے ہے۔ وہ معاشرتی تقاضوں اور حالات کی گردشوں کو نہیں سمجھ پا رہی۔ امید ہے کہ سمجھ جائے۔ میں بس اسی انتظار میں ہوں کہ اللہ میری دعا سن لے اور مہک کا معاملہ حل ہو جائے۔ میرے لیے تمہارے باپ سے بھی بات کرنا دشوار ہے۔ وہ شاید ہی مانیں اور بات طول پکڑ جائے۔ تمہارے تایا ابو اور دادی... کس کس کے سامنے مجھے صفائیاں دینی پڑیں گی۔" دونوں ماں بیٹی کے چہروں پر تفکرات کے سائے چھے ہوئے۔

مریم آپی نے پاکستان آنے کا عندیہ دیا تھا۔ بابا کے حصے سے تایا ابو نے چاول، گندم اور گڑ گاؤں سے بھیجا۔ کچھ ترکاریاں اور پھل بھی آئے تھے۔ ملک دلاور اور ملک جلال دونوں گاڑی پر سب چیزیں لے کر آئے۔ عائزہ نے دھانی رنگوں سے مزین جوڑا پہن رکھا تھا۔ وہ کچن میں کھانے کی تیاریوں میں لگ گئی۔ جبکہ مہک نے اوپری منزل کی کھڑکی سے ہی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ آف موڈ کے ساتھ اوپر ہی رہ گئی۔ پھر تجسس سے دوبارہ کھڑکی کے قریب آکر نیچے دیکھنے لگی۔ ملک دلاور نے کریم کلر کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ کسی بات پر مسکرا رہا تھا اور مسکراتے ہوئے اس کے شفاف دانت اور روشن آنکھیں بڑی نمایاں سی لگ رہی تھیں۔ بلاشبہ وہ پرکشش شخصیت کا مالک تھا، پر تھا تو گاؤں کا رہائشی... مطلب پینڈو... اور یہ ذرا پینٹ شرٹ پہن لے تو کلاس کی پرسنالٹی لگے۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی ڈریسنگ سوچنے لگی۔ اگر اس کو بلیک... لائٹ گرین... اور فان کلرز میں شرٹس زیب تن کروا دی جائیں، تو یہ بالکل ٹھیک ٹھاک لگے گا۔ گھورنے کا عمل جب بھی شروع کیا جائے مقابل کی حس ضرور جاگ جایا کرتی ہے۔ انسانی فطرت میں چونک جانے کا عنصر بھی اتنا ہی موجود ہوتا ہے جتنا تجسس کا مادہ... گھورتی آنکھوں میں مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ جس کی لہریں قابو میں کر لیتی ہیں۔ وہ بھی کسی احساس کے تحت اس کی طرف مڑا اور جب نظریں ٹکرائیں تو دو آنکھوں میں خجالت تھی اور سٹپٹا کر پلٹ جانے کی کیفیت، جبکہ دوسری دو آنکھوں میں شوق کا ایک جہاں آباد تھا۔ سٹپٹائی آنکھوں کے پلٹ جانے پر وہ آنکھیں اداس سی ہو گئیں۔

"مہک! مریم آپی کی کال ہے۔" نیچے سے عائزہ نے آواز دی۔ وہ اکثر پیکیج کروا کر عائزہ کے نمبر پر کال کرتی، پھر سب سے بات ہو جاتی۔ وہ بالوں کو کیچو میں باندھ کر لاپروا لٹوں کو یوں ہی بکھرائے۔ دوپٹا قدرے تمیز

سے سر پر اوڑھے نیچے آگئی۔ ملک جلال کو احتراماً سلام جھاڑا جبکہ ملک دلاور کو نظر انداز کردیا گیا۔ دادی ساتھ ہی آئی تھیں۔

"آئے ہائے... لڑکی... مت تو نہیں ماری گئی تیری۔ نہ دادی کو سلام' نہ ہونے والے مجازی خدا کا خیال۔"

اف دادی کی صاف گوئی۔ مجازی خدا پر سب ہی مسکرا دیے' جبکہ وہ جو ملک دلاور کی گھورتی نظروں سے پناہ مانگتے مڑ کر جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ جلدی میں تخت پر بیٹھی دادی کو بھی نہ دیکھ سکی۔ جس کی وجہ سے اتنی سننے کو مل گئی تھیں۔ دادی کے پاس جا کر سلام جھاڑا گیا اور بمشکل مسکراتے ہوئے یہ ہی احسان ملک دلاور پر بھی کیا گیا۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ تھوڑی دیر پہلے والی افسردگی اڑن چھو ہو گئی تھی۔

مریم آپی سے حال احوال پوچھا۔ ان کی بچوں کی سرگرمیاں جانی' پھر دل میں بڑھتی افسردگی کو لبوں تک لے ہی آئی۔

"آپ لوگ خیر سے چھوٹی عید کے بعد آرہے ہیں۔"

"ہاں۔ ارادہ تو یہ ہی ہے... مما کہہ رہی تھیں کہ عائزہ اور تمہاری شادی کرنی ہے... تو اس فرض سے فارغ ہو کر وہ پہلے عمرہ کرنے جائیں گی۔ پھر میرے پاس کینیڈا آئیں گی۔"

"مریم آپی! کیا قسمت پائی ہے آپ نے... من چاہا شہر... در و دیوار... شوہر... زندگی..."

اس کے ٹوٹتے لہجے میں پنہاں معنی کو سمجھتے ہوئے مریم چونک سی گئی۔ "مہک! تم ابھی تک راضی نہیں ہوئیں۔ حالانکہ چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ دیکھو' زبردستی کے رشتے عمر بھر کا طوق بن جاتے ہیں۔ تمہیں حق ہے۔ اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو میں بابا جان سے بات کرسکتی ہوں۔" مریم کو دور بیٹھے چھوٹی بہن کی فکر سی ہونے لگی۔

"پھر عائزہ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔" وہ مدھم آواز میں بولی۔

"نہیں ہوتی' عائزہ راضی ہے تو ملک جلال سے اس کی شادی کروا دیتے ہیں۔ اگر تم نہیں راضی... تو تم پر کوئی زبردستی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ زمانے گئے جب لڑکیوں پر اپنے فیصلے تھوپ دیے جاتے تھے۔ تم فکر نہیں کرو۔ میں خود تایا ابو' بابا اور ملک دلاور سے بات کرتی ہوں۔ اگر ہمارے گھروں کے مرد باشعور ہوئے تو یقیناً" اس کو اتنا کا مسئلہ نہیں بنائیں گے۔" مریم کے امید افزا لہجے پر مہک کا دل قدرے ہلکا ہوا۔ کتنے عرصے بعد اطمینان کی سانس لی تھی۔ ورنہ ہر شام ملگجے سایوں میں وہ اپنی شوخ و چنچل زندگی کو اندھیروں کے سپرد ہوتا دیکھتی تھی۔ وہ مہک ملک تھی' کانونٹ کی پڑھی... انگریزی ادب... انگریزی لب و لہجے کی دلدادہ... کچھ خود پر دی جانے والی توجہ نے اسے دونوں بہنوں میں سب سے زیادہ منفرد بنا دیا تھا۔ وہ کانچ سے بھی زیادہ نازک مزاج تھی... مگر فریدہ کی تربیت کا بھی اثر تھا۔ جو مزاج ابھی تک اتنے بھی آسمانوں کو نہیں چھوئے تھے۔ عائزہ نے آج اسے بھی ساتھ لگایا ہوا تھا۔ مہک کا پسینے سے برا حشر ہو رہا تھا۔ دونوں نے پہلے گوڈی کی... اب گملوں پر رنگ کرنے کا کام ہو رہا تھا۔ عائزہ کی فطرت میں بننا سنورنا... سجانا بنانا بڑی حد تک شامل تھا۔ کبھی مہک کو ساتھ لگا کر کپڑوں کی ڈیزائننگ پر طبع آزمائی کی جاتی' کبھی گھر کا کوئی کونا پکڑ کر اس کو سجایا جاتا۔ در حقیقت گھر میں وہ چلتی پھرتی پروفیشنل انٹیریئر ڈیکوریٹر تھی۔ ہمیشہ وہ مہک کے کتنے ہی کام بن کہے کردیا کرتی۔ ناچار مہک کو بھی اس کی سرگرمیوں میں اس کا ساتھ نبھانا پڑتا۔ ایسے میں کبھی وہ ساتھ برٹنی کو سنتی یا فوک گانوں کے انگلش ورژن لگا لیتی۔ جبکہ عائزہ اس کے ساتھ ہمیشہ ایک معاہدہ کرتی کہ کام کے دوران ایک اس کی پسند کا ایک عائزہ کی پسند کا گانا سنا جائے گا۔ وہ کلاسک... نیم کلاسک کی دلدادہ تھی۔ مہک کو اس کی پسند پر نیند سی آنے لگ جاتی۔ اب گانے اور گرمی سے بھی نیند آنے لگی تھی۔ وہ سارا کام وہیں چھوڑ کر نیم کے نیچے آکر بیٹھ گئی۔

"ارے... یہ دو تین گملے رہ گئے ہیں۔ چلو ادھر

آؤ۔" عائزہ نے اسے واپس مڑتے دیکھ کر کہا۔

"نہ جی نہ اب نہیں اتنا اسٹمنا (برداشت) تھوڑی دیر بعد دیکھوں گی اگر اٹھا گیا تو کردوں گی۔"

وہ وہیں چارپائی پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی۔ آنکھ ہلکی ہلکی ہوا کے چلنے پر کھلی تھی۔ غالباً" عائزہ کام مکمل کرکے اندر چلی گئی تھی اور اسے سونے دیا تھا۔ مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ کام والی نے لان کی باقی ماندہ صفائی بھی کردی تھی۔ اس لیے لان ذرا صاف صاف اور پیارا سا لگ رہا تھا۔ سرسراتی ہوا شدت پکڑ رہی تھی۔ دور افق پر آندھی آنے کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ڈوبتے سورج کے جاتے رنگ سارے کے سارے اس کی آنکھوں میں تواتر سے اترنے لگے۔

"مہک۔۔۔ مہک۔۔۔" عائزہ نے لان کی طرف والا دروازہ کھول کر اسے آواز دی۔ عائزہ کی آواز میں نہ جانے کیا بات تھی وہ اندر کو دوڑی۔ مما سر پکڑے بیٹھی تھیں اور بابا فون پر کسی سے غصے ہو رہے تھے۔

"تم نے مریم آپی سے کچھ کہا تھا۔" عائزہ نے سرگوشی میں کہا۔

مہک کا ماتھا ٹھنکا۔۔۔ یقیناً" انہوں نے بات کردی تھی۔ فریدہ بیگم نے گھور کر مہک کی شکل دیکھی۔ جس کا اپنا رنگ اڑ چکا تھا۔ بابا کو صرف ایک دفعہ غصہ آیا کرتا تھا۔ جس کے بعد کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہ رہتی۔

"کیوں کیا اس کے کان ٹیڑھے ہیں؟ کیا وہ ان پڑھ، جاہل ہے۔ میں کون سا بیٹیاں لے کر امریکا میں رہ رہا ہوں۔ میں بھی تو منڈی احمد آباد کا رہائشی ہوں۔ ساری دنیا کی طرح میں نے بیٹیوں کو اچھے پرائیویٹ اداروں سے پڑھا دیا ہے تو کون سا تیر مار لیا ہے اور یہ کون سی ہیلری کلنٹن کی ہمسائی ہے، جو ملک دلاور میں اسے پینڈو شخصیت نظر آرہی ہے۔ گھر کے بچے دیکھے بھالے۔ پتا نہیں کیا ہو رہا ہے؟ اور کیا ہونے جارہا ہے؟ تم ماں بیٹیوں کی وجہ سے میں اپنی ماں اور بھائی سے کنارہ کشی کرکے بیٹھ جاؤں؟"

بابا کا بولتے بولتے چہرہ لال ہوگیا۔ وہ بلڈ پریشر کے مریض بھی تھے۔ عائزہ اور مما نے مہک کی طرف دیکھا۔ ایک تنبیہہ اور شرم دلانے والا احساس تھا۔ وہ وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔

کمرے میں آکر وہ بے تحاشا روئی تھی۔ "جب والدین کو یہ ہی سب کرنا ہے تو اولاد کو اتنا exposure (آسائش و لوازمات کی دنیا) کیوں دیتے ہیں؟ نہ پڑھائیں اعلا اداروں میں۔۔۔ کروا دیتے کسی عام سے انسٹی ٹیوٹ میں۔۔۔" عائزہ اس کے پیچھے آئی تھی۔

"لے دے کر ہیلری کی ہمسائی بنانے کا طعنہ دے دیا۔ وہ اوبامہ کو ہی سوٹ کرتی ہے۔"

"اوبامہ کی بیوی کا نام مشعال ہے۔" عائزہ نے تصحیح کی۔

"میں نے کیا کرنا ہے۔ اس کا اچار ڈالنا ہے۔" اس وقت اس کی تصحیح ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔

"بابا نے جو آخری الفاظ کہے ہیں۔۔۔ میرا دل کر رہا تھا کہ زمین پھٹے اور میں اندر سما جاؤں۔۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس طرح بھی بول سکتے ہیں۔" وہ غصے و رنج کی شدت سے بولی۔

"کیا کہہ دیا ہے بابا نے۔" عائزہ نے اس کی برستی آنکھوں اور بہتی ناک کو دیکھا۔

"بابا کا غصہ مما پر نکل رہا تھا۔" اس ساری صورت حال میں اسے مما کی فکر ہو رہی تھی اور مہک اور مریم آپی پر غصہ آرہا تھا۔ "تمہارے سامنے نہیں کہا۔ "ولایتی بلی دیسی چیکاں" (ولایتی بلی، دیسی چیخیں)" وہ روتے ہوئے بولی۔ عائزہ نے بمشکل ہنسی کنٹرول کی۔

"تو ٹھیک کہا نا بابا نے۔ تم نے بھی ایسے ہی ہوا بنایا ہوا ہے ملک دلاور کو۔ اچھا خاصا ڈیشنگ، پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ تمہارے فضول سے اعتراض کی نذر ہو رہا ہے۔ بابا نے پھر ایسے ہی کہنا تھا۔" اس کے منہ کے بگڑتے زاویوں کو دیکھ کر اس نے اندھا دھند چلتی گاڑی کے یک دم موڑ بدلنے کی طرح بات کا رخ بدلتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "یا تو تمہیں کوئی اور پسند ہو تو بات ہے

نا۔ پھر جو باپ پسند کر کے دے رہا ہے اسی پر راضی ہو جاؤ۔" عائزہ نے کن انکھیوں سے اس کے بسورتے چہرے کا جائزہ لیا۔

جبکہ اس وقت اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ بس یہاں سے چلی جائے۔ "مجھے دو منٹ کے لیے اکیلے چھوڑنے کا احسان کیا جائے گا۔"

وہ روڈ ہوئی۔ "بالکل۔۔۔ میں اتنی دیر میں کھانا تیار کرتی ہوں۔ پھر مل کر کھائیں گے۔ اتنی دیر تم ذرا اپنا غم ہلکا کرو۔"

وہ برا مانے بغیر بشاشت اور قدرے لاپروائی سے بولی۔

عائزہ کا رویہ اسے مزید دکھی کر گیا۔ یہ بہن کم دوست زیادہ تھی۔ اگر اسے ہی کچھ احساس نہیں تو وہ کسی کو کیا سمجھائے۔ شاید ملک جلال کی خاطر بہن کی زندگی کو نہ سوچ رہی ہو۔ ایک کمینی سی سوچ جاگی۔

دادی کا کولیسٹرول لیول بڑھ گیا تھا۔ بابا نے تایا ابو سے کہہ کر انہیں گاؤں سے شہر بلوالیا۔ ڈاکٹر نے ادویات کے ساتھ مکمل پرہیز اور تھوڑی واک کا کہہ دیا۔ دادی کے دیسی گھی میں پکے سالن اور پراٹھے چھوٹ گئے۔ وہ چڑچڑی سی ہو گئی تھیں۔ من پسند چیز ہاتھ سے نکل جائے تو مزاجوں میں عجیب سی کھلبلی مچ جاتی ہے۔ پھر ہر اچھی چیز بھی بری لگنے لگتی ہے۔ بابا نے دادی کا خاص خیال رکھنے کا کہا۔ عائزہ نے ان کے لیے بطور خاص زیتون کے تیل میں پکے کھانے بنائے اور مہک نے روزانہ ان کی پنڈلیوں کی مالش کی ذمہ داری لے لی۔ تھوڑی کڑوے مزاج کی دادی۔۔۔ بیمار ہونے پر اور پوتیوں کی خدمت گزاریوں کو دیکھتے ہوئے تھوڑی نرم سی ہو گئیں۔ فریدہ کو سبزی بنانی ہوتی یا سہ پہر کی چائے پینی ہوتی۔ وہ اماں جی کے پاس آکر بیٹھ جاتیں۔

"اماں جی! میں سوچ رہی ہوں دو مشینی رضائیاں اور دو ہاتھ کی بنی ہوئی کرلوں۔۔۔" فریدہ جان بوجھ کر انہیں باتوں میں الجھاتیں۔ دادی انہیں اپنے مشوروں سے نوازتیں۔ عائزہ اور مہک کی شادیوں کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ مریم آپی نے فروری میں آنا تھا اور اسی عرصے میں تاریخ پکی کرنی تھی۔

مہک کی بے چینی۔۔۔ بے زاری۔۔۔ اب عجیب سی افسردگی میں ڈھلنے لگی۔ وہ اداس گانے اور غزلیں سنتی، جو کبھی عائزہ کی پسند ہوا کرتی تھی۔ ساری شوخی، سنجیدگی کی چادر میں چھپی جا رہی تھی۔ گھر میں ہر وقت اس کی چہچہاٹیں کہیں کھو سی گئیں۔ زیرک نگاہوں نے اداسی کے عنوان پڑھ لیے تھے۔

"فریدہ! اگر مہک راضی نہیں تو تم لوگ زبردستی نہ کرو۔ صفدر کو میں سمجھالوں گی۔ میری پھول سی بچی چپ ہی ہو گئی ہے۔ بہرحال عمر بھر کا بندھن ہے اور عمر بھر کے فیصلے دلی رضامندی سے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔"

دادی کے لیے وہ کالی مرچوں والا چکن بنا کر لائی تھی جب انہوں نے بنا لگی لپٹی کے سیدھی سیدھی بات کہہ ڈالی۔ فریدہ کی تو مانوں ساری انگلیاں گھی میں۔۔۔ وہ بھی کافی عرصے سے یہی بات کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر ہمت ہی نہ ہو پا رہی تھی۔ اب اماں نے خود ہی کہہ دیا۔

مہک کو لگا کتنے عرصے کی بے آرامی اور بے کلی کے بعد یک دم سکون کی لہر سی دل کے اندر تک چلی گئی۔ وہ عائزہ کو بتانے دوڑی۔ عائزہ کے تاثرات اس کی توقع سے یکسر مختلف تھے۔

"بہرحال جو بھی ہوا، ٹھیک نہیں ہوا، تم ایک بہت اچھے انسان کو ٹھکرا رہی ہو۔" وہ دل گرفتی سے گویا ہوئی۔

"اب کوئی منحوس بات نہ منہ سے نکالنا۔" اسے اس وقت عائزہ کی یہ افسردگی ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔ دادی نے رات میں ابو سے بات کی۔ گھر میں سکوت کے آثار نمایاں تھے۔ عائزہ ہاتھ میں "دستکوں میں زندگی" تھامے مطالعے میں غرق تھی۔ امی کچن میں بلاوجہ مسالوں کے ڈبوں کی صفائی میں لگ گئیں۔ ہر بندہ مصروف ہو گیا تھا یا مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ اطمینان سے بے آواز سیڑھیاں چڑھ گئی۔ گگن کا چاند اسے کبھی مسکراتا نظر آتا کبھی اداس۔۔۔ اسے کوئی پسند نہ تھا۔ دل شفاف آئینہ تھا ابھی تک جہاں کسی کا عکس نہ سمایا تھا۔ اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح اس نے بھی خوابوں کے کندھوں پر سوار ہو کر عمر رفتہ کی منازل طے کی تھی۔ وہی پھول۔۔۔ خوشبو۔۔۔ ہوا۔۔۔ بادل۔۔۔ چاندنی۔۔۔ اسے بھی بھاتے۔۔۔ آنکھوں کی دہلیز میں خوابوں اور خواہشات کا ایک جہاں آباد تھا۔

وہ سوچوں میں مگن تھی جب وہ چمکتی آنکھیں تصور میں آکر اسے تھوڑا بے کل کر گئیں۔ کیا میں زیادتی کرنے جا رہی ہوں؟ خود سے سوال کیا گیا۔

کبھی وہ آنکھیں محبت سے لبریز ہو جاتیں۔۔۔ کبھی عزت براجمان ہوتی، کبھی مایوسی۔۔۔ کبھی حسرت۔۔۔ بس زوم ہو کر پردہ اسکرین پر اس کے تصور کو بے چین کیے جا رہی تھیں۔ وہ تھک کر نیچے اتر آئی۔



ابا چپ سے ہو گئے تھے۔ عائزہ کی شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں، پتا نہیں دادی، تایا اور ابا کے درمیان کیا خاموش معاہدہ طے پایا تھا۔

مریم نے آنے کی تاریخ بتا دی۔ گھر شادی والا بن گیا۔ شاپنگ شروع ہو گئی۔ ابا نے گھر کی مرمت کا کام بھی شروع کرا دیا۔ کاموں کے گھن چکر میں کچھ دن پہلے والی انہونی بھلائی جا چکی تھی۔ ہاں ملک دلاور اور ملک جلال نے یہاں آنا چھوڑ دیا۔ ملک جلال تو چلو۔۔۔ شادی تک کے لیے رسم و رواج کے مطابق اب نہ آسکتا تھا، ملک دلاور بھی نہ آتا۔ حالانکہ دونوں بہنیں ہر ہفتے ان کا دیدار کرتیں، کبھی گاؤں سے ترکاری، کبھی نئے موسم کے پھل، کبھی تائی اماں کے ہاتھ کے بنے لوازمات تو کبھی کپڑے ان کے لیے آتے۔

مریم آئی تو گھر میں رونق کا سا سماں تھا۔ اس کے دونوں بیٹے عماد اور حماد۔۔۔ ماشاء اللہ گول مٹول اور خوب صورت۔۔۔ عائزہ اور مہک تو بھانجوں کے پیچھے ہی پاگل ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر خرم تو جب سے آئے تھے آرام ہی کر رہے تھے۔

"پتا نہیں خرم بھائی کینیڈا میں مریضوں کا علاج کرتے ہیں یا انہیں گھر سے لانے لے جانے کی اضافی سروس بھی دیتے ہیں۔ جب سے آئے ہیں نیندیں ہی نہیں پوری ہو رہیں۔" مہک بے زاری سے بولی۔

"اوپر سے مریم آپی کو دیکھا ہے۔۔۔ ادھر مت جاؤ۔۔۔ خرم سو رہے ہیں۔ خرم یہ سلاد کھائیں گے، اس ٹائم جاگنگ پر جائیں گے۔۔۔ بندہ بات کرنے کو ہی ترس جائے۔ بابا بے چارے ہارٹ کے مریض کیا کچھ کریں۔" عائزہ بھی بڑبڑانے لگی۔

فریدہ اور ملک ایاز کو بھی بڑے داماد کے آنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ الٹا اضافی بوجھ۔۔۔ رات کو اکثر ملک ایاز کو کھانسی آیا کرتی تھی۔

اس رات بھی انہیں شدید کھانسی آئی۔ فریدہ پریشان سی ہو گئیں، کھانسی کے ہمراہ خون بھی آنے لگا۔ مہک خرم بھائی کو اٹھانے کے لیے بھاگی۔

"مریم آپی! ابو کی طبیعت نہیں ٹھیک۔۔۔ خرم بھائی کو کہیں ذرا آکر چیک کر لیں۔" وہ حواس باختہ سی ہو رہی تھی۔

"خرم! اٹھیں۔۔۔ ابو کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔۔۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے انہیں۔" وہ پریشان سی بولی۔

"What the hell (کیا مصیبت ہے؟)" وہ غصے سے بڑبڑاتے اٹھے، مہک ان کے فقرے پر گنگ رہ گئی۔ داماد نہ سہی ڈاکٹر ہونے کا تو حق ادا کریں۔ وہ افسردگی سے سوچتی رہ گئی۔ ابا کو دل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔

خرم بھائی کی بروقت طبی امداد سے جان تو بچی۔۔۔ پر ابو کو اسپتال ایڈمٹ کرا دیا گیا۔ شادی والا گھر افسردگی میں ڈھل گیا۔ گاؤں سے تایا ابو بھی گھبرائے ہوئے بیٹوں کے ہمراہ آگئے۔ ملک صفدر کے لیے چھوٹے بھائی ملک ایاز کو اس طرح سے دیکھنا سخت تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا۔ دادی علیحدہ گھر میں رو رو کر دعائیں مانگ رہی تھیں۔ عائزہ اور مہک بھی بابا پر اتر جانے والی اس اچانک افتاد پر آنسو برسا رہی تھیں۔ نوافل ادا کیے

گئے، دعائیں مانگی گئیں۔ ابا کی حالت خطرے سے باہر ہو گئی۔ ڈاکٹر خرم وقت کے پابند سب چھوڑ چھاڑ کر گھر آ کر لیٹ گئے۔ ان کے آرام کرنے کا وقت تھا، جبکہ ملک جلال اور ملک دلاور نے دن رات ایک کر دیا۔

مریم خود ڈاکٹر تھی، مگر ابا کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ابا کو انتہائی نگہداشت کی ضرورت تھی خود تو وہ تینوں بہنیں ہی تھیں، مگر تایا ابو اور دونوں بیٹے سایہ بنے بیٹھے تھے۔

مہک اور عائزہ ابا کو دیکھنے اسپتال آئیں۔ وہاں ملک دلاور سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ پہلے سے کمزور اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔ عائزہ کے دل کو کچھ ہوا، مگر مہک نے لاپروا نظر آنے کی پوری کوشش کی تھی۔

مریم آپی نے رات کا ڈنر تیار کیا۔ ملک جلال گھر سے کھانا لینے آیا۔ ڈاکٹر خرم لیپ ٹاپ پر بیٹھے اپنے پیشنٹ فیکوز چیک کر رہے تھے۔ مہک، عائزہ اور فریدہ کے لیے ڈاکٹر خرم کی شخصیت کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ مریم شادی کے فوراً" بعد کینیڈا شفٹ ہو گئی تھی۔ اسی لیے اتنا زیادہ پتا نہ چل سکا۔ ہاں وہ لوگ یہ ضرور جانتی تھیں کہ نک چڑھے اور مغرور سے ہیں۔

اس رات تینوں بہنیں اکٹھی ہو کر بری کے کپڑے ٹانکنے لگیں تو عائزہ نے سوال کر دیا۔

"مریم آپی آپ خوش ہیں؟" تینوں بے دلی سے کپڑے ٹانک رہی تھیں۔ ابا کی طبیعت نے ساری خوشی بھلا دی۔ بس کارڈ بٹ چکے تھے تو یہ فریضہ بھی نپٹانا تھا۔

"مجھے پتا ہے کہ تم لوگ کس حوالے سے پوچھ رہی ہو۔۔۔ میں جب یہاں آ رہی تھی تب ہی مجھے اندازہ تھا کہ یہ بندہ تم لوگوں کے لیے نیا ہے۔ میں تو ایڈجسٹ کر ہی چکی ہوں۔ دیکھو عائزہ! جہاں تک خوشی کا تعلق ہے تو شادی کے بعد خوشی لڑکی اپنے لیے خود ہی پیدا کرتی ہے۔ زندگی اتنی بے یقین اور نہ سمجھ میں آنے والی بن جاتی ہے کہ کچھ پتا نہیں چلتا کہ کس سمت جانا ہے۔ خرم میں بظاہر کوئی بری عادت نہیں۔ میرے حقوق پورے کرتے ہیں۔ میرے بچوں کے باپ ہیں۔ بحیثیت باپ سارے فرائض پورے کرتے ہیں، پر مشین سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ شروع شروع میں، میں اتنا روتی اور پریشان بھی ہوتی تھی کہ یا اللہ یہ کیا آزمائش ڈال دی۔ یہ بندہ کیلکولیٹ کر کے کھاتا ہے۔۔۔ بولتا ہے۔۔۔ میرا دل لمبی لمبی باتیں۔۔۔ فرمائشیں کرنے کو چاہتا تو ان کی روٹین میں لمبی بات کی مجھے اجازت نہ تھی۔ کوئی فرمائش کرتی تو بلا حجت فوراً" سے پوری کر دیتے، کبھی بھی روٹھنے منانے والے سین ہی نہ آئے اور اس رشتے کا حسن اسی میں ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے روٹھو بھی مناؤ بھی۔۔۔ دل کی باتیں بھی کرو۔ یقین کرو انسان کے ساتھ اس کی برائیوں سمیت رہنا قدرے آسان ہے بجائے اس کے کہ آپ ایک روبوٹ یا مشین کے ساتھ زندگی گزارو۔ کم از کم وہ رونے والی بات پر روتا تو ہے۔۔۔ ہنسنے والی بات پر ہنستا تو ہے۔۔۔ اچھے برے جو بھی جذبات ہوں ظاہر تو کرتا ہے۔"

مریم آپی کی آنکھوں میں نمی سی چھلکی۔

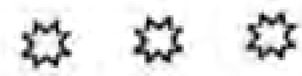
"مجھے کینیڈا میں الحمدللہ ہر چیز میسر ہے۔ میرا خیال بھی کرتے ہیں۔ پر میں مشین جیسی زندگی سے اوب گئی ہوں۔ میرا روبوٹ کے بجائے انسان کے ساتھ رہنے کو دل چاہتا ہے۔"

بھل بھل آنسو پلکوں کی باڑ سے نکل کر گالوں کے کھیت کو سیراب کرنے لگے۔ عائزہ اور مہک کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

"اسی لیے میں کہہ رہی تھی جو مہک کی خواہش ہے اس کے مطابق اس کی شادی کی جائے۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ اس کو نصیبوں کے سمندر میں نہیں جھونک دینا چاہیے۔ کچھ غلطیاں مقدر سمجھ کر کی جاتی ہیں، مگر کہیں نہ کہیں ہمارے غلط فیصلے بھی کار فرما ہوتے ہیں اور یہی غلط فیصلے کل کو مقدروں کی مار کہلاتے ہیں۔ مقدر زندگی کا آدھا حصہ بھرتے ہیں اور غلط اقدام غلط فیصلے پوری تصویر کو مرضی کے رنگ دے دیتے ہیں۔"

مہک کو عجیب سی گرانی محسوس ہونے لگی۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے وہ صبح سے کچھ نہیں کھا سکی تھی۔ وہ اٹھ کر کچن میں کھانے کے لیے چلی گئی۔ دونوں بہنیں اپنی اپنی سوچوں میں غرق اسے جاتا دیکھنے لگیں۔

روزانہ وہی سورج نکلتا تھا۔ جو وہ بچپن سے دیکھتی آئی مگر اب کی بار سورج بھی ڈھیلا ڈھیلا سا لگتا اور اس کا اندر بھی عجیب سی آلکسی، سستی اس کی شخصیت کا خاصا بنی جارہی تھی۔



مہندی کا فنکشن آپہنچا۔ گھر کی لائٹنگ کروائی گئی۔ ابا اسپتال سے گھر شفٹ ہوگئے تھے۔ ملک دلاور اور ملک جلال دونوں ہی ابا کے ہمراہ گھر آئے۔ مہک نے کچن کی ونڈو سے دیکھا۔ ابا کا چہرہ مزید کمزور ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور دوسروں کے سہارے پر گھر آتا دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ وہ وہیں کچن کے ٹیبل پر بیٹھ کر رونے لگی۔ بیٹیوں کے لیے باپ کو اس حالت میں دیکھنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے دیوار کے پار سے کوئی سایہ رفتہ رفتہ سرک رہا ہو۔

سایہ جیسے جیسے جگہ چھوڑتا جاتا ہے دل کی دھڑکنیں ویسے ویسے اندیشوں کی زد میں آتی چلی جاتی ہیں۔

"ابا کو کبھی کچھ نہ کرنا اللہ!" ایک دعا لبوں پر آئی تھی۔

مریم شاید حماد کا فیڈر بنانے کچن میں آئی تھی۔ اس نے مہک کو اس حالت میں بیٹھے دیکھا تو چونک گئی۔

"مہک! کیا ہوا؟"

"آپی! ابا کو اس طرح سے دیکھ کر دل بھر سا آیا.... ابا چلتے پھرتے.... بھاگتے دوڑتے ہی اچھے لگتے ہیں.... ایک تحفظ کا احساس سا ہوتا ہے۔"

مریم کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

"اللہ! ہمارے ابا کا سایہ ہم پر سلامت رکھے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"مہک..! ابھی بھی سامنے کی چیز بھی نظروں سے یوں پرے ہٹادی جاتی ہے کہ وہ سیراب لگنے لگتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ساری عمر لوریاں دینے والے.... محبت کے نغمے سنانے والے.... عشقیہ افسانوی باتیں کرنے والے ہی زندگی کے سودوزیاں میں آپ کا ساتھ دیں گے۔ بعض اوقات ساری عمر اکھڑ.... چپ چاپ رہنے والے بھی محبت کی دہلیز پر سب سے آگے کھڑے ہوتے ہیں۔ محبت ہمیشہ پروا کرنے پر زیادہ سنورتی ہے۔ محبت کی قدر نہ کی جائے تو یہ ادھ کھلی کلیوں کی طرح مرجھا سی جاتی ہے۔ اور اپنائیت اپنوں میں رچی بسی ہوتی ہے۔ اپنائیت کی چاشنی انا پرستی کے بت کو بھی مسمار کر دیتی ہے۔ مجھے رشک آتا ہے ان دونوں لڑکوں پر جنہوں نے رات دن ابا کے ہمراہ اسپتال میں گزارا۔ جنہیں میرے ابا کو اٹھاتے بٹھاتے.... سنبھالتے ہوئے کچھ محسوس نہ ہوا۔ جنہوں نے اپنے ہونے کا حق ادا کر دیا۔"

وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے کیا کچھ سمجھا گئی تھی۔

وہ وہیں پتھر کا بت بنے منجمد ہو گئی۔ بہت سی سوچوں کے ہمراہ.... چھا جانے والے بادلوں کی طرح سوچوں کا ایک ہجوم کوئی کنارا نہ کوئی منزل.... بس یونہی ایک بے سمت....

وہ ابا کے لیے کھچڑی کا پیالہ لے کر آئی تھی۔ اندر کا سین یوں تھا کہ ابا کو جو انجکشن لگایا تھا اس سے ابا کے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔ ڈاکٹر خرم انجکشن لگا کر کرسی پر دھنس گئے۔ تایا ابو، ملک دلاور اور ملک جلال ابا کو دبانے لگے۔

"یہ دوائیاں لے آؤ۔" ڈاکٹر خرم نے پرچی پر کچھ لکھ کر جلال کو دیا۔ وہ دوائیاں لینے بھاگا۔

"پتر! ادھر والی ٹانگ تو دبا دے.... ایاز کانپے جارہا ہے۔" دادی نے فکر مندی سے ڈاکٹر خرم سے کہا۔

انہوں نے ہونق بن کر بات سنی اور ناک کی عینک ٹھیک کرتے ہوئے بولے۔

"اماں جی مجھے دبانا نہیں آتا۔"

ان کی بات پر بہت ساری آنکھیں ان کی طرف اٹھیں۔ جن میں تنبیہہ... غصہ... بے زاری اور سرد مہری عیاں تھی۔

ملک دلاور نے خود ہی دوسری ٹانگ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔ اب وہ کچھ یوں دبا رہا تھا۔ ایک ٹانگ پر ایک ہاتھ اور دوسری ٹانگ پر دوسرا ہاتھ تھا۔

وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

مہندی کا فنکشن ہی نارمل کیا ہوتا تھا ساری شادی ہی نارمل ہوئی۔ ابا آہستہ آہستہ روبہ صحت یاب ہونے لگے۔ ابا کی صحت مندی نے گھر کی چہکاریں واپس لوٹانی شروع کردیں۔ اتنے دنوں سے وہ مسکرا بھی نہ پائی تھی۔ پر اب ایک علیحدہ ہی مسکان لبوں پر رہنے لگی۔

عائزہ نے شادی کے بعد دوسرے روز چکر لگایا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوگئی تھی۔ ملک جلال اور تائی اماں کی تعریفیں کرتے نہ تھکتی۔ ملک دلاور نے اب آنا چھوڑ دیا تھا۔

"کیا تم آج ہی واپس چلی جاؤ گی۔" وہ حماد کو سلانے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔

"ہاں' اب میرا یہاں دل نہیں لگتا۔" وہ اس کی طرح بولی۔ مہک کو پتا چل گیا کہ وہ اسی کی نقل اتار رہی ہے۔ جب وہ ہاسٹل سے پڑھ کر گھر آئی تھی' تب وہ بھی ایسے ہی کہتی۔

"جلال بہت اچھا ہے؟" مہک کے سوال پر اس نے بڑے خوب صورت سے احساس کے ساتھ اسے دیکھا۔

"پتا نہیں' تم نے یہ بات کس سینس میں کی ہے۔ البتہ میرے لیے اس کے ہمراہ زندگی گزارنا پھولوں کی سیج پر بیٹھنے کی طرح لگ رہا ہے۔"

"دلاور کو بھی جاب مل گئی ہے۔ اب اس کے لیے لڑکی دیکھوں گی۔" عائزہ نے کن اکھیوں سے اس کا جائزہ لیا' جس کا رنگ اڑ گیا تھا۔

"ماشاء اللہ شادی پر ہی دو تین رشتہ دار خواتین نے امی سے کہا تھا کہ اگر دلاور کا رشتہ آپ لوگوں نے نہیں لیتا تو ہماری بیٹیوں کی بات چلادیں۔ آج کل ویسے بھی اچھے رشتوں کا کال پڑا ہوا ہے۔ اونچا' لمبا' خوش شکل اور اب برسرروزگار بھی ہے۔ کون چھوڑتا ہے ایسا رشتہ؟ خاص طور پر جس طرح ابا کی حالت تھی۔ ان کے لیے یہ دونوں بھائی بیساکھیاں بن گئے تھے۔ ایسے خدمت گزار داماد کسے نہیں چاہئیں۔"

"اور ملک دلاور کیا چاہتا ہے؟" وہ ہلکی سی آواز میں بولی۔

"وہ تو جس کو چاہتا تھا... وہ قصہ اب قصہ پارینہ بن گیا۔" عائزہ اس کی بات کو کس رنگ میں لے گئی تھی۔

وہ شرمندہ سی ہوگئی۔ ابا کی دوسری ٹانگ پر دھرا اسے وہ دوسرا ہاتھ یاد آیا۔ وہ مضبوط ہاتھ عمر بھر کے تحفظ کے لیے کافی تھا' وہ بڑی روشن سی آنکھیں اور محبت کی چمک سے لو دیتا چہرہ... بہت سی باتیں وقفے وقفے سے یاد آئیں۔

"اگر تم ادھر ادھر نہ تلاش کرو اور اسی قصہ پارینہ کو دوبارہ سے قصہ حال بنادو تو کیا خیال ہے!؟"

وہ بنا جھجکے بولی۔ عائزہ کی تو مراد بر آئی۔ وہ خوشی سے شادی مرگ کی کیفیت میں چلی گئی۔

"کیا وہ راضی ہوجائے گا؟" اس کی چپ پر وہ پریشان ہوتے بولی۔

"میں بات کرکے دیکھوں گی۔" عائزہ بتا نہ سکی کہ وہ تو دل و جان سے راضی ہوگا۔ پھر مہک کے چہرے پر پریشانی دیکھ کر بولی۔

"تم فکر نہ کرو' وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتا۔"

مہک ہلکی سی مسکراہٹ کے ہمراہ باہر چلی گئی جبکہ عائزہ کا دل خوشی سے قہقہے مارنے کو چاہ رہا تھا۔ صحیح چیزوں کو اور لوگوں کو جوڑنے کے لیے مصلحت آمیز جھوٹ کبھی کبھی بول لینے چاہئیں۔ وہ دبی مسکراہٹ سے سوچتی رہ گئی۔



تنزیلہ ریاض

عہدِ الست

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرا ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کرپارہا۔

عمر شہروز کا کزن ہے، جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہوجاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت کا یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچہ پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول




پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

اصرار پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

بلی انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہوچکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈ پا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ بیتارا‌ؤاس کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مچھلی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہوسکتے۔ گرینڈ پا کو بتایا' وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امامہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہروز کو بتاتی ہے۔ شہروز اور عمر کا جھگڑا ہوجاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہوجاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر اسی سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن لیتے ہیں' وہ اس کی بری طرح پٹائی کردیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کردیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہوجاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہوجاتے ہیں اور کمرا بند کرکے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امامہ کی والدہ شہروز کو فون کرتی ہیں۔ شہروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔ جس کے بعد عمر کے والد امامہ کے والد کو فون کرکے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کردیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امامہ کا نکاح ہوجاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امامہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امامہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امامہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے' جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امامہ عمر اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے' جسے عمر یہ کہہ کر رد کردیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہوجاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کردیتا ہے' لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضرالٰہی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈ پا کا انتقال ہوجاتا ہے اور گرینی مسٹر ایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے

کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلوالیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کردیتی ہیں۔

میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہوجاتی ہے۔

عمر نے اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتادیا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امائمہ کی خاطر دلچسپی لیتا۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امائمہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کرپارہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امائمہ کو گلے لگا کر مبارک باددی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری' گھر جاکر دونوں میں جھگڑا ہوگیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹر ایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کرلیا اور کوہو نے مسٹر ایرک سے شادی کرلی۔

نور محمد' احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار' عمدہ خوشبو' نفیس گفتگو' اعلا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے' اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے' اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ "اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔" "اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے' اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں' جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صبا نورین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبا نے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنالیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوبت مارپیٹ تک آگئی۔

امائمہ اور عمر میں دوستی ہوگئی لیکن دونوں کو احساس ہوگیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہو کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات میتا راؤ سے ہوئی۔ وہ اب نیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگا دیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصوروار ٹھہراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو مورد الزام ٹھہرا کر لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئرپرسن حمید کا دوانی جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کر دیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہوجاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہوجاتا ہے' جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی پھیرو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آکر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ "وہ آج سے اس کے لیے مرچکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی

تعلق نہیں ہے۔" پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مرجاتا۔ نور محمد 'احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتادیتا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بوجھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔

بلی ثیا کو بے حد چاہتا ہے 'لیکن وہ انتہائی خود غرض 'مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔

بلی کے گھر فیملی فرینڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فوٹو گرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ثیا کو ملواتا ہے۔ ثیا 'عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کیمرے سے رقص کرتی ثیا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ثیا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی 'ثیا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ثیا اس بات پہ بلی سے ناراض ہو جاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ ثیا جیسی بناوٹی 'خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو ہو کے عوف سے تعلقات ہیں 'زارا کے والدین زارا اور شہروز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں 'جبکہ شہروز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے 'کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کر لیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہروز 'زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال سخت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔

امائمہ 'نور محمد کی بہن ہے۔ امائمہ کی ماں نے اس کی شادی عمر سے اسی لیے کی تھی کہ وہ لندن جاکر بھائی کو ڈھونڈے۔ وہ عمر کے علم میں لائے بغیر بھائی کو ڈھونڈنے کی کوششیں کرتی ہے 'مگر عمر کو پتا چل جاتا ہے۔ امائمہ یہ جان کر حیران رہ جاتی ہے کہ عمر 'نور محمد کو جانتا ہے۔ وہ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ثیا رقاصہ بن چکی ہے مگر غلط ہاتھوں میں چلی جاتی ہے اور اپنا بہت نقصان کر کے بلی کو ملتی ہے۔ بلی اس وقت تک ایک کامیاب ناول نگار بن چکا ہے۔ وہ دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ ثیا کو بچوں کی خواہش ہوتی ہے۔ کافی علاج کے بعد انہیں خوش خبری ملتی ہے 'مگر ثیا کے مس کیرج ہو جاتا ہے۔ ثیا خود کشی کر لیتی ہے۔

بلی کو کچھ لوگ مجبور کرتے ہیں کہ مسلمان دہشت گردوں کے خلاف ناول لکھے۔ وہ لوٹن کی مسجد کے موذن کے خلاف بات کرتے ہیں کہ وہ مسلمان دہشت گرد ہے۔ بلی اس موضوع پر ناول لکھنے کی تیاری کرتا ہے اور اس سلسلے میں نور محمد سے ملتا ہے۔ نور محمد سے احمد معروف کے نام سے ملنے والا شخص بلس گرانٹ ہی ہے 'مگر نور محمد سے مل کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خلاف کی گئیں ساری باتیں غلط ہیں۔ وہ نور محمد سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے اپنے سارے حالات بتا چکا ہوتا ہے کہ کس طرح اس کا باپ اس پر پڑھائی کے معاملے میں سختی کرتا تھا۔ کس طرح اکیڈمی سے نکالنے پر وہ دلبرداشتہ ہوا 'پاگل ہوا۔ پھر اس کے ماموں اپنے ساتھ لندن لے آئے۔ وہاں انہوں نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور اپنی بگڑی ہوئی بیٹی ثریا سے شادی کردی 'جو پانچ ماہ بعد ہی ماں بن گئی۔ نور محمد نے سب کچھ سمجھنے کے باجود اس بچی سے محبت کی۔ اسے پالنے لگا۔ مگر جب ثریا نے بخار کی وجہ سے بچی کو برانڈی پلانے کی کوشش کی اور نور محمد کے منع کرنے کے باوجود باز نہ آئی تو تھپڑ مار دیا۔ جس پر ماموں نے اسے خوب لعن طعن کی اور وہ ان کا گھر چھوڑ کر یہاں آگیا۔ ماموں نے اس کے گھر والوں کو کہہ دیا کہ نور محمد ان کے گھر سے چوری کر کے بھاگ گیا ہے۔ تب سے نور محمد اور امائمہ کی ماں پریشان ہیں اپنے شوہر سے بھی بائیکاٹ کر چکی ہیں۔ زارا کی زندگی میں اتفاق سے ٹیپو نامی لڑکا آتا ہے۔ وہ بہت اچھا ہے۔ زارا اس پر بہت بھروسا کرتی ہے۔ شہروز خوب ترقی کر رہا ہے۔ اس کی ملاقات عوف بن سلمان سے ہوتی ہے۔ وہ شہروز کو اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دیتے ہیں۔ شہروز بہت خوش ہوتا ہے۔

سولہویں قسط

زارا کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ وہ اس سے کتنی بھی بے تکلف سہی 'لیکن یہ معاملہ اور نوعیت کا تھا۔ اس میں مذاق کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے اعتراف نے زارا کے وجود کو مزید سرد کر دیا تھا۔ یہ سب جو ہو رہا تھا۔

اس کے اعصاب کے لیے بہت بھاری تھا۔

"آپ کو نہیں کرنی چاہیے تھی محبت مجھ سے۔۔۔ آپ جانتے تھے میں شہروز سے محبت کرتی ہوں اور میں اسی سے محبت کرتی رہوں گی۔۔۔ میری زندگی میں کسی اور کی گنجائش نہیں ہے اور نہ کبھی ہوگی۔ میں اگر شہروز کے متعلق آپ سے شکوے شکایات کرتی رہتی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنے ذہن میں میرے متعلق کچھ بھی سوچتے رہیں۔"

وہ سخت برا مان کر بولی تھی۔ اب کی بار اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔ وہ دل ہی دل میں سخت پچھتا رہی تھی کہ وہ اس شخص سے شہروز کی شکایتیں کیوں کرتی رہی تھی۔ اسے نہیں کرنی چاہیے تھیں، جبکہ سلمان اس کے چہرے کے تاثرات کو پرکھتا ہوا سنبھلا تھا اور پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔

"یہ بات مجھے پتا ہے محترمہ۔۔۔ اس انکشاف کی کیا ضرورت پیش آگئی آپ کو اس وقت۔۔۔؟" وہ بھی اب سنجیدہ ہو چلا تھا۔ زارا نے اتنا سنجیدہ اسے پہلے کم ہی دیکھا تھا۔

"آپ مجھے پاگل مت بنائیں۔۔۔ آپ نے ابھی کہا کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔۔۔ اور ابھی آپ اس بات سے انکار کر رہے ہیں۔" وہ عادت کے مطابق چڑ کر بولی تھی۔

"انکار۔۔۔ انکار کس الو کے پٹھے نے کیا ہے۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" وہ اسی کے انداز میں بولا تھا، پھر اس کے الجھے ہوئے انداز سے خود بھی الجھتا ہوا بولا۔

"انسانوں کو پرکھنے میں جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے زارا بی بی۔۔۔ مرد اگر بے تکلفی سے بات کرتا ہے تو یقین کرو، یہ اس کی محبت نہیں ہوتی۔۔۔ یہ اس کی عادت بھی ہو سکتی ہے۔۔۔ اور میں تو فطرتاً "محبت کرنے والا انسان ہوں۔۔۔ انسانوں سے محبت میری گھٹی میں ہے۔۔۔ محبت میری عادت ہے۔۔۔ یقین کرو، میں عادتاً" محبت کرتا ہوں۔۔۔ نہیں جانتا اچھا کیا ہے، برا کیا ہے، لیکن میرے ماں باپ نے مجھے یہ ہی سب سکھا کر پروان چڑھایا ہے کہ انسان سے محبت کرو۔۔۔ بے غرض، بے لوث محبت۔۔۔ محبت ہماری خاندانی صفت ہے۔۔۔ نفع نقصان تو تجارت سے مشروط ہوتا ہے۔۔۔ ہمارے لیے محبت اس سے ذرا اوپر کی چیز ہے۔۔۔ میرے لیے محبت ایک درویشی سا جذبہ ہے۔۔۔ ہم "محبت" کو غلاظت کی عینک لگا کر نہیں دیکھتے۔" وہ اسے بولنے کا موقع دیے بغیر اپنی طرف سے وضاحت دے رہا تھا۔

"آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ فرشتہ ہیں۔۔۔ انسانوں سے بے غرض ہو کر محبت کرتے ہیں۔" وہ شرمندہ تو ہوئی، مگر پھر بھی اس کے انداز سے مرعوب ہوئے بغیر بولی تھی۔ اب کی بار سلمان کو سخت برا لگا اور اس کے چہرے سے خفگی چھلکنے بھی لگی تھی۔

"مجھے ایک بات بتاؤ، کیا فرشتے انسان سے محبت کرتے ہیں۔ کہیں پڑھا ہے تم نے ایسا۔۔۔ کسی کتاب میں۔۔۔ کسی حکایت میں۔۔۔؟ فرشتے انسان سے محبت نہیں کرتے، فرشتے صرف اللہ سے محبت کرتے ہیں، اللہ محبت کرتا ہے انسانوں سے۔۔۔ اور میں اللہ کی خاطر اس کے انسانوں سے محبت کرتا ہوں۔ یہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق تھا اور میں بس اس کو فالو کرتا ہوں۔ میں نے کہا تھا نا میں چرواہا ہوں۔۔۔ میں انسانوں کو ایک جگہ گلے میں متحد رکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور یہ کام محبت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے اس طرح بات کر کے مجھے میری نظر میں شرمندہ مت کرو۔ میری نیت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی، کبھی نہیں، مجھے نہیں پتا میرے کس انداز سے تمہیں میری نیت پر ایسا شک ہوا۔"

وہ تنک تنک کر بول رہا تھا۔ زارا پر ٹھنڈے پانی کی بھری ہوئی بالٹی پڑنے والی صورت حال تھی۔ وہ چند لمحے سر جھکائے اپنی انگلیوں کو مروڑتی رہی۔

"میں نے آپ کی اور آنٹی کی سب باتیں سنیں۔۔۔ آمنہ والی۔۔۔ آنٹی مجھے آمنہ سمجھتی ہیں۔" وہ شرمندہ

تھی۔ مگر اپنی غلطی کا برملا اعتراف کرنے سے بھی کترا رہی تھی۔

"واہ رے زارا بی بی! آپ کی پھرتیاں۔۔۔ لاحول ولا۔۔۔ یعنی کہ حد ہو گئی۔۔۔ ماں بیٹے کی گفتگو چھپ کر سنی اور پھر بس سوچنے لگیں الٹا سیدھا۔ متنفر ہونے سے پہلے تصدیق تو کر لیتا ہے انسان۔۔۔" وہ خفا تھا۔

"آئی ایم سوری! لیکن آپ آنٹی کو آمنہ سے ملوا دیں نا۔۔۔ وہ مجھے آمنہ سمجھتی ہیں۔" شرمندگی اور خفت اس کے الفاظ پر بھی غالب تھی۔

"امی کی بات مت کرو۔ یہ بات ان سے چھپی ہوئی ہو سکتی ہے کہ تم انگیجڈ ہو، لیکن میں تو جانتا ہوں۔" وہ جھنجلایا ہوا بول رہا تھا۔

"میں نے کبھی کسی سے نہیں چھپایا۔۔۔ یہ بات تو میں نے آپ کو سب سے پہلے بتائی تھی۔" زارا نے عجلت بھرے انداز میں کہا تھا۔ سلمان نے اس کی جانب دیکھا، پھر ناک چڑھا کر بولا۔

"میں بہت پہلے سے جانتا تھا کہ تم اور شہروز منور انگیجڈ ہو۔"

"آپ شہروز کو پہلے سے جانتے تھے؟ آپ نے مجھے نہیں بتایا۔۔۔ کیسے۔۔۔ کیسے جانتے تھے آپ شہروز کو۔۔۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ سلمان کے منہ سے شہروز کا سرنیم سن کر وہ مزید حیران ہوئی تھی۔ اس نے اس کا مکمل نام کبھی نہیں بتایا۔

"ہماری ایک دلچسپی مشترک ہے۔" سلمان نے کہا تھا۔ زارا کی گردن پر چہرہ نہیں تھا، بلکہ ایک بڑا سا سوالیہ نشان ابھر آیا تھا۔

"معاف کیجیے گا۔۔۔ وہ آپ نہیں ہیں۔۔۔ اس لیے کسی خوش فہمی کا شکار ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" اس نے جتا کر کہا، پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"عہد الست" سلمان نے سچ اگلنے کا تہیہ کر ہی لیا تھا۔ زارا نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ اسے یاد تھا اس نے یہ لفظ ان کاغذات پر لکھا دیکھا تھا جو ایک بار سلمان ہی کی گاڑی میں اسے ملے تھے اور اس نے انہیں اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔



"یہ عہد الست کیا ہے؟" یہ اس سے اگلے روز کی بات تھی۔ لندن کے ایک علاقے ایلفرڈ کے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھے شہروز نے اپنے سامنے بیٹھے تیمور نصار سے پوچھا تھا۔

"میرے لیے یہ ایک مشہور ادیب کی آٹوبائیوگرافی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک مشہور شخص کی زندگی کی کہانی ہے۔ جو اپنے آخری ایام میں کنورٹ (مذہب تبدیل کر لیا) ہو گیا ہے اور اب وہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اس کی طرح کنورٹ ہو جائے۔ ان کا اسکول آف تھاٹ ہی یہ ہے۔۔۔ ہر شخص کو اس دائرے میں طوعاً و کرہاً کھینچ کھانچ کر لے آنا۔ جسے یہ "اسلام" سمجھتے ہیں۔ اسی دائرے کو یہ دین کہتے ہیں اور اسے ہی یہ "عہد الست" کہتے ہیں۔"

اس نے سرسری انداز میں کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے سینڈوچ کا ایک بڑا سا لقمہ لیا تھا۔ وہ بہت بے ڈھنگے انداز میں کھا رہا تھا۔ بڑے بڑے لقمے اور عجلت بھرا انداز شہروز کو سخت ناگوار گزر رہے تھے۔

شہروز نے عمر سے ہونے والی طویل بحث کے بعد رات کافی تاخیر سے اسے ٹیکسٹ کر کے ملنے کے لیے کہا تھا اور وہ اگلی ہی صبح برنچ کرنے لوٹن سے ایلفرڈ آ گیا تھا۔ وہ "زین العابدین" نہیں تھا۔ اسی لیے وہ پہلی ملاقات والے زین العابدین سے بہت مختلف تھا۔ لوٹن میں وہ ایک تھکا ہوا لاچار ضرورت مند آدمی نظر آتا تھا، جبکہ اب شہروز کے سامنے وہ کارپوریٹ کلچر کے ایک نمائندہ کے روپ میں تھا۔ اس کا تعلق ترکی سے تھا اور وہ چند ایک چھوٹی موٹی جاب کے علاوہ ایک برطانوی شخص کے پاس فارسی مترجم کے طور پر کام کر رہا تھا۔ زبانوں پر اس کا عبور قابل رشک تھا۔ وہ ترکی، فارسی، ہندی اور عربی کے علاوہ فرنچ بھی بول سکتا

تھا، لیکن اس کی اصل جاب وہی تھی جو شہروز کی تھی۔

وہ مختلف بین الاقوامی چینلز کے علاوہ عوف بن سلمان کے لیے بھی کام کرتا تھا اور فری لانس کرتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک فوٹو گرافر تھا۔ اور اسی لیے وہ بھی اس ڈاکومنٹری کا حصہ تھا۔ اس کے ساتھ چند منٹ گزار کر ہی شہروز مایوس ہوا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس شخص کی واحد خصوصیت اس کی مختلف زبانیں بولنے کی صلاحیت ہے، ورنہ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ جس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے وہ چھوٹا سا کیفے ٹیریا ٹائپ کینٹین تھی جہاں اکا دکا سفید فام ٹین ایجر طالب علم ہی نظر آرہے تھے۔

تیمور نے خود ہی اس سے اردو میں بات شروع کی تھی۔ سو وہ بھی اردو میں ہی اس سے بات کرنے لگا تھا۔

"میں نور محمد صاحب کے ساتھ کافی مہینوں سے رہ رہا ہوں۔۔۔ اچھے انسان ہیں۔۔۔ اس سے بھی زیادہ اچھے رائٹر ہیں۔۔۔ قدرت نے انہیں الفاظ پر بے پناہ مہارت عطا کی ہے۔ الفاظ کی بنیاد پر ہی دوسروں کی سوچ تک بدل کر رکھ سکتے ہیں۔۔۔ وہ اپنے اسی ہنر کا سہارا لے کر مسلم دنیا میں اپنی جگہ بنانا چاہتے ہیں۔۔۔ نئے نئے کنورٹ ہوئے ہیں۔۔۔ اس لیے جوش بھی زیادہ ہے۔۔۔ میں نہیں کہتا کہ ان کی نیت میں کوئی کھوٹ ہے۔۔۔ یا وہ کوئی ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔ نہیں وہ ایسے انسان ہی نہیں ہیں۔۔۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ٹوہ لینے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔۔۔ میں نے ایک بار اپنے متعلق جو کہانی سنادی کہ میں مجبور غریب انسان ہوں۔ جس کے پاس رہائش نہیں ہے۔ جس کا تعلق ایک غریب ملک سے ہے۔ جس کا خاندان بہت بڑا ہے۔ اسی پر یقین کر کے بیٹھے ہیں۔ کبھی بلاوجہ کے سوالات نہیں کرتے۔۔۔ کمرے کی یا میری چیزوں کی چیکنگ نہیں کرتے۔۔۔ مالی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔۔۔ ان میں وہ تمام خوبیاں ہیں، جو ایک اچھے انسان میں ہونی چاہئیں۔ اس لیے میں انہیں دل سے پسند کرتا ہوں۔ میرا ان سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں ہے۔"

وہ اپنی دھن میں مگن مسلسل بول رہا تھا۔ شہروز کو اس کی وضاحت سے کوئی غرض نہیں تھی۔

"ہمارے درمیان اختلاف کا بس ایک ہی پہلو ہے۔۔۔ وہ ہر شخص کو ریڈیکلائز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ سب کی داڑھیاں رکھوا کر سر پر امامے بندھوا دیں اور انہیں جہاد کے لیے بھیج دیں۔ عورتوں کو گھروں کی مخلوق قرار دے کر انہیں محصور کر کے ایسے رکھ دیں جیسے بالٹیاں باتھ روموں میں رکھی جاتی ہیں۔ یعنی اگر ڈرائنگ روم میں یا گھر کے کسی دوسرے حصے میں نظر آئیں تو اوڈ لگیں گی۔۔۔ نامناسب تحقیر آمیز۔۔۔ میں اس سوچ سے سخت چڑتا ہوں۔" وہ مقام جب شہروز اسے بائے کہہ کر اٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے بالآخر ایک کام کی بات کہہ ڈالی۔ "ہمم۔۔۔" شہروز نے ہنکارا بھرا۔

"کیا واقعی۔۔۔ ان کی سوچ اس قدر ریڈیکلائزڈ ہے؟" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔ اسے **تیمور** کی ہر بات سے اتفاق نہیں تھا۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ نور محمد کنورٹ ہونے کے باوجود ابھی بھی کوئی ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔

"اس سے بڑھ کر۔۔۔ لیکن ان کی غلطی نہیں ہے۔ انہوں نے اسلام کی جو شکل دیکھی ہے وہ ایسی ہی ہے۔ وہ تبلیغیوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ ایسے لوگ جو اسلام کو پابندیوں کا مذہب سمجھتے ہیں۔ تنگ نظری ان کی سوچ ہی نہیں خون میں بھی رچی بسی ہوئی ہے۔ میوزک، الکحل، عورت، لباس، حرام حلال۔۔۔ ان کے یہاں ہر معاملہ تنگ نظری کا شکار ہے۔ وہ یہ بات نہیں سمجھتے کہ یہ سب چیزیں کلچرل ویلیوز ہیں۔ ان کا تعلق مذہب سے ہے نہ ہو سکتا ہے۔۔۔ مذہب اسلام سے تو قطعاً" نہیں ہو سکتا۔۔۔ میں الحمد للہ مسلمان ہوں۔۔۔ میرے ماں، باپ مسلمان ہیں۔۔۔ میرا ماننا ہے اسلام جیسا جدید مذہب کوئی نہیں۔۔۔ یہاں تنگ نظری نہیں ہے۔ یہاں ہر معاملے میں لچک ہے۔ دواؤں میں ایک عنصر کے طور پر علاج کی غرض سے الکحل استعمال کی

ہو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مسلمان مرد اہل کتاب غیر اسلامی عورت سے شادی بھی کر سکتا ہے۔ موسیقی بھی اگر طبیعت میں ہیجان پیدا نہیں کرتی تو اسے سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ عورت اگر سر نہیں ڈھکتی' مگر مہذب لباس میں ہے تو پھر اس کو ٹوکنے کا کوئی جواز نہیں بنتا عورت مجسم خوب صورتی ہے اور خوب صورتی کو قید کر کے رکھنا ظلم کے مترادف ہے۔ وہ اگر بغیر آستینوں کی قمیض پہنتی ہے یا گھٹنوں سے اونچا اسکرٹ پہن لیتی ہے تو یہ اس کی خوب صورتی کو اجاگر کرنے کے لیے ہے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ وہ مرد کے سکون کے لیے پیدا کی گئی ہے' ناکہ پابندیوں میں جکڑ کر گھروں میں محصور رکھنے کے لیے۔ اس کا گھر سے باہر نکل کر مرد کی ذمہ داریاں بانٹنا بھی مرد کے لیے باعث رحمت اور باعث سکون ہی ہے۔۔۔ لیکن برادر نور محمد یہ سب نہیں مانتے اور قصور ان کا بھی نہیں ہے۔ انہیں لوگ ہی ایسے ملے ہیں جن کے عقائد نہایت فنڈ امینٹلسٹ ہیں۔ ہر معاملے میں تنگ نظری ان کا وتیرہ بن چکی ہے۔ آپ مل چکے ہیں ان سے۔۔۔ آپ جانتے ہیں وہ آپ کے جس رشتہ دار سے بے پناہ متاثر ہیں وہ کون ہے۔۔۔ وہ آج کل کہاں ہے۔ وہ سرٹیفائیڈ دہشت گرد ہے۔"

شہوز کو لفظ "رشتہ دار" دہشت گرد سے بھی زیادہ برا لگا۔

"کیا واقعی نور محمد "المہاجرون" کے لیے کام کر رہا ہے؟" شہوز نے اپنی کیفیت چھپا کر اس کی جانب جھکتے ہوئے رازداری بھرے انداز میں سوال کیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' پھر استفہامیہ انداز میں بولا۔

"برٹش نور محمد۔۔۔" شہوز نے بدقت منہ کا زاویہ برا بنانے سے خود کو روکا۔۔۔ اتھنک بنیادوں کو یہاں بھول جانا آسان نہیں تھا۔

"پاکستانی نور محمد۔۔۔" وہ لفظ پاکستانی پر زور دے کر بولا' تیمور نصار نے ناک چڑھائی۔

"پاکستانی کے بارے میں حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہہ سکتا میں۔۔۔ ان کے بارے میں تو ان کے گھر والے بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ معاف کیجئے گا' لیکن پاکستانیوں کی سرگرمیاں ایسی ہیں کہ کوئی بھی انہیں شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ افغانستان کے بعد یہ دوسری بڑی قوم ہے جو اپنی سوچ میں نہایت ریڈیکل ہے۔ کنزرویٹو ہے۔ ستر فیصد پاکستانیوں کی رائے ایک جیسی قدامت پسندانہ سوچ پر مبنی ہے۔ طالبانائزیشن اور ریڈیکلائزیشن ان کے لیے نیا فینامینن نہیں۔ سو پاکستانی نور محمد کے بارے میں یہ بات حتمی ہے کہ اس کا کوئی نا کوئی تعلق کسی الٹی سیدھی سرگرمی سے رہا ہو گا۔"

وہ شہوز کے چہرے کو دیکھ رہا تھا' جہاں ناپسندیدگی کے تاثرات تھے' مگر وہ اس کی بات کو رد بھی نہیں کر رہا تھا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہا۔

"آپ نے کچھ زیادہ ہی سخت الفاظ استعمال کر لیے۔۔۔ یہ سب مغربی پروپیگنڈہ ہے اور کچھ نہیں' ورنہ ہم پاکستانی بہت مہذب اور لبرل قوم ہیں۔" شہوز نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا' لیکن اس کی آواز تاثیر سے عاری تھی۔

"نہیں۔۔۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ میرے الفاظ آپ کو سخت لگے' لیکن سچائی کی تلخی ہے۔۔۔ یقیناً" چبھے گی۔ آپ لوگ مغربی پروپیگنڈہ کے بعد مہذب ہوئے ہیں۔۔۔ اب واقعی صورت حال بہتر ہو رہی ہے۔ ورنہ کتنے ہی واقعات میں آپ کو یہاں بیٹھے بیٹھے انگلیوں پر گنوا سکتا ہوں' جب اسلامی جمہوریہ پاکستان میں "اسلام" کے نام پر وہ قتل و غارت ہوا ہے کہ اللہ کی پناہ۔۔۔ دراصل آپ لوگوں نے خود کو اسلام کا ٹھیکے دار ہی سمجھ لیا ہے۔ رہی سہی کسر اٹمک پاور نے پوری کردی۔۔۔ گویا قدرت نے گنجے کو ناخن دے ہی ڈالے۔۔۔ اب کھجا کھجا کر لہولہان ہی ہو گا نا۔۔۔" اس نے رک کر ایک بار پھر شہوز کی شکل دیکھی' پھر اس کی خفگی محسوس کر کے ہاتھ ہوا میں بلند کر کے بولا۔

"برا مت مانیے برادر۔۔۔ میں کسی ملک یا اس کے شہریوں کے خلاف نہیں ہوں۔۔۔ بلکہ میں اس سوچ

کے خلاف ہوں جو اسلام کے نام پر وہاں پروان چڑھائی جارہی ہے۔ میں افغانستان، سعودی عرب، ایران اور ان جیسے سب ہی ممالک پر تنقید کرتا ہوں۔"

"آپ کر سکتے ہیں۔۔۔ میں مان لیتا ہوں، لیکن اب کام کی بات کریں اور نور محمد کے ناول پر روشنی ڈالیں۔۔۔ یہ زیادہ مناسب رہے گا۔" شہروز نے اس کی باتوں سے اکتا کر ٹوکنا ضروری سمجھا تھا۔ اس نے ناک سکیڑ کر اور آنکھیں پھیلا کر شہروز کو دیکھا۔ پھر سرہلایا۔ گویا سمجھ گیا ہو کہ اس کے سامنے بیٹھا شخص برا منا رہا ہے۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔۔۔ جو آپ کو مناسب لگے۔۔۔ لیکن یہ سب بھی ڈسکس کرنا ضروری ہے۔ میری کوئی بات بری لگی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں، لیکن حقیقت سنیں گے تو برداشت کرنا سیکھیں گے اور برداشت کرنا سیکھیں گے تو اس دنیا میں اپنے مقام کا تعین کرپائیں گے۔ میں آپ کو صرف یہ سمجھانے کی کوشش کررہا تھا کہ نور محمد اور ان کا عہد الست ریڈیکلائزڈ سوچ پر مبنی ایک کاغذات کا پلندہ ہے۔ میری نظر میں اس لیے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ آپ بھی اس کی پروا نہ کریں۔۔۔ اور تعصب پسند ہوئے بغیر یکسوئی سے اپنے کام پر دھیان دیں۔" اب کی بار وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ شہروز کو اس کی یہ بات بھی اچھی نہیں لگی، بلکہ یہ بات اسے سب سے زیادہ بری لگی۔

"میں اپنے کام پر ہی دھیان دے رہا ہوں، لیکن متضاد آرا کو سن کر ہی کسی نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے۔ میں آپ کی باتیں سن رہا ہوں۔ ان سے اتفاق کرنا یا نہ کرنا میری مرضی پر منحصر ہے۔ مگر میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ میں تعصب پسند نہیں ہوں، اس لیے میں اس بین الاقوامی چینل کے لیے میرٹ پر چنا گیا ہوں۔ میں بھی اس پراجیکٹ کو اپنا سو فیصد دینا چاہتا ہوں۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا نکتہ جس پر میری اپنی سوچ واضح نہ ہو اسے عوام کے سامنے پیش کرکے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کی وجہ بنوں۔"

اس نے بہت ہی پیشہ ورانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی تھی اور اپنا موقف واضح کردیا تھا۔ اسے اس لمحے ذہنی طاقت کی بہت ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ وہ اس امر کو ہمیشہ گلوکوز کی طرح استعمال کرتا تھا کہ وہ میرٹ پر چنا گیا ہے۔ اس کے لیے خود شناسی خود اعتمادی تھی۔

"ہم سب کی یہ ہی سوچ ہے۔۔۔ یہی مقصد ہے۔۔۔ ہمارا پروجیکٹ مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے۔۔۔ پاکستان کے خلاف بھی نہیں ہے۔۔۔ میں ترکی میں بھی بسنے والے فنڈامینٹلسٹ پر سخت تنقید کرتا ہوں۔ آنر کلنگ پر بہت کام کیا ہے میں نے۔۔۔ ہم تو مسلم دنیا کا وہ رخ پیش کرنے والے ہیں جو حقیقی معنی میں بے پناہ خوب صورت ہے۔۔۔ ہمارا کلچر ہماری ویلیوز ہمارے طور طریقے کس قدر جدید ہیں، کس قدر دل موہ لینے والے ہیں۔ یہ دوسری اقوام کو دکھانے اور باور کروانے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں اس چودہ سو سال پہلے والی دقیانوسی سوچ سے نکلنا ہوگا۔ یہ وقت کا تقاضا ہے۔ ہمیں اپنے وہ اصول جو دوسری اقوام کے لیے ناقابل برداشت ہیں کو بدلنا ہوگا اور ان میں ترمیم کرنی ہوگی۔ اقوام عالم کے ساتھ تعلقات بنا کر چلنا ہے تو ان کے ساتھ ہم آہنگی کی خاطر ان کی عادات کو اپنانا ہوگا۔ میں نے اپنے مذہب سے یہ ہی سیکھا ہے کہ جمود معاشروں کو جوہڑ بنادیتا ہے اور یہ ہی میں اپنی آنے والی نئی نسلوں کو سکھاؤں گا۔۔۔ میں اس پروجیکٹ کے ساتھ اسی لیے منسلک ہوں کہ یہ وہ سب کرے گا جو میں بحیثیت مسلمان کرنا چاہتا ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔۔۔ ہماری نیت نیک ہے۔۔۔ اور کامیابی ہمیں ضرور ملے گی۔۔۔ اس لیے انہیں اپنا کام کرنے دیں اور آپ اپنا کام کریں۔ ہمیں اپنی ڈاکومنٹری ان کے ناول سے پہلے تیار کرنی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ اپنا کام مکمل نیک نیتی سے وقت پر کرلیں گے۔"

تعمور نصار نے کہا تھا۔ شہروز نے سرہلایا۔ اب کی بار اس کے مستحکم لہجے نے شہروز کو متاثر کیا تھا۔ وہ اس کی سوچ کے ساتھ سو فیصد متفق تھا۔

"ان شاء اللہ۔۔۔" اس نے بھی کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ عہد الست کیا ہے؟" اسی روز اور تقریباً" اسی وقت جب شہوز الفرڈ کے ایک کیفے ٹیریا میں بیٹھا عہد الست کے متعلق بات کر رہا تھا۔

عمر نے اس سفید فام شخص کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا جس کا نام نور محمد تھا۔ اس کے پاس بہت سے سوالات تھے جن کے تسلی بخش جوابات جاننا اس کے لیے بہت ضروری تھا۔ اس لیے وہ لوٹن میں موجود تھا اور اس بار اس نے کسی کو بتانے یا پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس نے اپنے باس سے تین گھنٹے کا بریک لیا تھا اور پھر یہاں آگیا تھا۔ اسے کل رات ہونے والی ایک لمبی بحث نے سمجھا دیا تھا کہ وہ اگر اس سمندر میں کودے گا تو اکیلا ہی کودے گا۔ کوئی اس کا ساتھ نہیں دے گا اور وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کود کر ہی دم لے گا۔ یہ ہی اس کی طبیعت کا وہ رنگ تھا جس کی بنا پر وہ سارے خاندان میں جذباتی مشہور تھا۔ وہ عموماً" ہر بات پر بھی ضد میں نہیں آجایا کرتا تھا، لیکن جب اسے کسی معاملے میں اپنا آپ حق پر لگتا تھا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کے فیصلوں سے ایک انچ بھی نہیں ہٹا پاتی تھی۔ اس کے ساتھ ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔

اس کے ابو نے جب اپنے بھائی کی معاونت سے لندن میں ہوزری کا بزنس شروع کیا اور پاکستان سے ہوزری کا سامان امپورٹ کرنا شروع کیا تو بہروز بھائی کے ایک جاننے والے کسٹم میں اچھی پوسٹ پر تھے۔ ان کی معاونت سے ایکسائز ڈیوٹی پر کافی چھوٹ ملنے لگی، تب بھی عمر نے بہت شور ڈالا تھا۔ حالانکہ تب وہ پڑھ رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ابو اور تایا ابو سے اس بات پر بہت بحث کی تھی کہ وہ ایک ال لیگل کام کر رہے ہیں جو ان کے اپنے ملک کے مفاد میں نہیں ہے اور وہ پاکستان کی خرابیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ سب خرابیاں پاکستانیوں کی خود کی پیداوار ہیں۔ تب بھی اسی طرح وہ ایک طرف رہ گیا تھا اور باقی سارا خاندان اسے جذباتی قرار دیتے ہوئے ایک طرف ہو گیا تھا۔

پھر جب اس کی بہن صبا کی شادی ہائی اسکول کے بعد ہی طے کر دی گئی، تب بھی اس نے خوب واویلا مچا کر اپنے ابو کی ناراضی مول لی تھی اور اسے اسی طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس نے انہیں واضح لفظوں میں کہا تھا کہ وہ صبا کی خواہش کے باوجود اسے مزید پڑھنے کی اجازت صرف اس لیے نہیں دے رہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کی بیٹی اپنی مرضی سے شادی نہ کر لے۔ انہیں اللہ سے زیادہ لندن کے آزاد ماحول سے خوف آتا ہے اور اگر انہیں اتنے ہی خدشات ستاتے ہیں تو وہ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔ اس طرح کی صورت حال میں اسے ہمیشہ اپنے والدین کے دوغلے پن سے الجھن ہوتی تھی اور وہ واقعی جذباتیت کا شکار ہو جایا کرتا تھا۔

سو اب بھی وہ اکیلا تھا، تنہا تھا، لیکن حق پر تھا۔

"عہد الست آپ کے لیے شاید ایک عام سا ناول ہے، جس میں آپ کے کسی رشتے دار کا ذکر ہے..... کسی دوسرے شخص کے لیے یہ ایک مشہور شخص کی آٹو بائیو گرافی ہو سکتی ہے، لیکن میرے لیے یہ ایک عقیدہ ہے 'ایک سوچ' زندگی گزارنے کا طریقہ، جسے میں نے ساری زندگی گزار لینے کے بعد سیکھا ہے اور میں اسی لیے اس پر زور دیتا ہوں اور اس سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں ہوں۔" عمر نے دیکھا وہ شخص پہلے سے پر عزم دکھائی دیتا تھا۔

"میں نے اپنی زندگی میں پہلا اہم سبق یہ سیکھا تھا کہ اپنی فطرت سے غداری نہیں کرنی چاہیے۔ بہت چھوٹی عمر میں میرے گرینڈ پا نے مجھے یہ بات سمجھا دی تھی کہ فطرت سے بغاوت بگاڑ کا باعث بنتا ہے اور میری زندگی کا آخری اہم سبق یہ تھا کہ انسان فطرت حنیف پر پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی دین حق کا اقرار اس کی فطرت ہے۔ انسان اس اقرار سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ انسان فطرت حنیف سے منہ موڑتا ہے تو کل انسانیت کے لیے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہی عہد الست ہے اور یہ ہی میری کہانی ہے۔ اس کہانی کی بظاہر آپ

کے لیے کوئی اہمیت نہیں ہے' لیکن آپ نور محمد کے رشتہ دار ہیں اور ان کے لیے یہ ناول بہت اہم ہے' کیونکہ یہ ان کی بے گناہی کو ثابت کرسکتا ہے۔ اسی لیے میری کہانی آپ کے لیے اہم ہو سکتی ہے۔"

"نور محمد سے اتنی محبت کیوں ہے آپ کو۔۔۔ ان سے آپ کی کوئی رشتہ داری تھی نہ کوئی گہرے مراسم۔۔ وہ آپ سے عمر' علم' تجربے میں بھی کم تھے۔ آپ کے ان کے تعلقات کی عمر بھی شاید ہی کچھ مہینے رہی ہوگی۔ اس کے باوجود آپ کے دل میں ان کے لیے اتنی عقیدت سننے میں عجیب سی لگتی ہے۔ ایسی بھی کیا خاص بات ہے ان میں؟"

عمر یہ سوال سب سے پہلے پوچھنا چاہتا تھا۔ یہ سوال اس کے دل میں بے حد کھلبلی مچا رہا تھا۔ فی زمانہ ایک شخص کا دہشت گرد قرار دیا جانا ہی اس سے لاتعلق ہوجانے کے لیے کافی تھا۔ وہ امائمہ کا رویہ ہی دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اپنے بھائی کے لیے اتنا بے چین رہنے والی امائمہ اب یک دم اس کے بارے میں جان کر تعلق جان کر کیسے لاتعلق ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی تو ایسی کیا الفت تھی اس بوڑھے سفید فام کو اس "نور محمد" سے کہ جو اس کی خاطر ہر قدم اٹھانے کو تیار تھا۔ وہ کون سا جذبہ تھا جو اس سارے عمل کے پیچھے کار فرما تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کو مسلا اور پھر جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔

"یہ سوال پہلے بھی کسی نے پوچھا تھا اور اسی انداز میں پوچھا تھا۔۔۔ آپ لوگ اس بات پر حیران ہوتے ہیں کہ نور محمد ہی کیوں اور میں یہ پوچھتا ہوں کہ۔۔۔ نور محمد کیوں نہیں؟ وہ اگرچہ ایک عام سا انسان ہی ہے۔۔۔ لیکن "خاص" ہونے سے پہلے ہر انسان "عام" ہی ہوا کرتا ہے بظاہر دنیاوی لحاظ سے ان میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ آیا وہ پھونک مار کر ٹوپی میں سے خرگوش نکال سکتے تھے یا آبرا کاڈابرا قسم کا کوئی منتر پڑھ کر انسان غائب کرسکتے تھے ایسا کچھ نہیں ہے میرے دوست۔۔۔ مجھے اس کا تقویٰ پسند ہے "کیا پیارے نبی کا پڑھایا ہوا آخری سبق یہ نہیں ہے کہ تقویٰ کو ہی فضیلت حاصل ہے۔ کیا کسی انسان کو جانچنے کا اس سے اچھا کوئی اور پیمانہ ہو سکتا ہے یا ہونا چاہیے۔۔۔؟"

وہ اس سے پوچھ رہے تھے اور عمر چپ کا چپ رہ گیا۔ اس کے پاس اتنا علم نہیں تھا کہ وہ ایسی باتوں کے جوابات فوراً" دے پاتا۔ ہر عام مسلمان انسان کی طرح وہ تو خود کو ہی سب سے بڑا متقی سمجھتا تھا۔ اس کے لیے تو یہی سب سے بڑی خوبی تھی کہ اس نے کسی کا دل نہیں دکھایا تھا' کسی کا حق نہیں مارا تھا۔ وہ تو اس بات پر بھی اتراتا تھا کہ وہ نماز پڑھ لیتا ہے۔ روزے بھی رکھ لیتا ہے۔ اس کے لیے یہی فخر کم نہیں تھا کہ اس نے آزاد ماحول میں پرورش پانے کے باوجود وہاں کا رتی برابر اثر قبول نہیں کیا تھا۔ اس سے کوئی پوچھتا تو وہ کہتا کہ ہاں میں ہی بہترین مسلمان ہوں۔۔۔ میرے دم سے آج تک کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔۔۔ میں اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا ہوں؟"

"نور محمد ایک متقی انسان ہیں۔۔۔ اللہ کو متقی انسان سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ میرے لیے بھی ان سے محبت کرنے کے لیے یہی خوبی کافی ہے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوئے تھے۔

"تقویٰ کیا ہے سر!" عمر نے لاچار انداز میں سوال پوچھا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھا شخص جو پہلی ملاقات میں ایک عام سا سفید فام بوڑھا تھا اب یکدم ایک عالم بن گیا تھا۔ اس کے لفظوں میں تاثیر تھی جو دل پر وار کرتی تھی۔ عمر خود کو اس کے سحر میں جکڑا محسوس کرتا تھا۔

"تقویٰ وہ سیڑھی ہے جو اکملیت کی طرف لے جاتی ہے۔۔۔ مجھے پتا ہے اب آپ پوچھیں گے کہ اکملیت کیا ہے' میں آپ کو اس سوال کا جواب بھی دوں گا۔ میری اہلیہ نے خودکشی کی تھی' میری دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس کے ساتھ نرمی والا معاملہ روا رکھے کہ اس کے الجھے ہوئے سوالات نے ہمیشہ مجھے سلجھی ہوئی راہ دکھائی۔ اس کی اپنی زندگی ایک سوال کے گرد گھومتی رہی۔ "اکملیت کیا ہے؟" اس نے

بہت تھی لیکن زندگی گزاری تھی یقین کیجیے بس چیز کی تلاش تھی وہ اسے تازندگی نہ ملی۔ وہ کہا کرتی تھی وہ لمحہ جب روح اور جسم ایک نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں تو ابدی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اسے اس سکون کی تلاش تھی وہ سمجھتی تھی کہ یہ سکون اسے تب ملے گا جب وہ "ماں" بن جائے گی۔ اس نے فرض کرلیا تھا کہ "اولاد کا حصول ہی ماں کے لیے "اکملیت" ہے۔ وہ سوچتی تھی کہ اولاد مل جانے سے زندگی مکمل اس کی ہوجائے گی' اس کی مطیع ہوجائے گی... اور اسے اس مقام پر ابدی سکون حاصل ہوگا اور وہ "اکمل" ہوجائے گی۔ اس کے لیے اکملیت کے نہ جانے کیا معنی تھے' لیکن مجھے لگتا ہے ہر انسان اسی سوال کے تعاقب میں پورا جیون گزارتا ہے۔ نئی سے نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ اپنی خواہشات کے بے لگام گھوڑے پر بیٹھ کر سرپٹ دوڑتا چلا جاتا ہے۔ آرزو کو جنون پھر لگن اور پھر عشق بنالیتا ہے... اور پھر اسی کے گرد طواف کرتا رہتا ہے۔ درد سے بے چین ہوتا ہے تو مرہم بنالیتا ہے پھر تجسس اور تھرل اور مہم جو فطرت سے بے قابو ہوکر درد میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ ہم سب ایسا کرتے ہیں ہماری ابدی خواہش سکون ہے اور ہم اسے جنون میں تلاش کرتے کرتے لقمہ اجل بن جاتے ہیں' لیکن سمجھ نہیں پاتے کہ ہم چاہتے کیا تھے۔ ہمارا آخری سوال خود سے یہی ہوتا ہے کہ کیا ہم "یہی" چاہتے تھے جو ہم کرتے رہے اور پھر ہم میں سے بہت سے لوگ اس سوال کا جواب نفی میں ہی دیتے ہیں۔ یہ انسان کا ذاتی معاملہ نہیں ہے ۔ یہ کل انسانیت کا تجسس ہے کہ آخر اسے چاہیے کیا۔ میں نے یہ سیکھا کہ وہ "اکملیت" کا مارا ہوا ہے۔ اسے "اکملیت" چاہیے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے... کہ "اکملیت کیا ہے؟ میں اگر یہ کہوں گا کہ دین کی پیروی ہی اکملیت ہے تو آپ فوراً" مجھ پر ہنسیں گے اور مجھے طالبان سمجھنے لگیں گے... یہی آج کل کے ماڈرن انسان کا المیہ ہے۔ آج کل کے سائنٹفک دور کے ہم سب انسانوں کے لیے دین مذہب سب پرانی باتیں ہیں۔ ہمیں ان میں دقیانوسیت نظر آتی ہے۔ ہمیں وہ جواب چاہیے جو سائنسی بنیادوں پر پرکھا جانچا جاسکے۔ اکملیت روح اور جسم کا ایک نقطے پر آجانا ہے۔ بنیادی طور پر جسم مادہ کثیف ہے اور روح مادہ لطیف... یہ دونوں ایک نقطے پر آنہیں سکتے' لیکن کچھ عوامل ایسے ہوتے ہیں جو یہ ناممکن کام ممکن کر دکھاتے ہیں۔ وہ لمحہ جب انسان بے پناہ پرجوش ہوکر خوش ہوتا ہے تو اسے سکون حاصل ہوتا ہے' جو اسے ہلکا پھلکا کردیتا ہے۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بالکل ہلکا پھلکا ہوچکا ہے اور ہواؤں میں اڑ رہا ہے... وہ لمحہ جب آپ کسی چیز کو بہت لگن کے بعد حاصل کرلیتے ہیں بھوکے پیٹ کے لیے لقمہ حلال... انسان کی محبت میں مبتلا انسان کے لیے محبوب سے وصال کا لمحہ... کسی شوق کے جنون میں مبتلا انسان کے لیے انعام کی وصولی کا لمحہ... ہنر کی بے پناہ داد و تحسین کا لمحہ۔ دردزہ میں مبتلا ماں کے لیے بچے کی دنیا میں آمد۔ حالت نزع تڑپتے سسکتے وجود کے لیے موت کی نوید ... سب عوامل ہی ایسے ہیں جو اسے بے پناہ سکون دیتے ہیں... ڈرگز کیوں اتنی پاپولر ہوگئی ہے مغرب میں... نئی نسل خود کو نشے میں گم کرکے آخر کیا تلاش کرتی رہتی ہے۔ وہ "اکملیت" ہی تلاش کرتی ہے۔ وہ پرسکون ہونا چاہتی ہے... بے چینی سے چڑ ہونے لگی ہے اسے۔ یہ لوگ ڈرگز میں بھی تو پہلے تھرل' پھر بے چینی اور پھر سکون تلاش کرتے ہیں وہ اپنے ہوش وحواس کو نشے کے پاس رہن رکھ کے چند گھنٹوں کا سکون چاہتے ہیں۔ ابدی سکون... انہیں کسی نے سکھایا ہی نہیں کہ سکون حاصل کرنے کی چند اور چیزیں بھی ہیں ایسی چیزیں جن میں انسان اپنے حواس کھوئے بغیر بھی پرسکون ہوسکتا ہے اور تقوی بھی سکون دینے کی ہی چیز ہے یہ آپ کے جسم کو بھاری نہیں ہونے دیتا اسے روح کے ہم وزن رکھتا ہے... اسے آلائشوں سے بچا کر رکھتا ہے... یقین کیجیے آلائشیں نہیں ہوتیں تو آزمائشیں بھی نہیں ہوتیں۔" وہ یہ سب بتاتے ہوئے بھی کس قدر پرسکون لگ رہے تھے جبکہ عمر کے چہرے پر ہی نہیں ہر عضو پر لاچاری طاری

تھی۔

"آپ بہت مشکل باتیں کرتے ہیں سر!..... میں بہت عام سا انسان ہوں..... مجھے اتنی مشکل فلسفیانہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں میرے جیسے عام انسان کے لیے یہ سب بہت مشکل ہے۔ مادہ کثیف' مادہ لطیف' ان کا ایک مقام پر آنا۔" وہ اپنی کم عقلی کا اتنا کھلا اعتراف کرتے ہوئے ہچکچایا نہیں تھا۔ نور محمد مسکرائے تھے۔

"سادہ اور آسان ترین بات یہ ہے کہ دنیا کو اپنی حاجت سمجھیں رغبت نہیں..... دنیا صفر ہے اگر صرف خواہش ہے۔ اسے خواہش نہیں ضرورت سمجھیں۔ اسے جائے عمل سمجھیں۔ اسے ضرورت بنائیں..... اسے دین کی اکائی کے ساتھ ملائیں۔ اسے دس بنائیں۔"

نور محمد نے اسے سادہ ترین انداز میں اپنی بات سمجھانی شروع کی تھی۔



"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ شہروز استعمال کیا جا رہا ہے..... وہ اپنے باسز کی بہت تعریف کرتا ہے اور اس نے تو ہم سے ذکر بھی نہیں کیا کہ وہ کسی سعودی این جی او کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ عوف بن سلمان کا تو نام بھی کبھی نہیں سنا میں نے اس کے منہ سے..... کسی انٹرنیشنل چینل کے ساتھ کسی جوائنٹ وینچر کا ذکر بھی کبھی نہیں کیا اس نے..... میں نے تو اس کے منہ سے کبھی عہد الست کا لفظ تک نہیں سنا۔" زارا نے اس کی سب باتیں سن لینے کے بعد کہا تھا۔ وہ انکل آفاق' ان کے بیٹے نور محمد کے بارے میں سن کر افسردہ تو ہوئی تھی' لیکن اس کا تمام اضطراب اور پریشانی شہروز کے متعلق سن کر ظاہر ہوا تھا۔ سلمان کی باتوں نے اسے نا صرف حیران بلکہ پریشان بھی کر دیا تھا۔ وہ مشکوک نہیں تھی لیکن متذبذب ضرور تھی۔ سلمان حیدر پراسرار تھا' لاپروا تھا اور اپنے متعلق کبھی کھل کر بات نہیں کرتا تھا' لیکن وہ جھوٹا بھی نہیں تھا اور زارا کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔

"سیکریسی ان کی پہلی شرط ہوتی ہے۔ اس نے اگر اپنے گھر والوں سے بھی ذکر نہیں کیا تو یقیناً" یہ اس کی جاب کی شرائط میں سے ایک رہی ہو گی..... یعنی اس کے ایگریمنٹ کا حصہ رہی ہو گی لیکن یہ فیلڈ کے لوگوں کے لیے اتنی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں ہے۔ میرے کہے کو مستند سمجھو..... میرے پاس ان سب لوگوں کی لسٹ ہے جو اس پراجیکٹ میں شہروز کی معاونت کر رہے ہیں..... وہ عوف بن سلمان کے ساتھ کام کر رہا ہے یہ بات میرے علاوہ بھی کچھ لوگ جانتے ہیں۔ شہروز کے باس رضوان اکرم بھی ان میں سے ایک ہیں..... ان کا نام تو سنا ہی ہو گا تم نے؟"

وہ کہہ رہا تھا۔ زارا کچھ نہیں بولی۔ شہروز اپنی جاب کے متعلق بات کم ہی کرتا تھا۔ وہ صرف کامیابیوں کے متعلق بات کرتا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال سے تو وہ صرف ان باتوں پر دھیان دیتا تھا جن میں اس کی تعریف اور خود نمائی کا پہلو زیادہ نکلتا تھا۔ زارا نے سر ہلایا۔ رضوان اکرم کا نام اس نے سن رکھا تھا۔

"دراصل شہروز سے پہلے یہ پراجیکٹ مجھے آفر کیا گیا تھا..... میں پہلے سے ہی ایک ڈاکیومنٹری تیار کر رہا تھا جو "نور محمد" کے متعلق تھی' کچھ وجوہات کی بناء پر میں نے یہ پراجیکٹ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ رضوان اکرم مجھ سے بہت اصرار کرتے رہے ہیں کہ میں ان کے ساتھ مل کر کچھ نا کچھ ضرور کروں لیکن میرا دل جب کسی چیز سے اچاٹ ہو جاتا ہے تو پھر میں اسے نہیں کر پاتا..... میں نے اپنا پراجیکٹ بھی ادھورا چھوڑ دیا تھا اور رضوان صاحب یہ بات جانتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میری اس موضوع پر کافی ریسرچ ہے۔ وہ میری ڈاکیومنٹری کے کاپی رائٹس مجھ سے لینا چاہتے تھے۔ میرے انکار کے کچھ عرصہ بعد عوف بن سلمان نامی ایک شخص نے تین پاکستانی جرنلسٹس کو کافی خطیر رقم پر ہائر کیا تھا۔ شہروز ان تین لوگوں میں شامل ہے۔" وہ اسے اس کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے باوجود یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ کہ شہروز ٹریپ کیا جا رہا ہے۔۔۔ وہ اتنی محنت کرتا ہے اپنے کام کے لیے دن رات کا فرق بھی نہیں دیکھتا۔ اس کے اندر کچھ پوٹینشل تو ہو گا نا کہ جو اسے اتنے لوگوں میں منتخب کیا گیا ہے۔" وہ اب بے حد معتدل لہجے میں بات کر رہی تھی لیکن کنفیوژن ابھی بھی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔

"محنت کی بات مت کرو۔ محنت سب کر لیتے ہیں۔ شہروز کو اس بنیاد پر نہیں چنا گیا شہروز نے یہ سودا محنت یا روپے کی بنیاد پر نہیں کیا بلکہ اس کی خواہش "شہرت" ہے۔ اس کے خریدنے والوں نے یہ بات بھانپ لی تھی کہ وہ شہرت کی خاطر آنکھیں بند کر کے بہت دور تک جا سکتا ہے۔ اتنا دور کہ جہاں جھوٹ اور سچ کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے گھر والوں کو بھول سکتا ہے اپنی ترجیحات بدل سکتا ہے اور کسی کی اندھی پیروی بھی کر سکتا ہے۔ یہ بات تم بھی جانتی ہو کہ شہرت کے سامنے شہروز کو کوئی بھی نظر نہیں آتا۔۔۔ کوئی بھی نہیں۔"

اس نے آخری تین لفظوں پر زور دیتے ہوئے جملہ مکمل کیا تھا۔ زارا کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے سلمان کی کسی بات کی تردید نہیں کی تھی۔ یہ خدشات تو اس کو بھی ڈراتے تھے کہ شہروز کے لیے ہر چیز، شخص اور جذبہ "شہرت" کے بعد آتا تھا۔

"آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔۔۔ شہرت کی خواہش کوئی گناہ تو نہیں ہے تو پھر یہ سب شہروز کے ساتھ ہی کیوں۔" وہ عادت کے مطابق فوراً" ہی بے دلی کا شکار ہونے لگی تھی۔

"شہرت کی خواہش واقعی گناہ نہیں ہے۔ ہم سب کے اندر یہ خواہش موجود ہوتی ہے۔ لیکن اس خواہش کی خاطر اتنا آگے چلے جانا کہ آپ کے اعصاب ہی مفلوج ہو جائیں۔۔۔ اچھے برے کا فرق مٹ جائے گناہ ثواب کی تخصیص نہ رہے تو پھر یہ گناہ ہی ہے۔۔۔ میں تمہیں کنفیوز نہیں کرنا چاہتا، لیکن اتنا جان لو زارا بی بی! کہ یہ ایک گورکھ دھندا ہے۔ اس کو سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ میں نے بتایا نا کہ ایک برٹش نو مسلم ناولسٹ نور محمد ہیں جو ایک ناول "عہد الست" لکھ رہے ہیں جبکہ ایک فوٹو گرافر عوف بن سلمان ایک ڈاکومینٹری "عہد الست" پر کام کر رہا ہے۔ دونوں کا مقصد تقریباً" ایک ہی ہے۔ دونوں ہی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ دین اسلام ایک سچا مذہب ہے اور اسے دیا گیا دہشت گردی کا لیبل صرف بہتان ہے۔۔۔ لیکن دونوں کا طریقہ مختلف ہے۔ یہی میرا اور شہروز منور کا حال ہے۔ ہم کام ایک ہی کر رہے ہیں لیکن ہمارا طریقہ کار مختلف ہے۔"

"آپ دونوں میں غلط کون ہے؟" زارا نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی تھی۔ سلمان نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"اس کا فیصلہ تم کرو گی ڈاکٹر۔۔۔ ہر بات میں نہیں بتاؤں گا، لیکن ایک بات یاد رکھنا' اس بار دماغ سے فیصلہ کرنا قدرت بے وقوفوں کو بھی عقل مندی سے فیصلہ کرنے کا ایک موقع ضرور دیتی ہے' یہی موقع دنیا میں ان کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ یہی موقع وہ فصیل ہوتا ہے جو کامیابی اور ناکامی کے درمیان ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔"

زارا اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ اسے فیصلہ کرنا آتا ہی کب تھا۔



"زارا کچھ کہہ رہی تھی؟"

وہ سہ پہر کا نکلا دوبارہ مغرب کے وقت گھر آیا تھا۔ گرمیاں تھیں سو مغرب بھی سات بجے کے قریب ہوتی تھی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور ساتھ ہی بجلی جا چکی تھی۔ امی انورٹر پر چھوٹا سا بلب روشن کیے برآمدے میں بیٹھی ہاتھ میں تسبیح لیے نماز کے بعد والی تسبیحات پڑھ رہی تھیں۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا لیکن ان کا سوال بہت تاؤ دلانے والا تھا۔ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ کر ٹی شرٹ کی آدھی آستینوں کو مزید اونچا کرنے لگا۔ امی نے بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ بڑھا کر

پیڈسٹل فین کا رخ اس کی جانب موڑا تھا۔

"اس نے کھانا کھا لیا تھا اسے شامی کباب پسند آئے؟" امی اس کے تاثرات دیکھ بھی چکی تھیں پھر بھی مسلسل سوال کر رہی تھیں۔ اس نے اکتا کر انہیں دیکھا۔

"امی! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں آپ کا بیٹا نہیں آپ کی بہو ہوں۔ جسے آپ ہر وقت کھینچ کھینچ کر کے زچ کیے رکھتی ہیں" اس نے عادت کے مطابق ان کے گندم سوال کا چنا جواب دیا پھر اٹھ کر پنکھے کے سامنے اپنے لیے چارپائی بچھانے لگا۔ امی کچھ نہیں بولی تھیں بلکہ سکون سے تسبیح ختم کر کے انہوں نے اسے دروازے کے اوپر لگے کیل پر ٹانگ دیا پھر اس کے ساتھ اسی کی چارپائی کے قریب بیٹھنے آگئیں۔ اس نے ان کے لیے سمٹ کر جگہ بنائی تھی۔ وہ آسمان کو تک رہا تھا اور امی اس کو تکنے میں مگن تھیں۔ وہ کچھ الجھا الجھا سا نظر آتا تھا۔

"تم اتنی جلدی چڑنے کیوں لگے ہو۔۔۔ میں تو عادتاً" ہی سوال کر رہی تھی۔ کیا کروں کوئی بیٹی نہیں ہے تو جو بھی اچھے سے بات کرتا ہے اسی سے لگاؤ ہو جاتا ہے۔ تمہیں پتا تو ہے میں فطرتاً" محبت کرنے والی انسان ہوں۔" امی اسے مسکراتے ہوئے وضاحت دے رہی تھیں۔ سلمان نے انہیں چونک کر دیکھا۔ یہی وضاحت تو وہ بھی ابھی دے کر آیا تھا۔

"مت کیا کریں امی۔۔۔ محبت کے مطلب نہیں بدلے 'انداز بدل گئے ہیں محبت اب حاجت نہیں عادت ہو گئی ہے۔۔۔ لوگ فطرتاً" محبت کرنے والے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔"

"کوئی بات ہوئی ہے کیا؟ زارا نے کچھ کہا؟" امی کی سوئی ابھی بھی زارا پر ہی اٹکی تھی۔

"اس نے آپ کی اور میری باتیں سن لی تھیں جب کھانا کھاتے ہوئے آپ آمنہ کی باتیں کر رہی تھیں، وہ کافی برا مان گئی۔" امی نے اس کی بات کاٹی۔

"برا کیوں مان گئی۔۔۔ کیا وہ تمہیں ناپسند کرتی ہے؟"

"امی! وہاں سے کوئی چیز اٹھائیں اور میرے سر میں مار دیں۔" وہ انتہائی چڑ کر بولا تھا۔

"پھٹ جائے گا بیٹا جی۔" امی مسکرائی تھیں۔ وہ دونوں بعض اوقات ایسے باتیں کرتے تھے جیسے ہم عمر دوست ہوں۔

"پھٹ ہی رہا ہے امی جی۔۔۔ آپ کی انٹلکچوئل باتیں سن سن کر۔" وہ اسی انداز میں بولا۔

"اچھا' اب نہیں بولوں گی۔ آؤ میں دبا دیتی ہوں سر۔" وہ لاڈ سے بولی تھیں اور ایسے لاڈ کے مظاہرے بہت ہی کم آتے تھے اس کی زندگی میں۔ امی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھیں۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ پنکھے کی گھرر گھرر کے علاوہ دور کسی کے گھر میں جنریٹر چلنے کی آوازیں ماحول میں ارتعاش بکھیر رہی تھیں۔

"مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میری کس بات سے آپ کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ ڈاکٹر زارا در اصل آمنہ ہے۔ میں آپ کو کئی بار بتا چکا ہوں کہ زارا آمنہ نہیں ہے۔" اس نے تمہید باندھی تھی۔ امی اس کے بالوں کو سہلاتی رہی تھیں۔

"زارا انگیجڈ ہے امی۔۔۔ آپ کو پتا ہے اس کا منگیتر کون ہے 'شہروز منور۔" اس نے اپنی جانب سے انکشاف کیا تھا۔ امی کی انگلیاں لحہ بھر کو تھمی تھیں۔ انہیں نہیں یاد آیا تھا کہ وہ کس کا ذکر کر رہا ہے۔

"شہروز منور۔۔۔" انہوں نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"یہ سب آفاق صاحب کی بیٹی کے سسرالی رشتے دار ہیں امی۔" انکشاف اب مکمل ہوا تھا اور امی کے چہرے پر اصل حیرانی بھی اب ہی چمکی تھی۔

"شہروز منور وہی لڑکا ہے جسے رضوان صاحب نے میرے بعد اپروچ کیا تھا۔ میرا خیال ہے یہ بات میں نے آپ کو بتائی تھی۔" وہ انہیں یاد کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔ امی نے سر ہلا دیا۔

"شاید۔۔۔ پتا نہیں۔" وہ اتنا ہی کہہ سکیں۔ زارا اور اس کے منگیتر کا ذکر انہیں باور کرا گیا تھا کہ ان کا انداز غلط تھا۔ اب سلمان سے یہ پوچھنا بھی بے کار تھا کہ وہ

شہروز کو پہلے سے جانتا تھایا زارا بھی۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ ان کے بیٹے کی دلچسپی زارا میں تھی نہ شہروز میں 'بلکہ اس کی دلچسپی "عہد الست" میں تھی۔

"امی۔۔۔ میں آپ کو کچھ باتیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔۔۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

سلمان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب بہت دن ہو چلے تھے۔ امی سے بہت سی باتیں تھیں کرنے کے لیے۔۔۔ امی کو اس سارے معاملے کی تب سے خبر تھی 'جب وہ آفاق صاحب سے مل کر اور انہیں موصول ہونے والے پوسٹ کارڈز دیکھ کر آیا تھا۔ آفاق صاحب کے ساتھ اس کی شناسائی اس دن کے بعد سے دوستی میں بدل گئی تھی۔ وہ اکثر اوقات ان کو فون کرلیا کرتا تھا۔ صرف یہ جانچنے پرکھنے کو کہ آیا نور محمد کی جانب سے دوبارہ کوئی رابطہ کیا گیا یا نہیں۔۔۔ اگرچہ دوبارہ ایسے کوئی کارڈز وغیرہ نہیں ملے تھے۔۔۔ لیکن ایک تجسس اور ہمدردی اسے اس خاندان سے جوڑے رکھتا تھا۔ آفاق صاحب بھی اسے کافی اہمیت دینے لگے تھے اور خود بھی اسے فون کرتے رہتے تھے۔ ان ہی دنوں امی کو اس نے یہ سب باتیں بتائی تھیں۔ اس لیے وہ بھی آفاق صاحب کی فیملی کے متعلق کافی تفصیل سے جانتی تھیں۔ جب امائمہ کی شادی ہوئی تھی۔ تب بھی بطور خاص آفاق صاحب نے اس کو امی سمیت مدعو کیا تھا 'لیکن وہ تقریب میں جا نہیں پائی تھیں۔۔۔ مگر وہ جانتی تھیں کہ ان کا بیٹا پروفیسر آفاق صاحب کے ساتھ کافی گہرے مراسم رکھتا ہے۔ نور محمد 'امائمہ اور آفاق صاحب وہ سب کو ناموں سمیت جانتی تھیں 'لیکن ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ زارا جسے وہ "آمنہ" سمجھتی ہی نہیں تھیں 'بلکہ بریقین بھی تھیں کہ وہی ان کے بیٹے کی پسند ہے 'دراصل وہ بھی "عہد الست" کا حصہ تھی۔ انہیں اپنے بیٹے کی سرگرمیوں پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا، لیکن بحیثیت ماں وہ واقعی چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا اب شادی کرلے 'سو دل ہی دل میں انہیں اس بات پر دکھ تو ہوا کہ زارا بھی وہ لڑکی نہیں تھی جو مستقبل قریب میں ان کی بہو بن سکتی تھی 'لیکن ابھی وہ اس دکھ کا اظہار نہیں کرسکتی تھیں۔ ان کے بیٹے کو فی الوقت ماں ایک سامع کے روپ میں چاہیے تھی 'سو انہوں نے سلمان کی باتوں میں دلچسپی لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یا الٰہی میں واقعی تیری نعمتوں کو نہیں جھٹلا سکتا۔ تو مجھے وہاں وہاں سے نوازتا ہے 'جہاں میری سوچ بھی نہیں پہنچ سکتی۔"

نور محمد اپنے دل میں تشکر کا ایک طوفان ابلتا ہوا محسوس کررہے تھے۔ انہوں نے نماز عشاء سے فراغت کے بعد نوافل بھی ادا کرلیے تھے اور روٹین کی تسبیحات بھی پڑھ لی تھیں 'لیکن جی نہیں بھرا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ مصلے پر بیٹھے رہیں اور رب کا شکر ادا کرتے جائیں۔ بہت دن کے بعد وہ اتنے پرسکون ہوئے تھے کہ ان کے وجود سے ان کی خوشی کا ہر رنگ چھلک رہا تھا۔ وہ اب واقعی چاہتے تھے کہ ان کا آخری ناول اشاعت کے مرحلے سے گزر کر پبلک تک پہنچ جائے۔ ایک طویل عرصے بعد وہ اس ناول کی اشاعت کے لیے اتنے ہی پرجوش تھے جتنا کہ اپنے پہلے ناول کے لیے تھے۔

سلمان حیدر نے اپنا سارا کام مکمل کرکے انہیں ای میل کردی تھی۔ دوسری طرف نور محمد کے بہنوئی سے مل کر بھی وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ اچھا شخص تھا اور ان کی ہر ممکن مدد کر گیا تھا۔ ان لوگوں کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا تھا جو ان کی مدد کے لیے مخلص اور پرجوش تھے۔ سلمان حیدر کے بعد عمر نے بھی ان کے دائرے میں داخل ہوکر ان کی طاقت میں اضافہ کیا تھا۔ وہ معاملات جو کچھ سال پہلے بنتے بنتے بگڑ گئے تھے۔ بالآخر درست سمت میں چلنا شروع ہوگئے تھے۔ اسی لیے وہ کافی دن کے بعد کافی مسرور نظر آتے تھے۔

انہوں نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ان کے روم میٹس کی واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا 'لیکن یہ طے تھا کہ وہ سونے کی غرض سے رات کے کسی پہر

ہی سہی، مگر واپس آتے ضرور تھے۔ ان کا دل چاہا کہ وہ سب کے لیے اچھے سے کھانے کا اہتمام کریں۔ انہوں نے جاء نماز کو تہ کر کے اس کی جگہ پر رکھا' پھر سیڑھیاں اتر کر کچن میں آگئے۔ اب مارکیٹ جانے کا وقت نہیں تھا کہ وہ کچھ لا پاتے' سو فریج میں جو بھی انہیں میسر تھا' انہوں نے اسے کاؤنٹر پر نکال کر رکھنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ سبزیاں تھیں۔ سفید چنے کا ٹن موجود تھا۔ پنیر کے کیوبز تھے۔ سینڈوچ بریڈ بھی موجود تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا پکایا جائے۔ ان کے تینوں روم میٹ بلا کے خوش خوراک تھے اور چکن مٹن کے دلدادہ بھی۔

ان کے لیے صرف سبزیاں پکانا انہیں سزا دینے کے مترادف تھا۔ انہوں نے کچھ دیر سوچ بچار کے بعد کارڈلیس اٹھایا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ زین العابدین کو فون کر کے اس کی واپسی کا وقت پوچھ لیتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ آتے ہوئے ترکش قصاب سے حلال چکن لیتا آئے۔ وہ ابھی اس کا سیل نمبر ملا ہی رہے تھے کہ داخلی دروازے کا قفل کھلنے کی آواز آئی۔ انہوں نے گردن لمبی کر کے دروازے کی سمت دیکھا تھا۔

"لمبی عمر ہے آپ کی۔۔۔ میں آپ کو ہی فون کرنے والا تھا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ زین العابدین اندر آگیا تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے سینے پر ہاتھ رکھ کر انہیں سلام کیا تھا' پھر ہال میں پڑے کاؤچ پر گر گیا۔

"سن کر خوشی ہوئی کہ آپ مجھے یاد کر رہے تھے برادر۔۔۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔" وہ وہیں نیم دراز بولا تھا۔ نور محمد نے فون کو اس کی جگہ پر رکھ دیا تھا۔

"میں ڈنر تیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بہت دن ہوئے آپ لوگوں نے میرے ہاتھ کا کھانا نہیں کھایا۔۔۔ آپ کچھ مشورہ دیں' میں کیا بناؤں۔۔۔ میرے پاس یہ سبزیاں ہیں اور بینز۔۔۔ پنیر ہے اور کچھ بریڈ سلائسز بھی۔۔۔" وہ اپنے دھیان میں مگن بول رہے تھے۔ ان کے رویہ میں خوش گوار تبدیلی آئی تھی۔

"برادر! میں تو دو گھنٹے بعد کارڈف کے لیے نکل رہا ہوں۔ میرے باس نے مجھے اپنے وہاں کے آفس میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔۔۔ میں ڈنر نہیں کر پاؤں گا۔۔۔ وقت کم ہے اور کام زیادہ۔۔۔ سامان بھی سمیٹنا ہے۔" وہ تھکا ہوا لگتا تھا۔ نور محمد نے بغور اس کی جانب دیکھا۔

"کارڈف۔۔۔ ٹرانسفر۔۔۔ ایسے اچانک۔۔۔؟" وہ حیران ہوئے تھے۔

"اچانک نہیں ہے۔۔۔ کافی دن سے باس سے سیلری بڑھانے کی بات چل رہی تھی۔۔۔ وہ چاہتا ہے میں کارڈف چلا جاؤں تو وہ انکریمنٹ لگا دے گا۔۔۔ مجھے تو اسی سے غرض ہے۔۔۔ میں نے ہامی بھر لی۔" وہ اسی انداز میں بولا۔

"آپ نے بتایا ہی نہیں پہلے۔" نور محمد نے شکوہ نہیں کیا تھا' وہ فقط حیران تھے۔

"بتانے والی بات تھی ہی نہیں برادر۔۔۔ بس اب آپ کے وطن میں دل نہیں لگتا۔۔۔ میں جلد واپس چلا جاؤں گا۔۔۔ میرا رزق اتنا ہی تھا ادھر۔۔۔" اس نے گردن موڑ کر ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے بتایا تھا۔

"میں کافی بناتا ہوں۔۔۔ آپ اپنا سامان سمیٹ لیں۔" نور محمد نے اس ۔۔۔ کی بات پر کوئی تاثر ظاہر کیے بنا کہا تھا۔ وہ کافی میکر کی طرف مڑے تھے اور زین العابدین سیڑھیوں کی جانب چل دیا تھا۔ کافی بننے میں چند منٹ ہی لگے تھے۔ وہ مگ کے ہمراہ جب کمرے میں پہنچے تو زین اپنا بیگ تیار کر چکے تھے۔ انہیں اس سے اتنی پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ اگرچہ اس کا سامان چند کپڑوں کے جوڑوں پر ہی مشتمل تھا' لیکن ان کو سمیٹنے میں بھی اس نے جس تیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ نور محمد کے لیے باعث حیرت تھی۔

"میں آپ کو اپنی زندگی میں ہمیشہ ایک محسن کے طور پر یاد رکھوں گا۔۔۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔" وہ فارمل انداز میں جملے بول رہا تھا۔ نور محمد پہلی

بار مسکرائے۔

"میں امید کرتا ہوں کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہو۔" ان کی بات پر زین نے ان کو بغور دیکھا، مگر منہ سے کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ پہلے بھی ایک دوسرے کو کم ہی کریدتے تھے۔ ان دونوں نے خاموشی سے کافی ختم کی تھی۔ نور محمد اس کو خالی مگ میز پر رکھتا دیکھ کر اٹھے تھے، پھر انہوں نے اپنی پاکٹ سے کچھ نکالا تھا۔

"یہ میری طرف سے آپ کے لیے ایک ہدیہ ہے۔" انہوں نے زین کا ہاتھ پکڑ کر اسے کچھ تھمایا تھا۔ اس نے حیرانی سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ نور محمد نے اس کے ہاتھ پر ایک یو ایس بی ڈرائیور رکھ دی تھی۔

"یہ وہی چیز ہے جس نے آپ کو میرے جیسے خشک انسان کے ساتھ اتنا عرصہ باندھے رکھا، تعمور نصار۔" وہ سادہ سے انداز میں اس کا مکمل نام لے کر بولے تھے۔ زین نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا، اسے اپنی حیرانی چھپانے میں چند لمحے لگے تھے، لیکن بہرحال وہ بھی ایک کائیاں آدمی تھا۔ اس لیے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نور محمد بھی اس کے اصل کو پاسکیں گے۔ نور محمد نے دل ہی دل میں سلمان کا شکریہ ادا کیا۔ جس نے انہیں عوف بن سلمان کے ساتھ کام کرنے والے لوگوں کی ایک لسٹ بھیجی تھی، اس لسٹ میں ہی انہیں تعمور نصار کی تصویر اور نام وغیرہ دیکھنے کو ملے تھے۔ اسی لیے وہ زین العابدین کی حقیقت پہلے سے جانتے تھے۔

"آپ جانتے تھے مجھے... یعنی میں خود کو بلاوجہ ایک اچھا اداکار سمجھتا رہا۔" اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی تھی۔

"آپ ایک اچھے اداکار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے تعمور... آپ بس ابھی ناتجربہ کار ہیں... اس لیے آپ نے میرے سفید بالوں کا ذمہ دار دھوپ کو سمجھ لیا... حالانکہ میرا دعوا ہے یہ تجربے کی دین ہیں۔" نور محمد اسی کے انداز میں مسکرائے تھے۔

"بے شک... بے شک... میں مانتا ہوں آپ بے حد تجربہ کار ہیں۔" وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں تھا۔

"آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ آپ میرے گھر میں رہتے ہوئے میرے دوست عوف بن سلمان کے اتنے اہم پراجیکٹ پر کام کریں گے اور مجھے کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔" وہ مسلسل مسکراتے ہوئے بات کررہے تھے۔

"آپ اتنے باخبر رہے تو آپ نے مجھے روکا کیوں نہیں۔" تعمور کے لیے یہ سوال اہم تھا۔

"میں چاہتا تھا کہ آپ جو کام کرنے آئے ہیں... اسے پوری ایمان داری سے کھلی آنکھوں اور ہوش مندی کے ساتھ انجام دیں۔ ہمارے راستے بے شک الگ ہوں، لیکن ہمارا مقصد ایک ہی تھا۔ میں بھی یہاں کچھ عرصہ پہلے اپنے اندر اٹھنے والے سوالات کا جواب ڈھونڈنے آیا تھا اور آپ بھی یہ ہی کرنے آئے تھے... مجھے کسی نے نہیں روکا تھا تو میرا بھی یہ فرض بنتا تھا کہ میں آپ کی معاونت کروں... وہ تعمور کے سامنے بیٹھ کر اسے بتانے لگے تھے۔

"شکریہ... لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا سر... آپ اسلام کی اصل شکل سے بہت دور نکل گئے ہیں... آپ ریڈیکلائزڈ ہوگئے ہیں... میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کی نیت غلط ہے، لیکن مجھے کہنے دیجیے کہ آپ کا طریقہ درست نہیں ہے۔ آپ "دین" کو سمجھ نہیں پائے۔" تاسف اس کے ہر لفظ سے ٹپکتا نظر آیا۔

"تعمور! اس کا فیصلہ اتنی عجلت میں مت کیجیے۔ آپ نے میرے ناول کا نام سنا ہے... اسے پڑھا نہیں ہے... ایک دفعہ اسے پڑھ کر دیکھ لیجے... یہ ننھی سی ڈیوائس میرے تجربے کا نچوڑ ہے تعمور... یہ عہد الست ہے... آپ اگر واقعی میرے تجربے کے معترف ہیں تو آپ اس کے ایک ایک لفظ کا اعتراف بھی کریں گے۔ اس میں وہ سب مواد ہے جو میں اب تک اس موضوع پر جمع کرتا رہا ہوں... میں چاہتا ہوں آپ اسے اپنے ہمراہ لے جائیں اور فرصت سے اس کی جانچ کریں۔"

تعمور نے ان کی بات پر ہاتھ پر رکھی ڈیوائس دیکھی، پھر وہ مسکرایا۔ اس نے وہ ڈیوائس دوبارہ نور محمد کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

"یقین کیجیے سر!" میں آپ کی دل سے عزت کرتا ہوں، لیکن پروفیشنل معاملات میں نے ہمیشہ دماغ سے نپٹائے اور سلجھائے ہیں.... یہ آپ اپنے پاس رکھیں.... میں آپ کے پاس جس کام کے لیے آیا تھا.... وہ کام میں بخوبی کرچکا ہوں.... مجھے اس "عہد الست" کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے لیے آپ کے نظریات ریڈیکل تھے اور ریڈیکل ہی رہیں گے۔ ایسے نظریات دنیا کے لیے آؤٹ ڈیٹڈ ہوچکے ہیں.... دنیا انہیں وائرس سمجھتی ہے.... آپ بھی جیت کا خیال ترک کردیجیے۔

وہ اب بالکل مختلف انسان کے روپ میں ڈھل کر ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک ایسا انسان جو شاطر تھا، ذہین تھا، کائیاں تھا۔ اس کے جملے میں ذو معنی اشارہ تھا۔

"اس کا فیصلہ وقت کرے گا.... آپ میرے مقابل ہیں۔ میں اپنی جیت کا دعویٰ نہیں کرتا.... لیکن ایک بات یاد رکھیے گا، میں مرتے دم تک آپ کو بھی جیتنے نہیں دوں گا.... لیکن میں ابھی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا.... آپ سفر کے لیے نکل رہے ہیں۔ آپ کو پریشان کرکے میں بھی پریشان رہوں گا۔" نور محمد نے بھی واقعی بال دھوپ میں سفید نہیں کیے تھے۔ انہیں انسانوں کے ساتھ اپنے معاملات نپٹانے آتے تھے۔

"وقت فیصلہ کرچکا ہے سر.... آپ یہ بازی ہار چکے ہیں.... اب آپ کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔ آپ جس شخص کی خاطر اتنا تردد کررہے ہیں.... وہ دنیا کے لیے ہی نہیں، اس کے خاندان والوں کے لیے بھی قابل قبول نہیں رہا.... ایک دہشت گرد کی ضرورت کسی کو نہیں ہوتی.... ایسے شخص کو دنیا بعد میں دھتکارتی ہے۔ گھر والے پہلے دھتکار کر دروازے بند کرلیتے ہیں.... نور محمد کے لیے دروازے بند ہوچکے ہیں.... اس لیے آپ اب اس ناول کو ردی کے بھاؤ بیچ ڈالیے.... مجھے افسوس ہے آپ کی محنت ضائع ہونے پر۔"

اس کے لہجے میں اتنی استقامت تھی کہ نور محمد چپ رہ گئے تھے۔



"مجھے تم سے بات کرنی ہے عمر!"

شہروز نے تین روز بعد عمر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ماحول پر چھایا بدگمانی کا غبار کافی حد تک چھٹ چکا تھا۔ ان میں سے کسی کے درمیان بھی دوبارہ کوئی بحث نہیں ہوئی تھی۔ عمر بھی کافی پرسکون دکھتا تھا اور روٹین کے مطابق امائمہ اور وہ ڈنر کرنے چاچو کے گھر پر ہی آرہے تھے۔ چاچو نے بھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی اور چچی بھی امائمہ کے پہلے کی طرح لاڈ اٹھا رہی تھیں اور اس کا خیال رکھ رہی تھیں۔ شہروز کی واپسی کے دن قریب تھے۔ اسے ایک ہفتے کے لیے آئرلینڈ بھی جانا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عمر سے حتمی بات کرنا ضروری ہے۔ اس کی ضدی طبیعت سے بخوبی واقف تھا وہ اور اسے اندازہ تھا کہ عمر کی خاموشی طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے۔ وہ عمر کو ایک بچکانہ اور خطرناک قدم اٹھانے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہتا تھا۔

"کرلو بات.... اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔" عمر کو بھی جیسے اندازہ تھا کہ شہروز ایسے آسانی سے جان نہیں چھوڑے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ ڈنر کے بعد ممی اور ابو سٹنگ ہال میں بیٹھ کر عمر کی شادی کی مووی دیکھ رہے تھے۔ امائمہ بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی، جبکہ وہ دونوں بیڈ روم میں آگئے تھے۔

"پہلے وعدہ کرو.... جذباتی نہیں ہوگے۔" شہروز نے اس کے خوش گوار مزاج کو دیکھتے ہوئے پہلے ہی شرط عائد کی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیڈ کے قریب پڑے کاؤچ پر بیٹھ گیا تھا۔

"میں وعدہ نہیں کرسکتا۔ نہ جانے تم کیا بات کرنے والے ہو.... کس کے متعلق کرنے والے ہو۔" اس نے بھی اسی کے انداز میں جتا دیا تھا۔

"مجھے امائمہ کے بھائی کے متعلق بات کرنی ہے

عمر!" اس نے کہا۔

"واقعی۔۔۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ امائمہ کا کوئی بھائی ہے۔ اس بات کا یقین تو خود امائمہ صاحبہ کو بھی نہیں رہا اب۔۔۔" وہ عام سے انداز میں بات کر رہا تھا' لیکن یہ ایک بھاری بھرکم طنز تھا۔ شہروز نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ یہ ان دونوں کی عادت تھی جب ایک طنزیہ انداز اپناتا تھا تو دوسرا تحمل سے کام لیا کرتا تھا۔

"میں نور محمد کی بات کر رہا ہوں عمر!"

"اچھا تو یوں کہو نا کہ تم ایک پاکستانی دہشت گرد کی بات کرنا چاہتے ہو۔۔۔ کرلو بھائی۔۔۔ کرلو۔۔۔ اجازت ہے۔" یہ دوسرا بھاری بھرکم طنز تھا۔ شہروز نے بمشکل اپنی خفگی کو ظاہر ہونے سے روکا۔

"تم کچھ بھی کہو۔۔۔ کسی بھی انداز سے کہو عمر! لیکن یہ ہی حقیقت ہے کہ نور محمد ایک دہشت گرد ہے۔۔۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے قتل کیے ہوں گے یا وہ دھماکوں وغیرہ میں ملوث ہوگا' لیکن وہ ان عناصر کے ساتھ رہا ہے۔ جن کے مقاصد نہ صرف عالمی امن کے لیے خطرہ بلکہ اسلامی ممالک کے لیے بھی ناپسندیدہ ہیں۔۔۔ یہ لوگ ریڈیکلائزڈ سوچ رکھتے ہیں۔۔۔ ان کی فنڈ امینٹلسٹ (بنیاد پرست) سوچیں اسلامی اقدار کے منافی ہیں۔ یہ نا صرف اپنے اپنے ملک کی بدنامی کا باعث ہیں' بلکہ یہ اسلام کے اصولوں کے بھی خلاف چل رہے ہیں۔" شہروز نے اپنی بات کی کھل کر وضاحت کی تھی۔

"مجھے تمہارے منہ سے یہ الفاظ سن کر دکھ ہو رہا ہے شہروز۔۔۔ فنڈ امینٹلزم کسے کہتے ہو تم۔۔۔؟ یہ ریڈیکلائزڈ سوچ کیا ہے؟" وہ اسے تک رہا تھا۔ شہروز کو اس سے بحث برائے بحث نہیں کرنی تھی۔ اسے دل ہی دل میں عمر کے انداز سے چڑ ہوئی تھی۔

"یہ ہی مسلمانوں کی بلاوجہ کی تنگ نظری' چھوٹی چھوٹی باتوں میں مذہب کی بلاوجہ کی مداخلت۔۔۔ اور کیا؟" وہ ناک چڑھا کر بولا۔

"چھوٹی چھوٹی باتیں۔۔۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں لگتی ہیں تمہیں؟" عمر کو حیرانی ہوئی تھی۔

"تمہیں پتا ہے' یہاں عورت کا سر ڈھکنا بھی ریڈیکلائزیشن میں شامل ہو گیا ہے۔ آفس اوقات میں گرل فرینڈ کو بیس منٹ کی کال کرنے پر کوئی نہیں ٹوکتا' لیکن نماز پڑھنے کے لیے دس منٹ کا بریک نہیں دے سکتے اور کچھ علاقوں میں مسلمان روزہ نہیں رکھ سکتے' کیونکہ باقی آبادی کے لیے وہ ریڈیکلائزیشن ہو جاتی ہے۔ داڑھی فیشن کے طور پر رکھ لو تو کوئی بات نہیں۔۔۔ اسے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام دینا ریڈیکلائزیشن ہے۔ آپ ویجی ٹیرین ہیں تو آپ پورک کو ناپسندیدہ قرار دے سکتے ہیں' لیکن اگر آپ مسلمان ہیں تو آپ اسے "حرام" نہیں کہہ سکتے۔ آپ اور گینک چکن مانگ سکتے ہیں' لیکن اگر آپ یہ کہیں گے کہ آپ کو "حلال" چکن چاہیے تو آپ فنڈامینٹلسٹ' بنیاد پرست' ہیں۔ اس دنیا کے دہرے معیار ہیں یہ سب اور کچھ نہیں اور خدارا کوئی بھی نئی ٹرم جب مسلمان کے لیے استعمال کی جانے لگتی ہے تو اس کے بارے میں احتجاج نہیں بھی کر سکتے تو نہ کرو' لیکن اسے استعمال بھی تو مت کرو' حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ صرف یہاں نہیں ہو رہا' بلکہ پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔ وہاں' یہاں سے بھی زیادہ فنڈ امینٹلسٹ (بنیاد پرست) کی گردان ہو رہی ہے۔ لوگ ہر دوسرے مذہبی شخص کو ریڈیکل قرار دینے پر تل گئے ہیں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا تھا۔ شہروز نے گہری سانس بھری۔

"تم اتنے جذباتی کیوں ہو جاتے ہو۔۔۔ کبھی تو تحمل سے بات سن لیا کرو۔" شہروز نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ بالآخر اسے وہ عمر نظر آ گیا تھا جو کہیں کھو گیا تھا۔ وہی جذباتیت' وہی ضد' وہی اندھا جوش۔

"یہ دیکھو میرے ہاتھ۔۔۔ جوڑتا ہوں میں تم سب کے آگے۔۔۔ تم لوگ مل جل کر میرے ماتھے پر لکھوا دو کہ میں جذباتی ہوں۔ میں تو آج تک اس لفظ کا مطلب نہیں سمجھ پایا۔ اور یہ تو بالکل نہیں سمجھ پایا کہ مجھے یہ ٹائٹل دیا کیوں گیا ہے۔ میرا سچ بولنا جذباتیت

لگتا ہے تم لوگوں کو۔ میرا حق کا ساتھ دینا جذباتیت لگتا ہے یا پھر غلط کو غلط کہنے کو جذباتیت کہتے ہو آپ لوگ۔" وہ تپا ہوا بول رہا تھا۔ "دیکھا پھر ہو گئے جذباتی۔ بات تو سن لو میری۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دو۔" شہوز خلاف ضرورت اور توقع، کافی تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"عمر بات یہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اسلام کی اصل شکل ہم سب نے مل جل کر مسخ کر دی ہے۔ ہم نے دنیا کو یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم جنگجو ہیں۔ ہم تنگ نظر ہیں۔ ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں نہ باقی دنیا کو ترقی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم مسجدیں بنا بنا کر ہلکان ہوئے جا رہے ہیں۔ فرقہ بنانا، فرقہ مٹانا ہمارا قومی کھیل بن چکا ہے۔ ہم اپنے ملک کی پچپن فیصد آبادی کو اسلام کے نام پر محصور کر کے اپنی کامیابی اور ترقی کا راستہ روک رہے ہیں۔ ہم عورتوں کو تعلیم نہ دلوا کر مذہب کے نام پر بلیک میل ہو رہے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ہم باقی دنیا سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ ریڈیکلائزیشن چاٹ گئی ہے میرے ملک کو۔ ملائیت نے میرے ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ طالبانائزیشن نے گھس کر رکھ دیا ہے اسے۔ مذہب کھا گیا ہے میرے پاکستان کو۔" شہوز کے چہرے پر پاکستان کے لیے پریشانی چھلک رہی تھی، جسے دیکھ کر عمر کو مزید تاؤ چڑھا۔

"مذہب نے نہیں کھایا پاکستان کو۔ پاکستانیوں نے خود ہی کھا لیا ہے پاکستان کو۔ ہر ادارہ اس میں شامل ہے۔ ملا، سیاست دان، فوجی، بزنس مین۔ بیورو کریٹ۔ صرف مذہب کو الزام کیوں دیتے رہتے ہو تم لوگ۔ تم لوگوں نے خود مذہب کا ڈیم بنا کر اسے چوراہے میں رکھ دیا ہے۔ سب مل جل کر اسی میں مسالا شامل کرتے جا رہے ہیں۔ جس کا بس چلتا ہے وہ مذہب کی نئی شکل بنا کر خود کو اسلام کا پیروکار ثابت کرنے پر تل جاتا ہے۔ ایک شخص کہیں سے بھی اٹھ کر آتا ہے اور اگر مذہب کے نام پر سب لوگوں کو بلیک میل کرنے لگتا ہے۔ باقی سب بھیڑیں بنے اس کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ جو بتا رہے ہو کہہ رہے ہو، قرآن و حدیث میں کہاں درج ہے۔ اپنی اپنی آسانی کی خاطر سب نے مل جل کر ایک آسان ترین مذہب کو ایسی شکل دے دی ہے کہ باقی دنیا اسے "ریڈیکلائزیشن" کہنے لگی ہے اور اندھے، لولے لنگڑے لوگ بھی مان چکے ہیں کہ ہاں اسلام تنگ نظری کا دوسرا نام ہے۔ اب یہ مت کہنا کہ مذہب کھا گیا اس ملک کو۔ اندھی تقلید کھا گئی ہے اس ملک کو شہوز۔ یہ ہی سوچ تو بدلنی ہے۔ اندھی تقلید سے ہی تو نکالنا چاہتے ہیں ہم۔ یہی تو سمجھانا چاہتے ہیں قوم کو کہ اسلام کی چودہ سو سال پہلے کی رائج چیزوں کو اکیسویں صدی میں رائج کریں گے تو ترقی کی راہ پر کبھی گامزن نہیں ہو سکیں گے۔ اسلام وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھلنے کی ضرورت قرار دیتا ہے اور تنگ نظری سے نکلنا ہماری ضرورت ہے۔ ہمیں ملائیت سے نکلنے کی ضرورت ہے۔ اس ملک کو انویسٹمنٹ چاہیے، کاروبار چاہیے، آزادی چاہیے؟" وہ حتمی انداز میں بولا تھا۔

"یہ سب کچھ جو اس ملک کو چاہیے۔ کیا یہ سب اسلام کے دائرے سے نکل کر ملے گا؟" عمر نے سابقہ انداز میں سوال کیا تھا۔

"دائرے سے نکلنے کو کون کم بخت کہہ رہا ہے۔ میں بھی الحمدللہ مسلمان ہوں اور اسلام کے دائرے سے نکلنے کا تو مر کر بھی نہیں سوچ سکتا۔ "میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اسلام کو بدلنا ہو گا۔ پرانی دقیانوسیت سے جان چھڑوانی ہو گی۔ ریڈیکلائزیشن کا طوق گلے سے اتارنا ہو گا۔ اسلام کو ختم نہیں کرنا۔ اسے ٹھیک کرنا ہے۔" شہوز اس کے انداز سے زچ ہو کر بولا۔

"یہ عجیب بات ہے۔ سب مسلمان مل کر اسلام کو ٹھیک کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمان خود ٹھیک نہیں ہونا چاہتے۔" عمر نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بہت سادہ سے انداز میں کہا تھا۔ اسے شہوز کی آخری باتوں سے بہت دکھ پہنچا تھا۔ شہوز اس کے سوال پر لمحہ بھر کے لیے چپ رہ گیا تھا، پھر اس نے دوبارہ سے ہمت پکڑی تھی۔

"عمر! میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں صرف بتانا چاہتا ہوں کہ تم غلط ہو۔۔۔ تم نور محمد کا ساتھ دے کر غلطی کرو گے۔ وہ ایک دہشت گرد ہے۔۔۔ میرے پاس اس کے خلاف ثبوت ہیں۔ وہ واقعی گوانتاناموبے میں ہے۔ میں صرف ہوا میں تیر نہیں چلا رہا۔ میری کہی ایک ایک بات حقیقت پر مبنی ہے۔ میں بتانا تو نہیں چاہتا تھا' لیکن کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔ دراصل میں ایک این جی او کے ساتھ منسلک ہوں جو ایک ڈاکومنٹری پر کام کر رہی ہے۔ میں پرائیویٹلی ایک دوسرے خبر رساں ادارے کے ساتھ بھی کام کرتا ہوں۔ وہ بہت عرصے سے اس پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ اس ڈاکومنٹری کا بنیادی موضوع نور محمد اور اس جیسے لوگ ہیں جو دنیا کو ریڈیکلائزڈ کر رہے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کا نام بدنام کر رہے ہیں۔ ہماری ٹیم سب کام تقریباً" مکمل کر چکی ہے۔ ہم ایک بین الاقوامی چینل کے ذریعے بہت جلد اسے آن ایر کر دیں گے۔ حقیقت سب کے سامنے آجائے گی۔ میں چاہتا ہوں تم میرا ساتھ دو عمر! اس سفید فام بوڑھے کی باتوں میں مت آؤ۔" اپنی طرف سے اس نے انکشاف کیا تھا۔

"میں کسی ادارے کے ساتھ منسلک نہیں ہوں شہروز' لیکن میرا دل کہتا ہے وہ سفید فام بوڑھا سچ کہتا ہے۔ ان کے الفاظ و انداز میں اس قدر تاثر ہے کہ میں دنگ رہ گیا ہوں۔ اللہ ایسی تاثیر کسی نیک نیت کو ہی دیا کرتے ہیں۔ ان کی نیت نیک ہے۔ وہ دین کو ہم سے بہتر سمجھ چکے ہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہے۔ ان کے پاس بھی ثبوت ہیں۔ تم ڈاکومنٹری بنا رہے ہو' جبکہ وہ ناول لکھ رہے ہیں۔ تم ایک دفعہ دوبارہ ان سے ملو۔ تم میری بات سے اتفاق کرو گے شہروز۔"

وہ اسے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہروز کو دل ہی دل میں بہت افسوس ہوا۔

"تم غلط کر رہے ہو عمر۔۔۔ تم جسے فرشتہ سمجھ رہے ہو نا۔۔۔ وہ شخص بہروپیے سے بڑھ کر نہیں۔۔۔ یہ ناول جس کا وہ راگ الاپ رہے ہیں۔۔۔ یہ ناول انہوں نے یو پی ایل کی خطیر فنڈنگ سے لکھنا شروع کیا تھا۔ یو پی ایل

وہ تنظیم ہے جسے آج کی دنیا ای ڈی ایل کہتی ہے۔
تمہیں یہ باتیں جو آج پتا چل رہی ہیں نا۔۔۔ میں یہ باتیں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ مجھے تو یہ شک بھی ہے کہ وہ بندہ مسلمان ہوا ہی نہیں ہے۔ وہ تمہیں، مجھے اور ہم سب کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ ان کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔" اسے عمر پر غصہ آرہا تھا اور اب کی بار وہ اپنے لہجے کی خفگی کو چھپانا نہیں چاہتا تھا۔
"ان کے ارادے اچھے نہیں ہیں اور تمہاری نیت اچھی نہیں ہے۔" عمر نے چڑ کر اتنا ہی کہا تھا کہ شہروز نے اس کی بات کاٹ دی۔
"میری نیت اچھی نہیں ہے، میری۔۔۔ میں جو صرف ایک نیک مقصد کے لیے اس پروجیکٹ کے ساتھ اٹیچ ہوں۔۔۔ مجھے کیا فائدہ ہوگا اس سب سے۔۔۔ میں تو صرف دنیا کو اسلام کی ایک مثبت شکل کو دکھانا چاہتا ہوں۔۔۔ اسلام کا ایک روشن چہرہ دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔" وہ تڑپ کر بولا تھا۔
"مثبت شکل۔۔۔ روشن چہرہ۔۔؟" عمر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں۔
"تو کیا اسلام کی کوئی منفی شکل بھی ہے۔ کوئی تاریک رخ بھی ہے؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔
"تم دنیا کو دکھانے سے پہلے خود کو یقین دلاؤ شہروز کہ اسلام کا کوئی رخ ایسا نہیں ہے کہ جس کی وضاحت ہمیں دنیا کو دینی پڑے۔ کوئی منفی شکل نہ کوئی تاریک چہرہ۔ اگر کوئی چیز منفی ہے تو وہ ہم مسلمان ہیں۔" تم ہو 'میں ہوں' بدلنا ہی ہے تو آؤ خود کو بدل کر دیکھتے ہیں۔ عہد الست کو سمجھ کر دیکھتے ہیں۔" وہ اب التجائیہ انداز میں بولا تھا۔ شہروز نے اسے دیکھا، پھر تاسف سے سر ہلایا۔ وہ اسے نہیں سمجھا سکتا تھا۔ وہ اسے کیسے سمجھا سکتا تھا، جب وہ اسے ہی غلط قرار دے رہا تھا۔
"عمر اس میں کوئی درمیانی راستہ نہیں ہے۔۔۔ تم میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔۔۔ یا اکیلے رہ جاؤ، کیونکہ لائمہ اس کے والدین۔۔۔ چاچو۔۔۔ چچی کوئی تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ کوئی تمہاری طرح احمق نہیں ہے، پاگل پن مت کرو۔" شہروز اسی کے انداز میں بولا تھا۔
"یہ اگر پاگل پن ہے نا شہروز تو مجھے اس پاگل پن سے پیار ہے۔۔۔ میں نور محمد سے کمٹمنٹ کر چکا ہوں۔۔۔ میں ان کا ساتھ دوں گا۔ اب ساری دنیا بھی ایک طرف ہو جائے گی تو بھی میں ان کا ساتھ دوں گا۔۔۔ میں انہیں حق پر مان چکا ہوں۔" عمر نے اپنا عزم دہرایا تھا۔ شہروز اس کی جانب دیکھتا رہ گیا، پھر اس نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور سامنے لگے وال کلاک کی جانب دیکھنے لگا۔ اسے آج سے پہلے عمر پر کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔
"ٹھیک ہے۔۔۔ تمہاری مرضی۔۔۔ میں اب تمہیں نہیں روکوں گا۔۔۔ لیکن ایک بات حتمی ہے آج سے تمہارا راستہ الگ اور میرا راستہ الگ۔" اس نے بالآخر اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ عمر چند لمحے اس کے سپاٹ انداز پر غور کرتا رہا، پھر اس نے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ سجائی تھی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"منظور ہے۔" اس نے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا اسے دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ ان کی باہمی محبت ان کے انفرادی مقاصد میں تقسیم ہو گئی تھی۔ وہ جدا جدا ہو رہے تھے۔ تفرقہ پھیلنے لگا تھا یا شاید بہت پہلے پھیل چکا تھا۔



"نور محمد کا پتا چل گیا ہے۔" رافعہ بیگم نے اس سادہ سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے دو نفوس کو ان کی زندگی کی ایک بڑی خوش خبری دی تھی۔ مسز آفاق نے تڑپ کر ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ اپنے سامنے بیٹھی رافعہ نامی اس خاتون سے پہلی بار مل رہی تھیں۔
"آپ میرے بیٹے کو جانتی ہیں۔ آپ مل چکی ہیں اس سے" اندازے کے عین مطابق انہوں نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ سر آفاق بھی اب متجسس ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔
"میں اسے جانتی ہوں نہ اس سے ملی ہوں، لیکن گزشتہ چند سالوں سے سلمان اس کا اتنا ذکر کرتا رہا ہے کہ لگتا ہے میں آپ کے بیٹے کو بہت قریب سے جانتی

ہوں۔"

رافعہ حیدر نے ان کی تڑپ کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سلمان کے کہنے پر ان سے ملنے آئی تھیں۔ سلمان چاہتا تھا کہ اس سے پہلے سب معاملات ناول کے ذریعے پبلک تک پہنچیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ نور محمد کے گھر والے ان سب باتوں سے آگاہ ہوں۔ اسی لیے وہ یہاں موجود تھیں۔

"میرا بیٹا کہاں ہے؟" آفاق صاحب نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے دوسرا سوال کیا تھا۔ نور محمد کا ذکر انہیں ہمیشہ لاچار کردیا کرتا تھا۔ اتنے سال گزر چکے تھے اور اتنے سالوں میں ان کی امید روز مرتی تھی روز جیتی تھی۔ امائمہ کی شادی کے بعد سے تو وہ بیٹے کے غم سے مزید بے حال رہنے لگے تھے۔ دل کو پچھتاوے ہی ستاتے رہتے تھے کہ انہوں نے اولاد کی قدر نہیں کی۔ ان کے اندر اب یہ آس دم توڑنے لگی تھی کہ وہ کبھی اپنی پہلوٹھی کی اولاد سے مل پائیں گے۔ چند سال پہلے ملنے والے کارڈز کے علاوہ اس کی جانب سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔ وہ تو اس حد تک مشکوک رہتے تھے کہ یہ کارڈز بھی نجانے اس نے خود بھیجے تھے بھی یا نہیں۔

"سر! آپ پلیز حوصلے سے کام لیجیے گا... خبر کچھ اچھی نہیں ہے۔" یہ سلمان نے کہا تھا۔

"آپ حوصلے کی بات مت کیجیے بیٹا... پہاڑ جتنا حوصلہ ہے میرا... اعصاب ہچکولے کھا کھا کر اب اتنے پتھر دل ہو چکے ہیں کہ بڑی سے بڑی خبر سن بھی سکتے ہیں اور سہہ بھی سکتے ہیں۔" یہ مسز آفاق نے کہا تھا۔ ان کا چہرہ اس لمحے اتنا سپاٹ تھا کہ رافعہ حیدر کو ان پر ترس آیا۔ وہ حوصلہ مندی سے سفاک نہیں نظر آتی تھیں۔ انہیں تھکن نے اس حال تک پہنچایا تھا۔

"آپ ہمیں ایسے مت دیکھیں۔ ہم ٹھیک ہیں... کچھ نہیں ہو گا ہمیں... ہم اب اس حال کو پہنچ چکے ہیں کہ کوئی اس کے مرنے کی خبر بھی دے گا تو ہم یہ سوچ کر مطمئن ہو جائیں گے کہ وہ اللہ کے پاس ہے۔ اللہ اسے مجھ سے زیادہ لاڈ اور توقیر سے رکھ رہا ہو گا۔ اللہ کے یہاں تو اس کی قدر ہو رہی ہو گی نا!" سر آفاق نے کہا تھا۔

"بات اس سے بھی زیادہ بڑی ہے سر... وہ زندہ ہے لیکن..." سلمان نے کہا پھر رک کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"وہ گوانتاناموبے میں ہے سر۔" اس نے بطور خاص مسز آفاق کا چہرہ بھی دیکھا تھا۔

"کہاں... گوانتاناموبے لیکن کیوں، وہاں تو... وہاں تو... دہشت گرد رکھے جاتے ہیں۔ میرے معصوم بیٹے نے کیا بگاڑا ہے کسی کا۔" بات واقعی بیٹے کی مرگ سے بڑی تھی۔

"میں آپ کو تمام باتیں تفصیل سے بتاتا ہوں سر... یہ سازش بہت پہلے شروع ہوئی تھی جب نور محمد کے ماموں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اپلائی کیا تھا..."

سلمان نے کہنا شروع کیا تھا۔ وہاں سے جہاں سے یہ ساری سازش شروع ہوئی تھی۔ نور محمد کے چاہنے والے، اسے ستانے والے... وہ ہر شخص کا تذکرہ کرتا رہا... صوفی سیف اللہ، استقلال بیگ، بل گرانٹ... وہ دونوں میاں بیوی تمام تر سماعتیں اس کی جانب مبذول کیے ایک ایک لفظ کو بغور سن رہے تھے۔

"2007ء میں وہ پولیس کی جانب سے مقتول قرار دیا گیا تھا، میں یہ بات جانتا تھا لیکن میں نے جب آپ

کو بتانے کی ہمت کی تب ہی آپ نے مجھے وہ پوسٹ کارڈز دکھا دیے۔ جب آپ کو وہ پوسٹ کارڈز ملے تھے تب ہی میں حیران ہو گیا تھا کیونکہ میں نے خود اس فیونرل میں شرکت کی تھی جو نور محمد کے لیے پڑھایا گیا تھا۔ یہ ایک بے حد انوکھی بات تھی سر۔۔۔ آپ کو لوٹن سے کارڈز بھیجے گئے تھے پھر جب میں نے لوٹن کال کی اور نور محمد عرف بل گرانٹ سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ ان کو بھی کچھ کارڈز ملے ہیں جو پاکستان سے بھیجے گئے تھے۔ ابھی یہ ہی الجھن نہیں سلجھی تھی کہ میرے ایک مہربان میجر اظہر نے مجھے کچھ تصاویر دکھائیں۔ یہ تصاویر ایک ڈاکومنٹری کے اسکرین شوٹس تھے جس میں نور محمد کچھ قیدیوں کے ہمراہ زرد لباس پہنے نظر آ رہا تھا۔ ہم سب کو گمراہ کیا جا رہا تھا کہ ہم کنفیوز ہو جائیں۔"

وہ سب کچھ بتا چکا تھا لیکن، بہت کچھ ابھی بھی باقی تھا۔

"سر! سازش اتنی بڑی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم ہوئی۔۔۔ کون خیر خواہ ہے اور کون بد خواہ۔۔۔ آپ یقین کیجیے میں بہت سی چیزوں سے واقف ہوں، لیکن میرا خود کا دماغ گھوم جاتا ہے جب کیا، کب، کیسے، کہاں، کس طرح والے سب سوال اٹھتے ہیں۔۔۔ بہت سے لوگ ہیں جو ایسی سازشوں کا شکار ہوئے ہیں۔ نور محمد ان میں سے ایک ہے۔۔۔ بہر حال ایک بات طے ہے وہ المہاجرون کے نام پر بدنام کیا گیا جبکہ اس کا کوئی تعلق اس تنظیم کے ساتھ تھا ہی نہیں۔ اس کی بے گناہی کے ثبوت بھی موجود ہیں۔۔۔ وہ لوٹن کی ایک جامع مسجد میں بے ضرر زندگی گزارتا رہا ہے۔ اس کی گواہی خود بل گرانٹ صاحب دیں گے جو اس کے ساتھ رہے ہیں اور اس کی نیک خصلت کی تعریف کرتے ہیں اور ان کا ناول "عہد الست" نور محمد کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔۔۔ ہمارے پاس بہت سے حقائق ہیں۔ ثبوت ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ بہت حوصلہ مند ہیں اور یہ حوصلے کا ہی امتحان ہے۔ یہ اگر جنگ ہے تو سمجھیں اپنے آخری مراحل میں ہے سر۔ اس جنگ میں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں لیکن۔۔۔" اس نے ان دونوں کا چہرہ دیکھتے ہوئے توقف کیا۔ یہ اپنی جانب سے انہیں حوصلہ دینے کی ایک ادنیٰ سی کوشش تھی۔ وہ دونوں ساری گفتگو سننے کے دوران ایک بار بھی رنجیدہ نہیں ہوئے تھے۔

"اب آپ کو نور محمد کو قبول کرنے کی زیادہ بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔۔۔ لوگ بہت سوال کریں گے۔۔۔ انگلیاں پہلے سے زیادہ اٹھیں گی۔۔۔ بہتان پہلے سے زیادہ لگیں گے اور ہمت پہلے سے زیادہ درکار ہو گی۔۔۔ یہ آسان جنگ نہیں ہو گی" رافعہ حیدر نے سلمان کی نامکمل بات کو مکمل کیا تھا۔ سر آفاق نے اپنی اہلیہ کی سمت دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وہ حوصلہ جھلکنے لگا تھا جسے دیکھنے کی سلمان اور اس کی والدہ کو امید دی تھی۔ وہ کچھ بولنا بھی چاہتے تھے، لیکن ان کی اہلیہ ان سے بھی پہلے بول اٹھی تھیں۔

"میں نے جب اپنے بیٹے کو کھویا تھا اس دن سے میں صرف ایک بات کے لیے پچھتا رہی ہوں کہ میں نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس پر بھروسا نہیں کیا۔۔۔ اس کا خیال تو رکھا۔۔۔ اسے محبت تو دی، لیکن محبت کا مان نہیں دیا۔ ممتا کی طاقت نہیں بخشی، یہ میری سنگین غلطی ہے جو مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی۔۔۔ میں اب کوئی غلطی نہیں دہراؤں گی۔ اب ساری دنیا ایک طرف ہو کر بھی کہے نا کہ میرا بیٹا ایسا ہے ویسا ہے۔۔۔ میں نہیں مانوں گی۔۔۔ میں کبھی نہیں مانوں گی۔" رافعہ حیدر اپنی جگہ سے اٹھی تھیں اور انہوں نے مسز آفاق کو اپنے کندھے کے ساتھ لگایا تھا۔

"ہم بھی نہیں مانیں گے۔۔۔ ہم دہشت گرد نہیں ہیں نہ ہی ہمارے بیٹے اتنے سستے ہیں کہ دہشت گردی کے نام پر قربان ہوتے چلے جائیں۔" سلمان نے اپنی امی کو دیکھا۔ وہ مسکرایا تھا۔ وہ بھی مسکرا رہی تھیں۔ ہاتھ سے ہاتھ مل رہا تھا۔ قدم سے قدم مل رہا تھا۔۔۔ منزل دور تھی لیکن راستہ نظر آنے لگا تھا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

غنچۂ دید کھلے، عید کے روز
کون فرقت کو سہے عید کے روز

وہ جو روٹھا ہوا ہے مدّت سے
کاش وہ آن ملے عید کے روز

جھوٹی مسکان کے پسِ پردہ
اشک چپ چاپ بہے عید کے روز

میں نے کچھ خواب سے بُن رکھے ہیں
وہ ملاقات کرے عید کے روز

پا بہ زنجیر دو دھڑکتے دل
کتنے بے حال رہے عید کے روز

منّتِ شوق، رائیگاں ہی گئی
جلنے والے نہ رُکے عید کے روز

خالد معین

گزارش،

لفظوں سے مت کھیلو جاناں
جاناں!
لفظوں سے مت کھیلو
لفظ ہیں گونگے، لفظ ہیں بہرے
اندر پیتل، رنگ سنہرے
لفظ تو پھر الفاظ ہی ٹھہرے
لاکھوں ہی اوراق پہ ہر دن
کتنے لفظ لکھے جاتے ہیں
لیکن کس کے کام آتے ہیں
ویسے تمہارے اپنے قلم سے
لکھے ہوئے الفاظ حسین ہیں
لیکن سچے درد کے رشتے
لفظوں کے محتاج نہیں ہیں!

اعتبار ساجد

ہر اک دریچہ کرن کرن ہے، جہاں سے گزرے، جدھر گئے ہیں
ہم اک دیا آرزو کا لے کر بطرزِ شمس و قمر گئے ہیں

جو میری پلکوں سے تم نہ پلٹے وہ شبنمیں مہرباں اُجالے
تمہاری آنکھوں میں آ گئے تو تمام رستے نکھر گئے ہیں

وہ دُور کب تھا حریمِ جاں سے کہ لفظ و معانی کے ناز اُٹھاتی
جو حرف ہونٹوں پہ آ نہ پائے، وہ بن کے خوشبو بکھر گئے ہیں

جو دردِ عیسیٰ نفس نہ ہوتا، تو دل پہ کیا اعتبار آتا
کچھ اور پیماں، کچھ اور پیکاں کہ زخم جتنے تھے بھر گئے ہیں

خزینے جاں کے لُٹانے والے، دلوں میں بسنے کی آس لے کر
سُنا ہے کچھ لوگ ایسے گزرے جو گھر سے آئے نہ گھر گئے ہیں

جب اک نگہ سے خراش آئی، زمانے بھر سے گلہ ہوا ہے
جو دل دُکھا ہے تو رنج سارے نجانے کس کس کے سر گئے ہیں

شکستِ دل تک نہ بات پہنچی مگر ادا کہہ سکو تو کہنا
کہ اب کے ساون دھنک سے آنچل کے رنگ سارے اُتر گئے ہیں

ادا جعفری

دلِ آباد کا برباد ہونا بھی ضروری ہے
جسے پانا ضروری ہے، اسے کھونا ضروری ہے

مکمل کس طرح ہوگا تماشا برق و باراں کا
ترا ہنسنا ضروری ہے، مرا رونا ضروری ہے

بہت سی سُرخ آنکھیں شہر میں اچھی نہیں لگتیں
ترے جاگے ہوؤں کا دیر تک سونا ضروری ہے

کسی کی یاد سے اس عمر میں دل کی ملاقاتیں
ٹھٹھرتی شام میں ایک دُھوپ کا کونا ضروری ہے

یہ خود سر وقت لے جائے کہانی کو کہاں جانے
مصنف کا کسی کردار میں ہونا ضروری ہے

جناب دل بہت نازاں نہ ہوں داغِ محبت پر
یہ دُنیا ہے یہاں یہ داغ بھی دھونا ضروری ہے

شعیب بن عزیز

شگفتہ جاہ



شب قدر کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس شخص نے ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے شب قدر میں قیام کیا (اللہ کی عبادت کی) اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔
(بخاری و مسلم)

فائدہ:۔
قیام کا مطلب ہے اس رات کو اپنی طاقت کے مطابق جاگ کر اللہ کی عبادت کی، نوافل پڑھے، توبہ و استغفار اور دعاو مناجات کی۔ بالخصوص عشاء اور فجر کی نماز باجماعت ادا کی تو امید ہے کہ اس سے انسان کو اس کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

مشہور ادیب ابن مقفع کا قرآنی بلاغت کے سامنے اپنے عجز کا اظہار

ابن مقفع اپنے وقت کا ایک بلند پایہ ادیب گزرا ہے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ قرآن بے شک فصاحت و بلاغت کی انتہا پر ہے لیکن میں اسی طرز کا کلام لکھ سکتا ہوں۔ اس نے اپنی کافی عمر اسی خیال خام میں ضائع کی اور اپنے خیال میں کچھ اس طرح لکھا بھی۔

ایک روز اسے ایک مکتب کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک لڑکا سورہ ہود کی یہ آیت پڑھ رہا تھا۔

ترجمہ: "اور حکم آیا اے زمین نگل جا اپنا پانی اور اے آسمان تھم جا اور سکھا دیا گیا پانی اور ہو چکا کام اور کشتی ٹھہری جودی پہاڑ پر اور حکم ہوا دور ہو قوم ظالم۔"
(سورہ ہود۔ آیت نمبر ۴۴)

ابن مقفع سنتے ہی حیرت زدہ اور مدہوش ہو گیا۔ اور گھر آ کر اپنے سب لکھے ہوئے کو مٹا دیا۔ اور قسم کھا کر کہا کہ اس کلام کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔

علامہ سلیمان الجمل متوفی ۱۲۰۴ھ فرماتے ہیں۔
"یہ آیت کریمہ قرآن پاک کی انتہائی بلیغ آیت ہے۔

کیونکہ یہ فن بدیع کی — 21 اقسام پر مشتمل ہے جبکہ اس آیت کے کل کلمات صرف (۱۹) ہیں۔

کچھ باتیں

- سڑک چاہے کانچ کی کیوں نہ ہو، پیدل چلنے والوں کو تھکا دیتی ہے۔
- جو راستوں کے عشق میں گرفتار ہو جاتے ہیں، منزلیں ان سے دور ہو جاتی ہیں۔
- اگر آپ سب کچھ کھو چکے ہیں تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو سب کچھ کھو دیتا ہے اس کے پاس پانے کے لیے پوری دنیا ہے۔
- خون کے رشتے چاہے کتنے ہی اذیت ناک کیوں نہ ہوں، تا دمِ آخر ہمارے احساسات کے ساتھ جڑے رہتے ہیں۔
- دریا پہاڑوں میں سے سمٹ کر گزرتا ہے اور میدانوں میں سے پھیل کر گزرتا ہے۔ اپنے حالات کے مطابق سفر کرنا چاہیے۔ انسان حالات سے باہر ہو جائے تو بکھر کر رہ جاتا ہے۔
- ٹھیک وہ نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں، بلکہ ٹھیک وہ ہوتا ہے جو رب نے ہمارے لیے لکھ رکھا ہے۔ اگر ہم چند جملوں پر مشتمل اس کلیے کو سمجھ لیں تو زندگی آسان ہو جائے۔

شفق شان شاہ۔ گوجرہ

میری ماں

کس نے بیٹھ کر میرے ننھے سر کی حفاظت کی۔ جب میں اپنے پنگھوڑے میں سو رہی ہوتی تھی۔

اور میرے اوپر پیار بھرے آنسو بہانے والی ہستی کون تھی۔ وہ (یقیناً) میری ماں تھی۔

کون مجھے عمدہ اور خوش رنگ کپڑے پہناتی تھی اور مجھے شوق سے کھیلنا سکھاتی تھی اور جو کچھ بھی میں نے کہنا ہوتا تھا وہ اس پر بھرپور توجہ دیتی تھی۔ وہ یقیناً میری ماں (تھی)۔

کون بھاگ کر میری مدد کو دوڑتی تھی۔ جب میں گر پڑتی تھی اور پھر مجھے خوبصورت کہانی سناتی تھی یا

مجھے تندرست کرنے کے لیے میری پیشانی چومتی تھی۔ وہ (یقیناً) میری ماں (تھی)

کیا میں کبھی بھی آپ سے شفیق اور مہربان ہونے سے رک سکتی ہوں۔ کیونکہ آپ بھی تو میرے ساتھ بہت زیادہ شفیق رہی ہیں۔ میری ماں۔

جب آپ کمزور، بوڑھی اور سفید بالوں والی ہو جاؤ گی تو میرے صحت مند بازو آپ کا سہارا بنیں گے۔ میں آپ کے دکھ درد کو آرام پہنچاؤں گی میری ماں۔

شاعرہ این ٹیلر   لاریب، ماہ زیب، چونیاں

رقاصہ

1940ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری ایک ریاست کے درباری شاعر تھے۔ والیٔ ریاست نے عین اس وقت جب اس کی منظور نظر رقاصہ محو رقص تھی۔ حفیظ جالندھری کو رقاصہ کی شان میں نظم کہنے کے لیے کہا۔ حفیظ صاحب نے ترنم سے یہ اشعار پڑھے۔

ہاں ناچتی جا، گائے جا، نظروں سے دل برمائے جا
تڑپائے جا تڑپائے جا او شمع عریاں نازنیں
تیرا تبسم کتنا خوب ہے، تیری ادائیں دل نشیں
لیکن ٹھہر تو کون ہے او دشمن دنیا و دیں
کیا مشرقی عورت ہے تو، ہرگز نہیں ہرگز نہیں
تیری نظر چالاک ہے تیری نظر بے باک ہے
شرم اور عزت والیاں، ہوتی ہیں عفت والیاں
کس قوم کی بیٹی ہے تو، تقدیر کی ہیٹی ہے تو

رقص ختم ہو گیا، رقاصہ سر جھکائے نواب کے قدموں میں جا بیٹھی۔ حفیظ صاحب کے زور کلام کا اعجاز، محفل رقص و سرود درہم برہم ہو گئی۔

ہری مرچیں

- آپ کے بچے کتنا آگے جا سکتے ہیں، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ نے گاڑی میں کتنا پٹرول چھوڑا ہے۔
- آج کا کام کل پر چھوڑ دیجیے۔ ہو سکتا ہے کہ کل اس کام کو کرنے کے لیے مشین ایجاد ہو جائے۔
- ڈاکٹر نے خوبصورت مریضہ سے کہا۔ "آپ کی خوراک ٹھیک نہیں ہے لہٰذا آج رات کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں۔"
- بلاشبہ محبت اندھی ہوتی ہے لیکن وہ ہیرے اور معمولی نگینے کی انگوٹھی میں فرق محسوس کر سکتی ہے۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

جھوٹا

کوچوان گھوڑا تانگہ گلی میں چھوڑ کر سواری کا ٹرنک رکھنے اندر گیا تو قریب سے گزرتے ہوئے ایک آدمی کو دیکھ کر گھوڑے نے کہا۔

"السلام علیکم"

آدمی پہلے تو ٹھٹکا پھر گردن موڑ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ گھوڑے نے گردن اٹھا کر قدرے بلند آواز میں کہا۔

"میں نے کہا۔ السلام علیکم"

آدمی اسی طرح ڈرا ڈرا سہما سہما واپس لوٹا اور گھوڑے کے پاس آ کر بولا۔

"کیا تم نے السلام علیکم کہا تھا؟"

"کیوں نہیں"۔ گھوڑے نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ تو تم مجھے اب اس پھٹیچر تانگے میں جتا ہوا دیکھ رہے ہو ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں پچھلے سال

سیزن کی ریس میں اول رہا تھا۔"

گھوڑے نے ابھی یہ جملہ پورا ہی کیا تھا کہ اندر سے اس کا مالک برآمد ہوا۔ ایک غیر آدمی کو یوں اپنے تانگے کے پاس رکے دیکھ کر بولا۔

"اس گدھے نے آپ کو روکا ہوگا؟"

"بے شک۔" آدمی نے اقرار کیا۔

"اور اس لیاڑیے نے یہ بھی کہا ہوگا میں پچھلے سال سیزن کی ریس میں اول رہا تھا۔"

"جی ہاں! کہہ تو رہا تھا۔"

"جھوٹا ہے سالا۔" کوچوان نے چابک جھٹک کر کہا "دوم رہا تھا۔"

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

ڈپریشن،

ڈپریشن حاصل اور خواہش کے درمیان فاصلے کا نام ہے۔ ڈپریشن انسان کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ چاہتا کچھ اور ہے اور اسے ملتا کچھ اور ہے۔ اور جو کچھ اسے ملتا ہے۔ اس کو وہ پسند نہیں کرتا۔ ایثار کی تمنا ہو جائے تو ڈپریشن ختم ہو جائے گا۔

(واصف علی واصف)

نوال افضل گھمن۔ لاہور

دل آزاری،

ہر وہ کامیابی انسان کی ہار ہے۔ جس کا مقصد کسی کو نیچا دکھانا ہو۔ دنیا میں ہر چیز کی قضا ہے سوائے دل آزاری کے۔"

طیبہ، سعدیہ، عطاریہ۔ کھٹیالہ سیالکوٹ

دعا،

اپنے حصے کا کام کیے بنا دعا پہ بھروسا کرنا حماقت ہے۔ اور اپنی محنت پہ بھروسا کرکے دعا سے گریز کرنا تکبر ہے۔

(شیخ سعدیؒ)

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

اللہ تعالیٰ کی شان،

- سیب دل کی حفاظت کرتا ہے اور خون کو جمنے نہیں دیتا۔
- امرود پیٹ کو صاف کرتا ہے۔
- کیلا ہڈیاں مضبوط کرتا ہے اور بلڈ پریشر کنٹرول کرتا ہے۔
- گاجر آنکھوں کی بینائی بہتر کرتی ہے اور کینسر نہیں ہونے دیتی۔
- لیموں بلڈ پریشر کنٹرول کرتا ہے اور چہرے کو صاف رکھتا ہے۔
- آم یادداشت کو اچھا کرتا ہے۔
- انگور گردے کی پتھری نہیں ہونے دیتا۔
- مالٹا جسم میں بیماری کے خلاف دفاعی نظام کو بہتر کرتا ہے۔
- آڑو کینسر نہیں ہونے دیتا۔ ہارٹ اٹیک کو روکتا ہے اور ہاضمے کو بہتر کرتا ہے۔

تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

آسیہ فرید۔ ملتان

دعائے مغفرت

فریدہ اشفاق احمد کے بہنوئی حافظ محمد اقبال قضائے الٰہی سے اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہم فریدہ اشفاق اور ان کی بہن کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں۔ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

خالدہ جیلانی



شعبان فاطمہ ــــــــ نامعلوم شہر

ہمیشہ کے لیے چہرے نقابوں میں نہیں رہتے
سبھی کردار کھلتے ہیں کہانی ختم ہونے پر

رقیہ اقبال ــــــــ پتوکی

کیسے نہ رہے چاند گریزاں میرے گھر سے
زنجیر فاصلوں کی ابھی در پر پڑی ہے

نسیم حیدر ــــــــ گوجرانوالہ

جب بھی اس کی صورت دیکھی
میں نے ہاتھ پہ رکھا چاند
جانے کس کو ڈھونڈ رہا ہے
اک مدت سے تنہا چاند

صدف رفیق ــــــــ جہلم

دیکھ کر ہلال عید کو جو مسکراتے تھے
اب وہ چاند چہرے ڈھونڈے سے نہیں ملتے

رابعہ اختر ــــــــ میاں چنوں

اب کے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں
مل کے اک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں
خزاں کی اجاڑ شامیں نہ آئیں اگلے سال
اس بہار رت کو زنجیر کرتے ہیں

غزل معراج ــــــــ کھاریاں

لگا ہوں میں شوخی لبوں پہ تبسم
وہ چوڑی کھنکتی تو جب عید ہوتی

صائمہ کنول ــــــــ خانقاہ شریف

مجھ کو اک خواب پریشاں سا لگا عید کا چاند
میری نظروں میں ذرا بھی نہ جچا عید کا چاند
آنکھ نم کر گیا بچھڑے ہوئے لوگوں کا خیال
درد دل دے کے ہمیں ڈوب گیا عید کا چاند

کوثر جمال ــــــــ کھروڑ پکا

وہ آئے نہ آئے یہ اس کی رضا ٹھہری
جشن عید ہے ارم گھر کو سجا کر دیکھیں

اقصیٰ خان ــــــــ سکرنڈ

میں بھی ہوں اگر خاموش آج ہنسا تو بھی نہیں
مجھ سے بچھڑ کے کسی سے ملا تو بھی نہیں

واجدہ خانم ــــــــ فورٹ عباس

کوئی حرف وفا نہ حرف سادہ
میں خاموشی کو سننا چاہتی ہوں
میں بچپن کے کسی لمحے میں رک کر
کوئی جگنو پکڑنا چاہتی ہوں

حنا راجپوت ــــــــ چاکیواڑہ

جن کی صداقتوں پہ کوئی شک نہ کر سکے
تم بھی کتاب دل کی انہی آیتوں میں ہو

انعم مرزا ــــــــ سانگھڑ

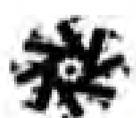
شام تک اس لیے دروازہ کھلا رکھیں گے
شاید تم کہنے آ جاؤ عید مبارک

ثمرہ احمد بٹ ــــــــ پتوکی

چند دن تو اگر میرے ساتھ رہے
کس قدر حسیں پھر سفر حیات رہے
جہاں چاہے تو چلا جا اے ہمسفر
کوئی منتظر ہے اتنا مگر یاد رہے

گل پری مرزا ــــــــ لاہور

قاصد پیام شوق کو اتنا نہ کر طویل
کہنا فقط یہ ان سے آنکھیں ترس گئیں





نادرہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

مسرت الطاف احمد..... لیاری کراچی

جون کا شمارہ قابل تعریف تھا' ٹائٹل کچھ خاص دل کو نہیں بھایا۔ "آب حیات" کی یہ قسط دل کو چھوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ غلام فرید کی بے بس حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا "بن مانگی دعا" کی یہ قسط کافی ڈرامائی لگی۔ ثانیہ پر بہت زیادہ غصہ آیا۔ اتنی ہٹ دھرمی شادی کے بعد بھی اور یہ ٹسوے بہانے کا کیا فائدہ "عہد الست" کی یہ پوری قسط نور محمد کے اردگرد ہی محسوس ہوئی لیکن پھر بھی یہ الجھنیں سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہیں زارا کا ٹیپو کے ساتھ ہی جوڑ بنے گا۔ شہروز نے زارا کو اپنی لاتعلقی سے تکلیف ہی دی ہے۔ "سیکھا ہے جینا" نبیلہ ابر راجہ کا نام دیکھ کر ہی دل خوشی سے جھوم اٹھا نبیلہ جی کی تحریر کافی عرصہ بعد پڑھنے کو ملی۔ ناول بہت ہی زبردست تھا۔ "حنا کے رنگ" ہنستی مسکراتی رشتوں سے جڑی سوفٹ سی اسٹوری مزہ دے گئی۔ ہر کردار قابل تعریف تھا۔ طرز تحریر بہت زبردست تھا ابا کے کردار نے بھی سوچنے پر تو بھی مسکرانے پر مجبور کردیا۔ "نمل" زمر کی فارس کے ساتھ لاتعلقی اب ختم بھی کردیں۔

اوں ہوں .... میں تو بھول ہی گئی میری طرف سے خواتین ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کو رمضان کی نعمتیں اور رحمتیں مبارک ہوں۔

ج : پیاری مسرت! ایمرجنسی لائٹ کی روشنی میں آپ نے ہمیں خط لکھا' اس محبت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں' تفصیلی تبصرہ۔ بہت اچھا اور جامع ہے لیکن یہ ہماری مجبوری ہے کہ ہم پورا تبصرہ شائع نہیں کرسکتے۔ ہم بہنوں کے تبصرے قطع و برید کرکے شائع کرتے ہیں اس کے باوجود بہت سارے خطوط شامل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔

ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا' اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچارہے ہیں۔

سہانہ میر..... جعفر روڈ اٹک

جیسے ہی رسالہ ملا سب سے پہلے بن مانگی دعا پڑھا (مگر یہ کیا) کچھ مزا ہی نہیں آیا پڑھ کر۔ پلیز معیز اور ابیہا کو جلد ملادیں اور ثانیہ تو بہت بے وقوف ہے۔ بہت برا کررہی ہے۔ عون کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی اور یہ رباب کو توسیفی کے حوالے کرنا چاہیے۔ مجھے تو اس کے قابل لگتی ہے ابیہا اور معیز مجھے پسند ہیں لیکن اس بار کچھ خاص نہیں لگے۔ نمل تو بہت بہت زبردست ہے جی بہت ہی خوب۔ قرآن پاک کی تشریح پڑھتے ہوئے تو بہت مزہ آتا ہے اور سعدی کے ساتھ بہت برا ہوا۔ پڑھ کے بہت روئی۔ رنگا رنگ پھول' کہنی سنی بہت پسند آئے میرا باخبر' ہاں سیکھا ہے میں نے جینا' کملی دا ڈھولا پڑھ کے بہت مزہ آیا۔ میں سوچتی ہوں سب رائٹرز کس طرح اتنے خوب صورت اور طویل ناول لکھ لیتی ہیں لفظ لفظ موتی ہوتے ہیں۔

اور پلیز مجھے ان ڈشوں کی ترکیب بتادیں (ہنسنا نہیں ہے) دال ماش' سفید چنے' پالک گوشت' یہ 'نہاری اور کشمیری یخنی جس کو دودھ والی یخنی یا سفید یخنی کہتے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوگی اور پلیز عمران عباس آر جے رضوان علی احمد کا انٹرویو لے لیں۔

ج : پیاری سمانہ! آپ کی فرمائشیں نوٹ کرلی ہیں جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ رضوان احمد کون سے ایف ایم پر آتے ہیں۔
کہانیاں لکھنے کا شوق ہے تو ضرور لکھیں۔ تخلیقی صلاحیت قدرتی ہوتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہوتی ہے جسے اللہ عطا کرے۔
اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیابی عطا فرمائے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

عائشہ رباب..... نامعلوم شہر

حسب عادت حسب معمول کہنی سنی سے پڑھنا شروع کیا "کرن کرن روشنی" پھر چلتے چلتے "آب حیات" پر رک گئے۔ مجھے رونے دھونے والی ہیروئین کبھی پسند نہیں آتیں لیکن میرے علاوہ میرے تمام گھر والوں کا کہنا ہے "امامہ جس طرح کے حالات سے گزر کر آئی ہے۔ اس کا رونا کچھ انوکھا نہیں ہے۔" خیر سالار کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ "بن مانگی دعا" بھی اچھا جا رہا ہے۔ برائے مہربانی رفتار بڑھا دیں۔ کہانی رکی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور پھر "نمل" میرا پسندیدہ ناول۔ نمرہ احمد بہت بہترین لکھتی ہیں۔ ان کے ناول میں موجود ایک ایک کردار بہترین ہے۔ مجھے ہمیشہ سے نگیٹیو پوائنٹ زیادہ پسند آتا ہے۔ سچ کہوں تو اسی لیے مجھے ہاشم زیادہ پسند ہے۔ لیکن جواہرات مجھے کبھی پسند نہیں آئی۔ پتا نہیں کیوں اس کے علاوہ تمام ناولٹ اور افسانے پسند آئے ہیں۔ مستقل سلسلوں میں "آپ کا باورچی خانہ" بہت پسند ہے۔ پچھلے ماہ "عہد الست" کی قسط نہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا۔ "عہد الست" میں حیران کن باتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ بڑی بڑی باتوں کو بالکل غیر محسوس انداز میں بتاتی چلی جاتی ہیں' دلیلوں کے ساتھ حق و باطل کا موازنہ 'بغیر کسی اختلاف کے یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو ان موتیوں جیسے الفاظ کو پیرائے میں ڈھالنے کے ہنر سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اللہ ہماری مصنفین کو سدا سلامت رکھے آمین۔

ج : پیاری عائشہ! کرداروں پر آپ کا تبصرہ بہت دلچسپ ہے۔ تنزیلہ ریاض ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں اور عہد الست ان کی اب تک کی تمام تحریروں میں سب سے زیادہ فکر انگیز اور سوچنے پر مجبور کردینے والا ناول ہے۔

افشاں شہزاد..... کراچی

ٹائٹل سادہ مگر اچھا لگا۔ کرن کرن روشنی نے دل میں روشنی بکھیر دی۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھے۔ علی رحمن اور نازلی نصر سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ سلسلے وار سب ہی ناول شان دار چل رہے ہیں۔ یہ بات کہنے کی نہیں مگر پھر بھی لکھ رہی ہوں۔ ہر قسط اگلی قسط کے انتظار پر مجبور کردیتی ہے۔ نبیلہ ابر راجہ صاحبہ کا ناول بھی خوب صورت تھا۔ اچھا لگا۔ آسیہ رزاقی صاحبہ کا ناولٹ رنگ حنا بھی خوب صورت تھا۔ کہیں کہیں پڑھتے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ بھی آگئی۔ جہاں شازیہ کا کردار خوب صورت تھا وہیں میاں جی بھی اچھے لگے۔ شازیہ جمال طارق نے خوب صورت موضوع کو خوب صورتی سے پیش کیا۔ کنیز نور علی کا افسانہ بھی خوب صورت تھا۔ "کملی دا ڈھولا" "اعتماد اور میرا باخبر' تینوں ہی بھرپور تھے۔ سب کو مبارکاں!

ج : پیاری افشاں! ہمیں افسوس ہے کہ پچھلی بار آپ کا خط شامل نہ ہوسکا۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

نمرہ کشور..... میلسی

"عہد الست" "تنزیلہ ریاض! آپ کتنا پیارا کتنا گریٹ سرمایہ ہیں ہمارا' ہمارے وطن کا! اللہ آپ کو شاد و آباد رکھے۔ نور محمد کا کردار کیسے لکھا ہے آپ نے! اس کے بچپن سے لے کر آخر تک کے واقعات کو پڑھتے ہوئے کبھی ایسا نہ ہوا کہ میرا دل نہ تڑپا ہو' میں نہ روئی ہوں' نہیں پتا آگے آپ کہانی کو کدھر موڑیں گی مگر نور محمد کی ڈیتھ نے بہت دکھ دیا۔ امائمہ کیسے سنبھالے گی خود کو! اور سب سے بڑھ کے اپنی ماں کو کیا بتائے گی۔ ہمیں بالکل یقین نہیں تھا کہ نور محمد مر جائے گا۔ ناول کا ہر کردار منفرد ہے اور جن حقائق سے پردہ اٹھایا ہے اس لحاظ سے انتہائی شان دار اور یادگار تحریر ہے۔
حرف سادہ کو اعجاز کا رنگ ہماری مصنفات نے دیا اور انہوں نے اپنی تحریروں کے مختلف و منفرد رنگوں سے ہمارے اطراف میں اجالا کردیا ہے۔ اقبال بانو آپی میں آپ

کی فین ہوں البتہ کہانی آپ کی ایک نہیں پڑھی آج تک .... مجھے کبھی ملی ہی نہیں' آپ لکھیں تب نا! لیکن سروے میں آپ کی شرکت' آپ کی باتیں' آپ سے مل کر بہت اچھا لگتا ہے ہمیشہ 'میڈیا کی طرف رخ کر لینے والی رائٹرز کے نام آپ کا پیغام بہت اعلا اور ہمارے دل کی آواز ہے۔

اب بات ہو جائے "نمل" کی نمرہ احمد کا ہر نیا ناول ان کا اپنا ہی بنایا ہوا پچھلا ریکارڈ توڑ دیتا ہے۔ زمر مجھے بہت پسند ہے اپنے بالوں سمیت۔ بال تو سب کے ہی منفرد ہیں سوائے تیمور کے۔ بم پھٹے بالوں والا!.... اور شونا 'پالا ہمارا سعدی" اتنا اچھا لگتا ہے نا! صبح کو قرآن پڑھنے والا' سب سے زیادہ غیرت والا! جب ہاشم کی اصلیت اس پر کھلتی ہے تو سعدی کی حالت' دل کی ویرانی' اس کی آنکھوں کی نمی بہت بہت دکھی کر دیتی ہے۔ حنین' سیم اور "ندرت بہن" کی نوک جھونک مزا دیتی ہے میرے اپنے ہی گھر کا منظر لگتا ہے۔ یا پھر.... خیر یہ حنین! یا اللہ!.... یہ کس مرض میں گرفتار ہے! اگر سعدی پھنسا لیا گیا تو مجبوراً" حنہ کو خود سے کیا عہد توڑنا پڑے گا اور پھر وہ سعدی کی دی ہوئی فلیش کو کھولنے کی کوشش کرے اور تب ہی اس کے سر سے عشق کا بھوت اترے گا' سائرہ رضا کا بلدیہ ٹاؤن کراچی سانحہ پر لکھا گیا افسانہ کب اور کس ڈائجسٹ میں شائع ہوا ہے؟ ضرور بتا دیں! اور ہمیں شدید خواہش ہے کہ نمرہ احمد کو سروے میں پڑھیں' ہمیں پتا ہے آپ نے نمرہ کو بھی سوالنامہ بھیجا ہو گا لیکن پلیز پلیز انہیں جواب بھیجنے اور شمولیت پر بھی راضی کریں نا!

ج: نمرہ کشور! ہم نمرہ احمد تک سروے میں شرکت کے لیے آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔ ہم نے سوال نامہ تمام مصنفین کو بھجوایا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سائرہ رضا کا بلدیہ ٹاؤن کراچی کے سانحہ پر افسانہ نومبر 2012 خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔

آسیہ فرید.... ملتان

ملتان کے دیہی علاقے سے تعلق رکھتی ہوں میں 8th کلاس سے شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں۔ ایم اے (اردو) کے ساتھ ساتھ درس و تدریس سے وابستہ ہوں' شادی شدہ ہوں اور اپنے ایک پیارے سے ایک سال کے بیٹے محمد انس کی ماں بھی ہوں۔ فارغ ٹائم میں پڑھنے کے باوجود میری فیملی کے کسی بھی فرد کو میرا ڈائجسٹ پڑھنا نہیں پسند۔ سب سے ڈانٹ کھا چکی ہوں۔ اپنی بیسٹ فرینڈ کے توسط سے یہ دونوں ڈائجسٹ پڑھتی ہوں کیونکہ میں ان کو پڑھے بنا رہ بھی نہیں سکتی بہت کچھ سیکھا ہے میں نے ان سے اور میں انہیں اپنے حقیقی استاد کا درجہ دیتی ہوں۔ میری فیورٹ مصنفین میں نمرہ احمد' نگہت سیما' عمیرہ احمد' نبیلہ عزیز' سمیرا حمید اور فرحت اشتیاق صاحبہ شامل ہیں۔ از روئے عقیدت ان کے ہاتھوں کو چومنے کا جی کرتا ہے۔ آپ کے ڈائجسٹ کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں اور میں کبھی ایک لائن بھی مس نہیں کرتی۔

ج: پیاری آسیہ! خواتین سے آپ کی محبت کا حال جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا تعلق دیہی علاقے سے ہے لیکن اکثر شہروں میں بھی لڑکیوں کے رسالے پڑھنے پر روک ٹوک کی جاتی ہے جبکہ ان گھروں میں دن بھر ٹی وی دیکھنے کی آزادی ہوتی ہے اور انڈین یا پاکستانی ہر طرح کے چینل چلتے رہتے ہیں۔

آپ کی پسندیدہ مصنفین تک آپ کا اظہار عقیدت پہنچا رہے ہیں۔

عروہ حفیظ.... میانوالی

میں جب آٹھویں کلاس میں تھی تو میں امی سے ڈائجسٹ چھپا چھپا کر پڑھتی تھی اب میں سیکنڈ ایئر میں آئی ہوں اور اب تک امی کو بھی پتا چل چکا ہے' میری کلاس کی لڑکیاں میرا مذاق اڑاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ عروہ تو ڈائجسٹ کو دیکھ کر ایسے خوش ہو جاتی ہے کہ جیسے اسے عیدی مل گئی ہو اور مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے آج تک خود ڈائجسٹ نہیں منگوایا کیونکہ مجھے کوئی لا کر نہیں دیتا۔ امی کہتی ہیں کہ پہلے اپنی اسٹڈی مکمل کرو پھر پڑھنا لیکن میں اپنی ایک سہیلی سے ڈائجسٹ منگوا کر پڑھتی ہوں۔ میں عمیرہ احمد کی بہت بڑی فین ہوں اور میں تمام رائٹرز کی شکر گزار ہوں کہ وہ ہمارے لیے اپنا قیمتی وقت نکال کر لکھتی ہیں۔ میں زندگی میں اتنی کبھی نہیں روئی ہوں گی جتنا میں ناول "متاع جاں ہے تو" پڑھ کر روئی تھی۔ "بن مانگی دعا" "آب حیات" "عہد الست" اور "نمل" یہ سب بہت زبردست ناول ہیں۔

ج : پیاری عروہ! پڑھائی پر توجہ دینا تو بہت ضروری ہے لیکن پڑھائی کے ساتھ ساتھ تفریح بھی ضروری ہے۔ اور اگر صاف ستھری تفریح کے ساتھ ساتھ کچھ سیکھنے کا بھی موقع ملے تو اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے۔ پڑھائی کے دوران ٹی وی بھی تو دیکھتے ہیں اس سے تو کوئی بھی منع نہیں کرتا۔ یہ بات حیران کن ہے کہ ڈائجسٹ پڑھنے سے گھر والے کیوں منع کرتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیابی دے۔ آمین

سائرہ نازش خان..... سانگھڑ

2 سال سے خواتین 'شعاع پڑھ رہی ہوں خط لکھنے کی وجہ ہے "نمل" اور "آب حیات" نمل کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ نمرہ باجی پلیز سعدی کو واپس اس کے گھر والوں سے ملوا دیں۔ مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے سعدی اور ہاشم کا کردار تو میرا فیورٹ کردار ہے میں چاہتی ہوں 'ہاشم کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جو لاسٹ میں سعدی کو گولی لگنے سے پہلے کسی نے اس کی بات سنی تھی 'وہ احمر شفیع تھا اور اب وہی سب کو ہاشم کی اصلیت بتائے گا۔ نوشیرواں کو تو کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔ بلکہ اسے تو ڈائریکٹ پھانسی پہ چڑھا دینا چاہیے۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی سعدی کو مارنے کی 'جواہرات کو تو مر ہی جانا چاہیے۔
اب آتے ہیں "آب حیات" کی طرف تو عمیرہ باجی شروع کے تین چار ماہ تو آپ نے بہت زبردست کہانی لکھی اور اب کیا ہو گیا۔ سالار اور امامہ کے بیچ میں یہ غلام فرید کی کہانی کہاں سے آ گئی "اف" اور اور اور مجھے نہیں لگتا کہ عفت باجی کا کوئی ارادہ ہے "بن مانگی دعا" ختم کرنے کا۔

باقی سب کہانیاں بہت اچھی لگیں۔
ج : پیاری سائرہ! عمیرہ احمد کی تحریروں میں کوئی بھی چیز غیر ضروری اور بلاوجہ نہیں ہوتی۔ غلام فرید کی کہانی آئی ہے تو اس کا تعلق لازمی مرکزی کرداروں سے ہو گا۔ جو آگے چل کر آپ کو پتا چلے گا۔ "بن مانگی دعا" اب اختتامی مراحل میں ہے۔
خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

یسری کشف..... سانگھڑ

میں خواتین و شعاع پچھلے ایک سال سے پڑھ رہی ہوں۔ لیکن شرکت اس ماہ کر رہی ہوں۔ اس کی وجہ "نمل" ہے۔ آخر کار سعدی کو ہاشم کاردار کے خلاف ثبوت مل ہی گیا۔ ہاشم اور سعدی میرے فیورٹ کردار ہیں۔ پلیز پلیز ہاشم کاردار کو کہانی کے آخر میں کم سے کم سزا دلوایئے گا۔ احمر شفیع کا کردار بھی لاجواب ہے۔ نوشیرواں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سعدی کے لیے بہت دکھ ہوا۔
عمیرہ احمد کا "آب حیات" ویسے تو میرا فیورٹ ناول ہے پر اس بار کی قسط بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ آخری خطبہ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ مجھے سالار کا کردار بہت پسند ہے۔ کیا سالار سکندر جیسا انسان اصل زندگی میں ہوتا ہے۔ سب کہانیاں اچھی لگیں۔ پلیز زمر نام کا مطلب بتا دیں۔ سعدی کے ساتھ کچھ برا مت کیجیے گا۔
ج : پیاری یسری خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔
زمر کے معنی گروہ یا گروپ کے ہیں۔

دعائے سحر..... فیصل آباد

پہلی بار شعاع 'خواتین 'کرن کب پڑھا..... شاید تب جب ابھی صرف الفاظ سے آگہی تھی۔ ان کے مفہوم سے نہیں۔ شاید نو یا دس سال کی تھی اور آج مجھے خواتین پڑھتے تقریباً" دس سال ہونے کو آئے۔ وقت کیسے بیتا کچھ پتا ہی نہ چل سکا۔ مگر ہاں ایک لمحے کے لیے بھی خواتین میرے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ بہت کچھ سیکھا میں نے اس سے۔ اور بہت کچھ سیکھ رہی ہوں۔ نجانے کیا جادو ہے اس نگری میں.... جو بھی جائے مسحور ہو جائے.... میری پریشانی 'غم 'ڈپریشن سب کو یوں اپنے میں ضم کر لیتا ہے جیسے پیاسی زمین بارش کے قطروں کو۔
ج : سحر! آپ کی والدہ کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔
واقعی مطالعہ سے اچھی عادت کوئی نہیں ہے۔ انسان جب مطالعہ کرتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے اس دنیا اور اس کے سارے غم بھول کر ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اور ہمارے پرچے تو جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔

حنا گل..... بنوں

(بی اے فائنل ایر کا ایگزام دے کے فارغ ہو گئے ہیں) سو اب صورت حال "فکر نہ فاقہ عیش کر کاکا" اب کیا کیا

جائے (اف بورنگ) بڑی معصومیت اور بے چارگی سے گنگنا رہے ہیں "مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا" نا بھئی نا، کیوں نہیں آتا کوئی کام تو جناب ہم نے سوچا کیوں نہ چار پانچ سالوں سے التوا میں پڑے کام کو سرانجام دیا جائے۔

نکھرا نکھرا سرورق نکھرا نکھرا تاثر چھوڑ گیا۔ "کرن کرن روشنی" کے سامنے تمام کرنیں ماند ہیں زبردست! عفت سحر طاہر کا "بن مانگی دعا" لو جی ساس چلی گئی اب سب کچھ ہیپی اینڈنگ ہو جائے گا۔ مشاہدہ ہے بھئی اور اب بات ہو جائے میری اس بہترین اور پسندیدہ ترین مصنفہ کی۔ نمرہ احمد کیا لکھوں اقبال سے معذرت کے ساتھ۔

زندگی مضمر ہے تیری اعلیٰ تحریر میں

سمجھ نہیں آتا کہ ان کی شخصیت پر کیا لکھوں

اور اب آپ سے ایک نہایت عاجزانہ، فقیرانہ اور مؤدبانہ گزارش کی جاتی ہے کہ ہم پہ یہ ظلم عظیم روکا جائے۔ بھئی دیکھیں نا ہماری موسٹ فیورٹ رائٹر نمرہ احمد کا انٹرویو شائع نہ کرنا ہم پر ظلم ہی ہے نا۔ نمرہ احمد کی تحریروں سے ہم نے قدم قدم پہ اصلاح کشید کی ہے اور یہ آپ کے قلم کا جہاد ہے۔

ہم انتظار میں ہیں کہ سعدی کی ہیروئین کب انٹری مارے گی، ویسے ندرت بہن (آپس کی بات ہے) "سعدی کے لیے کوئی لڑکی شنز کی ڈھونڈی ہے کیا؟" (آج کی نسل تھوڑی زیادہ اسمارٹ ہے) اور آخر میں نمرہ احمد، ہمارے گل کی طرح کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے نا..... کہ

"حنا گل تم سے بہت پیار کرتی ہے نمرہ احمد!"

ج : پیاری حنا! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

شائستہ اکبر..... گڈو کالونی

جون کا سرورق دوپٹہ پہنے سادہ سی ماڈل گرل کے ساتھ بہت ہی اچھا لگا (پہلی بار) پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ پلیز ہر ماہ انشاء جی کی کوئی نہ کوئی ایک غزل ضرور شائع کیا کریں۔

نمرہ احمد کا "نمل" ناول اپنی خوب صورتی لیے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ عمیرہ احمد آپ بھی بہت زبردست جا رہی ہیں اور زوبار یہ خالد کے خط کے جواب میں آپ نے جو فرحت اشتیاق کے ناول کے کردار مسعود اور ایمن کا ذکر کیا ہے وہ "دل سے نکلے جو لفظ" ناول کے کردار نہیں بلکہ "میرے ہمدم میرے دوست" ناول کے کردار ہیں مریم عزیز اور نبیلہ عزیز کہاں ہیں؟ ان سے بھی ناولز لکھوائیں۔

ج : پیاری شائستہ! آپ نے تصحیح کی، بہت شکریہ نبیلہ عزیز سے ہم بھی ناول لکھوانا چاہتے ہیں لیکن وہ کچھ پریشانیوں میں الجھی ہوئی ہیں اس لیے لکھ نہیں پا رہی ہیں۔ مریم عزیز نے ناول شروع کر رکھا ہے۔ اب دیکھیں وہ کب مکمل کرتی ہیں۔

اقراء اکرم..... گاؤں سیلیاں شریف

کافی عرصے بعد خط لکھ رہی ہوں، وجہ پاکستان کے حالات ہیں ہم باڈر لائن پر رہتے ہیں۔ آئے دن فائرنگ گولہ باری کی وجہ سے اپنا گاؤں چھوڑ کر جانا پڑتا ہے لیکن ہم نے خواتین اور شعاع کو پڑھنا نہیں چھوڑا مجھے خواتین کے تمام سلسلے اچھے لگتے ہیں لیکن قسط وار ناول کے لیے پورا مہینہ انتظار کرنا پڑتا ہے میری دوستیں حافظہ پاکیزہ، نفیسہ، عظمیٰ اور سائرہ باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔

ج : اقراء اکرم! ہمیں اندازہ ہے کہ بارڈر پر رہنے والے لوگوں کو کن مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً جب پڑوسی ملک انتہائی عیار اور مکار ہو۔ انہوں نے تو ہمارے شہروں کو نہیں چھوڑا تو بارڈر پر تو کارروائی کرنے میں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری محب وطن افواج کو سلامت رکھے جو وطن کے دفاع کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

رضوانہ پروین..... سیالکوٹ

جون کا شمارہ دس تاریخ کو ملا۔ سرورق پسند آیا۔ اگر آنکھوں کا میک اپ تھوڑا اور اچھا ہوتا۔ سب سے پہلے مکمل ناول کی طرف آتے ہیں "نمل" کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس دفعہ "نمل" پڑھ کر سعدی کی حالت پر رونا اور نوشیرواں پر غصہ آیا۔ پلیز سعدی کو اس کے گھر والوں سے جلدی ملوائیے گا اور زمر کا دل فارس کے لیے تھوڑا نرم کریں "سیکھا ہے جینا" بہت اچھا ناول لگا۔ مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی تھی کہ افراح تہجد کی نماز پڑھتی ہے لیکن اس کے لیے پہلے تھوڑی سی نیند کرنی پڑتی ہے پھر یہ نماز پڑھتے ہیں۔ ناول میں "آب حیات" پڑھا، مجھے تمام قسطوں میں سے یہ قسط سب سے زبردست لگی اب پڑھنے کا اور بھی مزہ آئے گا "بن مانگی دعا" بھی اچھا جا رہا ہے پلیز

ایسا ہے اچھے دن بھی لائیں افسانے "اعتماد ...... ملی دا ڈھولا" میرا باخبر بہت پسند آئے باقی ڈائجسٹ پڑھنا ابھی باقی ہے۔ "رنگ حنا" آسیہ رزاقی کا نام ہی کافی ہے تمام کہانیوں پر ہم بہنیں (کشور 'شبانہ) آپس میں تبادلہ خیال بھی کرتے ہیں (فون کے ذریعے) اس دفعہ کا ڈائجسٹ دیکھ اور پڑھ کر بہت مزہ آیا۔

ج : پیاری رضوانہ! آپ نے درست لکھا ہے۔ تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے پہلے نیند لینا ضروری ہے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔
ہماری طرف سے کشور اور شبانہ کو بھی شکریہ کہہ دیں۔

رضوانہ پروین۔۔۔۔سیالکوٹ

تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ پلیز نمرہ سعدی کے ساتھ کچھ برا مت کیجیے گا کیونکہ سعدی میں مجھے اپنا بڑا بھائی نظر آتا ہے۔ جس طرح سب کو جوڑے رکھنا چاہتا ہے بالکل میرا بھائی بھی اسی طرح ہے۔ "آب حیات" کی اس دفعہ کی قسط زبردست تھی۔

ج : پیاری رضوانہ! آپ نے صرف ایک کہانی پر تبصرہ کیا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔
اپنے بھائی اور بہن کا ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دیں۔

فوزیہ ملک۔۔۔۔ہارون آباد

مجھ سمیت تقریباً "25 افراد ہیں۔ جو میرے ساتھ یہ رسالے شیئر کرتے ہیں۔
اسٹوڈنٹ لائف سے شادی اور اب چھوٹے چھوٹے بچوں کی اماں بن چکی ہوں۔ مگران رسائل سے تعلق دن بدن مضبوط ہوتا جارہا ہے۔ اب ایک استاد کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دے رہی ہوں۔ ایم اے ایجوکیشن اور ایم اے اردو ہوں۔ میں خواتین 'شعاع اور کرن تینوں رسالے باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ صرف تین سال شادی کے بعد شوہر کے منع کرنے پر رکی۔ مگر جب جاب ہو گئی۔ تو دوبارہ سے سلسلہ جوڑلیا اور آج تک قائم ہے۔
میری پسندیدہ مصنفین میں عمیرہ احمد 'انیس سلیم' فرحت اشتیاق 'نگہت سیما' سائرہ رضا (شعاع میں تارے والی کہانی پڑھ کر میں بہت روئی) عنیزہ سید شامل ہیں۔
رومانٹک کہانیوں میں کنیز نبوی در ثمن پسند ہیں۔
مجھے سنجیدہ کہانیاں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ موجودہ مصنفین میں نمرہ احمد 'سمیرا حمید نے بہت متاثر کیا ہے۔
تنزیلہ آپ عہد الست لکھ کر بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھول رہی ہیں۔ بہترین کاوش ہے۔ عمیرہ احمد کے کیا کہنے آب حیات تسلی سے پڑھتی ہوں اور ایک ایک لفظ کو محسوس کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ باقی سب سلسلے بھی بہترین ہیں۔
پہلی دفعہ میں تنقید نہیں کروں گی۔ کبھی کبھی کچھ ناول اور افسانوں پر میں سوچتی ہوتی ہوں۔ انہیں شامل نہیں ہونا چاہیے تھا۔

ج : پیاری فوزیہ! بہت سلجھے ہوئے انداز میں آپ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچارہے ہیں آئندہ خط لکھیں تو بلا جھجک خامیوں کی بھی نشان دہی کریں۔ ہمیں تنقید بری نہیں لگتی۔

محصنہ علاقہ چراٹ سے پٹھان خٹک

اللہ اس ادارے کو ہمیشہ قائم رکھے۔ نمرا احمد جس طرح لوگوں کو تعلیم دیتی ہے اس کی مثال نہیں میرے خیال میں یہ علماء سے بھی بہتر کام کررہی ہیں کیونکہ میں نے خود عالمہ کا کورس اور ترجمہ تفسیر کا کورس بھی کیا ہمارا چھوٹا سا مدرسہ ہے اس میں ہم ترجمہ تفسیر صبح سے شام تک پڑھاتے ہیں لیکن ہم سے بڑھ کر کام نمرا احمد کررہی ہیں۔ کیونکہ مدرسے میں ہر کوئی نہیں آتا۔ آپ کے رسالے ہر کوئی پڑھتے ہیں میں نے اس کے پڑھنے کی ترغیب دی اور ترجمہ تفسیر کی ترغیب دی۔ ہر کردار سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔
ایک بات قارئین سے کہوں گی کہ تنقید کرنا اچھی بات ہے۔ جن سے لکھنے میں مزید نکھار آتا ہے لیکن نرم الفاظ اور خوب صورت طریقے سے کریں۔ ایسے سخت الفاظ نہ کریں جن سے تکلیف ہو کیونکہ مصنف حساس ہوتے ہیں۔ یہ رسالے کزن کے شوہر لاتے ہیں نوشہرہ سے جو ہم سے بہت دور ہے باجی اس کے ملنے کا کوئی آسان حل بتائیں۔

ج : پیاری محصنہ رسالے ملنے میں دشواری ہوتی ہے تو

اس کا آسان حل یہ ہے کہ آپ سالانہ خریدار بن جائیں۔ آپ کو گھر بیٹھے پرچے ملتے رہیں گے۔

خواتین اور شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عائشہ صدیقہ..... اٹک

میرا نمرہ احمد سے ایک سوال ہے کہ آپ اس فیلڈ میں اپنا استاد کسے مانتی ہیں؟ اور آخر میں تمام میٹھی میٹھی اور پیاری بہنوں سے یہ درخواست ہے کہ میں 8th کلاس پڑھ رہی تھی تو کالا موتیا آنے کی وجہ سے میری نظر چلی گئی۔ اب میں مکمل بلائنڈ ہوں۔ یہ خط میں کسی سے لکھوا رہی ہوں آپ سب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری کھوئی ہوئی نظر واپس کردے۔

ج : پیاری عائشہ اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں کہ وہ آپ کی بینائی لوٹادے قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ

37-اردو بازار کراچی

ارم بشیر..... اسلام آباد

جون کا شمارہ پڑھا ٹائٹل بہت اچھا تھا اور ینج اور گرین کا امتزاج بہت دل کو بھایا کہانیاں سبھی ہی اچھی تھیں مگر "سیکھا ہے جینا" اور آسیہ رزاقی جی کا رنگ حنا تو بہت دل سے پسند آئی اور ایک چھوٹی سی بات نبیلہ ابر راجہ جی کے لیے کہ اگر وہ افراح کے دونوں گالوں پہ ڈمپل بھی بنادیتیں تو وہ شاید زیادہ پیاری تصور ہوتی۔

ج : پیاری ارم! آپ کہانی کے بارے میں ہمیں فون کرکے پتا کرلیں یا اپنا فون نمبر لکھ دیں ہم فون کرلیں گے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

آصفہ حمید، مریم حمید، نبیلہ ہنین، صائمہ اصغر، عزمی ہنین..... بدو کی گوسائیاں گوجرانوالہ کینٹ

اس ماہ کا مکمل ناول "ہاں سیکھا ہے" بہت زبردست رہا افسانے سب ہی کمال کے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ زبردست، "کملی دا ڈھولا" اور میرا باخبر رہا۔ پلیز ماما ملک، کنیز نبوی، فرحت اشتیاق، نبیلہ عزیز، سمیرا حمید سے گزارش ہے کہ خواتین کے لیے اچھا سا ناول لکھیں۔

ج : آمنہ، مریم، نبیلہ، صائمہ اور عزمی! آپ کا پیغام مصنفین تک پہنچایا جارہا ہے۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل	عینی
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر	موسیٰ رضا

امت الصبور

خاتون کی ڈائری

پرہ احمد کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر احمد فراز کی یہ خوبصورت غزل آپ سب قارئین بہنوں کے نام۔

وادیٔ عشق سے کوئی نہیں آیا جا کر
آؤ آواز لگائیں سرِ صحرا جا کر

بزمِ جاناں میں تو سب اہلِ طلب جاتے ہیں
کبھی مقتل میں بھی دکھلائیں تماشا جا کر

کن زمینوں پہ مری خاک لہو رولے گی
کس سمندر میں گریں گے مرے دریا جا کر

ایک موہوم سی امید ہے تجھ سے ورنہ
آج تک آیا نہیں کوئی مسیحا جا کر

دیکھ یہ حوصلہ میرا مرے بزدل دشمن
تجھ کو لشکر میں پکارا تنِ تنہا جا کر

اُس شہرِ حسن کے در پہ ہے فقیروں کا ہجوم
یار ہم بھی نہ کریں عرضِ تمنا جا کر

ہم تجھے منع تو کرتے نہیں جانے سے فراز
جا اُسی کے در پہ مگر ہاتھ نہ پھیلا جا کر

نوشابہ منظور کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

دل کے دریا کو کسی روز اُتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل، لوٹ کے گھر جانا ہے

اُس تک آتی ہے تو ہر چیز ٹھہر جاتی ہے
جیسے پانا ہی اُسے، اصل میں مر جانا ہے

بول اے شامِ سفر رنگِ رہائی کیا ہے
دل کو رکنا ہے کہ تاروں کو ٹھہر جانا ہے

کون اُبھرتے ہوئے مہتاب کا رستہ روکے
اس کو ہر طور سوئے دشتِ سحر جانا ہے

میں کھلا ہوں تو اسی خاک میں ملنا ہے مجھے
وہ تو خوشبو ہے، اسے اگلے نگر جانا ہے

وہ ترے حسن کا جادو ہو کہ میرا غمِ دل
ہر مسافر کو کسی گھاٹ اُتر جانا ہے

نوال افضل گھمن کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر جون ایلیا کا خوبصورت انداز تمام قارئین بہنوں کے نام۔

حالتِ حال کے سبب، حالتِ حال ہی گئی
شوق میں کچھ نہیں گیا، شوق کی زندگی گئی

ایک ہی حادثہ تو ہے اور وہ یہ کہ آج تک
بات نہیں کہی گئی، بات نہیں سنی گئی

بعد بھی تیرے جانِ جاں دل میں رہا عجب سماں
یاد رہی تیری یہاں پھر تیری یاد بھی گئی

اس کی گلی سے اٹھ کر میں آن پڑا تھا اپنے گھر
ایک گلی کی بات تھی اور گلی گلی گئی

خاموشی کو بیاں ملے

امت الصبور

عاصمہ رمضان..... سوک کلاں گجرات

1 میں کون؟ نہ موسیٰ نہ فرعون --- آہم --- نام عاصمہ رمضان --- گجرات کے ایک بڑے سے گاؤں سوک کلاں کی باسی ہوں --- ڈگری والی تعلیم بی ایس سی ہے۔ گود سے گور تک والی ابھی جاری ہے --- جون کی تپتی دوپہر کو آخری پریکٹیکل دے کر، فرصت کے دنوں کے سہانے خواب دیکھتے گھر آئی تو ایک فیصلہ منتظر تھا۔ والد صاحب کے اسکول میں معلمہ کے فرائض ادا کرنے کو کہا گیا۔ اور ہم ان خوابوں کو دل کے ٹرنک میں بند کر کے اگلے روز اسکول --- وہ دن آج کا دن نکل نہیں پائے --- اللہ کا شکر کہ مجھ سی ناچیز کو اس عظیم پیشے سے وابستہ کیا --- بچوں سے سیکھتی ہوں سکھاتی ہوں --- بہت پیار ہے اپنے تمام اسٹوڈنٹس سے --- بہت۔

2 خوبیاں اور خامیاں، سب ہیں مجھ میں --- خامیاں زیادہ ہیں --- بہت جلد اعتبار کر لیتی ہوں اور جب پاتال میں گرتی ہوں تب ہوش آتا مگر پھر وہی عادت --- بھول جانے کی بری عادت ہے نا چاہتے ہوئے بھی غلط کر جاتی ہوں --- انا پرست ہوں جھکتی نہیں ٹوٹ جاتی ہوں۔ خوبی کہیے یا خامی --- بہت حساس ہوں، گزرتی سرد ہوا بھی اداس کر جاتی ہے۔ دوستی کے معاملے میں بہت سنجیدہ ہوں --- دوست زندگی کا حصہ ہیں نا---

3 کتابیں اور رسائل پڑھنا میرا شوق ہے --- شاعری میرا جنون --- نہیں مجھ میں گردش کرتا خون --- موقع پر شعر کہنا بہت پسند ہے --- عمیرہ احمد، راحت جبیں اور نمرہ بہت اچھی رائٹرز ہیں نمرہ موسٹ فیورٹ ہے۔ نمرہ کی تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اگر آج مصنف مجھ سے بات کرتا تو اس کا کریڈٹ نمرہ کو جاتا۔

مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ آج میں جو ہوں ان رسائل کی بدولت ہوں۔ آٹھویں جماعت سے چھپ چھپ کر خواتین پھر شعاع پڑھنا شروع کیا مار، ڈانٹ سب سہا۔ مگر رسائل کا ساتھ نہ چھوڑا۔ میں سمجھتی ہوں جو کچھ میں نے ان رسائل سے سیکھا شاید میری ماں اور اساتذہ بھی نہ سکھا پاتے۔

4 فضول رسموں سے چڑ ہے۔ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ اللہ کی پسند میں خوش رہیں --- سکون ملے گا۔

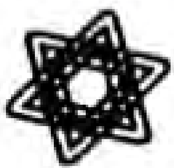
5 پسندیدہ شعر نہیں اشعار ہیں --- دو لکھ سکتی ہوں فی الحال ---

فکر زمانہ میں، نہ تلاش معاش میں
میں در بدر ہوا ہوں تو اپنی تلاش میں

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

6 ادنیٰ سی شاعرہ ہوں --- شاید اپنی یہ کاوش ---
جی ذاتی ہے ---

کہانی تو بس یہی ہے ---
اسے مجھ سے محبت نہیں ہے ---



عید کے پکوان

خالدہ جیلانی

عید کے دن گھر کی صفائی سے لے کر سجاوٹ و آرائش کے ساتھ عید کی خصوصی ڈشز کی تیاری بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ عید پر بطور خاص خصوصی پکوان تیار کیے جاتے ہیں۔ انواع و اقسام کی نمکین ڈشز کے ساتھ ساتھ مختلف میٹھے اور مٹھائیاں دسترخوان کی زینت ہوتی ہیں۔ عید کی روایتی مٹھائیاں' سویاں' شیر خورما تو لازمی ہیں' لیکن ان روایتی کھانوں کے ساتھ اب جدت کے رنگ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ نہ صرف گھر والوں کے لیے بلکہ گھر آنے والے مہمانوں کی تواضع کے لیے بھی خاص اہتمام ضروری ہوتا ہے۔

عید کے پرمسرت موقع کے لیے ہم نے آپ کے لیے مزے دار خوش رنگ' خوش ذائقہ اور آسان' نمکین اور میٹھی ڈشز کا انتخاب کیا ہے۔ آپ انہیں اپنے ہاتھ سے بنائیں اور گھر والوں اور مہمانوں سے داد وصول کریں۔

سویوں کا شیر خورمہ

ضروری اشیا :

باریک سویاں 1 کپ
گھی 1 کھانے کا چمچہ
چھوٹی الائچی (کوٹ لیں) 4 عدد
دودھ ڈیڑھ لیٹر
کیوڑا 1 کھانے کا چمچہ
بادام (سلائس کاٹ لیں) 10 عدد
پستہ (سلائس کاٹ لیں) 10 عدد
چھوہارے (سلائس کاٹ لیں) 8 عدد
کشمش 1/4 کپ
ناریل (کدوکش کیا ہوا) 1/2 کپ
چینی 1 کپ

ترکیب :

ساس پین میں گھی گرم کر کے الائچی ڈال کر کڑکڑائیں' اس میں سویاں' بادام' پستہ' چھوہارے' کشمش اور ناریل ڈال کر ہلکی آنچ پر فرائی کریں۔

سویاں ہلکی سنہری ہو جائیں تو چینی ڈال کر مکس کریں اور آنچ ہلکی کر دیں۔

دیگچی میں دودھ ڈال کر اتنا پکائیں کہ ایک کلو دودھ باقی بچ جائے اسے سویوں میں شامل کر کے ہلکی آنچ پر 5 منٹ تک مزید پکائیں۔ کیوڑہ ڈال کر ملا لیں اور چولہے سے اتار لیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر سرو کریں۔

کھیر دل پسند

ضروری اشیا :

دودھ 1 لیٹر
چینی 125 گرام
چاول (ابال کر چھان لیں) 3/4 کپ
کھویا 125 گرام
چھوہارے' بادام' پستے گارنشنگ کے لیے

ترکیب :

پتیلی میں دودھ تیز آنچ پر گرم کریں۔ ابال آجائے تو درمیانی آنچ پر دودھ کے گاڑھے ہونے تک پکائیں۔

چاول چوپر میں ڈال کر پیس لیں اور دودھ میں شامل کر کے مسلسل چمچہ چلاتے ہوئے پکائیں' چینی ڈالیں اور مزید 10 منٹ تک پکائیں۔

کھیر گاڑھی ہو جائے تو کھویا ڈال کر مکس کریں اور سرونگ ڈش میں نکال کر چھوہارے، بادام اور پستے سے گارنش کریں، کھیر دل پسند تیار ہے ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔

مینگو جیلی ٹرائفل

ضروری اجزا :

آم	1/2 کلو (کیوب کاٹ لیں)
مینگو کسٹرڈ	حسب ضرورت (1 کلو دودھ سے تیار کریں)
کریم	1 پیکٹ
مینگو جیلی	1 پیکٹ
بادام (سلائس کیے ہوئے)	1 کھانے کا چمچہ

ترکیب :

ڈش میں تیار کسٹرڈ ڈال کر اس کے اوپر مینگو سلائس پھیلائیں۔ اب تیار جیلی کے کیوب ڈالیں۔ جیلی کے اوپر کریم ڈالیں۔ بادام سے گارنش کر کے ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

چکن تمپورا

ضروری اشیا :

انڈے	2 عدد
چکن	250 گرام (بون لیس)
کارن فلور	2 کھانے کے چمچے
میدہ	4 کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	1 چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چکن کے 1/2 انچ چوڑے اسٹرپس کاٹ لیں۔ پیالے میں نمک، کالی مرچ پاؤڈر اور لہسن ڈال کر ملائیں اور اس میں چکن اسٹرپس ڈال کر 1/2 گھنٹے کے لیے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ انڈوں کی سفیدی علیحدہ کر کے پھینٹ لیں۔

پیالے میں سفیدی، کارن فلور، میدہ اور نمک شامل کر کے آمیزہ تیار کریں۔

چکن اسٹرپس کو اس آمیزے میں ڈپ کر کے ڈیپ فرائی کریں۔

دونوں طرف سے سنہری ہو جائیں تو نکال کر کیچپ یا چلی گارلک ساس کے ساتھ سرو کریں۔

چکن کارن پکوڑے

ضروری اشیاء :

چکن (بون لیس، چھوٹی بوٹی)	1 کپ
شملہ مرچ	1/2 کپ (چھوٹے کیوبز کاٹ لیں)
ہرا دھنیا (باریک چوپ کر لیں)	1/2 کپ
ہری مرچیں (چوپ کر لیں)	2 عدد
انڈے	1-2 عدد
لال مرچیں (کٹی ہوئی)	1/2 چائے کا چمچہ
زیرہ	1/2 چائے کا چمچہ
بھٹے کے دانے (ابلے ہوئے)	1 کپ
پیاز (باریک چوپ کر لیں)	1/2 کپ
میدہ	3-4 کھانے کے چمچے
ڈبل روٹی کا چورا	1/2 کپ
نمک	حسب ذائقہ
سویا ساس	1 چائے کا چمچہ

ترکیب :

چکن، شملہ مرچ، ہرا دھنیا، ہری مرچوں کو ایک پلیٹ میں رکھیں۔ تمام مسالا جات ایک جگہ کر لیں۔

ایک پیالے میں چکن، پیاز، شملہ مرچ، بھٹے کے دانے، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، نمک، کٹی ہوئی لال مرچیں، زیرہ، میدہ، ڈبل روٹی کا چورا، سویا ساس اور انڈے کو اچھی طرح ملا کر تھوڑی دیر چھوڑ دیں۔

ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں اور چھوٹے پکوڑے ڈال کر فرائی کریں۔
پکوڑوں کو دہی کی چٹنی، کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

گلاب جامن

اجزا :

خشک دودھ	1 پیالی
سوجی	آدھی پیالی
میدہ	آدھی پیالی
پھیکا کھویا	آدھی پیالی
بیکنگ پاؤڈر	چوتھائی چائے کا چمچہ
تیل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

ان سب چیزوں کو اچھی طرح ملا کر آٹے کی طرح گوندھ لیں اور پانچ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے پیڑے بنالیں۔

شیرا بنانے کے لیے اجزا :

چینی	دو پیالی
پانی	1 پیالی
چھوٹی الائچی	آٹھ عدد

(دانے نکال کر باریک پیس لیں)

ترکیب :

چینی میں پانی ملا کر ہلکی آنچ میں شیرہ بنالیں۔ جب شیرہ بننے لگے تو الائچی ڈال کر اتار لیں۔
ایک کڑاہی میں گھی گرم کرلیں جب گھی تیز گرم ہو جائے تو ہلکی آنچ کر کے پیڑے تلنا شروع کریں۔ جب براؤن ہو جائیں تو نکال کر شیرے میں ڈال دیں۔
گلاب جامن شیرے میں ڈال کر ہلکی آنچ کر کے دم پر رکھ دیں۔

لاہوری پلاؤ

ضروری اشیا :

گوشت	1/2 کلو
باسمتی چاول	1/2 کلو
	(15 منٹ کے لیے بھگودیں)
دہی	1/2 کپ
سفید زیرہ	1 چائے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	1 چائے کا چمچہ
ادرک لہسن پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
پیاز (سلائس کاٹ لیں)	2 عدد
سونف پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

دیگچی میں گھی گرم کر کے پیاز کو سنہرا ہونے تک فرائی کرلیں اس کے بعد اس میں ثابت گرم مسالا، گوشت، ادرک اور لہسن کا پیسٹ ڈال کر فرائی کرلیں، اور دہی بھی ڈال دیں اس کے بعد اس میں سونف پاؤڈر دھنیا پاؤڈر اور نمک ڈال کر بھون لیں اور گوشت گلانے کے لیے پانی ڈال دیں جب گوشت گل جائے تو چاول ڈال کر 3 گلاس پانی شامل کردیں۔ پانی خشک ہونے لگے تو دم پر رکھ دیں۔ پلاؤ کو 15-10 منٹ تک ہلکی آنچ پر دم دیں اور سرونگ ڈش میں نکال کر سرو کریں۔

آپ کا باورچی خانہ

مسرت سلیم

مسرت سلیم.....لاہور

1 میری روٹین بہت ٹف ہے کیونکہ میں ایک ٹیچر ہوں اس لیے گھر، اسکول کی جاب، بچے اور ان کی پڑھائی اور پھر اپنی پڑھائی ان سب میں سے کچن کے لیے ٹائم نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے بلکہ (کچن میں سے باقی مصروفیات کے لیے ٹائم نکالنا) اس لیے میں پسند و ناپسند کے علاوہ یہ خیال رکھتی ہوں کہ جو چیز جلدی اور آسانی سے بن جائے وہی بنالوں۔ گھر میں کسی سے پوچھوں کہ آج کیا پکاؤں؟ تو میاں صاحب کی آواز آتی ہے سبزی والے سے پوچھ لو کہ بھائی کون سی سبزی جلدی پکتی ہے وہ پکالو اللہ اللہ خیر صلا۔"

اس لیے میں کوشش کرتی ہوں کہ اتوار کو ایک دو کھانے بنا کر فریز کر دوں تاکہ آسانی رہے۔ (میں بھی خوش گھر والے بھی خوش)"

2 میری فیملی کو پتا ہے کہ یہ اپنی جاب کی وجہ سے گھر میں دستیاب نہیں ہوتی اس لیے زیادہ تر اطلاع دے کر ہی آتے ہیں۔ اگر (خدانخواستہ) اچانک آ بھی جائیں تو پھر فریز کیا ہوا سالن، کباب زندہ باد، یا پھر چکن اور قیمہ میں سے فٹ کچھ تیار کیا، چٹنی سلاد بنا کر مہمان بھگتا دیا جاتا ہے۔

ویسے تو الحمدللہ سب ہی کھانے کی تعریف کرتے ہیں لیکن اس وقت رمضان کے حوالے سے اسپیشل بریڈ رول کی ترکیب لکھ رہی ہوں جس کی اکثر فرمائش کی جاتی ہے۔

چکن ویجی ٹیبل بریڈ رول

اجزا :

ڈبل روٹی (درمیانی)	ایک عدد
چکن بون لیس	ایک پاؤ
بند گوبھی، آلو، گاجر (کش کیے ہوئے)	ایک ایک عدد
مٹر (ابلے ہوئے)	آدھی پیالی
انڈے	دو عدد (پھینٹ لیں)
دودھ	ایک کپ
بریڈ کرمز	حسب ضرورت
آئل	حسب ضرورت
نمک	حسب ضرورت
کالی مرچ	آدھا چمچہ
چاٹ مصالحہ	حسب پسند
سرخ مرچ	حسب پسند

ترکیب :

چکن ابال کر ریشے ریشے کرلیں۔ اب اس میں کش کی ہوئی بند گوبھی، آلو، گاجر اور ابلے مٹر شامل کریں باقی کے تمام مسالا جات بھی شامل کردیں اور دیگچی میں ایک چمچہ آئل ڈال کر ہلکا فرائی کرلیں تاکہ سبزیوں کا کچا پن ختم ہو جائے ایک کھلے برتن میں ایک کپ دودھ ڈال کر ڈبل روٹی کے سلائس کو دونوں طرف سے اس میں ہلکا ہلکا ڈپ کریں۔ اب ایک ہاتھ پر سلائس رکھیں دوسرے ہاتھ سے ہلکا ہلکا دبا کر زائد دودھ نچوڑ دیں۔ اس سلائس پر چکن کا مسالا رکھیں اور دونوں ہاتھوں سے دبا کر رول کی شیپ دے لیں اب اسے پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈپ کرکے بریڈ کرمز لگائیں اور ڈیپ فرائی کریں بے حد لذیذ رول تیار ہیں کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

3 میرا کچن چونکہ امریکن اسٹائل میں ہے (اوپن

ہے) اس لیے اسے صاف رکھنا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی، وہ اس طرح کہ ماشاء اللہ سے تین بیٹے ہیں (اور میں گھر کی اکلوتی لڑکی آہم) تو ایک اگر ایک گلاس میں پانی پیے گا تو دوسرا تیسرے گلاس میں پیے گا اور مجال ہے کہ کبھی گلاس کچن میں ملے اور میں بے چاری کبھی فریج میں پانی کی بوتلیں بھرنے یا گلاس پورے کرنے میں لگی رہتی ہوں اور کچن میں کام کرتے ہوئے میری کمنٹری ان پھوہڑ بچوں پر جاری رہتی ہے اور میرے کمنٹری کرنے پر میاں صاحب بچوں سمیت باجماعت تالیاں پیٹنے کا سین کرتے کرتے رہ جاتے ہیں (آخر کو اکلوتی بیگم کی گھوریوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے)

4 (اندرون لاہور کے رہنے والے ہوں اور ناشتے میں اہتمام نہ ہو) جی یہ ہو سکتا ہے کیونکہ ٹائم نہیں ہوتا (اہتمام کرنے کا) زیادہ تر انڈہ، بریڈ، جام، مکھن پر ٹرخاتی ہوں، چھٹی والے دن خاص اہتمام ہوتا ہے کبھی نان چنے (سردیوں میں سری پائے) بن مکھن، حلوہ پوری، مولی کے پراٹھے، مغز کا سالن اور پراٹھے وغیرہ چلتے ہیں۔

5 لاہوریوں کا تو مہینے میں کم از کم ایک آدھ دفعہ باہر کھانا تو ثواب کا کام ہے اس لیے کبھی میاں کی جیب اور کبھی میری سیلری ملنے کے بہانے باہر چلے جاتے ہیں۔ یا گھر پر ہی بچے باہر سے کچھ منگوا کر پارٹی کرتے ہیں۔

6 کھانا موسم کے حساب سے ہی اچھا لگتا ہے، کیونکہ موسم کے حساب سے نہ ہو تو میاں صاحب کا موسم خراب ہو جاتا ہے۔ گرمیوں میں شربت، جوس ملک شیک، قیمہ کریلے خاص طور پر پسند کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح سردیوں میں اکثر سری پائے سوپ اور خاص طور پر گاجر کا حلوہ بنا کر رکھتی ہوں اور بارش کا موسم ہو تو میرے بچے ہی مجھے نکلنے نہیں دیتے۔ لائن بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں احتجاج کرنے کہ آج بارش ہے ہمیں تو میٹھے پڑے بنا کر دیں (ایک اور شوشہ) ورنہ آج کھانے پر دھرنا ہو گا (لوجی پھر دھرنا) اور میاں صاحب تو ہر موسم کو ثواب سمجھ کر سیلبریٹ کرتے ہیں بھئی آج سخت گرمی ہے شام کو ابلے چاول اور دال اور ساتھ میں ملک شیک۔ سخت سردی ہے تو چائے، سوپ، یا کافی والی چائے کے ساتھ گاجر کا حلوہ تو لازمی ہے (ورنہ سخت گناہ ہو گا)

اور برسات میں پکوڑے، چپس، میٹھے پڑے یا گڑ والے چاول تو لازمی بنتے ہیں۔

7 جو کھانا محنت توجہ اور محبت سے بنے وہ دل ہی نہیں معدہ بھی جیت لیتا ہے اور کھانا ہمیشہ اچھے برتنوں میں پیش کریں (بقول میاں اس طرح کھانے کی ویلیو بڑھ جاتی ہے اور آخر میں ضروری انتباہ! ڈائجسٹ، ہمیشہ مسالا بھوننے کے بعد پڑھیں اور پڑھتے وقت ہمیشہ ایک کیبنٹ یا دراز کھلی رکھیں تاکہ چھپانے میں آسانی رہے محکمہ رسالیات حکومت شوقستان۔



دعائے مغفرت

ہمارے ادارے کے دیرینہ کارکن، ہمارے ساتھی عابد صاحب کے بڑے بھائی محمد صدیق اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

اِنَّا للہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ عابد صاحب کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی خطاؤں کو درگزر کر کے ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

خبریں گپ شپ وغیرہ

ڈاکٹر صفیہ سہیل



افادیت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کو روزہ کھجور سے افطار کرنے کا کہا گیا ہے۔ تاہم اگر کھجور دستیاب نہ ہو تو پانی سے روزہ کھولیں۔

سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں کنگ سعود میڈیکل کے آئی سی یو اسپیشلسٹ محمد شمیم کا کہنا ہے کہ کھجور سے روزہ کھولنے میں سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ روزے کی حالت میں جسم ۔ گلوکوز سے محروم ہو کر نڈھال ہو چکا ہوتا ہے۔ کھجور کھانے سے وہ گلوکوز جسم کو حاصل ہو جاتی ہے۔ افطار کے وقت کھجور کھانے سے معدہ فعال ہو جاتا ہے۔ کھجور میں حل پذیر ریشے کی مقدار بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے جو لوگ کھجور سے روزہ کھولتے ہیں انہیں قبض کی شکایت نہیں ہوتی' کھجور خون میں تیزابیت کے اثرات دور کر دیتی ہے۔

اہمیت

سید نور پاکستانی فنکاروں کے بھارتی فلموں میں کام کرنے کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ایک اچھی تبدیلی ہے' لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری بنیاد کیا ہے۔ (ویسے کیا ہے.... نور صاحب؟) مجھے خوشی ہے کہ نئے فنکار موقع سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ (کب نہیں اٹھاتے؟) لیکن انہیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں انہیں پاکستان کا سفیر سمجھا جاتا ہے۔ (اور سفیروں کو....) اس لیے اپنی حدود کا خیال رکھیں۔ (حدود کا تعین کون کرے گا نور صاحب!) ایک پاکستانی اداکار راتوں رات بولی وڈ کا ستارہ بن سکتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ہمارے شان کی شاہ رخ خان سے زیادہ عزت و اہمیت ہے۔ (جب تک شاہ رخ سامنے نہ آئے جب تک ہے نا؟)

شکایت

معروف گلوکارہ منی بیگم کا کہنا ہے کہ "پرائیڈ آف پرفارمنس" ہے کیا چیز؟ تین لاکھ روپے اور پیتل کا ایک ٹکڑا بس.... (اسی پیتل کے ایک ٹکڑے کو حاصل کرنے کے لیے بعض فنکار ساری زندگی محنت کرتے ہیں۔ پھر بھی....) تین لاکھ روپے تین دن میں



خرچ ہو جاتے ہیں۔ (چاہیں تو تین منٹ میں ہی خرچ ہو سکتے ہیں' مگر یہ پاکستان ہے بھیا۔۔۔ یہاں۔۔۔) تین لاکھ میں ایک کمرہ یا ایک جھگی بھی نہیں آتی۔ (اس میں تو کوئی شک نہیں۔) پتا نہیں حکومت پرائیڈ آف پرفارمنس کیوں دیتی ہے۔ (زخموں پہ مرہم رکھنے کے لیے) انہوں نے مزید کہا کہ فن کاروں کو عزت اور مقام ملنا چاہیے' یہاں تو فن کاروں کے پاس قبر خریدنے کے پیسے بھی نہیں ہیں۔

منی بیگم کو پنجاب حکومت سے بھی شکایت ہے کہ انہوں نے فن کاروں کو بھکاری بنادیا ہے۔ اس طرح ہر مہینے چند ہزار روپے دینے سے بہتر ہے کہ چند فنکاروں کو یکمشت اتنی رقم دے دی جائے کہ وہ اپنا گھر یا اپنے لیے زمین ہی خرید سکیں۔ (تجویز تو آپ کی بری نہیں ہے' لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب یہ فنکار اپنے عروج پر ہوتے ہیں۔ اتنا کماتے ہیں انہیں تب گھر یا زمین لینے کا خیال کیوں نہیں آتا جو۔۔۔)

غرور

صنم ماروی کہتی ہیں کہ عابدہ پروین کو میں اپنے ہر پروگرام میں یاد رکھتی ہوں۔ (ظاہر ہے آپ کے پاس گانے کو کچھ اور ہے ہی نہیں) وہ میرے لیے ایک خزانہ ہیں۔ ان کو سن سن کر میں نے گانا شروع کیا۔ (اور اب ان کو گا گا کر۔۔۔؟) میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی' میں نے چھوٹی عمر میں دنیا گھوم لی۔ (اف کم عمری۔۔۔) اور یہ سب میرے بزرگوں کے کلام کی وجہ سے ہے۔ میں نے کبھی غرور کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیا۔ (بھئی دوسروں کو گا کر غرور کیسا۔۔۔)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ امریکا بہادر نے پچھلے ایک برس سے ڈاکٹر عافیہ صدیقی پر فون پر رابطے کے بھی ذرائع بند کر رکھے ہیں۔ پچھلے برس فون پر بات ہوئی تھی تو عافیہ نے کہا تھا۔ امی سے کہیں افسردہ نہ ہوا کریں۔ مجھے خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تسلی دیتے ہیں اور ان کی مسکراہٹ دیکھ کر میں اپنی ساری تکلیفیں بھول جاتی ہوں۔

امریکی جیل کے حکام حیران ہیں کہ اس قدر سختی اور مظالم کے باوجود یہ لڑکی اس قدر پرسکون اور مطمئن کیوں ہے۔

(ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی بہن فوزیہ صدیقی کی بات چیت)

☆ کیا یہ اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے لیے ڈوب مرنے کا مقام نہیں ہے' جن کے گھر میں کھانے کے لیے ایک کھجور نہیں ہوتی تھی' لیکن دیوار پر 9 تلواریں اور 7 زرہیں لٹک رہی ہوتی تھیں جو اس قدر پریکٹیکل تھے۔ زندگی میں 27 غزوات میں خود شریک ہوئے جو تاجر بھی تھے۔ معلم بھی تھے اور مبلغ بھی تھے۔ جنہوں نے زندگی میں ایک لمحہ ضائع نہیں کیا' جو گھوڑے سے اترتے تھے تو صفہ کے اصحاب کو پڑھانے لگتے تھے۔ وہاں سے فارغ ہوتے تھے تو بیماروں کی عیادت کرتے تھے۔ وہاں سے نکلتے تھے تو بازار میں تاجروں کے مسائل سنتے تھے۔ وہاں سے نکلتے تھے تو مسجد آجاتے تھے۔ جو رات کے وقت اہل خانہ کی تربیت فرماتے تھے۔ اگر پھر بھی وقت بچ جاتا تو وہ اپنے جوتے گانٹھ لیتے تھے۔ لشکر کو بدر کے میدان میں لاتے تھے اور پھر اللہ سے نصرت کی دعا کرتے تھے۔

لیکن ہم علم اور عمل کے بغیر دعا کے ذریعے اپنے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

(جاوید چوہدری)



مہندی کے ڈیزائن

ادارہ





بقیہ مریم انصاری

65 "مستقبل کے لیے کیا سوچا؟"

"کہ بہت بڑی ڈائریکٹر بنوں۔ بہت بڑی ڈی او پی بنوں اور اچھی تعلیم حاصل کر کے فلم انڈسٹری کو کچھ دوں۔"

66 "کھانے کون سے پسند ہیں دیسی یا بدیسی؟"

"مجھے دیسی کھانے ہی پسند ہیں۔ بریانی' تکہ۔"

67 "ایک کھانا جو آپ بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟"

"کڑاہی' چکن کی۔"

68 "نرم دل کون ہوتا ہے؟"

"مرد بھی کبھی کبھی بہت نرم دل کے ہو جاتے ہیں اور عورت تو خیر ہوتی ہی ہے۔"

69 "ہاتھ میں ذائقہ کس کے ہوتا ہے۔ مرد یا عورت؟"

"آج کل کے دور میں مرد کک زیادہ ہو گئے ہیں۔ تو دونوں کے ہاتھ میں ذائقہ ہوتا ہے۔"

70 "بوتیک یا درزی کیا پسند ہے؟"

"ریڈی میڈ بھی لے لیتی ہوں اور امی بھی ڈیزائن بتا کر سلوا دیتی ہیں۔"

71 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"کیڑوں سے ڈر نہیں لگتا۔ البتہ چھپکلی سے ڈر لگتا ہے۔"

72 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"بالکل ہوتی ہے۔"

73 "بہت تکلیف ہوتی ہے؟"

"جب انسان غصے میں دل کی بات کر دے اور منہ سے نکلی بات کبھی واپس نہیں آتی' مگر دل کا حال تو معلوم ہو جاتا ہے۔"

74 "مزاج میں نخرے ہیں؟"

"بالکل نہیں خاص طور پر کھانے پینے کے معاملے میں تو بالکل نہیں ہیں۔"

76 "پاکستان کی کس تاریخی شخصیت سے ملنا چاہتی ہیں؟"

"قائداعظم اور ہاں عمران خان سے بھی ملنا چاہتی ہوں۔"

77 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"

"بہت بار..... بس کچھ لوگوں کے ہاتھ لگ جائے تو جان نہیں چھوڑتے تو بدلنا پڑتا ہے۔"

78 "کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"

"چارجر' فون' والٹ اور پرفیوم اور پیسے۔"

79 "شہرت نے مسئلہ کیا؟"

"نہیں ہرگز نہیں۔ میں تو اب بھی ویسی ہوں جیسی پہلے تھی اور اتنے بچپن سے کام کر رہی ہوں۔ اس لیے مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

80 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"

"بالکل جی..... بہت آسانی سے۔"

81 "اپنی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

"بری تو یہ کہ میں بولتی بہت ہوں۔ لوگوں کو کہنا پڑتا ہے چپ ہو جاؤ اور اچھی یہ کہ کبھی کسی کے بارے میں برا نہیں سوچا۔"

82 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"

"کھانے پینے پہ غصہ نہیں اتارتی۔"

83 "غصے میں پہلا لفظ کیا منہ سے نکلتا ہے؟"

"لفظ کوئی نہیں نکلتا بلکہ میں ہی کمرے سے نکل جاتی ہوں۔"

84 "مارننگ شو کیسے لگتے ہیں؟"

"کوئی خاص نہیں۔"

85 "کبھی سوچا کہ کاش میں اس فیلڈ میں نہ ہوتی؟"

"نہیں نہیں ایسا کبھی نہیں سوچا۔ ہاں جب فیملی کو ٹائم نہیں دے پاتی تو کہتی ہوں کہ کاش میں تھوڑا کام لے لیتی۔"

86 "نیند جلدی آتی ہے؟"

"کوشش تو ہوتی ہے کہ تسبیح پڑھ کر سو جاؤں کیونکہ اس سے ثواب بہت ملتا ہے' مگر مجھے نیند مشکل سے آتی ہے"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"اللہ نہ کرے جی۔"

☆

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

س۔ع۔ڈیرہ غازی خان

آپ کے بہنوئی شروع سے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ آپ کے والد کے دیے پیسوں سے وہ باہر گئے' لیکن وہاں بھی کوئی کام نہیں کیا۔

جب وہ ملک سے باہر تھے تو بہن نے کسی سے رانگ نمبر پر بات کی۔ یہ بہن کی غلطی تھی۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن غلطی انسان سے ہوتی ہے اور غلطی کی معافی ہے۔ بشرطیکہ انسان سچے دل سے توبہ کرلے۔ جبکہ آپ کی بہن کے سسرال والوں نے تو اسے مارا بھی ہے۔ اب بہن میکے میں ہے ' بچے سسرال والوں کے پاس ہیں اور بہنوئی اسے گھر لے جانے پر تیار نہیں ہے' جبکہ بہن شرمندہ ہے اور روتی رہتی ہے۔

آپ نے پوچھا ہے کیا اسے طلاق لے کر دوسری شادی کرلینا چاہیے؟

فی الحال نہیں' اور اس صورت میں جبکہ وہ مزید بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے' دوسری شادی مسئلہ ہو سکتی ہے۔ دوسری شادی کی صورت میں اسے اپنے بچوں کی جدائی برداشت کرنا پڑے گی۔ پہلا شوہر بچے نہیں دے گا اور بالفرض دے بھی دے تو دوسرا شوہر بچوں کو قبول نہیں کرے گا۔

کورٹ میں جاکر بچے لینا بھی آسان نہیں ہے۔ کیونکہ بقول آپ کے گھر میں کوئی اس کے ساتھ کورٹ جانے پر رضامند نہیں ہوگا۔ پھر کورٹ کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے' جبکہ گھر میں کوئی تعاون کرنے کو تیار نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شوہر بچے دے دے گا تو آپ کی بہن بچوں کی پرورش کیسے کرے گی' جبکہ اس کی کوئی خاص تعلیم بھی نہیں ہے کہ وہ کوئی اچھی نوکری کرسکے۔

ان حالات میں صرف یہ ہی صورت بہتر نظر آتی ہے کہ آپ کی بہن کوئی ہنر سیکھ کر آمدنی کا ذریعہ پیدا کرنے کی کوشش کرے' کیونکہ شوہر کوئی کام نہیں کرتا' اس لیے امکان یہ ہی ہے کہ زیادہ دیر بچوں کو اپنے پاس نہیں رکھ سکے گا اور آپ کی بہن کے پاس چھوڑ جائے گا۔

دوسری شادی کے بارے میں فی الحال نہ سوچیں' ممکن ہے' تھوڑا وقت اور گزرے تو کوئی صورت نکل آئے۔

آپ کے بھائیوں کا رویہ قابل مذمت ہے۔ انہیں بہن کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔

فارہ

کوئی بھی چیز جو حد سے بڑھ جائے نارمل نہیں رہتی۔ آپ کے والد کی حد سے بڑھی ہوئی کنجوسی بھی ایک قسم کی ذہنی بیماری ہے' لیکن اس کا علاج ممکن نہیں ہے' کیونکہ والد خود کو کبھی بھی بیمار تسلیم نہیں کریں گے۔

آپ نے لکھا ہے کہ یونی ورسٹی میں داخلہ لے کر رشتہ ڈھونڈلوں' اچھی بہن یونی ورسٹی علم حاصل کرنے کی جگہ ہے' رشتہ کرنے کی نہیں اور یہ کوئی یقینی بات نہیں کہ آپ کو وہاں رشتہ مل جائے گا۔ پھر یونی ورسٹی میں داخلہ ملنا اور وہاں کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے' کیونکہ آپ کے والد تو پیسہ خرچ کرنے کو تیار نہیں۔

آپ نے اپنی والدہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ کیا وہ بھی والد صاحب کے ساتھ ہیں؟ آپ ان سے بات کریں۔ ان حالات میں آپ کے لیے مشورہ یہ ہے کہ آپ کوئی کورس کر کے کہیں جاب کرنے کی کوشش کریں'

تاکہ شادی کے اخراجات کے لیے کچھ رقم جمع کرسکیں۔ شاید اس صورت میں آپ کے والد آپ بہنوں کی شادیاں کردیں۔

سارہ۔ کراچی

اچھی بہن کسی سے فون پر بات کرکے اس کے عشق میں مبتلا ہوجانا محبت نہیں حماقت ہے۔ آپ ٹی وی اور فلمیں دیکھنا بند کردیں۔ اس طرح کی چیزیں حقیقی زندگی میں نہیں ہوتیں۔ وقت گزاری کے لیے میٹھی میٹھی باتیں کرنا الگ بات ہے۔ شادی بالکل علیحدہ بات ہے اس کا شروع سے ہی شادی کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ آپ سے فون پر باتیں کرتا رہا۔ محبت کا اظہار کرتا رہا۔ شادی کا وقت آیا تو پیچھے ہٹ گیا اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ وقت گزاری کررہا تھا اور آپ اس پر یقین کر بیٹھیں' اپنی نہیں تو والدین کی عزت کا خیال کریں۔ جو شخص آپ سے ملنا ہی نہیں چاہتا' اس کے پیچھے خوار ہونا پاگل پن ہے۔ جتنی جلد اس پاگل پن سے نکل جائیں' آپ کے لیے بہتر ہے۔

سعدیہ۔ لاہور

آپ کی شادی کو صرف ایک ماہ گزرا ہے اور اتنے مسائل لھڑے ہوگئے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی مسئلہ بہت بڑا نہیں ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ شادی کے بعد فوراً"ہی شوہر آپ کے اشاروں پر چلنے لگے گا تو یہ آپ کی بھول ہے۔ آپ بہت ساری باتیں شوہر سے منواسکتی ہیں لیکن پہلے آپ کو اس کا دل جیتنا ہوگا۔ خود کو اس کی مرضی کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ جس ماحول سے آپ آئی ہیں۔ سسرال کا ماحول اس سے یکسر مختلف ہے' ان لوگوں میں کچھ خامیاں ہیں آپ ان لوگوں کو بدلنا چاہتی ہیں' یہ کام اتنا آسان نہیں' ان کو بدلنے میں وقت لگ سکتا ہے۔ اگر آپ نے سچے دل سے اور خلوص سے کوشش کی تو یقیناً"کامیاب ہوں گی۔ لیکن بہت محتاط انداز سے اور نرمی سے کوشش کرنا ہوگی۔ نوکری کے لیے شوہر اجازت دیں تو کرلیں۔ اسے انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ زندگی کا مضبوط بنیادوں پر استوار ہونا ضروری ہوتا ہے۔ حالات سے سمجھوتا کرکے ہی زندگی گزر سکتی ہے ورنہ تماشا ہی بنتا ہے۔

روزینہ۔ کراچی

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے غصہ بہت جلدی آجاتا ہے۔ میں ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں شادی سے پہلے بھائیوں کی لاڈلی تھی اب بھی میرے بھائی مجھے بہت چاہتے ہیں خیال کرتے ہیں۔ میرے اندر حسد بھی بہت ہے میں اپنی نندوں' جٹھانیوں اور بھاوجوں کو خوش دیکھتی ہوں میرے اندر آگ سی بھڑک جاتی ہے مجھے لگتا ہے کہ ان خوشیوں پر صرف میرا حق ہے۔ میں اپنے خود ساختہ دکھوں سے پریشان رہتی ہوں الحمدللہ میرے شوہر اور بچے بھی بہت اچھے ہیں۔

ج: یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ کو اپنی خامیوں کا اندازہ ہے انسان کو جب اپنی خامیوں کا ادراک ہوجائے تو انہیں دور کرنا مشکل نہیں ہوتا۔

غصہ جلد آنے اور حسد کی وجہ تو آپ نے خود لکھ دی ہے شادی سے پہلے آپ بھائیوں کی لاڈلی تھیں۔ اب بھی آپ کے بھائی آپ کو چاہتے ہیں لیکن آپ ان کی محبت پر بلا شرکت غیرے اپنا حق سمجھتی ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ آپ ہر چیز پر صرف اپنا حق سمجھتی ہیں۔ خواہ شوہر ہوں یا بھائی' آپ ان کی محبت میں کسی کی شراکت برداشت نہیں کرسکتیں۔ بھائیوں کے بیوی بچوں کو خوش دیکھ کر آپ کو جلن ہوتی ہے۔ نندوں' جٹھانیوں کے ساتھ آپ کا رویہ یہی ہے۔ اس رویے سے آپ دوسروں کو کم اور خود کو زیادہ نقصان پہنچارہی ہیں' آپ نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اپنی صحت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔ جب بھی آپ کے دل میں جلن حسد کا جذبہ پیدا ہو لاحول پڑھیں اور شیطان سے پناہ مانگیں۔



امت الصبور

بیوٹی بکس

فائزہ علی.... کبیروالا

س : میرے بال بہت روکھے اور خشک ہیں، کئی شیمپو بدل کر دیکھے کوئی فائدہ نہیں ہوا، خشک ہونے کی بنا پر بال بکھرے رہتے ہیں۔ کتنی بار کنگھا کرلوں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تیل لگانے کے بعد لگتا ہے جیسے میلے ہوں کوئی چمک یا رونق نظر نہیں آتی۔

ج : سب سے پہلے تو آپ اپنا شیمپو تبدیل کریں، ایسا لگتا ہے کہ آپ جو شیمپو استعمال کررہی ہیں وہ خشک بالوں (dry hair) کے لیے نہیں ہے۔

دوسری بات آپ اپنی غذا پر توجہ دیں۔ خصوصاً "آئرن" والی چیزیں کھائیں۔ جیسے پالک، کیلا، سیب وغیرہ، ممکن ہو تو ڈاکٹر کے مشورے سے کوئی آئرن ٹیبلٹ استعمال کریں۔

ایک ماسک لکھ رہی ہوں یہ بالوں پر لگائیں۔ یہ ماسک بالوں کو نمی بھی فراہم کرتا ہے۔

کچا دودھ	تین کھانے کے چمچے
کیلا	ایک عدد
شہد	ایک کھانے کا چمچہ
زیتون کا تیل	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب : ان تمام اشیاء کو بلینڈر میں ڈال کر پیسٹ بنالیں بلینڈر نہ ہو تو آپ کانٹے کی مدد سے بھی کیلے کو میش کرسکتی ہیں۔

اب اس پیسٹ کو بالوں میں لگا کر ایک گھنٹہ تک چھوڑ دیں۔ اس کے بعد پانی سے دھو کر صاف کرلیں اور پھر شیمپو استعمال کریں۔ آپ کے بال چمکیلے اور لچک دار ہوجائیں گے۔

.....

س : میری بھنویں پہلے بہت گھنی اور اچھی تھیں، لیکن پتا نہیں کیا ہوا کہ ہلکی اور جھڑنا شروع ہوگئیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے انہیں شیپ دینے کے لیے کئی بار تھریڈنگ اور پلکنگ کروائی تھی۔ اب مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں۔

ج : بھنویں کبھی کبھی وراثت کے اثرات کی وجہ سے بھی چھدری ہوتی ہیں، لیکن آپ کی پہلے گھنی تھیں اب جھڑنا شروع ہوئی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے کچھ اس قسم کی کاسمیٹکس استعمال کی ہیں جن سے جلد کو نقصان پہنچا ہے۔ اگر آپ کوئی کاسمیٹکس استعمال کررہی ہیں تو فوراً روک دیں۔ بہت زیادہ بال نوچنے سے بھی پھر بال نکلنا بند ہوجاتے ہیں تھریڈنگ کرانا بھی بند کردیں۔

بھنوؤں کو موٹا اور گھنا بنانے کے لیے اپنی خوراک میں وٹامن سی اور وٹامن ای پر مشتمل غذائیں بڑھادیں۔ جیسے کینو، لیموں، آج کل آموں کا موسم ہے۔ آم اور جامن زیادہ کھائیں۔ ڈاکٹر سے مشورہ کرکے وٹامن سی اور ای کی ٹیبلٹ بھی لے سکتی ہیں۔ یہ وٹامنز آپ کے سر کے بالوں اور چہرے کی جلد کے لیے بھی مفید ثابت ہوں گے۔

بھنوؤں کو سیاہ، چمک دار اور موٹا بنانے کے لیے رات کو سوتے وقت بھنوؤں پر کیسٹر آئل لگائیں۔ اس کے بہت اچھے نتائج حاصل ہوں گے۔

فی الحال آپ براؤن پنسل کی مدد سے اپنی پتلی اور چھدری بھنوؤں کو گھنا تاثر دے سکتی ہیں۔

☆